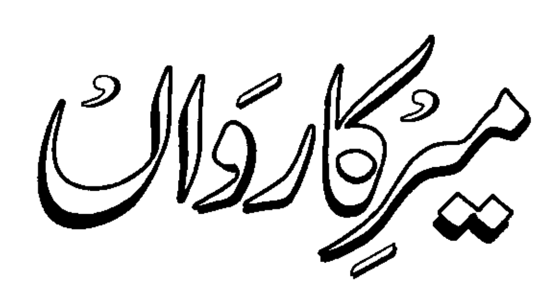


حضرت مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندوی رحمۃ اللہ علیہ کی سیرت کے چند نقوش، چشم دید واقعات، سفر و حضر میں خادمانہ رفاقت کی یادگاریں، سیرت ساز ماحول، عقل و فکر کی نشو و نما کا میدان، طبعی رجحان، درس و تدریس کا طریقہ، تقریر و تحریر کا اسلوب، تعلق باللہ کے مظاہر، عرب و عجم میں عند اللہ مقبولیت کے آثار، ملت اسلامیہ کے میر کارواں کے امتیازی اوصاف، آپ کی خودنوشت سوانح حیات ”کاروان زندگی“ میں جو باتیں ازراہ تواضع نہیں لکھی گئیں ان کی چند جھلکیاں



عبداللہ عباس ندوی

شائع کردہ

مجلس تحقیقات و نشریات اسلام، لکھنؤ

بعد نظر ثانی واضافہ

باراول

از: مجلس تحقیقات ونشریات اسلام

۱۴۲۲ھ ۲۰۰۱ء

نام کتاب .... میر کارواں

مؤلف .... عبداللہ عباس ندوی

کمپوزنگ .... حامد، کمپیوٹر سیکشن مجلس تحقیقات

تعداد اشاعت .... دو ہزار

صفحات ۶۳۸

طابع .... کاکوری آفسٹ، لکھنؤ

قیمت .... ۱۳۰/۰۰ روپے

ناشر

مجلس تحقیقات ونشریات اسلام، لکھنؤ

پوسٹ بکس نمبر ۱۱۹

تعارف مؤلف

نام: عبداللہ عباس ندوی
فاضل دارالعلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ
پوسٹ گریجویٹ ڈپلوما السنہ سامیات (ممتاز)
ایم اے، پی ایچ ڈی (فلسفہ لسانیات) یونیورسٹی آف لیڈس، انگلینڈ
جائے پیدائش: پھلواری شریف ضلع پٹنہ ۱۹۲۶ء
موجودہ سکونت و شہریت: مکہ مکرمہ

مؤلفات:

دروس الاطفال۔ آسان فقہ۔ عربی میں نعتیہ کلام (اردو)۔ ردائے رحمت (شرح قصیدہ بانت سعاد، قصیدۂ بردہ)۔ شرح قصیدہ علامہ نحوی۔ عربی، اردو۔ تفہیم المنطق (اردو)۔ پیغمبر اخلاق و انسانیت۔ خطبات حیدرآباد سیرت نبوی۔ تعلم لغۃ القرآن الکریم (عربی، انگریزی)۔ ترجمات معانی القرآن وتطور فہمہ عند الغرب (عربی)۔ قاموس الفاظ القرآن الکریم (عربی، انگریزی)۔ مذاہب المنحرفین فی التفسیر (عربی)۔ نظام اللغۃ الاردیۃ (عربی)۔ نگارشات۔ عربی میں نعتیہ مشاعرہ مضطرب کا درماں

سابقہ مشغولیت:

استاذ ادب۔ ادیب اول دارالعلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ
وکیل ادارۂ نشریات شرقیہ (سعودی عرب)
مدیر منظمات اسلامیہ رابطہ عالم اسلامی،
اڈیٹر ماہنامہ رابطہ (انگریزی)
استاذ جامعہ ام القریٰ مکہ مکرمہ (ادب عربی و معہد عربی برائے غیر عرب)

موجودہ مشغولیت

معتمد تعلیمات دارالعلوم ندوۃ العلماء
مشیر اعزازی رابطہ عالم اسلامی
لنگوئسٹک سوسائٹی کیمبرج انگلینڈ

فہرست

شکر و اعتراف

حضرت مخدوم و مربی مولانا سید ابوالحسن علی ندوی رحمۃ اللہ علیہ کی سوانح حیات کے چند نقوش پیش کرنے کا ارادہ کئی سال پہلے کیا تھا، اور خیال تھا کہ ایک دو ماہ میں اپنے ذہنی خاکہ کے مطابق یہ کام کرلوں گا۔ اسی طرح دو تین ہفتوں میں کتاب چھپ جائے گی۔ کمپیوٹر کا زمانہ ہے، تاخیر کا کوئی سبب نہیں سمجھ میں آرہا تھا کیونکہ اس کی ترتیب اپنی یادداشت اور مشاہدات پر مبنی ہے۔ چند اقتباسات لینا ہیں وہ موجود ہیں، خود حضرت مولانا کی خود نوشت سوانح موجود ہے۔ مگر کام شروع کیا۔ اپنی فکر کے مطابق ایک ذہنی ترتیب قائم کرلی۔ زیادہ مراجع و مصادر کی ضرورت نہیں اور جو مطلوب ہے وہ سامنے ہے، صرف چند باتیں ہی ہیں جو اگر مجھے لکھنے کی توفیق نہیں ہوئی تو دوسروں کے لئے مزید دشواری ہوگی، جیسے طریق تدریس، قرآن اور ادب کے معاملے میں مولانا کا ذوق، پسند اور ناپسند کا معیار، اردو، عربی تحریر و خطابت کا اسلوب یا بیرونِ ہند جو اہل علم کے نزدیک مولانا کا مقام رہا ہے اور اہل علم و قلم نے جس طرح حضرت مولانا کی قدر دانی کی ہے جس کا میں شاہد ہوں، غرض اسی طرح کی چند باتوں کو جمع کردوں گا۔ اور کتاب تیار ہوجائے گی، مگر بات سے بات نکلتی آئی، گفتگو کا سرا جہاں سے شروع کرنا چاہتا تھا اس سے پہلے کے واقعات و حالات کو

سامنے لانا ضروری تھا۔ مولانا کی اصلی فکر اور انداز دعوت کو سمجھنے کے لئے بعض طویل خطوط اور تقریروں کو نقل کرنا ضروری تھا۔ اس لئے بات پھیلتی اور بڑھتی گئی۔

دوسری دشواری یہ پیش آئی کہ جس شخصیت کی سوانح میں لکھنا چاہتا تھا ان کی پوری زندگی سراسر عملی تھی، روزانہ چار پانچ گھنٹے لکھنے پڑھنے اور املا کرانے کا معمول برسہا برس سے قائم رہا، بیماری کی حالت میں بھی جس کو چین نہ آتا ہو آنکھوں کی سخت جان لیوا تکلیف میں بھی جس کا ذہن خالی نہ رہا ہو، ۱۶ سال تک جو آنکھ کی کمزروی کی وجہ سے خود سے پڑھنے اور لکھنے سے معذور رہا ہو مگر اس زمانہ میں بھی متعدد اہم کتابوں کا املا کرایا ہو۔ ان کی زندگی کے نقوش ۔(سوانح حیات نہیں کہہ رہا ہوں وہ تو اور بھی دشوار طلب کام ہے) کا جمع کرنا اور متناسب چوکھٹے میں ان کو جگہ دینا، کسی آرام طلب، انسان کے لئے آسان نہ تھا۔ خاص طور پر یہ بات کہ کیا لکھے اور کیا چھوڑے۔ جب کوئی بات لکھ چکا تو خیال آیا کہ اس سلسلہ میں فلاں بات رہ گئی۔

مزید دشواری اپنی کاہلی اور اس کے ساتھ کثرت سے سفر، یونیورسٹی سے ریٹائرڈ ہونے کے باوجود چند طلباء کے تحقیقی کاموں کی نگرانی، مکہ مکرمہ کے قیام کے زمانہ میں رابطۂ عالم اسلامی سے رسمی اور غیر رسمی مشیر ہونے کا تعلق۔ اور جب لکھنؤ میں رہے تو کچھ پڑھنے پڑھانے کا سلسلہ چند الٹی سیدھی تحریریں تبصرہ اور مقدمہ وغیرہ لکھنے کا سلسلہ قائم رہا۔ اس لئے بھی کام ٹلتا رہا اور اصل دشواری وہاں پیش آئی جس کو آسان سمجھ کر اختیار کیا تھا یعنی کمپیوٹر پر کتاب چھپوانا، جس میں کتابت سے کہیں زیادہ دشواریوں کا سامنا کرنا پڑا۔

ادھر یہ تاخیر ادھر احباب کا تقاضہ ظاہر ہے کہ ان کا تقاضہ بھی بجا تھا، کوئی فردوسی کا شاہنامہ یا مہابھارت کا رزمیہ تو نہیں لکھ رہے تھے جس کے لئے اتنی مدت ناکافی ہو۔ بعض عزیز احباب نے میری مدد کی، مگر وہ خود مجھ سے زیادہ مشغول تھے۔

بالآخر اللہ تعالیٰ کو منظور ہوا تو ایک عزیز طالب علم مولوی مزمل حسین قاسمی ندوی نے کمپوز کرانے اور تصحیح کا کام اپنے ذمہ لیا اور حضرت کی زندگی کے آخری ایام میں یہ کتاب چھپ کر آ گئی۔ محبّ گرامی جناب مولانا عبدالکریم پاریکھ ہمیشہ سباق الی الخیر (اچھے کاموں میں پیش قدمی کرنے والے) رہتے ہیں میری ہمت افزائی کی۔ اور مالی تعاون بھی کیا۔ عزیزی شاہد حسین صاحب (نائب ناظر عام ندوۃ العلماء) نے آمادگی ظاہر کی کہ اپنے پریس میں بلا معاوضہ چھپوا دیں گے، اس لئے مجھے اس کتاب کی طباعت کا پورا بار نہیں اٹھانا پڑا۔ جناب مولانا عبدالکریم پاریکھ اور شاہد صاحب نے بغیر میری طلب کے، حضرت مولاناؒ سے عقیدت و تعلق کی بنا پر اس کام میں حصہ لینے کو اپنی سعادت سمجھا۔ اسعدهما الله في الدارين خيرا، و تقبل منا و منهم صالح الأعمال۔

یہ دوسرا ایڈیشن حضرت کی وفات کے ۱۴ ماہ بعد مجلس تحقیقات و نشریات اسلام سے شائع ہو رہا ہے۔ آپ کے نام کے ساتھ ''مدظلہ'' اور دامت برکاتہم کی جگہ ''رحمۃ اللہ علیہ'' کر دیا گیا ہے پھر بھی بہت سے مقامات پر یہ تبدیلی نہیں ممکن تھی ناظرین خود اس کا اندازہ لگا لیں گے۔

عبداللہ عباس ندوی

عرض ناشر

(اول)

ڈاکٹر محسن عثمانی ندوی

(صدر شعبۂ عربی دہلی یونیورسٹی)

ہندوستان میں بیسویں صدی کے قرن سے جب خورشید تازہ نمودار ہوا تو یہ مسلمانوں کے زوال اور انگریزوں کے اقبال کا وقت تھا۔ حکومت ختم ہو چکی تھی۔ دولت بھی منھ پھیر چکی تھی۔ زبان اور تہذیب گرتی ہوئی دیوار تھی۔ مذہب جارحیت کا نشانہ تھا، ملت اسلامیہ خستگی اور درماندگی میں پچھلے پہر کسی سانس لیتے ہوئے چراغ کا منظر پیش کر رہی تھی۔ یہ اس گروہ کا حال تھا۔ جس نے تہذیب وتمدن کی ترقی میں ناقابل فراموش کردار ادا کیا تھا۔

اس ناتواں اور نیم جاں ملت کی مسیحائی کے لئے بہت سے اہل اخلاص پہلے سے سرگرم عمل تھے۔ ایک جماعت نے علوم دینیہ کو درد کا درماں سمجھ کر قدیم طرز کے مدرسے قائم کر لئے تھے۔ دوسرے طبقے نے انگریزی زبان اور دنیوی علوم کو زخم کا مرہم سمجھ کر جدید تعلیم گاہیں بنائی تھیں۔ دونوں طبقے مفید کام انجام دے رہے تھے۔ لیکن دونوں ایک دوسرے سے اجنبی اور بیگانہ تھے۔ ایک طبقے کے پاس دین تھا

لیکن تفہیم وترسیل کے لئے زبان نہیں تھی۔ دوسرا طبقہ اساس دین سے ناآشنا تھا۔

اسے کشتی نہیں ملتی اسے ساحل نہیں ملتا

دونوں طبقوں میں اعتدال وتوازن مفقود تھا۔ دین ودنیا کی جامعیت کمیاب تھی، مسلمانوں کے مختلف مسلکی گروہوں کے درمیان باہمی جدال، مناظرہ بازی سب وشتم، دشنام والزام کا بازار گرم تھا مسلمانوں کے قدیم اور جدید طبقے کے درمیان خلیج کو پاٹنے کے لئے، توازن پیدا کرنے کے لئے اور معاشرہ کو باہمی جدال سے بچانے کے لئے ایک اور ادارے کی ضرورت تھی۔ آخر کار اہل نظر اور دانش وروں نے اس ادارے کو قائم کر ڈالا اور اس کا نام ندوۃ العلماء رکھا تھا۔ تحریک ندوۃ العلماء کی تاریخ میں ایک ذمہ دار شخصیت حضرت مولانا سید عبدالحی الحسنی کی ہوئی، جو عربی زبان میں نزھۃ الخواطر جیسی انسائکلو پیڈیا اور اردو میں گلِ رعنا جیسی کتاب کے مصنف تھے۔ حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی مدظلہٗ جو اس پیش نظر کتاب کا عنوان ہیں ان ہی صاحب نزھۃ الخواطر حضرت مولانا عبدالحی مرحوم کے فرزند ارجمند ہیں۔ اور ملت اسلامیہ کے میرِ کارواں ہیں۔

ندوۃ العلماء کی اس تحریک نے متعدد ایسے عالم دین ادیب پیدا کئے، جنھوں نے علم کی جامعیت، وسعت نظری اور انشاء پردازانہ اسلوب کے ذریعہ علم دین کو فروغ دیا اور ملک کے اندر بھی امثال اور اقران میں ممتاز ہوئے اس سلسلۃ الذہب کی ایک کڑی حضرت مولانا کی شخصیت ہے۔ جن کی مقبولیت ہندوستان سے لے کر عالم اسلام تک پھیلی ہوئی ہے۔ جتنا عام اور ہمہ گیر اعتماد ان کو ملا ہے وہ پہلے کسی اور کو نہیں مل سکا۔ مولانا کی شخصیت جامع کمالات ہے اور دنیا کے ملکوں میں ان پر تحقیقی کاموں اور مذاکروں کا سلسلہ بھی شروع ہو چکا ہے۔ البیت یعرفہ والحل والحرم۔ (بیت اللہ ان کو جانتا ہے۔ اور پورا خطہ حل وحرم جانتا ہے۔)

حضرت مولانا ابوالحسن علی ندوی کی اپنی شخصیت بھی خود ان کے اسلوب کی طرح مختلف پھولوں کا عطر مجموعہ ہے۔ اہل دل کے دنوں کی تپش اور شبوں کا گداز، شعر وادب کے قلم کا ساز، اہل فکر وعلم کا ذوق جستجو اور مجاہدین کی روح عمل یہ سب کچھ ان کی ذات میں اس طرح جمع ہوگیا کہ ان کی اپنی شخصیت سب سے منفرد اور سب سے ممتاز ہوگئی ہے۔ اس میں جامعیت بھی ہے اور اعتدال بھی ہے۔ جمال بھی ہے اور کمال بھی ہے وہ بے ہمہ بھی ہے اور باہمہ بھی ہے۔

مثل خورشید سحر فکر کی تابانی میں
شمع محفل کی طرح سب سے جدا سب کا رفیق

یہ صرف مولانا ابوالحسن علی ندوی کی شخصیت ہے جس نے گلشن دین وعلم وادب کے بہت سارے پھولوں کا عطر کشید کرلیا ہے۔ ان کی ذات میں مدرسہ بھی ہے اور خانقاہ بھی۔ علم وادب کا سکون بھی ہے اور تحریک واجتماعیت کی گرمی محفل بھی۔ فکر کی تابانی بھی ہے اور انشاء کی درخشانی بھی۔ وہ ان سے بھی مخاطب ہوتے ہیں جو اورنگ نشین سلطنت ہیں اور ان کو بھی پیغام انسانیت دیتے ہیں جو برادرانِ وطن ہیں یہی جامعیت کا کمال ہے جو ان کی شخصیت کا امتیاز خاص ہے۔

مولانا کی عالمی مقبولیت اور شہرت کا راز صرف علم کی وسعت، تصانیف کی کثرت عربی اور اُردو دونوں زبانوں پر قدرت اور اسلوب کے جمال میں پوشیدہ نہیں۔ وہ ندوۃ العلماء مدارس عربیہ، دینی تعلیمی تحریک، مسلم پرسنل لا بورڈ، رابطہ ادب اسلامی اور بہت سے علمی اداروں کے روح رواں اور ان کے لئے باعث عزت وسرفرازی ہیں۔ ان کے کاموں اور کارناموں کا دائرہ آفاق گیر ہے۔ تصنیف وتالیف کا مشغلہ، پیرانہ سالی، عبادت وریاضت ان سب کا تقاضہ سکون وخلوت نشینی ہے۔ لیکن یہ روح جہاد ہے جو ان کو خلوت سے نکال کر جلوت میں لاتی اور سرگرم سفر رکھتی ہے۔ قرطاس

وقلم کی بساط سے لے کر کارزار عمل تک خدا اور خلق خدا دونوں کے تقاضوں سے عہدہ برآ ہوتے ہوئے شب وروز ہمہ وقت مشغول رہنا اور پوری دنیا کو اپنی جولان گاہ بنالینا اور اپنی مثالی زندگی اوراعلیٰ کردار سے انسانوں سے بلا اختلاف مسلک ومذہب محبت کا باج اور عقیدت کا خراج وصول کرنا معمولی درجے کی بات نہیں، یہ انھیں کا کام ہے جن کے حوصلے بلند ہوں۔

حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی کی تصنیفات کا مطالعہ متنوع سمتوں میں ہماری رہنمائی کرتا ہے۔ نگارشات کے گلدستے میں قرآنی موضوعات بھی ملتے ہیں، سیرت نبوی کے موضوع پر کتابیں بھی نظر آتی ہیں۔ حدیث، تاریخ، علم کلام، سوانح وخاکہ نگاری اور اصلاحیات کے علاوہ خالص فکری موضوعات پر بھی مستقل تصنیفیں ملتی ہیں۔ انھوں نے عربی اور اردو دونوں زبانوں کے دامن ادب کو مالا مال کیا ہے۔ سیرت سید احمد شہید ابتدائی عہد کی تصنیف ہے۔ اس کے بعد عربی زبان میں ان کی کتاب ''ماذا خسر العالم بانحطاط المسلمین'' سامنے آئی۔ جس نے مقبولیت کا ریکارڈ قائم کیا۔ انھوں نے اقبال کے کلام کا بہت خوبصورت عربی نثر میں ترجمہ کیا۔ پھر تاریخ دعوت وعزیمت کی جلدیں اور کئی دوسری وقیع کتابیں مولانا کے قلم سے نکلیں۔ ان کے قلم کی جوئے بار اور رود بار کو دیکھ کر کسی خوش خرام پہاڑی ندی کا تصور سامنے آتا ہے، جو گاتی ہوئی گنگناتی ہوئی عراق دل نشیں کے ساز کو چھیڑتی ہوئی سنگ رہ سے گاہ بچتی گاہ ٹکراتی ہوئی نخلستانوں کو شاداب اور ریگستانوں کو سیراب کرتی ہوئی چلتی ہے۔

مولانا کی شخصیت عالم اسلام کی محبوب ترین شخصیت ہے۔ مولانا کی دلآویز تحریریں پڑھی جاتی رہیں گی۔ ان کی شخصیت پر کتابیں اردو عربی میں چھپنے لگی ہیں اور آئندہ بھی چھپتی رہیں گی۔ کتاب دل کی تفسیریں لکھی جارہی ہیں اور لکھی جاتی رہیں گی

لیکن پیش نظر کتاب کا امتیاز یہ ہے کہ یہ اس شخص کے قلم سے ہے جو نصف صدی سے زیادہ تک مولانا کا شاگرد اور مسترشد خلوت وجلوت سے واقف اور سفر وحضر کا رفیق رہا ہے۔ جوان کے دنوں کی تپش سے بھی واقف ہے اور شبوں کے گداز سے بھی۔ جو دار العلوم ندوۃ العلماء کا معتمد تعلیم ہے اور خود مولانا کا معتمد علیہ بھی ہے۔ وہ ان کا دمساز بھی ہے اور محرم راز بھی اور مزاج شناس بھی ہے۔ بہت سے لوگ حضرت مولانا کی شخصیت کو ان کی خود نوشت سوانح ''کاروان زندگی'' کے آئینہ میں دیکھیں گے لیکن اس کتاب کے مصنف کے آئینہ دل میں ممدوح کی جو تصویریں ہیں وہ خود نوشت سوانح میں بھی نہیں ملیں گی۔ عشاق ہمیشہ سے بوقت ناز محبوب کی جنبش لب اور جنبش ابرو کو غنیمت جان کر دل میں محفوظ رکھتے اور سرمایہ غزل بناتے رہے ہیں مولانا عبداللہ عباس ندوی نے بھی یادوں کی امانت کو دل میں محفوظ رکھا ہے اور اب نصف صدی کے مشاہدات پر مشتمل اس سفینہ دل کو کتاب کی شکل میں پیش کردیا ہے۔ اس لئے حضرت مولانا کی شخصیت کردار اور مقام ومرتبہ کو جاننے کے لئے یہ کتاب ہمیشہ حوالہ کی کتاب اور مولانا کی شخصیت پر شائع ہونے والی کتابوں میں سب سے زیادہ قابل اعتماد سمجھی جائے گی۔ مولانا عبداللہ عباس ندوی خود صاحب طرز، صاحب اسلوب انشاء پرداز اور صاحب تصانیف ہیں اس لئے کوئی مبالغہ نہ ہوگا اگر غالب کا یہ مصرعہ بے ساختہ یاد آجائے۔

ذکر اس پری وش کا اور پھر بیاں اپنا

مجلس علمی کا ادارہ جو متعدد بیش قیمت کتابوں کا ناشر رہا ہے اس کتاب کی اشاعت کو اپنے لئے باعث افتخار سمجھتا ہے۔ امید ہے یہ کتاب دینی علمی روحانی اور ادبی حلقوں میں ذوق وشوق سے پڑھی جائے گی۔

ابتدائیہ

بنام خداوند جان آفریں   حکیم سخن در زباں آفریں

شوال ۱۴۰۳ھ مطابق اگست ۱۹۸۳ء میں مخدوم ومربی حضرت مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندوی رحمۃ اللہ علیہ کی خودنوشت سوانح کا پہلا حصہ شائع ہوا تھا۔ اس کتاب پر متعدد تبصرے علمی ودینی رسالوں میں شائع ہوئے۔ تبصرے کے عنوان سے ایک مستقل مضمون جناب سید حامد (سابق وائس چانسلر مسلم یونیورسٹی علی گڑھ) کے قلم سے نکلا، اور ایک مضمون راقم نے لکھا جو "الفرقان" (۱) (لکھنؤ) میں شائع ہوا۔ اس مضمون میں راقم نے بعض ان گوشوں کو اجاگر کرنے کی کوشش کی تھی جو مولانا نے فرط تواضع میں فراموش کر دیئے تھے۔ "الفرقان" میں جب یہ مضمون شائع ہوا تو لکھنؤ اور مکہ مکرمہ کے پتوں پر میرے نام متعدد خطوط آئے، لکھنے والوں میں سے بہت سے شناسا بزرگ بھی تھے اور بعض ایسے حضرات بھی تھے جن سے مجھے واقفیت نہیں تھی، ان میں اکثر نے تحسین ودعا کے ساتھ یہ فرمائش کی کہ ایک مستقل کتاب مولانا کی سیرت وسوانح پر شائع ہونی چاہیے۔

ان فرمائش کرنے والوں میں عزیزی شاہ حسن عسکری طارق ٹیلی فون انجینئر مدینہ منورہ اور ایک محبّ عزیز، اخلاص ودرجات میں مجھ سے بڑے اور عمر میں چھوٹے،

---

(۱) بابت ماہ مارچ واپریل ۱۹۸۴ء

ڈاکٹر عبادالرحمٰن نشاط تھے جو جامعہ ام القریٰ میں انگریزی زبان کے استاذ ہیں، موصوف نے یہ بات صرف ''بہ پاس خاطر'' اور اظہار تحسین کے طور پر نہیں کہی، بلکہ اخلاص واصرار کے ساتھ تقاضا کرتے رہے، میں پہلے تو جھجک محسوس کرتا رہا اور چند علمی کام جو پیش نظر تھے ان کو دیکھتے ہوئے ہمت نہیں کررہا تھا، لیکن ابوعیسیٰ الرُّمّانی کی کتاب ''النکت فی اعجاز القرآن' کی تصحیح اور شرح سے فارغ ہونے کے بعد دل میں آیا کہ اب اس کام کو مجھے کر ہی لینا چاہئے، خاص طور پر اس لئے کہ اپنی عمر کا کارواں بھی تیزی کے ساتھ نشیب کی طرف رواں ہے، اور اگر زندگی میں طوالت بھی مقدر ہے تو آج جو ذہن وحافظہ کی نعمت حاصل ہے وہ کل نہیں رہے گی، اور جو کام مجھے کرنا ہے اس میں میری اپنی یادداشت ہی سب سے بڑا مرجع ہے۔ للّٰہ الأمر من قبل و من بعد۔

اس کام کو مجھ سے بدرجہا بہتر طریقہ پر انجام دے سکتے تھے وہ خود حضرت مولاناؒ کے ہونہار بھانجے اور فرد خاندان تھے وہ کئی برس پہلے اللہ کو پیارے ہو چکے۔ وہ تھے، مولانا محمد ثانی مرحوم، جو مولانا کے حقیقی بھانجے اور ان کی آغوش تربیت کا بہترین نمونہ تھے۔ سوانح نگاری ان کا خاندانی ذوق تھا اور خاص طور پر بزرگوں کی سوانح لکھنے کا طویل تجربہ بھی حاصل تھا۔ احتیاط وتوازن کے ساتھ سیرت کے تمام گوشوں کو تحریر کے چوکھٹے میں سجانے میں خداداد صلاحیت رکھتے تھے، چنانچہ جب انھوں نے حضرت مولانا محمد یوسف کاندھلویؒ کی سوانح آٹھ سو صفحات میں لکھی تو ان کے مرشد ومخدوم حضرت شیخ الحدیث مولانا محمد زکریا مہاجر مدنی رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت مولانا خلیل احمد صاحب سہانپوری رحمۃ اللہ علیہ کی سوانح لکھنے کا حکم دیا، جو انھوں نے ایک ہزار سے زیادہ صفحات میں مرتب کر کے حضرت شیخ کی دلی دعائیں حاصل کیں۔ مزید مرحوم مولوی محمد ہارون بن مولانا محمد یوسف کاندھلوی کی مختصر سوانح

بھی حضرت شیخ ہی کے اشارہ پر تحریر فرمائی۔

مرحوم مولانا محمد ثانی کے بعد کسی پر نظر پڑ سکتی تھی یا یوں کہئے جس کو آج ان سطور کی تحریر کے وقت نگاہیں تلاش کر رہی ہیں وہ مولانا محمد الحسنی مرحوم تھے جو حضرت کے برادر زادہ، خداداد ذہانت اور تحریری صلاحیتوں کے مالک تھے تصنیف و ترجمہ کے میدان میں پختہ کار ہو چکے تھے، وہ بھی رخصت ہو چکے، اور ایسے رخصت ہوئے جیسے کوئی بھری محفل سے اچانک اٹھ جائے۔ وہ داستاں کہتے کہتے سو جانے والے، زندہ ہوتے تو اس موضوع کا حق ان سے زیادہ بہتر طریقہ پر کوئی دوسرا انجام نہیں دے سکتا تھا۔

احباب مخلصین کی صرف خواہش اور طلب ہی نہیں، بلکہ خود راقم کے اندر بھی یہ داعیہ تھا کہ باوصف اپنی تمام نارسائیوں کے مجھے یہ کام کرنا چاہئے اور مولانا کی سوانح کے وہ نقوش و خطوط، تجزیہ و تحلیل اور مشاہدات پر مبنی حقائق کے ساتھ سامنے لائے جائیں جن کا سراغ لگانے میں ''کاروان زندگی'' کا مطالعہ کرنے والا مشکل سے کامیاب ہوگا۔ اس کام کے لئے جس اہلیت کی ضرورت ہے اس میں سب سے اول فن سوانح نگاری سے واقفیت ہے جس سے یہ عاجز بے بہرہ ہے۔ اگر اس نقص کو کسی درجہ میں نظر انداز کیا جا سکے تو تحدیث نعمت کے طور پر عرض کرتا ہوں کہ یہ عاجز ۵۴ سال سے مولانا سے وابستہ ہے، سفر و حضر، خلوت و جلوت، رنج و راحت کے لمحات بہت نزدیک سے دیکھے ہیں نجی اور پرائیوٹ گفتگو بھی سنی ہے اور مجمع عام کا خطاب عام بھی، نشاط و انبساط کے لمحات بھی دیکھے ہیں اور تکدر و انقباض کی ساعتیں بھی میرے سامنے گزری ہیں۔ برّی، بحری اور فضائی سفروں میں رفاقت کا شرف حاصل ہوا ہے۔ اجنبی شہر کے ہوٹلوں میں اور مسافرانہ تنہائیوں میں وقت گذارتے دیکھا ہے، مزید یہ کہ اس عاجز کو حضرت سے تین سال تک تلمذ کی عزت حاصل ہے۔ اس

لئے بظاہر یہ کام میرے لئے مشکل نہیں تھا کہ حافظہ کی امانت لوح قلب سے لوحِ قرطاس پر منتقل کردی جائے لیکن اس راہ میں کچھ دشواریاں بھی ہیں، بڑی دشواری یہ ہے کہ عاجز حضرت مولانا کا عقیدت مند خادم وتلمیذ ہے اور یہ دیکھا گیا ہے کہ معتقدین جو کسی شیخ کے دامن سے وابستہ ہوتے ہیں وہ احتیاط وتوازن کی شاہ راہ پر مشکل سے قائم رہ سکتے ہیں۔

علماء ومشائخ کی سیرت نگاری کرنے والے عموماً دو قسم کے لوگ ہیں ایک وہ جو اپنے مخدوم وشیخ کا تقدس ارکان ایمان میں داخل سمجھتے ہیں، اس طبقہ میں بعض بزرگوں کی سوانح حیات اس طرح لکھی جاتی ہے جس کو پڑھ کر محسوس ہوتا ہے کہ کسی ولی کی نہیں، نبی کی سوانح ہے، زبان سے تو نہیں کہتے مگر اوصاف وعظمت کا بیان مرتبۂ عصمت تک پہنچ جاتا ہے اور ولایت، نبوت کے شانہ بشانہ دکھائی دینے لگتی ہے دوسرا معیار ماڈرن سوانح نگاروں کا ہے جو کوئی بھی ڈگری حاصل کرنے کے لئے کسی معروف شخصیت کی زندگی کو اپنا موضوع بناتے ہیں۔ اس طرح کے تحقیقی مقالے ایسے بھی دیکھے گئے ہیں جن میں محاسن سے پہلے مساوی کی فہرست تیار کرلی جاتی ہے۔ تاکہ جدیدیت کا بھرم قائم رہے۔ اور یہی نہیں بلکہ بسا اوقات محسوس ہوتا ہے۔

قصور ڈھونڈ کے لائے ہیں وہ جفا کے لئے

اب میرے لئے یہ اتفاق محض ہے یا حسن اتفاق کہ میری دونوں طبقوں سے شناسائی ہے، ایک ایسے خاندان کا بدنام کنندہ ہوں جس میں تین سو سال سے بلا انقطاع اہل علم واہل طریقت پیدا ہوتے رہے ہیں، ان کے متوسلین واخلاف اپنے مرشدین کے تذکرے اسی ادب واحترام سے کرتے ہیں جس طرح دوسرے مشائخ کے حلقہ بگوش کرتے آئے ہیں اور کرتے رہتے ہیں۔ نیز میری ابتدائی تعلیم فرنگی محل لکھنؤ کے ایک مدرسہ میں ہوئی جہاں بزرگوں کے نام دوسطری القاب کے ساتھ

لکھے جاتے تھے اور میں نے بھی مقفیٰ و مسجع القاب ممدوح کے نام کے اعتبار سے لکھنے کی مشق کی تھی جو ماحول کا اثر تھا۔

جہاں تک عصری دانش گاہوں کا اور جدید طرز تحقیق کا تعلق ہے یہ ناچیز یورپ کی ایک مشہور یونیورسٹی میں ایک عرصہ گزار آیا ہے اور ایک معاصر دانش گاہ میں خدمت تدریس انجام دے چکا ہے۔ پی. ایچ. ڈی اور ایم. فل کے متعدد مقالات کی رہنمائی کر چکا ہے۔ اور آج بھی ایک سے زیادہ طلبہ اس کی نگرانی میں تحقیقی کام کر رہے ہیں۔ لہٰذا ''موڈرن انسٹی ٹیوشن کے میتھڈ'' اس کے لئے نامانوس نہیں ہیں۔

لیکن ندوہ کی عطا کردہ یہ نعمت قابل تحدیث و شکر ہے کہ الجمع بین القديم الصالح و الجديد النافع (اسلاف کے تمام صالح طریق کار اور بعد میں آنے والوں یا عصر جدید میں جو بھی خیر ہے ان دونوں کو لے کر ایک ساتھ چلنا) کے اصول کو اللہ تعالیٰ نے مزاج کا جزء بنا دیا ہے۔ اللہ تعالیٰ دلوں کو دیکھنے والا، اعتدال کی شاہ راہ پر قائم رکھنے پر قادر ہے۔

اس موضوع (یعنی مولانا سید ابوالحسن علی ندوی رحمۃ اللہ علیہ کے بعض اہم نقوش) کا حق ادا کرنے میں ایک اور بات سخت دشوار نظر آ رہی ہے کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ مولانا کی سوانح کے پردے میں نفس خود اپنے آپ کو نمایاں کرنے کا سہارا ڈھونڈ لے۔ اور ''میں'' ''میں نے'' کی اتنی کثرت ہو جائے کہ پڑھنے والا یہ فیصلہ نہ کر سکے کہ نقوشِ سوانح کسی اور کے ہیں یا خود مرتب کا ''اپنا بیان'' حسن طبیعت بن کر نکھر آیا ہے۔ حالانکہ یہ مجبوری بھی ہے کہ جب کتاب کے ماخذ اپنے مشاہدات ہیں تو پھر مشاہد اپنا ذکر صیغۂ متکلم میں نہ کرے تو کیا کرے۔ ملفوظات و مکاتیب ہوتے تو صورت حال مختلف ہوتی۔ بہر حال اس غیر ارادی نقص کو کم کرنے کی کوشش جس قدر ممکن ہے اس کا لحاظ رکھا گیا ہے جہاں تک مقصد تالیف کا تعلق ہے اور جس نے مجھے

اس کام پر آمادہ کیا وہ میرا مشاہدہ ہے۔ اور صرف میرا ہی مشاہدہ نہیں بلکہ عام پڑھے لکھے مسلمانوں کا تاثر یہی ہے کہ اس دور میں اخلاص، للّٰہیت، غیرت دینی، حمیت اسلامی اور اس طرح کے الفاظ اپنی معنویت کھو چکے ہیں۔ عام طور پر یہ سمجھا جانے لگا ہے کہ اصل چیز پروپیگنڈہ، سیاسی ہتھکنڈہ پارٹی بازی، گروہی عصبیت اور جماعتی رقابت ہے۔ سکہ رائج الوقت نفاق اور مصلحت بنی ہے۔

اس تاریک ماحول میں اگر ایک بندۂ مسلم کی ایسی سیرت پیش کی جائے جس میں نیا گان کہن کا بانکپن بھی ہو اور سلف صالح کی ایمانی صلابت بھی، اہل اللہ کی غیرت ایمانی بھی ہو اور صدق احساس کی جلوہ تابانی بھی۔ جو چالاکی و فن کاری سے فطرتاً دور ہو اور اس کے باوجود اللہ تعالیٰ نے اس کو وہ مقبولیت عطا فرمائی جو محض قبول عند اللہ کا پرتو ہو جس میں قرآن کریم کی آیۂ کریمہ کی صداقت نظر آتی ہو۔

إِنَّ الَّذِينَ آمَنُوا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ سَيَجْعَلُ لَهُمُ الرَّحْمٰنُ وُدًّا ۝ (سورہ مریم۔۹۶)

یعنی جو لوگ ایمان اور عمل صالح پر قائم ہیں اللہ ان کی محبت (دلوں میں) ڈال دیتا ہے۔ اور جن کے بارے میں حدیث نبویؐ میں ارشاد ہے۔

ان الله اذا أحب عبداً دعا جبرئيل فقال انى أحب فلاناً فاحبه قال : فيحبه جبرئيل ثم ينادى فى السماء ان الله يحب فلاناً فاحبوه فيحبه أهل السماء ثم يوضع له القبول فى الأرض۔ (مسند احمد ۲/۳۴۱ص ۱۹)

"اللہ تعالیٰ جب کسی بندہ سے محبت فرماتا ہے تو جبرئیل کو بلا کر فرماتا ہے کہ میں فلاں بندہ کو چاہتا ہوں تم بھی اس سے محبت کرو۔ فرمایا: پھر جبرئیل اس سے محبت کرتے ہیں اس کے بعد آسمان میں منادی

کردی جاتی ہے کہ اللہ نے فلاں بندہ کو اپنی محبتوں سے نوازا ہے۔
اس کے بعد اس کی قبولیت روئے زمین پر پھیلا دی جاتی ہے۔''

لہٰذا اللہ تعالیٰ سے امید کی جاسکتی ہے کہ خشیت الٰہی اور تقویٰ، شرافت نفس اور حلم و تواضع کی طرف سے جو مایوسی پیدا ہوگئی ہے وہ دور ہوگی، اور پڑھنے والے محسوس کریں گے کہ

ہنوز آں ابرِ رحمت درفشانست

ہمارے مخدوم و مربی حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی رحمۃ اللہ علیہ ایک بشر تھے، ان کے مادحین بھی ہیں اور ناقدین بھی، جب پیغمبروں اور ان کے ساتھیوں اور افراد خاندان میں بھی کوئی ایسا نہیں گذرا جس پر زبان درازی کرنے والے بلکہ ہجوم بے جا اور سب وشتم کرنے والے نہ رہے ہوں، بلکہ صدیاں گذر گئیں اور ان کے خلاف ان کے دشمن طبقہ کا غم و غصہ ختم نہیں ہوا ہے تو پھر اس دور پر فتن میں اس کی کب توقع کی جاسکتی ہے لیکن دوسری جانب ایک جماعت ان کے معتقدین و ممنون افراد کی بھی ہوتی ہے، بزرگان سلف کی سوانح حیات کے مطالعہ سے اندازہ ہوتا ہے کہ یہ بات بھی منجانب اللہ ہے۔ پیغمبروں میں، ان کے حواریوں اور صحابہ کرام میں، ان کے ازواج و افراد خاندان میں کوئی تو ایسا ہوتا جس کے سب ہی ماننے والے ہوتے، سب ہی یکساں طور پر احترام کرنے والے ہوتے، سب کو چھوڑیئے سید الاولین والآخرین محسن انسانیت، فخر آدم و آدمیت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات گرامی تو کم سے کم مستثنیٰ ہوتی۔ ناشکری اور انکار حق اور حقائق سے روگردانی کرنے والے کب اور کس عہد میں نہیں رہے ہیں۔

مزید یہ کہ معاصرت خود اپنی جگہ پر ایک حجاب بلکہ حجاب اکبر ہے، لہٰذا یہ خام خیالی ہوگی اگر یہ تصور کروں کہ سوانح حیات کے جن نقوش کو ان صفحات میں اجاگر

کرنے کی کوشش کی جارہی ہے، وہ منصف مزاج اور گوہرشناس طبقہ کے علاوہ معاندین کے قلوب میں کوئی نرمی پیدا کرسکیں گے۔ہاں یہ ضرور ہے کہ دین کی پاسداری، تقویٰ وخشیت الٰہی پر اعتماد ویقین جو کمزور ہوتا جارہا ہے، اور ہر چیز کو دنیاوی نفع اندوزی کی میزان پر تولنے کا رواج عام ہورہا ہے، اور جو یہ خیال عام ہورہا ہے کہ دنیا میں اصل چیز چالاکی اور چالبازی ہے۔اس انداز فکر کے حاملین کے ہاتھ اگر یہ اوراق آگئے اوران کے مطالعہ سے اللہ کے ایک مخلص بندہ کی سوانح گذرگئی تو اللہ کی رحمت سے بعید نہیں کہ ان کی فکری اصلاح کا ذریعہ بن جائے اور ایمان باللہ اور تعلق مع اللہ کی عظمت پر ان کا یقین بحال ہوجائے۔

ایک کتاب نہیں بلکہ ایسی ایک درجن کتابیں پڑھنے کے بعد بھی اللہ تعالیٰ کی رحمت وبخشش پر کسی کا یقین پختہ ہوجائے تو یہ سودا گھاٹے کا نہیں ہوگا۔

''کاروان زندگی'' مولانا کی خودنوشت سوانح ہے، اس کی سات جلدیں شائع ہوچکی ہیں، خدا کرے اس کی اور جلدیں نکلتی رہیں، کیونکہ یہ ہمارے مخدوم و مربی حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی مدظلہٗ کی حیات مبارکہ کے دوران پیش آنے والے حالات، سیاسی واجتماعی حوادث کی تصویر ہے، اس کے علاوہ خود ان کے سفروں، قابل ذکر ملاقاتوں اور تقریروں کا ریکارڈ ہے، اس کتاب کا تسلسل آپ کی علمی ودینی سرگرمیوں کے تسلسل کی علامت ہے جس کو اللہ باقی رکھے اور کم از کم اس گناہ گار کو اس کی آخری جلد نہ دکھائے (۱)

ناظرین کاروان زندگی میں مولانا کے افکار وخیالات، ملکی حالات، تبدیلیوں کی کیفیات، مشاکل ومسائل کی روداد پڑھ رہے ہیں اور اس حقیر کاوش کے ذریعہ

---

(۱) مَا تَشَاءُ وْنَ اِلَّآ اَنْ یَّشَآءَ اللّٰہ جو اللہ تعالیٰ چاہتا ہے وہی ہوتا ہے۔ ہماری آرزوؤں اور تمناؤں کے برخلاف ساتویں جلد کے بعد زندگی کا کارواں ہمیشہ کے لیے رک گیا اور وہ قلم جس کے قلمرو میں روحانیت کی دنیا آباد تھی ہمیشہ کے لیے سرد پڑ گیا۔

مولانا کی شخصیت ومقبولیت عند اللہ وعندالناس ،انداز تحریر، اسلوب تقریر، مرکزی خیال، فکری رجحان، علمی وادبی ذوق اور طرز تحقیق کا اندازہ ہوگا، آپ کی عظمت کے شاید وہ نقوش بھی سامنے آجائیں جن کے بارے میں پورے وثوق واعتماد کے ساتھ یہ شعر پڑھا جا سکتا ہے۔

قمریاں پاس غلط کردۂ خودمی دارند
ورنہ یک سرو دریں باغ بہ اندام تو نیست

الحمدللہ کہ حضرت مولانا کی شخصیت کے متعدد گوشے ایسے ہیں جن پر دوسرے مخلص بندوں نے کام کیا ہے۔مولانا ممشاد علی قاسمی نے بزرگوں اور معاصرین کی آراء ایک جگہ جمع کردی ہیں، جن سے معلوم ہوتا ہے کہ مشاہیر امت نے آپ کو کس نظر سے دیکھا ہے۔دوسرا کام جناب مولانا محمد طارق زبیر ندوی نے کیا ہے کہ آپ کی عربی کتابوں کی ببلوگرافی تیار کردی ہے جو شائع ہو چکی ہے۔اور بہت خوبصورتی سے اس کے چوکھٹے تیار کئے ہیں۔مولانا نذرالحفیظ ندوی نے ہم سب پر سبقت حاصل کی حضرت مولانا کی تالیفات کی ببلوگرافی تیار کی تھی جو شائع ہوچکی ہے (الأستاد ابوالحسن کاتباً ومفکراً) پیش نظر راقم الحروف کی کتاب ابھی کمپوزنگ اور طباعت کے مرحلہ میں تھی کہ دمشق سے مولانا کی سوانح حیات پر ایک نئی کتاب چھپ کر آگئی، یہ کتاب ایک ہونہار نوعمر مصنف مولوی عبدالماجد غوری کی ہے جو سوریہ یونیورسٹی کے کلیۃ الشریعۃ میں زیر تعلیم ہیں، اس پر مقدمہ سوریہ کے مفتی اعظم علامہ ڈاکٹر احمد کفتارو نے لکھا ہے، دو تقریظیں جامعہ سوریہ (دمشق) کے دو پروفیسروں نے لکھی ہیں۔اس کتاب میں ایک باب معاصر علمائے عرب کی آراء کا بھی ہے عرب ممالک کے وہ علماء ومفکرین جو علمی، تحقیقی اور فکری اعتبار سے چوٹی کے مشاہیر میں شمار ہوتے ہیں ان کی تحریروں کے اقتباسات مصنف نے جمع کردیئے ہیں،

زبان وبیان معیاری ہے اللہ تعالیٰ اس نوخیز مؤلف کی عمر میں برکت عطا فرمائے۔

أعاذه الله من شر حاسد اذا حسد

اس عاجز کا کام اس لحاظ سے مختصر ہوگیا ہے مگر بعض ایسے گوشے سامنے آگئے ہیں کہ اگر ان کو قلم بند نہ کیا جاتا تو شاید پردۂ خفا میں رہتے۔

عبداللہ عباس ندوی

۱۰؍شوال المکرم ۱۴۱۹ھ

دیباچہ طبع دوم

آج سے ٹھیک چودہ ماہ پہلے ۱۶/شعبان ۱۴۲۱ھ کو یہ کتاب مطبوعہ شکل میں شاہد حسین صاحب نائب ناظر عام ندوۃ العلماء، مینجنگ ڈائرکٹر پاریکھ آفسٹ پریس نے میرے حوالہ کی اور میں نے اس کا ایک نسخہ حضرت مولانا رحمۃ اللہ علیہ کی خدمت میں پیش کیا۔ مزاج گرامی پر افسردگی چھائی ہوئی تھی، دنیا سے پرواز کرنے کے لئے روح بے چین تھی، چہرہ مبارک جو سخت سے سخت مصائب میں بھی ذکر کے انوار سے شاداں رہا کرتا تھا معلوم ہوتا تھا کہ بدر کامل اپنے عروج کی منزل مکمل کر چکا ہے اور اب جو چاندنی نظر آرہی ہے وہ صبح صادق کی نہیں بلکہ مکر چاندنی ہے، جو چند لمحات کی مہمان ہے۔

کتاب دست مبارک میں لی الٹ پلٹ کر نظر ڈالی، کچھ فہرست دیکھی اور زبان مبارک صرف اس درجہ گویا ہوئی کہ میری شرمندگی میں اضافہ کیا۔

معلوم ہوا کہ کتاب کمرہ میں سرہانے رکھ دی گئی تھی، مگر آپ نے پھر الٹ کر دیکھا اور نہ کسی سے کسی حصہ کو پڑھ کر سنانے کی فرمائش کی۔ اس کے بعد راقم مکہ مکرمہ واپس گیا۔ رمضان شروع ہو گیا۔ اور اس رمضان کی ۲۲ تاریخ جمعہ کے روز، روزہ کی حالت میں، صبح کے تمام معمولات ادا کرنے کے بعد جمعہ کی سنت غسل ادا کی، اور جو

معمول ہمیشہ سے چلا آرہا تھا۔

یٰبَنِیۡۤ اٰدَمَ خُذُوۡا زِیۡنَتَکُمۡ عِنۡدَ کُلِّ مَسۡجِدٍ

(الاعراف۔۳۱)

اے اولاد آدم تم مسجد پر حاضری کے وقت اپنا لباس پہن لیا کرو۔

پر عمل، وہ زندگی کے ساعتوں میں بھی فراموش نہیں کیا گیا، شیروانی پہنائی گئی، سر پر رومال ڈالا گیا، عطر سے جسم معطر ملموس ہوا، اور نماز جمعہ کا وقت داخل ہونے سے پہلے زندگی کی آخری سانس لی، در و دیوار سے آسمان سے، زمین سے، ہر سو یہ صدا آنے لگی۔

یٰۤاَیَّتُهَا النَّفۡسُ الۡمُطۡمَئِنَّةُ ۝ ارۡجِعِیۡۤ اِلٰی رَبِّكِ رَاضِیَةً مَّرۡضِیَّةً ۝ فَادۡخُلِیۡ فِیۡ عِبٰدِیۡ ۝ وَادۡخُلِیۡ جَنَّتِیۡ ۝

(سورہ الفجر۔۲۹،۳۰)

اے اطمینان والی روح اپنے پروردگار کے جوار رحمت کی طرف چل
اس طرح کہ تو اس سے خوش اور وہ تجھ سے خوش۔ (چل) اور میرے
ان بندوں میں شامل ہو جا اور میری جنت میں داخل ہو جا۔

یوم وفات اور تدفین کی کیفیت مولانا نذر الحفیظ، مولانا سید بلال عبدالحی حسنی اور حاجی عبدالرزاق صاحبان نے لکھی ہے جس پر اس کتاب کی آخری سطریں ختم ہوں گی۔

یہ کتاب ایک ہزار چھپی تھی، اور چند ماہ کے اندر ختم ہو گئی، مزید نسخوں کی طلب مسلسل آنے لگی، اس لئے اس کا دوسرا ایڈیشن شائع کیا جا رہا ہے۔ کوشش کی گئی ہے کہ طباعت کی بے شمار غلطیاں جو رہ گئی تھیں ان سے یہ کتاب حتی الامکان پاک ہو۔ راقم مؤلف مجلس تحقیقات و نشریات اسلام کا شکر گزار ہے کہ اس دوسری اشاعت کی ذمہ داری اس نے قبول کی۔ اور ادارہ کے مہتمم مولانا محمد غفران ندوی صاحب کی محنت اور دلچسپی

سے اس کام کو مکمل کرنے کی دل سے قدر دانی کرتا ہے۔

ناچیز مؤلف بھی بے شمار کوتاہیوں کا معترف ہے، جس مقصد سے یہ کتاب لکھی تھی کہ وہ باتیں جو حضرت مولانا رحمۃ اللہ علیہ نے فرط تواضع اور ''انکار ذات'' میں نظر انداز فرمادی تھی اور ''کاروان زندگی'' میں ان کا ذکر نہیں آیا تھا اس کی تلافی کردے مگر بعد میں محسوس ہوا کہ خود اس کمی کو پوری کرنے والے نے بھی حق نہیں ادا کیا۔

وفات کے بعد مراکش سے لے کر انڈونیشیا کے آخری جزیرہ تک جس طرح اس دینی خسارہ کو محسوس کیا گیا اور تعزیتوں کے جلسے سیمنار وغیرہ ہوئے ان کی فہرست ابھی تک مکمل نہیں ہوسکی ہے۔

یہ سطریں اس وقت لکھی جارہی ہیں جبکہ آپ کی وفات پر تیرہ ماہ گذر چکے ہیں اور ۱۹/۲۰ مارچ کو دہلی یونیورسٹی کے عربک ڈپارٹمنٹ کی طرف سے آپ کی تالیفات پر ایک سیمنار میں شرکت کر کے واپس آیا ہوں۔

عام طور سے جو مسلمان اپنے کسی بھائی کی موت پر وسعت قلبی سے کام لیتے ہیں اور ''اذکروا محاسن موتاکم'' اپنے مرے ہوئے لوگوں کی زندگی کی خوبیاں ذکر کرو۔ پر عمل رہتا ہے۔ حضرت مولانا رحمۃ اللہ علیہ کی زندگی میں بھی ایک نہیں متعدد کتابچے اور رسالے نکل چکے تھے اور وفات کے بعد تو ایک تانتا بندھ گیا، اس میں کس کا ذکر کروں اور کس کو چھوڑ دوں، حق ہر ایک کا ہے، اور یکساں ہے، ہم قصداً کسی کو فراموش نہیں کرنا چاہتے مگر حافظہ کی خرابی اور تمام مطبوعات پر مطلع ہونا ممکن نہ تھا۔ لہٰذا اگر کسی خاص نمبر یا کسی خاص مقالہ کا ذکر رہ جائے تو اس کو جمع کرنے والے کی بدنیتی پر محمول نہ کیا جائے۔

اشعار میں جو عقیدت مندی کے گلدستہ پیش کئے گئے۔ وہ بھی سیکڑوں سے متجاوز ہیں۔ عربی کا علمی وتحقیقی رسالہ الادب الاسلامی جو سعودی عرب کے پایہ تخت

ریاض سے نکلتا ہے اس نے اپنے خاص نمبر میں منظوم خراج عقیدت کو الگ جز میں شائع کردیا ہے اور اس کا نام "باب المراثی" رکھا ہے۔ اس میں ۲۵ مرثیے درج ہیں وہ قصائد جو آپؒ کی زندگی میں کہے گئے اور جو بعد میں لکھے گئے سب کو جمع کردیا جائے تو ایک جلد کی ضخامت کا حامل ہوگا۔ اور جو میسر ہے وہ حاضر ہے اب مولاناؒ کی ملی خدمت میں سب سے بڑھ کر خراج تحسین یہی ہے کہ دعا کی جائے کہ اللہ تعالیٰ آپ کے مراتب قرب میں اضافہ فرمائے اور "حضیرۃ القدس" میں آپ کو ممتاز مقام عطا فرمائے۔

عبداللہ عباس ندوی

۲۲؍مارچ ۲۰۰۱ء

دارالعلوم ندوۃ العلماء، لکھنؤ

پسِ کارواں است مشتِ غبارے

''دینی تعلیم کے لئے کسی مدرسہ میں آنا ایک طرح کی قربانی ہے، سرکاری اسکولوں اور کالجوں میں تعلیم حاصل کرنے والوں کو جو دنیاوی منافع کی توقع رہتی ہے وہ مدرسوں میں پڑھنے والے طلبہ کو نہیں ہوتی، زمانہ کا رخ جس بہاؤ پر ہے اس کے مخالف رخ پر چلنا آسان نہیں ہے، اس کے لئے عزم کی ضرورت ہے، اور سب سے پہلے نیت کی تصحیح ضروری ہے، مدرسے قربانی کی چھاؤنیاں ہیں، اگر کوئی ان مدرسوں میں بغیر عزم ونیت اور بغیر جذبۂ ایمانی کے جاتا ہے اور اس کے نزدیک ترقی کا معیار وہی ہے جو سرکاری کالجوں کے طلبہ کے نزدیک ہے تو اس کے لئے خسارہ کا بڑا خطرہ ہے''۔

۱۳۵۸ھ میں شوال کا مہینہ نومبر ۱۹۳۹ء میں پڑا تھا، راقم کا داخلہ درجۂ پنجم میں ہوا تھا، جس میں مخدوم ومربی حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی مدظلہٗ کے دو گھنٹے تھے، ایک عربی نثر کا جس میں ''مختارات'' خود مولانا کی تالیف پڑھائی جاتی تھی اور اس وقت تک ''مختارات'' طبع نہیں ہوئی تھی، قلمی مسودہ سے ہم لوگ اسباق نقل کرتے تھے۔ اور دوسرا گھنٹہ قرآن کریم کے ترجمے وتشریح کا تھا۔ ۷؍شوال کو میرا داخلہ ہوا تھا، قرآن کریم کا گھنٹہ نماز ظہر سے پہلے ہوا کرتا تھا، میں نے مولانا کو پہلی بار اس

درجہ میں دیکھا، اور پہلا سبق ۱۴؍شوال ۱۳۵۸ھ کو ہوا۔ سبق سے پہلے تمہیدی تقریر میں مولانا نے جو ارشاد فرمایا تھا وہ یہی تھا جو اوپر نقل کیا گیا۔ الفاظ میں خفیف ردو بدل کا امکان ہے مگر مفہوم کا جہاں تک تعلق ہے وہ یہی تھا۔ اور اکثر الفاظ بھی اس تقریر کے یاد ہیں۔ "تصحیح نیت عزم" قربانی کی چھاؤنیاں" وغیرہ، سب مولانا کے الفاظ ہیں۔

میرا داخلہ کیسے ہوا، کس نے داخلہ کا امتحان لیا، میرے ساتھی اس وقت کون کون تھے، یاد سب ہے، مگر اس کو لکھنے کا ارادہ نہیں ہے، کیونکہ کہ گفتگو کا سرا اپنی ذات کی طرف مڑ جائے گا۔ البتہ اتنا اشارہ قاری کے لئے بارِ خاطر نہ ہوگا کہ اس ناچیز کے لئے ندوہ میں آنا بھی زندگی کا اہم موڑ تھا۔ میرا خاندان بھی درس نظامی کے مقابلہ میں کسی دوسرے نصاب کا قائل نہ تھا۔ اور ندوہ سے پہلے میں نے مدرسہ قدیمہ فرنگی محل واقع ٹکسال میں تعلیم حاصل کی تھی، پھلواری شریف (میرا وطن) اور فرنگی محل (جہاں شرح جامی اور شرح وقایہ تک پڑھ کر آیا تھا) سے ندوہ کا بعد اتنا تھا جیسے عربی مدرسہ سے کالج کا فاصلہ ہے۔ ندوہ کی تاریخ اور خود حضرت مولانا کی زندگی کا بھی یہ اہم سال تھا۔

ندوہ کے استاذ الاساتذہ محدث جلیل حضرت مولانا حیدر حسن خاں صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے قیام ندوہ کا وہ آخری زمانہ تھا، وہ میرے داخلہ کے صرف دو ڈھائی ماہ بعد یعنی ذی الحجہ میں اپنے وطن تشریف لے گئے اور اس زمانہ میں مولانا محمد عمران خاں صاحب علیہ الرحمہ جامعہ ازہر سے تخصص فی الدعوۃ والارشاد کی سند لے کر آ گئے تھے اور ابتداء میں نائب مہتمم کی حیثیت سے انھوں نے ذمہ داریاں سنبھالی تھیں۔ اس سال ندوہ کی تمام علمی و انتظامی سرپرستی عملاً حضرت سید صاحبؒ (مولانا سید سلیمان ندویؒ) کے سپرد تھی۔ اور آپ بھی پورے نشاط و سرگرمی کے ساتھ ندوہ کی تعلیمی سربراہی فرما رہے تھے، درجوں میں آکر معائنہ فرماتے، دار الاقامہ میں جا کر ہر کمرہ میں طلبہ کو دیکھتے اور ان سے سوالات کرتے۔

نوجوان اساتذہ جو سب سید صاحبؒ کے شاگرد تھے اور عزیز و خرد کی حیثیت سے سید صاحب کا احترام ملحوظ رکھتے، ان میں مولانا کے علاوہ میرے گرامی قدر اساتذہ مولانا محمد ناظم صاحب ندویؒ(۱) مولانا عبدالسلام صاحب قدوائیؒ، اور مفتی محمد سعید صاحبؒ تھے۔ عمر و درجات کے لحاظ سے معاصرین اساتذہ میں محدث کبیر مولانا شاہ حلیم عطا سلونویؒ اور انگریزی کے استاد اول (ہیڈ ماسٹر) جناب عبدالسمیع صدیقیؒ سید صاحبؒ سے نیاز مندانہ تعلق رکھتے تھے، طلبہ کی انجمن الاصلاح طلبہ کی سرگرمیوں کا مرکز تھی، متعدد طلبہ برجستہ اور اچھی تقریریں کرتے تھے جنھیں دیکھ کر یہ تمنا ہوتی تھی کہ کاش ہم بھی اس طرح بول سکتے۔

اس سال رسالہ ''الندوۃ'' کا تیسری بار اجراء ہوا تھا، جس کے مرتبین میں بالترتیب دو نام تھے، سید ابوالحسن علی ندوی استاد تفسیر و ادب اور عبدالسلام قدوائی ندوی استاد تاریخ و اقتصادیات۔ یہ رسالہ ایک وقیع معیار کا حامل تھا، مگر چار سال سے زائد نہ چل سکا۔ مالی دشواریوں کی وجہ سے بند ہو گیا، لیکن اس عرصہ میں چند سلسلہ مضامین اتنے اہم شائع ہوئے تھے جس سے ملک کے اہم دانشوروں کی توجہ کا مرکز بن گیا تھا۔ مثلاً میری محسن کتابیں، اس پر مولانا دریابادی، مولانا مودودی، علامہ عبدالعزیز میمن، مولانا عبدالسلام ندوی (سید صاحب کے دارالمصنفین میں رفیق) اور الندوہ کے مرتبین مولانا سید ابوالحسن علی ندوی اور مولانا عبدالسلام قدوائی کے مضامین ایسے تھے جن کی تازگی آج بھی قائم ہے۔ مولانا عمران خاں صاحب نے الازہر کی مکمل تاریخ سلسلہ وار لکھی تھی، انگریزی کے استاد اول جناب عبدالسمیع صاحب صدیقیؒ نے مغرب کے مختلف نظریہ ہائے تعلیم پر ایک سیریز لکھی تھی۔

میرے مولانا جن کی سوانح نقوش کے مرتب کرنے کے لئے قلم اٹھایا ہے

---

(۱) ۷؍ربیع الاول ۱۴۲۰ھ (۹؍جون ۲۰۰۰ء) یوم جمعہ کراچی میں وفات پائی رحمۃ اللہ علیہ

اس وقت ۲۵-۲۶ سال کی لپیٹ میں تھے، جسم اکہرا مائل بہ لاغری تھا، لباس وہی تھا جو آج ہے، عینک اس وقت بھی لگاتے تھے، شخصیت میں جاذبیت تھی، جمال باطنی کے انوار جمال ظاہری کو دوبالا کر رہے تھے۔ طلبہ کو اس وقت بھی آپ سے عقیدت ومحبت تھی، اخلاص وللّٰہیت کا اثر کہئے یا ذکر وریاضت کی نورانیت، اس درجہ ہویدا تھی کہ کوئی شخص قریب بیٹھتا تو اثر لے کر اٹھتا۔

مولانا کی شہرت ومقبولیت کے آغاز کا بھی یہی زمانہ تھا، میرے داخلہ سے آٹھ دس ماہ پہلے اسی سال کے شروع میں "سیرت سید احمد شہیدؒ" کا پہلا ایڈیشن نکلا تھا اور الندوہ کے اڈیٹر کی حیثیت سے علمی ودینی حلقوں میں روشناس ہو چکے تھے، مقبولیت عند اللہ کا ثمرہ اہل اللہ اور اصحاب صفا کی محبت وشفقت ہے، اور خلق خدا میں قبول عام بھی اسی مقبولیت کا پرتو ہے۔ مولانا کی شہرت وتوقیر کا دائرہ پورے ملک میں پھیل چکا تھا، اور اہل قلب وبصیرت جیسے مولانا سید سلیمان ندویؒ اور خود مولانا کے برادر بزرگ حضرت مولانا حکیم ڈاکٹر سید عبد العلیؒ، حضرت مولانا سید حسین احمد مدنیؒ اور امام اہل سنت مولانا عبد الشکور فاروقیؒ کی شفقتیں اور دعائیں حافظ شیرازی کے اس شعر کی ترجمان تھیں۔

جمالت آفتابِ ہر نظر باد
بہ خوبی روئے خوبت خوب تر باد

مولانا کو ان بزرگوں سے جو تعلق تھا اس کا اندازہ اس سے کیا جا سکتا ہے کہ اس سال درس قرآن میں اولیاء اللہ کا ذکر آگیا، بزرگوں کی صحبت اور ان سے اکتساب فیض پر تقریر ہو رہی تھی، ایک طالب علم نے پوچھا کہ اب اس زمانہ میں کون ایسا عالم بزرگ ہے جس کی صحبت میں تاثیر ہو اور اللہ کا ایسا مخلص بندہ ہو جس کو اللہ کا ولی کہا جائے، مولانا نے فرمایا میرے شہر میں اس کی مثال مولانا عبد الشکور صاحب فاروقی

ہیں، ہم لوگ اس وقت تک امام اہل سنت کے متعلق یہی جانتے تھے کہ ردشیعیت میں ان کا کوئی ہمسر نہیں ہے، لیکن یہ کہ وہ صوفی اور شیخ ہیں، یہ بات مولانا سے سنی تھی، یہ ۱۹۴۰ء کا واقعہ ہے۔

اس سال کے آخر میں مولانا نے لکھنؤ کے اطراف میں گشت شروع کیا تھا، اس وقت ہم لوگ درجہ ششم میں پہنچ چکے تھے، ایک صاحب خالد گورداسپوری تھے جو ہم طلبہ کو آمادہ کر کے گشت میں لے جایا کرتے تھے، عام طور پر گشت ماہ نگر اور اس سے متصل محلوں میں ہوتا تھا، اور مسدس حالی کے وہ بند جو توحید میں ہیں سب مل کر پڑھا کرتے تھے۔

وہ بجلی کا کڑکا تھا یا صوتِ ہادی | عرب کی زمیں جس نے ساری ہلادی
نئی اک لگن دل میں سب کے لگادی | اک آواز میں سوتی بستی جگادی
کہ ہے ذات واحد عبادت کے لائق | زباں اور دل کی شہادت کے لائق
لگاؤ تو لو اس سے اپنی لگاؤ | جھکاؤ تو سر اس کے آگے جھکاؤ

۱۹۴۰ء میں مولانا کا تعلق مولانا ابوالاعلیٰ مودودی سے قائم ہوا، جماعت اسلامی کی تشکیل کے بعد مولانا مودودی لکھنؤ آئے تھے اور ندوہ کی مسجد میں انھوں نے جماعت کا ابتدائی نقشہ پیش کیا تھا، اس وقت تک علماء نے ان کے خلاف کوئی بیان نہیں دیا تھا، ''ترجمان القرآن'' کے ایک شمارہ میں مولانا کا ایک مضمون نماز پر شائع ہوا تھا، معلوم نہیں اس سے پہلے بھی ترجمان القرآن میں مولانا نے کچھ لکھا تھا یا نہیں۔ درجہ ششم میں مولانا کے یہاں ہم لوگوں کا گھنٹہ ''مضامین قرآن'' کا تھا وہ بھی قلمی مسودہ تھا جو مولانا لکھ رہے تھے آج اس کو مطبوعہ شکل میں دیکھتا ہوں تو سب باتیں یاد آتی ہیں۔

سیرت ساز گھرانہ "عقلیت" کی تعمیر

سوانح حیات کا پہلا باب صاحبِ سوانح کے نام ونسب، پیدائش، مقام وتاریخ اور تعلیم وتربیت کے بیان پر مشتمل ہوتا ہے، ریسرچ کے نام پر جو تحقیقی مقالات لکھے جاتے ہیں اس میں صاحب سوانح کے عصر کی تاریخ اور اس دور کی علمی، سیاسی اور اجتماعی تحریکات پر مفصل روشنی ڈالی جاتی ہے، نیز ذہن سازی میں جن عناصر کا دخل ہوتا ہے ان کی تفصیل ایک سے زیادہ ابواب وفصلوں پر مشتمل ہوتی ہے۔

جہاں تک میرے صاحبِ سوانح کا تعلق ہے (جن کی طرف اشارہ صرف لفظ "مولانا" سے کروں گا) وہ اپنی خودنوشت سوانح کے پہلے حصہ میں ان امور کی وضاحت فرما چکے ہیں، مولانا پر پی. ایچ. ڈی اور ایم. فل کرنے والوں نے انہی حوالوں سے کام لیا ہے۔ جن کی فہرست "مؤلفات سماحة الامام الداعية الشيخ ابى الحسن علي الحسني في اللغة العربية" میں طارق زبیر ندوی نے مرتب کردی ہے۔

راقم کی یہ تحریر چونکہ زیادہ تر اپنے مشاہدات پر مبنی ہے، اس لئے بات وہاں سے شروع کی جہاں سے مولانا کے " کاروان زندگی" میں غبارِ راہ بننے کی سعادت حاصل ہوئی جیسا کہ فصل اول میں ناظرین نے ملاحظہ فرمایا ہوگا۔

اب اصل سوانح پر نظر ڈالتا ہوں تو مجھے محسوس ہوتا ہے کہ گفتگو وہاں سے شروع

کی جائے جہاں سے ناظرین صاحبِ سوانح کے مزاج وفکر، افتادِ طبع اور اس کے ذہنی سانچہ کو سمجھ لیں، جن کو میں "عقلیت" کا نام دے رہا ہوں، عقلیت سے میری مراد آئیڈیالوجی یا نظریہ حیات وغیرہ قسم کی کوئی چیز نہیں ہے کیونکہ نظریہ تو تعلیم وتربیت کے بعد خارجی اسباب کی بنا پر بنتا ہے، مگر عقلیت کا تعلق داخلی ووجدانی عناصر سے ہے، عقلیت کی تعمیر، خاندانی اثرات گھر کے ماحول، والدین کی تربیت، وقت کے مسائل ومشاکل سے بنتی یا بگڑتی ہے، ذہانت وذکاوت، طبعی امنگ، فکر کی جولانی، سب اسی عقلیت کے محور پر گھومتی ہیں، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اس شخص نے دنیا کو کس نظر سے دیکھا، اس کی امنگوں اور حوصلہ مندیوں کی منزل کیا ہے، وہ کس نظر سے دوسروں کو دیکھتا ہے، خیر وشر کا اس کے سامنے کیا معیار ہے، ایک تاجر گھر میں نشو ونما پانے والا بچہ اپنی خاص عقلیت کا حامل ہوتا ہے، اسی طرح صنعت کار گھر کے تربیت یافتہ شخص کا پیمانہ عقل مختلف ہوتا ہے، مولانا کی خاندانی خصوصیات کی طرف ایک اشارہ حضرت شاہ ولی اللہ دہلویؒ کے ایک مکتوب میں ملا ہے جو "نادر مکتوبات حضرت شاہ ولی اللہ دہلویؒ" میں شامل ہے، یہ مکتوب شاہ صاحبؒ نے میر محمد معین نبیرۂ حضرت شاہ علم اللہ رائے بریلویؒ (مولانا کے مورثِ خاندان) کے نام تحریر فرمایا ہے، پورا مکتوب یہاں نقل کیا جاتا ہے:

مکتوب صد وسی و چہارم ﴿۱۳۴﴾ (۱)

میر محمد معین نبیرۂ سید علم اللہ رائے بریلیؒ کے نام بعض نصائح

سیادت ونجابت مآب، عزیز القدر، سلالۃ الکرام میر سید محمد معین
سلمہٗ اللہ تعالیٰ اپنے خیر اندیش فقیر ولی اللہ عفی عنہ کی جانب سے

(۱) نادر مکتوبات حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی جلد اول مرتبہ حضرت شاہ عبد الرحمٰن پھلتی رحمۃ اللہ علیہ شرح وترجمہ مولانا مفتی نسیم احمد فریدیؒ ص ۳۰۳ ـ ۳۰۴ طبع اول ۱۴۱۹ھ پھلت، ضلع مظفر نگر

سلام محبت التیام کے بعد مطالعہ کریں۔

آپ کا نامۂ مشکیں شمامہ بہترین اوقات میں وارد ہوا، اور اس میں جو کچھ تحریر کیا گیا تھا واضح ہوا۔ اُس طرف کے علماء نے جو فتویٰ لکھا ہے وہ بالکل صحیح ہے۔ لیکن فقیر کا کہنا یہ ہے کہ آپ کے اسلافِ کرام نے جو کچھ پایا ہے، ہمتِ عالیہ سے پایا ہے۔

حضرت سید شاہ علم اللہ قدس سرہ السامی کا دنیا پر لات مارنا اور تمام جھگڑوں سے ان کا یکسو ہو جانا، اظہر من الشمس ہے۔ فقیر کا اعتقاد یہ ہے کہ حضرت شاہ علم اللہؒ کی اولاد میں ہمتِ عالی اس وقت تک موجود ہے۔ یہی توجہِ خاطر اور (ہمتِ عالی) مطلوب و مقصود ہے۔

سید اور سنی ہونا جو کہ نوادر میں سے ایک نادر شے ہے، حضرت سید موصوفؒ کے خاندان میں ہم نے اپنی آنکھ سے مشاہدہ کیا ہے۔ اللہ تعالیٰ اس خاندان کو مزید اکرام کے ساتھ اور خصالِ حمیدہ و پسندیدہ کی توفیق کے ساتھ مکرم رکھے، اور آپس میں سب کو متحد و متفق رکھے حدیث شریف میں آیا ہے کہ ''اللہ رحم کرے اس شخص پر جو بیچنے اور خریدنے اور تقاضا کرنے میں نرمی اختیار کرے'' وہ فتویٰ ہے اور یہ تقویٰ، جو چیز بطریق سہولت حاصل ہو جائے مبارک ہے اور جو چیز مزاجوں کی سختی، ناراضگی اور قطعِ رحمی کے بعد حاصل ہو، اور اس کے بعد حاصل ہو کہ دوست اور دشمن میں اس کا چرچا ہو، اور ہر بیوقوف اعتراض کی گنجائش پائے تو ایسی چیز سے کیا فائدہ ہوگا؟ عام لوگوں کا کام اور ہے، عالی ہمت لوگوں کا کام اور ہے، بے شک اللہ تعالیٰ بلند ہمتی کو پسند فرماتا ہے۔

اِس خیراندیش مخلص کی خیرخواہی کو آپ تک پہونچانے والا (حافظ شیرازی کا) یہ شعر ہے۔

مصلحت دیدِ من آنست کہ یاران ہمہ کار
بگذرانند ،وخمِ طرہ ٔ یارے گیرند

میری مصلحتِ دید یہ ہے کہ احباب سب کام چھوڑ دیں اور طرہ ٔ دوست کو پکڑ لیں۔

والسلام

عقیدہ کی پختگی اور فکری توازن

کاروانِ زندگی کے پہلے حصہ میں مولاناؒ نے اپنے گھرانے کی تمام خصوصیات بیان فرمادی ہیں، اور اس کے ساتھ ان نقائص کو بھی ذکر کیا ہے جو ہر خاندان میں آپس کی رنجشوں کی بنا پر پیش آیا کرتی ہیں، نیز ایک ہی خاندان کے اندر رشتہ داریاں بعض لحاظ سے اچھی ہوتی ہیں تو بعض لحاظ سے ان کے اندر خطرات بھی ہوتے ہیں بعض امراض بھی جاگزیں ہوجاتے ہیں۔ حضرت مولاناؒ نے ان میں سے کوئی بات نہ چھپائی ہے نہ کم کرکے لکھی ہے، اور نہ کسی ایسے امر کی توجیہ کی ہے جو بشری قوانین سے ان کو ممتاز کرتا ہے۔ خاندان میں اونچ نیچ کے جھگڑے بھی رہے ہیں ایک دوسرے سے روٹھے بھی ہیں بسا اوقات یا ایک مرتبہ بات مقدمہ بازی تک پہونچ گئی تھی۔ کاروانِ زندگی کے صفحہ ۳۰ سے تفصیلات حاصل کی جاسکتی ہیں، لیکن ہمیں جس چیز کا مطالعہ کرنا ہے اور میرے نزدیک عظمت کی جو سب سے بڑی بات ہے وہ یہ کہ حضرت مولاناؒ کے خاندان میں عقیدہ کے بارے میں کبھی اختلاف نہیں رہا، توحید کا عقیدہ اس درجہ مستحکم پختہ اور گہرا رہا کہ غیر اللہ سے کبھی مناجات کرنے اور کسی دہائند کو غیر اللہ کی طرف منسوب کرنے کا رواج نہیں رہا۔ حضرت مولاناؒ نے جہاں خاندان کی بعض کمزوریوں اور انسانی سوسائٹی میں جہاں مدوجزر پیش آیا کرتے ہیں ان کو وضاحت

سے بیان کرنے کے بعد ایک جگہ تحریر فرماتے ہیں:

''کہ خاندان کے یکجا رہنے کی وجہ سے بعض جسمانی نقائص سامنے آئے، معاشی ترقی کے راستے محدود ہوئے مگر عقیدہ پر کبھی حرف نہیں آیا''۔

چند سطریں کاروانِ زندگی جلد اول صفحہ ۲۰-۲۱ سے نقل کرتا ہوں، جو میرے منشاء کو واضح طور پر پیش کرتا ہے۔

چند تاریخی خصائص

''لیکن اس ناہمواری کے باوجود جو حیات انسانی کا خاصہ، فطرت انسانی کا تقاضہ اور اقوام وملل، اور خاندانوں کی تاریخ یا تقدیر ہے، خاندان کی گزشتہ تاریخ پر جس قدر نظر ڈالی اور اس کا موجودہ دور جو خود اپنی آنکھوں سے دیکھا، اس میں چند باتیں قدرِ مشترک (Common Factors) کے طور پر نظر آئیں، ازراہ انصاف ان کا تذکرہ بھی ضروری معلوم ہوتا ہے، جہاں تک اپنے دل ودماغ کو ٹٹولتا ہوں، اور احتساب نفس سے کام لیتا ہوں، ان کے تعین اور ذکر میں خاندانی عصبیت اور جذباتی عقیدت (جس سے محفوظ وآزاد رہنا حقیقتاً بہت مشکل ہے) نظر نہیں آتی'' والغیب عند اللہ تعالیٰ''

خاندان کی جتنی تاریخ محفوظ ہے، اور اس کے حالات کا جتنا علم ہوسکا ہے، اس خاندان نے اپنے نسب کی حفاظت اس غلو ومبالغہ کی حد تک کی ہے، جس کا نہ شریعت نے مکلف کیا ہے اور نہ بہت سے ممالک بالخصوص بلاد عربیہ میں (جہاں سے سادات وشیوخ کے خاندان آئے) اس کو ضروری سمجھا گیا ہے، شاید اس کی وجہ ہندوستان کی آب وہوا ہے، یہاں کا معاشرتی اور طبقاتی ڈھانچہ، اور غیر مسلم

اکثریت کے اس ملک میں اپنے خصائص خاندانی روایات، اور خون کی حفاظت کا جذبہ ہو، جس کی ضرورت یہاں اکثر عربی النسل خاندانوں نے محسوس کی، غلو اور مبالغہ اس لئے کہتا ہوں کہ اس خاندان نے ہمیشہ سادات ہی میں یا کبھی کبھی معروف النسب شیوخ میں رشتہ کرنا ضروری سمجھا، اور اگر کبھی کسی نے کھلے طریقہ پر کسی غیر کفو سے شادی کر لی تو خاندان نے اگر چہ اس کو برادری میں شامل رکھا، اور اخوت و مساوات کا معاملہ کیا، لیکن مصاہرت و ازدواجی تعلقات منقطع کر لئے، اور نسب نامہ میں اس فرد خاندان کے نام کے ساتھ اس اصول سے انحراف کی نشاندہی کر دی، (۱) اور یہ بات خاندان کے لوگوں کو ہمیشہ معلوم رہی۔

اس کا اتنا فائدہ ضرور ہوا کہ خاندانی خصائص و روایات کا تسلسل بڑی حد تک قائم رہا، اور خاص طور پر عقائد میں کوئی فرق نہیں آیا، اور مشرکانہ اعمال و بدعات داخل نہیں ہونے پائے، بعد میں اس میں اتنا غلو اور ہوا کہ دائرہ سمٹتے سمٹتے بہت محدود ہو گیا، اور اس کا اثر اولاد کی صحت جسمانی، قویٰ، اور ذہنی ملکات پر پڑا، اور بعض امراض متوارث ہو گئے، اس موقع پر اتالیق امت فاروق اعظمؓ کی وہ ہدایت یاد آتی ہے، جو انھوں نے عرب کے ایک قبیلہ کو فرمائی تھی، حضرت عمرؓ نے دیکھا کہ اس کے افراد نمایاں طریقہ پر ضعیف و نحیف اور پستہ قامت ہیں، فرمایا "مالکم ضؤیتم" (کیا بات ہے، تم اتنے سکڑ کیسے گئے؟) انھوں نے کہا "قرب امھاتنا من اٰبائنا یا امیر المؤمنین!" (امیر المؤمنین! ہمارے والدین

---

(۱) ملاحظہ ہو سیرۃ السادات، از: مولوی حکیم سید فخر الدین صاحب خیالیؒ

کی آپس میں قدیم اور مسلسل قرابت اس کا سبب ہے۔) فرمایا
''اغربو ا انجبو '' (ذرا باہر نکل کر شادی کرو، اولاد قوی اور
ہونہار پیدا ہوگی) اس بارے میں دونوں جانب قوی دلائل اور
متضاد تجربے ہیں، اور ہر زمانہ اور ہر عہد کے لئے ایک کلیہ قائم
کرنا مشکل ہے''۔

خاندانی روایات اور معاشرت میں عقیدۂ توحید کا پیوست ہو جانا قابل صد شکر بات ہے، حضرت مولاناؒ کے خاندان کا ہر فرد توحید کے معاملہ میں کسی طرح کا سمجھوتہ یا تاویل کا قائل نہیں تھا۔ والدہ ماجدہ خود بھی انتہا درجہ کی خدا پرست اور خدا سے مناجات کرنے والی خاتون تھیں، اس گھرانے میں کبھی کسی ولی یا نبی یا شیخ یا بزرگ سے حاجت روائی طلب نہیں کی گئی جو مانگا براہ راست خدا سے مانگا، اسی کے آگے ہاتھ پھیلایا، اور اسی کے آگے سجدہ عبودیت کو اپنے دین و مذہب کا شعار سمجھا، یہی کیفیت حضرت مولاناؒ کی ذات میں چھائی ہوئی تھی، قرآن مجید کے ترجمہ میں یا ادب کی تعلیم میں کہیں ایسا نہیں ہوتا کہ اللہ کے علاوہ ایک ذرہ برابر کسی اور کو حاجت روا بنالیں، اللہ تعالیٰ کے بعد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی محبت حدود کے اندر طبیعت کا جزبن چکی تھی، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے خاک پا کو بڑے بڑے شاہان وقت کے تاج زریں سے افضل سمجھتے تھے، اور آپ کی ہر پسندیدہ چیز کو اللہ کے بعد محبوب ترین چیز سمجھتے تھے، صحابہ کرام سے آپ کا شغف اسی لئے تھا کہ وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ ہجرت کرنے والے اور مدینے میں مدد کرنے والے اور ہر ہر قربانی کے وقت اپنے آپ کو پیش کرنے والے تھے، آپ کا مقالہ ''ردۃ ولا أبابکر لها'' آپ کی دلسوزی صحیح تاریخ سے واقفیت اور صحابہ کی عظمت کا اعتراف ہے، مواعظ میں جہاں بھی موقع آتا صحابہ کرام کی عظمتوں کے گن گائے، صحابہ کرام میں اللہ تعالیٰ نے جس کو بڑا بنادیا اور

جس سے بڑے کام لئے ان کی عظمت کا بار بار ذکر فرمایا کرتے تھے، حضرت سیدنا علی کرم اللہ وجہہ اور آپ کے صاحبزادوں سے عقیدت واحترام کا تعلق اسی لئے تھا کہ وہ آپ کے محبوب کے محبوب تھے، حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے جو لباس زیب تن فرمایا جو کھانا پسند کیا، جس طریقہ پر چلنا پسند کیا، ہر ایک کو عزت ومحبت کی نگاہ سے دیکھا اور عظمت کے ساتھ ان کو بیان کیا۔ آپ بارہا مدینہ منورہ تشریف لے گئے، پوری دل شستگی کے ساتھ صلوٰۃ وسلام پڑھتے رہے، بقیع میں صحابہ کرامؓ، شہدائے احد، ازواج مطہرات، اور آپ کے اہل خاندان کے لئے معمول کے مطابق دعا فرماتے رہے لیکن کبھی بھی اس عقیدہ پر غبار نہیں آیا جس کی شہادت حضرت شاہ ولی اللہ دہلویؒ نے اپنے ایک مکتوب میں آپ کے بزرگ خاندان میر محمد معین نبیرۂ سید علم اللہ رائے بریلیؒ کے نام تحریر فرمایا ہے جس میں وہ تحریر فرماتے ہیں:

''سید اور سنی ہونا جو کہ نوادر میں سے ایک نادر شے ہے، حضرت سید موصوفؒ کے خاندان میں ہم نے اپنی آنکھ سے مشاہدہ کیا ہے''۔

فقہی مسالک میں آپ کے استاذ خلیل عرب صاحب کٹر اہل حدیث تھے، اور حدیث میں آپ کے استاذ اول میں حضرت مولانا شاہ حیدر حسن خاں صاحبؒ اور ان کے بعد حضرت مولانا سید حسین احمد مدنیؒ سے استفادہ کیا، اور دونوں حنفیت میں بہت پختہ مزاج تھے، لیکن یہ عجیب اتفاق ہے کہ آپ کے تمام اساتذہ عقیدۂ توحید، اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی عظمت اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پسندیدہ امور میں یکساں عقیدہ رکھتے تھے۔

عقل سازی کا ماحول

مولانا کی عقل سازی جس گھرانہ سے شروع ہوئی، وہ صرف یہی نہیں کہ

ایک دین دار مسلمان کا گھرانہ تھا جہاں صوم وصلوٰۃ کی پابندی ہو، دینی شعائر کا احترام کیا جاتا ہو، علماء وصلحاء کی تعظیم کی جاتی ہو، بلکہ اس سے کچھ زیادہ خصوصیات کا حامل تھا، یہ گھرانہ دین کی سربلندی کی تڑپ رکھنے والا گھرانہ ہے، جس کی خصوصیات حضرت شاہ ولی اللہ دہلویؒ نے بیان فرمائی ہیں جس گھرانے کو حضرت سید احمد شہیدؒ اور مولانا اسماعیل شہیدؒ کی داستانِ عزیمت وراثت میں ملی تھی، جہاں بچے کو لوری دے کر سلانے والی خادمہ ''سوجا میرے لال نہیں'' بلکہ اس طرح کے شعر سنا کر بچے کو سلایا کرتی تھیں۔

الٰہی ہو مجھ کو شہادت نصیب

یہ بہتر سے بہتر عبادت نصیب

مولانا نے جس گھر میں آنکھ کھولی وہاں صرف مرد ہی نہیں بلکہ مستورات بھی قرآن کریم کی تلاوت سے اپنی روح میں بالیدگی کا سامان مہیا کیا کرتی تھیں۔

مولانا نے لکھا ہے کہ ان کے بچپن کے زمانہ میں خاص ان کے گھر میں بچیوں بیبیوں میں قرآن کے حفظ کا خاص ذوق تھا، اور اس میں تنافس اور مسابقت کا جذبہ پیدا ہو گیا تھا، مولانا نے اپنے خاص گھر میں پانچ بیبیوں کو قرآن کریم کی حافظ پایا۔ جن میں خود مولانا کی والدہ ماجدہؒ، ایک پھوپھی، دو خالائیں اور ایک خاتون مولانا کے ماموں صاحب کی اہلیہ محترمہ تھیں رحمۃ اللہ علیہن۔

بعض علمائے فرنگی محل کے فتویٰ کے مطابق خواتین تراویح باجماعت پڑھ سکتی ہیں اور کوئی خاتون ان کی امامت بھی کر سکتی ہے، اس فتویٰ پر مولانا کے گھر میں عمل تھا، مولانا نے تحریر فرمایا ہے کہ ان کے بچپن میں مستورات کے ہاں تراویح میں جماعت کا اہتمام تھا، ان میں سے کوئی امام بنتیں باقی مقتدی، خاندان کے بزرگ سید خلیل احمد صاحب کو اس کا بڑا اہتمام تھا کہ یہ سب گھر کے اندر تراویح میں قرآن سنائیں، نصف

شب تک یا سحری تک یہ سلسلہ جاری رہتا، اور ان میں کئی بیبیاں ایک ایک پارہ سناتیں، مولانا لکھتے ہیں:

''اس اجتماعی ختم قرآن کے زمانہ میں میں بہت بچہ تھا لیکن والدہ صاحبہ کے قرآن مجید سنانے کا سلسلہ میرے شعور کے بہت بعد تک جاری رہا۔ میں کبھی دروازہ میں کھڑا ہو کر سنتا، ایسا معلوم ہوتا تھا کہ پانی برس رہا ہے صحت مخارج کے ساتھ روانی اور پھر اس میں رقت، دردبھری نسوانی آواز ''نور علی نور''۔

مولانا کے خاندان میں پڑھنا پڑھانا اور مطالعہ کا ذوق عام تھا، بڑے بوڑھوں سے لے کر لڑکیاں بالیاں اور بچے سب کے سب پڑھنے اور کتابیں جمع کرنے کے متوالے تھے، اس سلسلہ میں مولانا نے اپنے کئی واقعات لکھے ہیں، جس سے کہیں بچپن کا بھولا پن اور کہیں گھر کے بڑوں کی نقالی کا منظر سامنے آتا ہے، بچپن میں بڑوں کی نقالی کا شوق فطری ہوتا ہے۔ کسی جج صاحب کے بچوں کو دیکھئے تو وہ اپنا کورٹ کچہری جمائے دکھائی دیں گے، تاجر کا بچہ معمولی چند پیسوں کا سامان لئے اپنی دکان سجاتا ہوا نظر آئے گا۔ سجادہ نشین صاحبان کے بچے گدی بچھا کر پیر صاحب بنتے ہوئے دیکھے جاتے ہیں، غرض جس عمر میں آئیڈیل خاندان کے بڑے ہوتے ہیں اس عمر میں مولانا نے اپنی چند کتابوں کو جمع کر کے اس پر ''کتب خانہ ابوالحسن علی'' لکھ رکھا تھا۔ اس واقعہ سے گھر کا ماحول آئینہ کی طرح سامنے آجاتا ہے۔

بچپن سے جو ماحول اور رسم ورواج انسان دیکھتا ہے اس کا اثر کبھی زائل نہیں ہوتا۔ ان نہ زائل ہونے والی اور دل ودماغ کے باریک سے باریک ریشوں میں سرایت کر جانے والی باتوں کو تربیت دل ودماغ کا جزء بنادیتی ہے۔ مولانا نے شعور کی آنکھیں جس فضا میں کھولیں وہاں قرآن کا چرچا، تلاوت کا ذوق، حفظ قرآن کی

لکن عام بات تھی، یوں بھی اُس زمانہ میں پورے ملک میں پڑھنے کا رواج تھا، پڑھنے کا ذوق ایسا تھا کہ کتابیں بیچنے والے کتابوں کا بستہ لئے گلیوں میں پھیری کیا کرتے تھے۔ جس طرح آج کل گلیوں میں سبزی فروش آوازیں لگا کر سبزی بیچتے ہیں، اس زمانہ میں کچھ پھیری والے کتابوں کے تھیلے کاندھوں پر لئے آواز لگا کر کتابیں بیچا کرتے تھے۔ دلّی میں طوطا نامہ، مینا نامہ، کہانی گل بکاؤلی، علی بابا چالیس چور کی کتابیں پھیری والے بیچا کرتے تھے۔ جس کا تذکرہ خواجہ حسن نظامی نے اپنے روزنامچہ میں کیا ہے۔ مولانا کی چھوٹی بستی میں ان کتابوں کا کوئی خریدار نہیں تھا، ہاں دینی رسائل اور چھوٹی چند ورقوں کی کتابیں جن میں سیرت کے مستند واقعات، مثلاً قصہ معراج، حضرت بلال کا قصہ، حلیمہ سعدیہ کا واقعہ جو نظم میں تھا اور اسی طرح کی کتابیں ایک ایک دو دو آنے میں بکا کرتی تھیں، اور وہ لڑکیاں بالیاں اپنے چھوٹوں یا عزیزوں کو باہر بھیج کر منگایا کرتی تھیں، مولانا کے یہاں جو کتابیں (یہی چند ورقی رسائل) جو خریدی جایا کرتی تھیں وہ اولیاء وصالحین کے واقعات پر مشتمل ہوتی تھیں، حضرت حلیمہ سعدیہ کا واقعہ، حضرت بلال مؤذن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی داستان اور اسی طرح کے بے ضرر مگر مستند رسائل ہاتھوں ہاتھ لئے جایا کرتے تھے، مگر کتاب خوانی کے اس مذاق عام کے باوجود ایسی کتابیں گھر کے اندر بار نہیں پاتیں جن میں عقیدہ توحید کے خلاف اور غیر مستند واقعات ہوں، مثال کے طور پر مولانا نے تحریر فرمایا ہے کہ ''معجزہ آل نبی'' بھی انہی کتابوں میں تھی جو پھیری والے آنے دو آنے میں فروخت کیا کرتے تھے۔ مگر چوں کہ اس میں غیر مستند روایتیں تھیں اس لئے ان کو کوئی ہاتھ نہیں لگاتا، حالانکہ جو گھرانہ سادات کا آل نبی کی نسل سے ہو وہاں تو اس کی بڑی قدر دانی ہونا چاہئے تھی، مگر صحت عقیدہ نے خاندان کا ایمان وعقیدہ محفوظ رکھا۔

''کاروانِ زندگی'' حصہ اول میں مولانا تفصیل سے تحریر فرما چکے ہیں کہ جب

آپ کے والد صاحب علیہ الرحمہ کا انتقال ہوا اس وقت مولانا کی عمر ۹ سال تھی اور انتقال ہی کی شب میں اپنی والدہ صاحبہ اور بہنوں کے ساتھ رائے بریلی آ گئے تھے، اس وقت گھر کا ماحول اور تربیت کا انداز اوپر گذر چکا ہے، اس سلسلہ میں چند مزید سطریں کاروان زندگی جلد اول، صفحہ ۸۲ سے نقل کرنا ضروری سمجھتا ہوں تا کہ عقلیت سازی میں جن عناصر کا حصہ آرہا ہے وہ نظر کے سامنے رہے۔

"اس زمانہ میں (یعنی والد صاحب کی وفات کے بعد رائے بریلی کے قیام کے زمانہ میں) ہمارے خاندان کا ایک بڑا اچھا دستور تھا کہ جہاں کوئی غمناک واقعہ پیش آتا یا کوئی پریشانی کی بات ہوتی تو ''صمصام الاسلام'' سنی جاتی ، یہ مشہور مؤرخ واقدی کی کتاب ''فتوح الشام'' کا ۲۵ ہزار اشعار میں ترجمہ ہے، یہ ترجمہ اور نظم ہمارے ہی خاندان کے ایک بزرگ، میرے والد صاحب کے حقیقی پھوپھا منشی عبد الرزاق کلامی کی لکھی ہوئی ہے (۱) جوش وخروش سے بھری ہوئی اور درد واثر میں ڈوبی ہوئی ہے۔ جنگ کا نقشہ ایسا کھینچتے کہ دل خوشی سے اچھلنے لگتا، اور نبض تیز ہو جاتی۔ شہادت کا ذکر اس طرح کرتے کہ خود راہِ خدا میں جان دینے کے لئے دل بے تاب ہو جاتا، اور صحابہ کرام اور مجاہدین کے غم کے سامنے اپنا غم بھول جاتے، میری بڑی خالہ مرحومہ صالحہ بی جو قرآن مجید کی بھی حافظ تھیں، یہ منظوم فتوح الشام بڑے پر اثر اور دلکش لہجے میں پڑھتی تھیں، اور پڑھتے پڑھتے کتاب ان کو بہت رواں ہو گئی تھی، عموماً

---

(۱) اس مثنوی کا ایک علمی وتحلیلی جائزہ راقم الحروف کے قلم سے ماہنامہ ''ذکر وفکر'' میں شائع ہوا تھا جو اب میرے مجموعہ مضامین ''نگارشات میں شامل کرلیا گیا ہے، اس مثنوی پر علامہ شبلی نعمانیؒ اور مولانا حکیم سید عبدالحیؒ کی تقریظیں قابلِ توجہ ہیں۔ (ع ع ن)

عصر کے بعد یہ مجلس ہوتی اور بچے بھی کبھی اپنی ماؤں کے پاس کھیلتے کھیلتے یا کسی پیغام کے لئے آجاتے اور بے ارادہ کچھ دیر ٹھہر کر سنتے، کبھی باارادہ ٹھہر جاتے اور کبھی مائیں اپنے پاس بٹھا کر سننے کا موقع دیتیں۔ پھر جب اس میں لطف آنے لگتا تو کھیل چھوڑ کر اس مجلس میں شریک ہوتے۔''

مولانا نے یہ نہیں لکھا کہ وہ خود اپنی والدہ ماجدہ کے پاس بیٹھ کر اہتمام سے اس کو سنتے تھے، مگر بین السطور سے معلوم ہوتا ہے کہ صورت حال یہی تھی، مولانا کے یہ جملے'' دل خوشی سے اچھلنے لگتا اور نبض تیز ہو جاتی، شہادت کا ذکر اس طرح ہوا کرتا کہ خود راہ خدا میں جان دینے کے لئے دل بیتاب ہو جاتا۔ اور آخری جملہ کبھی مائیں اپنے پاس بیٹھ کر سننے کا موقعہ دیتیں۔ پھر جب اس میں لطف آنے لگتا تو کھیل چھوڑ کر اس مجلس میں شریک ہوتے۔''

یہ جگ بیتی نہیں بلکہ آپ بیتی ہے، جمع اور غائب کا صیغہ محض پردہ ہے جس کو فطری تواضع نے استعمال کرنے پر مجبور کیا ہے۔ فتوح الشام یا اس کا ترجمہ ''ایک رزمیہ'' ہے یعنی جنگ کی منظوم کہانی جس میں ایک فریق اہل ایمان ودعوت کا ہے اور دوسرا فریق کفر وضلالت کا نمائندہ، پڑھنے اور سننے والے کے دل میں ایک فریق کی ہمدردی اور اس کی حمایت کا جذبہ پیدا ہونا ایک فطری امر ہے۔ صرف اسی جنگ نامہ پر کیا موقوف ہے، کسی معرکہ کی داستان پڑھئے، یہاں تک کہ کسی کھیل کے مقابلہ کی رننگ کمنٹری (Running Commentary) سنئے کسی ایک طرف سننے والے کا جھکاؤ ہو ہی جائے گا۔ اور اس کی فتح کی تمنا دل میں مچلنے لگے گی۔ اس کی ناکامی کی تاویلیں دماغ کرنے لگے گا۔ اب ایسا معرکہ جو حق وباطل کے درمیان واقع ہوا ہے، اس کی داستان گھر میں پرسوز اور پرجوش طریقہ پر پڑھی اور سنی جارہی ہے تو اسلام کی نصرت

اور حاملینِ اسلام صحابہ کرام کی طرفداری اور ان کے لئے جوش اور ولولہ کا پیدا ہونا لازمی بات ہے۔ بچپن میں جب اسلام کی نصرت وحمایت کا جذبہ پیدا ہوا تو اس کے اثر نے دماغ کو اسی سانچہ میں ڈھال دیا۔ بچپن کی نرم ہڈی جس طرح غذا کے ذریعہ مضبوط ہوتی ہے اسی طرح اس عمر کی نرم ونازک رگوں میں اسلامی حمیت کا رچ بس جانا اور دماغ کا سانچہ ایک خاص شکل میں ڈھل جانا قانون فطرت کا تقاضا ہے۔

لہٰذا ایمان وعقیدۂ توحید کے تخم کو اس ماحول نے اور قرآن سے شغف، سیرت نبویؐ پڑھنے پڑھانے کا ذوق، صحابہ کرام کے معرکوں کی داستانوں نے وہ پانی اور کھاد فراہم کیا جو ایک تناور درخت کی شکل میں جب سامنے آیا تو دنیا نے بھی اعتراف کیا۔

مولانا کی سیرت سازی میں سیرت نبویؐ کا اہم حصہ ہے۔ خود انھوں نے جو کتاب پہلی بار اپنے پیسوں سے منگا کر بالکل نوعمری میں پڑھی وہ قاضی سلیمان منصور پوری علیہ الرحمہ کی مرتبہ "رحمۃ للعالمین" ہے، جن لوگوں نے اس کتاب کا مطالعہ کیا ہے ان کو معلوم ہوگا کہ سیرت نگاری میں قاضی صاحبؒ کی عقیدت ومحبت کا عنصر زیادہ نمایاں ہے۔

کاروان زندگی میں یہ تفصیل ہے کہ والد ماجد علیہ الرحمہ کی وفات کے بعد آپ کے بڑے بھائی ڈاکٹر سید عبدالعلی صاحبؒ سرپرست خاندان تھے اور ان کی محبت میں پدرانہ شفقت جلوہ گر تھی، مگر وہ خود ابھی تعلیم کے آخری مرحلہ میں تھے، نواب نورالحسن صاحب کی کوٹھی میں ان کا قیام تھا۔ (تفصیل اصل کتاب میں پڑھیے) وہاں انھوں نے مولانا کو بھی اپنے پاس بلالیا، ان کی تربیت بھی والدہ ماجدہ کی تربیت کا امتداد تھا۔ مولانا لکھتے ہیں:

"اس ماحول میں (یعنی نوابی ٹھاٹ باٹ اور بڑے نامور افراد کی آمد ورفت کے ماحول میں) بھائی صاحب دو باتوں کا خاص

اہتمام رکھتے تھے، ایک یہ کہ نماز جماعت کے ساتھ پابندی سے پڑھتا رہوں، کبھی ایسا ہوا کہ وہ دیر سے کالج سے واپس آئے جو بالعموم مغرب بعد ہوتی تھی، اور پوچھا ظہر، عصر مغرب کی نمازیں پڑھی تھیں؟ میں نے اثبات میں جواب دیا، ان کو کچھ شبہ ہوا تو تینوں نمازیں دوبارہ پڑھوائیں، دوسرے یہ کہ میں کوٹھی کے ملازموں کے پاس (جن کی بڑی تعداد تھی) زیادہ نہ بیٹھوں، اور بے تکلف نہ ہوں، نیز یہ کہ کوئی ناول وغیرہ کسی سے لے کر نہ پڑھوں، وہ ہمارے اس ذاتی کتاب خانہ میں خود سے کتابیں انتخاب کر کے دیتے اور مطالعہ کرواتے، ان کتابوں میں سب سے پہلی کتاب جو انھوں نے پڑھنے کو دی وہ سیرت خیر البشر تھی اس کے بعد غالباً رحمۃ للعالمین مطالعہ میں آئی"۔

عقلیت صرف ایک عنصر سے نہیں بلکہ متعدد عناصر سے تیار ہوتی ہے، یہ بھی دیکھا جاتا ہے کہ صاحب سوانح نے اپنے گردوپیش کیا زمانہ پایا، ملک کا سیاسی حال کیا تھا، اور کس طرح کی تحریکیں اس زمانہ میں چل رہی تھیں۔

اس وقت کا سیاسی ماحول انگریزوں کا پیدا کردہ تھا، پورا ملک غلامی کی زنجیر میں جکڑا ہوا تھا، حملہ آور اور غاصب قوم سے نفرت اس وقت ایمان کی علامت اور غیرت حق کا ثمرہ سمجھی جاتی تھی، اور حقیقت بھی یہی تھی، کہ سوائے مسخ شدہ فطرت کے کوئی صاحب غیرت مسلمان ایسا نہ تھا جو انگریزوں سے نفرت کو جزوِ ایمان نہ سمجھتا ہو، خاص طور پر علماءِ دین کے گھرانے اور مدارس اسلامیہ کے فرزند، سب انگریزوں سے نفرت رکھتے تھے، اور جس سے جو بنتا کرتا، پھر اس زمانہ میں جب کہ مولانا کی عمر ۸ سال تھی خلافت کی تحریک شروع ہوئی۔ خلافت اسلامیہ کے تسلسل کو باقی رکھنے کے لئے

لاکھوں ہندی مسلمانوں نے جانیں دی تھیں، جیل گئے تھے، گھر بار لٹائے تھے، اس ماحول میں اسلامی خلافت کی ہمدردی ہی نہیں بلکہ اس کے لئے جاں سپاری کا جذبہ ایسے گھر میں کیوں کر نہ پایا جاتا جو اپنے مورثِ اعلیٰ سید احمد شہیدؒ کے وقت سے اس میدان میں آگے رہا ہو، اس تحریک کا یک بیک خاتمہ اور ترکی کے فوجی حکمراں مصطفیٰ کمال کی خلافت سے دستبرداری کے اعلان نے پوری ملت اسلامیہ کو شرمسار کر دیا تھا۔ اس حادثہ یعنی ''الغائے خلافت'' کا زخم مسلمانوں کی اجتماعی زندگی میں ایک زخمِ کاری تھا، جس کو اس خاندان نے ایسا محسوس کیا گویا اس کے لئے اپنے گھر میں آگ لگ گئی ہو، اس لئے اندرونی غیظ و نفرت کا جذبہ ایک عقیدہ کی بنا پر پوری ایک قوم (انگریزوں) کے خلاف سلگتا رہا۔

محبت سے اگر انسان کا خمیر اٹھا ہے تو نفرت بھی فطرتِ انسانی کے خمیر میں داخل ہے۔ خیر کی طلب کے ساتھ شر سے اجتناب کا جذبہ بھی فطرت ہی کا عطیہ ہے۔ آدمی اگر ہنستا ہے تو روتا بھی ہے، مسرت کے ساتھ غم کا آہنگ بھی فطرتِ انسانی کا لازمہ ہے لہٰذا عقلیت کا سانچہ ایمان، محبت، جذبہ فدائیت کے ساتھ مخالف ایمان، دشمن محبت اور جذبہ فدائیت کو کچل دینے والے عناصر سے نفرت کا بھی طالب ہے، محبت کے ساتھ غیرت لازم و ملزوم ہے۔

اس واقعاتی تجزیہ کے بعد اگر ہم سمجھنا چاہیں کہ مولانا کی عقلیت کا سانچہ کن عناصر سے تیار ہوا ہے تو ہمیں صاف نظر آئے گا۔

۱- سید احمد شہیدؒ کا خاندان، اس نام کے بعد کسی تعارف اور تفصیل کی ضرورت نہیں، یہ نسبت خود اعلان کر رہی ہے کہ اس کے اثرات خون کے ذرات میں داخل ہیں۔

۲- ایسے نامور باپ کا فرزند ہونا جو صرف یہی نہیں کہ مؤرخ تھے بلکہ ان کی تاریخ نویسی کا مقصد اسلاف کے کارناموں کو اجاگر کرنا، مسلمانوں کی عظمتِ رفتہ کے

نقوش زندہ رکھنا، علمائے دین کے کام اور ان کی خدمات اور کارناموں کو آئندہ نسلوں کے لئے محفوظ کرنا تھا، تاکہ ان کو بھی اس طرح کے مجاہدات کا شوق ہو، والدہ ماجدہ حافظِ قرآن، دلِ دردمند کی مالک، جن کی دعائیں اور مناجاتیں اشعار کے قالب میں ڈھل کر ساز دل کو چھیڑنے کی صلاحیت رکھتی تھیں، نیز تلاوت وعبادت کا امتیازی ذوق رکھنے والی خاتون تھیں۔

۳- خاندان کا ماحول عقائد کے معاملہ میں پختہ تھا، خواہ دنیاوی معاملات میں کبھی تساہل کی کوئی مثال نہ ملتی ہو اس کے ساتھ عقیدۂ توحید میں حضرت شاہ اسماعیل شہیدؒ کی ''صراط مستقیم'' (۱) پر سب قائم تھے۔

۴- آنکھیں کھلیں تو قرآن مجید کی عظمت نے قلب ونظر کو اپنی گرفت میں لے لیا سننے اور دیکھنے کا زمانہ آیا تو تلاوتیں سنیں، سیرتِ نبوی کے واقعات سننے، پڑھنے کا زمانہ آیا تو سیرتِ خیر البشر اور رحمۃ للعالمین سے ابتداء کی۔

۵- انگریزوں سے نفرت دراصل چند افراد سے نفرت کا نام نہیں بلکہ کفر وعناد کے مجموعہ سے نفرت کا نام ہے، یہ نفرت بھی شروع ہی سے طبیعت میں راسخ ہوتی رہی، فتوح الشام کی سماعت اور خلافت کی تحریک کے عروج وزوال کے چشم دید واقعات نے طبیعت میں غیرتِ دین کا مادہ پیوست کر دیا۔

۶- تحریکِ خلافت اور الغائے خلافت (یعنی خلافت کے تسلسل کا ختم ہو جانا) کے واقعات مولانا کے بچپن میں پیش آئے۔ مسلمانوں کا جوش وخروش اور قربانیوں کا منظر بھی دیکھا اور سنا، الغائے خلافت سے جو مسلمانوں میں مایوسی پھیلی وہ بھی آپ کے مشاہدے میں آئی، اس لئے حق کی حمایت کا جذبہ اور بھی بیدار ہوا، اسی طرح ''چنگیزیٔ افرنگ'' سے نفرت مزاج کا جزء بن گیا۔

---

(۱) ''صراط مستقیم'' حضرت سید احمد شہیدؒ کے ملفوظات ہیں، جو مولانا اسماعیل شہیدؒ کے جمع کردہ ہیں۔

۷-نواب نور الحسن صاحب کی کوٹھی پر ایک فردِ خاندان کی حیثیت سے رہنے کی وجہ سے نوابی ٹھاٹ باٹ اور شاہانہ جاہ وحشم سے مرعوبیت ہمیشہ کے لیے ختم ہوگئی اور اس کا یہ نتیجہ دیکھنے میں آیا کہ سلاطین اور سربراہان حکومت سے کبھی مرعوب ہوکر نہیں ملے اور نہ ڈر کر بات کی، اور نہ اظہار حق میں جھجک محسوس کی، اس عقلیت کی تعمیر جس انداز میں ہوئی اس کے اثرات ابتدائے عمر سے لے کر اِس وقت تک جب کہ آپ کی عمر اسّی سے متجاوز ہوچکی ہے اپنا کام کرتی رہی۔

اسلامی حمیت، دین کی غیرت، تعلق باللہ اور رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے وہ محبت جو پیاسے کو ٹھنڈے پانی سے ہو مزاج کا خمیر بن گیا اور زندگی اسی محور کے گرد گردش کرتی رہی۔

۸-والدہ ماجدہ کی تربیت کا یہ انداز کہ اگر کسی خادم یا ملازم کے لڑے پر معمولی سی بھی زیادتی کا شبہ ہو جاتا تو اس سے معافی مانگنے اور اس کے سامنے ہاتھ جوڑنے کا حکم دیا کرتی تھیں، اس عمل نے طبیعت میں فروتنی، انکساری اور دوسروں کا احترام، مزاج کا جزء بنادیا۔ طفولیت کا زمانہ ختم ہوا، اور باقاعدہ تعلیم شروع ہوئی، مولانا کے استاد شیخ خلیل عرب صاحب مقرر ہوئے، جن کے بارے میں مولانا تحریر فرماتے ہیں:

> ''جب میری تعلیم کا سلسلہ شروع ہوا اور کچھ عربی کی شد بد ہوئی تو قرآن مجید کی آیتیں کچھ کچھ سمجھنے لگا، میرے استاد شیخ خلیل بن محمد عرب قرآن مجید کا بڑا پاکیزہ ذوق رکھتے تھے، ان کو اس کا بڑا شغف تھا، اس زمانہ میں وہ اکثر ہماری مسجد میں صبح کی نماز پڑھاتے تھے، ان کا نسبی تعلق عرب کے اس قبیلے سے ہے جس کے متعلق حدیث میں آتا ہے ﴿أتاكم أهل اليمن أرق أفئدة، وألين قلوباً﴾ تمہارے یہاں وہ اہل یمن آئے ہیں جن کے

دلوں میں بہت گداز ہے، اور بڑے ہی نرم دل ہیں۔ اللہ تعالیٰ
نے ان کو رقت اور اثر پذیری کی دولت سے حصۂ وافر عطا فرمایا
ہے۔ قرآن مجید پڑھتے ہیں تو قابو میں نہیں رہتے، آنکھوں سے
بے اختیار آنسو جاری ہو جاتے ہیں، آواز گلوگیر ہو جاتی ہے، ان
کے اندر درد کوٹ کوٹ کر بھرا ہے، آواز بھی بڑی دردناک اور لہجہ
پرتاثیر ہے، مجھے خوب یاد ہے کہ فجر کی نماز میں وہ آخری پاروں کی
کوئی بڑی سورہ شروع کرتے لیکن فرط تاثر اور شدت گریہ سے
اس کو مکمل کرنے کی نوبت کم آتی۔ اور سامعین کو حسرت رہ جاتی
کہ وہ پوری سورہ نہیں سن سکے۔

میری تعلیم قرآن کا آغاز بھی انہی کے یہاں ہوا، شیخ پر توحید کا
بڑا غلبہ تھا، اور وہ بڑا کھرا اور صاف عقیدہ رکھتے تھے، اور اپنے
شاگردوں کو بھی اسی عقیدہ کا قائل بنانا چاہتے تھے، یہ اللہ تعالیٰ کا
احسان ہے کہ اس نے ایسے صحیح العقیدہ آدمی سے پڑھنے کا موقعہ
عطا فرمایا۔ سورہ زمر جس میں توحید کی بڑی صاف اور طاقت ور
تعلیم ہے ان کی محبوب اور منتخب سورہ تھی، جب ہم لوگ عربی میں
کچھ چلنے لگے تو انھوں نے اس سورہ کا درس شروع کیا، اور سورہ
مومن و سورہ شوریٰ پڑھائی۔ عرب صاحب کو چند خاص رکوعوں
سے ایک طرح کا عشق تھا۔ جو خاص جوش اور لطف سے پڑھتے
تھے، ان میں سے سورہ آل عمران کا آخری رکوع اِنَّ فِیْ خَلْقِ
السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَاخْتِلَافِ الَّیْلِ وَالنَّهَارِ لَاٰیَاتٍ
لِّاُولِی الْاَلْبَابِ۔ جس کے متعلق صحیح حدیثوں میں آتا ہے کہ

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم جب شب کے پچھلے پہر کو تہجد میں اٹھتے تو اس سے پہلے ان آیتوں کو پڑھتے تھے اور سورۂ فرقان کا آخری رکوع وَعِبَادُ الرَّحْمٰنِ الَّذِيْنَ يَمْشُوْنَ عَلَى الْاَرْضِ هَوْنًا وَّاِذَا خَاطَبَهُمُ الْجَاهِلُوْنَ قَالُوْا سَلَامًا ۔ خاص طور پر یاد ہیں اور عرب صاحب کا پُردرد اور پُرتاثیر لہجہ گویا دماغ میں گونج رہا ہے، عرب صاحب سے سنتے سنتے ہم کو بھی یہ رکوع اچھے معلوم ہونے لگے اور اس طرح قرآن مجید سے ایک ذوقی تعلق پیدا ہوا''۔(۱)

مولانا نے اسی مضمون میں جس کا رسالہ صبح صادق سے اقتباس دیا گیا۔ یہ لکھا ہے کہ شیخ خلیل بن محمد عرب سے ادب عربی کی تکمیل کی، لہٰذا طفولیت کا زمانہ گھر کے قرآنی ماحول میں گذرا، جس کی تفصیل اوپر دی گئی، اور جب ۱۲ سال کی عمر ہوئی تو شیخ خلیل عرب سے وابستہ ہوئے، جن کے ذوق قرآنی کی جھلک آپ نے اوپر کی سطروں میں پڑھی۔ نیز عقیدۂ توحید میں پختگی اس گھر کی میراث تھی، جہاں مولانا نے آنکھ کھولی، اور گھر کے باہر جو پہلے استاذ ملے ان کو بھی اللہ تعالیٰ نے اس دولت سے وافر حصہ عطا فرمایا تھا۔

شیخ خلیل عرب صاحب سے پڑھنے اور ادب کی تکمیل کرنے کے بعد حدیث کی کتابیں حضرت مولانا حیدر حسن خاں رحمۃ اللہ علیہ سے پڑھیں جو حاجی امداد اللہ مہاجر مکی قدس سرہ کے مجاز تھے، ان کی سیرت سلف صالحین کے اخلاص وصداقت کی نمائندہ تھی، اس کے بعد مولانا احمد علی صاحب لاہوریؒ سے رجوع کیا، اور وہاں ایک عرصہ تک رہ کر ان کے خاص طرز پر قرآن کا مطالعہ کیا۔ غرض بچپن سے لے کر نوجوانی

---

(۱) منقول از رسالہ صبح صادق لکھنؤ، جنوری ۱۹۵۲ء۔ میرے مطالعہ قرآن کی سرگزشت

تک کا پورا زمانہ اولیاء وصالحین کی صحبت میں گذرا، اور یہی زمانہ ذہن کا سانچہ بناتا ہے، عقلیت بنتی ہے اور اس عرصہ میں جو مزاج بن گیا وہ زندگی بھر نہیں بدلتا۔ یہ سنت الٰہی ہے جس میں کوئی تبدیلی نہیں ہوتی، خود حضرت مولانا سید ابوالحسن علی رحمۃ اللہ علیہ حضرت مولانا محمد الیاس رحمۃ اللہ علیہ کی سوانح میں تحریر فرماتے ہیں:

> ''دینی جذبات کی پرورش، نیز دین کی سمجھ اور اس کا سلیقہ پیدا کرنے میں ان کیمیاء اثر صحبتوں اور مجالس کو جو دخل ہے وہ اہل نظر سے پوشیدہ نہیں۔ مولانا (حضرت مولانا محمد الیاسؒ) کی دینی اور روحانی زندگی میں اس ابتدائی ماحول کا فیض برابر شامل رہا ہے، انسان کی زندگی میں مقام وماحول کا اثر قبول کرنے کا جو بہتر زمانہ ہوسکتا ہے مولانا الیاس صاحب کا وہ زمانہ گنگوہ میں گذرا''۔(۱)

بعینہ اسی طرح حضرت مولانا علی میاں رحمۃ اللہ علیہ کے متعلق کہا جاسکتا ہے کہ ذہنی سانچہ کے بننے اور عقلیت کی تعمیر کا جو بہترین زمانہ ہوسکتا ہے، وہ والدہ ماجدہ، بھائی مولانا حکیم ڈاکٹر عبدالعلی صاحب، مولانا خلیل بن محمد عرب صاحب، حضرت محدث جلیل مولانا حیدر حسن خاں صاحب اور مولانا احمد علی صاحب لاہوری کی نگرانی میں اور ان کی محبتوں اور شفقتوں کے سایہ میں گذرا۔ حضرت مولانا احمد علی صاحب لاہوریؒ کے طرز تفسیر اور ربط معانی الآیات والسور سے ممکن ہے کسی کو مناسبت نہ ہو لیکن ان کی سیرت کی بلندی، عظمت کردار، علوئے نسبت، محرمات تو بڑی چیز ہے مشتبہ اور مشتبہ ہونے کے خوف سے مباحات سے بھی پرہیز ان کی سیرت کے اہم پہلو ہیں۔

---

(۱) مولانا محمد الیاس اور ان کی دینی دعوت۔ ص ۵۳ مطبوعہ دہلی

راقم کے زمانہ طالب علمی میں انجمن الاصلاح (طلبہ کی انجمن) میں تقریروں کا ایک موضوع تھا "میں کن شخصیات سے متاثر ہوا" اس موضوع پر اس وقت کے اساتذہ کو زحمت دی گئی کہ وہ طلبہ کی رہنمائی کے لئے اس عنوان پر تقریریں کریں۔ میرے اساتذہ میں محدث و مؤرخ جلیل مولانا عبدالسلام قدوائی رحمۃ اللہ علیہ، مولانا محمد ناظم صاحب ندوی رحمۃ اللہ علیہ مولانا شاہ عزالدین پھلواروی ندویؒ اور میرے مخدوم و مربی مولانا سید ابوالحسن علی ندوی رحمۃ اللہ علیہ تھے، ہمارے مولانا نے جو اس موقع پر تقریر فرمائی وہ مجھے اچھی طرح یاد ہے۔ آپ نے فرمایا: میں جن بزرگوں سے متاثر ہوا اتفاق سے ان سب کا نام احمد ہے۔ حضرت امام احمد ابن حنبل، حضرت سید احمد شہید اور حضرت مولانا احمد علی لاہوریؒ سبب تاثر تفصیل سے ذکر فرمایا۔ حضرت مولانا احمد علی لاہوریؒ کے بارے میں بتایا کہ مولانا ورع وتقویٰ، خشیت الٰہی کی زندہ تصویر ہیں (اس وقت حضرت لاہوری حیات تھے) اکل حلال میں احتیاط پسندی یہ دیکھی کہ آئے دن مدرسہ میں دعوتیں ہوا کرتی تھیں لیکن ایک روٹی کا ٹکڑا یا میٹھے کی ایک طشتری بھی حضرت کے گھر والوں کی طرف پہونچانے کی کوئی جرأت نہیں کرسکتا تھا۔

حضرت مولانا احمد علی لاہوریؒ جس طرح مولانا سید ابوالحسن علی ندوی رحمۃ اللہ علیہ کو عزیز رکھتے اور آپ کا مولانا لاہوریؒ کے دل میں کیا مقام تھا وہ صرف ایک خط کے اقتباس سے معلوم ہوسکتا ہے۔

محترم المقام فضیلت مآب حیثیت صلاشعار مولوی ابوالحسن صاحب علی اللہ درجاتکم

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

اس مبارک سفر میں قیام حرمین شریفین میں جو رحمتیں آپ پر نازل ہوئی ہیں ان کا بارگاہ الٰہی میں شکر ادا کیا گیا، الحمدللہ

حمداً كثيراً طيباً مباركاً فيه مباركاً عليه، چونکہ آپ میرے ہیں اس لئے اللہ تعالیٰ کا جو فضل بھی آپ پر ہو وہ میرے لئے صد فخر ہے، مجھے جس طرح مولوی حبیب اللہ سلمہٗ (۱) کی ترقی سے فرحت ہو سکتی ہے اسی طرح بلکہ واقعہ یہ ہے کہ بعض وجوہ کی بنا پر اس سے زیادہ خوشی اور سرور آپ کے درجات کی ترقی سے ہوتا ہے، اب یہ دعا کرتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ آپ کو استقامت عطا فرمائے اور موجودہ دور فتن میں تمام مصائب و آلام سے مامون رکھے۔ آمین یا اله العالمین (۲)

نوٹ! یہ ایک خط کی نقل ہے، اس طرح کا مزید ایک مکتوب پیش کیا جاتا ہے جس کے علاوہ دوسرے خطوط نیز حضرت مولانا محمد الیاس صاحبؒ کے خطوط مولانا ممشاد علی صاحب قاسمی نے اپنی کتاب میں درج فرما دیئے ہیں اس لئے یہاں ان کے نقل کی ضرورت نہیں سمجھی جاتی۔

(از احقر الانام احمد علی عفی عنہ)

بمحترم المقام مولوی ابوالحسن صاحب بارک اللہ فی اخلاصکم و اعمالکم

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

آپ کا ملفوف وصول پایا، حالات سے اطلاع پا کر سرور حاصل ہوا، آپ کا خط پڑھ کر ایک حدیث شریف یاد آئی۔

اللهم اجعلني في عيني الناس صغيراً وفي اعين الناس كبيراً۔ "اے اللہ! مجھے میری نظر میں چھوٹا اور لوگوں کی نظروں میں بڑا بنا دے"

---

(۱) حضرت مولانا احمد علی صاحب کے محترم صاحبزادے۔

(۲) مکتوبات شیخ التفسیر۔ جامع عبداللہ قاسمی۔

الحمدللہ ثم الحمدللہ آپ کی تحریر سے اس حدیث شریف پر عمل کی توفیق کی خوشبو آ رہی تھی، چونکہ میں آپ کو اپنا سمجھتا ہوں اس لئے مجھے اس خوشبو سے سرور حاصل ہو رہا تھا، میرے دل میں آپ کی جو عزت ہے اسے ضبط تحریر میں لانے کی ضرورت نہیں سمجھتا، اسی محبت اور عزت کا نتیجہ ہے کہ میں نے حج کی رات مسجد خیف میں آپ کے درجات کی ترقی کے لئے بارگاہ الٰہی سے استدعاء کی، اور الحمدللہ اس نے بارگاہ الٰہی میں قبولیت پالی، میں آپ کی اور زیادہ خدمت کرنا چاہتا ہوں خدا کرے کہ میری یہ آرزو پوری ہو جائے، اپنے حالات سے وقتاً فوقتاً مطلع فرماتے رہیں۔

فقط۔ والسلام

طفولیت سے لے کر آغاز نوجوانی تک کا عرصہ جس کو (Teen age) سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ یعنی ۱۹ سال تک کی عمر بالترتیب والدہ ماجدہ، مولانا ڈاکٹر سید عبدالعلی صاحب ؒ، شیخ خلیل بن محمد عرب اور حضرت مولانا احمد علی لاہوریؒ کی ہمہ جہتی توجہ ونگرانی میں ان کی زیر تربیت گذرا، حضرت مولانا احمد علیؒ نے ریاضتیں بھی کرائیں، اور اوراد وتلاوت، سحر خیزی، آہ نیم شبی کی دولت جو کسی کو آخر عمر میں ملتی ہے، بشرطیکہ اللہ تعالیٰ کا خاص کرم ہو۔ وہ مولانا کو ابتدائی عمر سے حاصل رہی۔

اس سانچہ میں جو عقلیت تعمیر ہوئی اس کے نتائج وثمرات بھی مصنوعی اور اختیار کردہ نہیں ہیں بلکہ وہ عمل کا ردعمل ہے جسے قدرتی طور پر ظاہر ہونا تھا۔ جس طرح ایک تخم صالح کا نتیجہ اس کے پھول، پھل کی شکل میں ظاہر ہوتا ہے، اگر اس کو اچھی مٹی، وافر پانی، مناسب ہوا اور دھوپ ملی ہو اور باغبان نے جانوروں کے دست برد سے اس کو بچا رکھا ہو، تو جس طرح باران رحمت کو ذریعہ بنا کر اللہ تعالیٰ زمین سے گل بوٹے

پھل پھول نکالتا ہے۔ اپنے بندوں سے بھی خیر و نفع عام کر کے دنیا کے چمن کو آراستہ کر دیتا ہے۔

وَتَرَى الْاَرْضَ هَامِدَةً فَاِذَآ اَنْزَلْنَا عَلَيْهَا الْمَاءَ اهْتَزَّتْ وَرَبَتْ وَاَنْبَتَتْ مِنْ كُلِّ زَوْجٍ بَهِيْجٍ ۔ (الحج۔۵)

''اور زمین کو تم دیکھتے ہو کہ خشک (پڑی) ہے پھر ہم جب اس پر پانی برساتے ہیں تو وہ ابھرتی ہے اور پھولتی ہے اور ہر قسم کے خوشنما نباتات اگاتی ہے۔''

●●●

دینی عقلیت کے مظاہر

جسم کی پرورش جس طرح غذا اور پانی سے ہوتی ہے اسی طرح فکر ومزاج کی پرورش تعلیم، گھرانے کی روایات اور ماحول سے ہوتی ہے، یہ علم النفس کے گہرے علمی مسائل نہیں بلکہ ہمارے آپ کے مشاہدات اور آئے دن کے تجربات ہیں، ذہانت بھی کسی ایک رخ پر چلتی ہے دوسرے رخ پر وہ بیکار ثابت ہوتی ہے، ایک تاجر گھرانہ کے فرد کی ذہانت کاروبار میں نفع ونقصان کا حساب لگانے میں، تجارتی موقع شناسی میں جس قدر تیز اور کارآمد ہوتی ہے، اس طرح وہ زراعت کے معاملہ میں نہیں چلتی، اسی طرح اس کے برعکس کسان کی عقلیت، تاجر سے مختلف ہوتی ہے، یہ بات ہر ماحول کے متعلق کہی جاسکتی ہے۔

میں نے اوپر کی سطروں میں جو عرض کیا اس کا خلاصہ یہ ہے کہ حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی مدظلہٗ ایک انتہائی ذہین، انتہائی حساس انسان ہیں، سرعت فہم کا یہ عالم ہے کہ ایک حرف سن کر پوری داستان کو ایک لمحہ میں سمجھ لیں، گردوپیش سے آگاہ، ہوا کا رخ پہچاننے والے، طوفان کی خبر طوفان کے آنے سے پہلے دینے کی صلاحیت رکھتے ہیں، پھر تعلق باللہ نے قلب کو آئینہ کی طرح روشن کر دیا ہے۔ جو ﴿اتقوا فراسة المومن﴾ (ایک بندہ مومن کی اس قوت فہم سے ڈرو جو دور سے باتوں کو

تاڑلیتی ہے) کا مصداق ہے۔ مگر یہ ساری ذہانتیں دین کے معاملہ میں کام آتی ہیں، ذہانت خیر کی طرف مائل ہے۔ اس ذہانت کے راستے میں شر پسندی کا نشیب نہیں ہے، عقلیت تعمیری ہے، تخریبی نہیں ہے، اس کے اندر دوسروں کے لئے حسن ظن کا مادہ غالب ہے، کسی مسلمان کا کمزور پہلوان کے سامنے آئے تو اس کی تاویلیں کرلیں گے، اس کی نیت پر شبہ نہیں کریں گے، دوسروں کے احساسات کا اس درجہ نزاکت اور باریک بینی کے ساتھ خیال رہتا ہے کہ جیسے شیشہ پر ہلکا بال نہ پڑنے پائے، اس پر کسی طرح میل نہ آئے، اور لطف یہ کہ دوسروں کے احساسات کا یہ احترام اس وقت بھی ملحوظ رہتا ہے جب دوسری طرف سے بالکل برعکس معاملہ ہو، پتھر پھینکنے والوں پر پھول کی بارش ایک شاعرانہ تخیل ہے، مگر حالات و تجربات کا تجزیہ کروں تو ایسا دکھائی دیتا ہے کہ مولانا کی زندگی میں یہ مجاز نہیں حقیقت ہے، روزمرہ کی بات ہے، آئے دن کا قصہ ہے۔

کاتب الحروف درِ کعبہ پر کھڑے ہو کر حلفیہ بیان دے سکتا ہے کہ میں حضرت مولانا کے ساتھ گھنٹوں تنہا بھی رہا ہوں، ہوائی جہاز پر برابر کی نشست پر بیٹھا ہوں، ریل پر بھی رفاقت کی ہے، ایسی مختصر مجلس میں بھی رہا ہوں جہاں کسی نے آکر یہ خبر دی کہ فلاں صاحب آپ کے بارے میں یہ کہتے ہیں، لیکن مولانا کی زبان سے کسی مسلمان کے حق میں ایک بھی ناروا جملہ نہیں سنا، لوگوں کو اکثر دیکھا ہے کہ کسی ناپسندیدہ شخص کا ذکر بہت برے الفاظ سے کرتے ہیں۔ معروف لقب (جیسے مولانا، ڈاکٹر، شاہ وغیرہ) کو چھوڑ کر صرف نام یا نام کا کوئی جزء نفرت کے اظہار کے ساتھ کرتے ہیں، تنابز بالالقاب کا ارتکاب بھی کر جاتے ہیں، مگر مولانا کی زبان سے کسی شخص کا نام بھی سنا تو اس کے عرفی لقب کے ساتھ سنا زبان کی یہ طہارت، قلب کی طہارت کا مظہر ہے۔

کسی فرد یا جماعت کے خلاف سازش، لوگوں کو کسی کے خلاف ابھارنا، پارٹی بنانے اور دوسری پارٹیوں کو گرانے یا بے وقعت دکھانے کی سعی تو بڑی چیز ہے کبھی

اشارۃً و کنایۃً بھی اس کا دور سے یا نزدیک سے اظہار مولانا کی عقلیت سے، بہت دور ہے، ایک مثال نوک قلم پر آ گئی ہے، اس کو اس لئے بھی لکھ رہا ہوں کہ بات کا ایک رخ چھپا ہوا نہیں بلکہ چَھپا ہوا ہے، کان پور سے ایک روزنامہ نکلتا ہے اس کے ایڈیٹر و مالک کہنے کو دیو بند کے فارغ تھے۔ مگر ریش وفش سے آزاد، ایک تاجر وضع کے آدمی تھے، ان کو مولانا سے للہی بغض تھا، بلکہ الرجی تھی، موقع بے موقع اپنی کدورت کا اظہار کرتے رہتے تھے۔ ان کا انتقال ہوا تو مولانا اس وقت بمبئی میں تھے، یہ ناچیز مکہ مکرمہ میں تھا مجھ سے فون پر گفتگو ہو رہی تھی، فرمایا.......... کا انتقال ہو گیا ہے، ان کے لئے دعائے مغفرت کرنا۔

ایک اور صاحب جو مشہور صاحب قلم ہیں، ان کے زیادہ اوصاف گنانے اور ماضی کے حوالے دینے سے گریز کرتا ہوں، اپنی تحریروں اور گفتگو میں نہایت دریدہ دہنی کے ساتھ مولانا کی ذات اور تصنیفات پر ناروا حملے کیا کرتے ہیں۔ اپنے قد کو اونچا دکھانے کے لئے ایک عصامی (وقت کے سب سے زیادہ قدآور) کو اپنی قامتِ کوتاہ تک گرانا ان کا مشغلہ ہے۔ ان کے پاس سے آنے والے اکثر ان کی باتیں نقل کرتے ہیں۔ مگر مولانا کی مجلس میں آج تک ان کا کبھی نام بھی نہیں آیا۔ تنقید کا جواب تنقید سے اور سب وشتم کا رد بالمثل سے تو بہت دور کی بات ہے۔

مولانا نے اپنی شخصیت کا اظہار کبھی نہیں کیا اور نہ کسی کارنامے کا سہرا اپنے سر باندھنے کی کوشش کی۔

بلکہ جہاں ایسا موقع آیا کسی کو شریک کر لیا۔ مطلقہ عورت (۱) کے نان ونفقہ کا مسئلہ بہت زور شور سے اٹھا تھا۔ لوگوں کو بھی اس کی تفصیل معلوم ہے یہ بھی سب کے علم میں ہے کہ آزادی ہند کے پچاس سال کے اندر کوئی مسئلہ مسلمانوں کے حق میں فیصل

(۱) مشہور شاہ بانو کیس

ہوا ہے تو یہی مسئلہ تھا۔ راجیو گاندھی نے مولانا سے وہ تاثر لیا تھا جو ایک یہودی نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو دیکھ کر کہا تھا، "ھذا لیس وجہ کاذب" یہ کسی جھوٹے کا چہرہ نہیں ہوسکتا۔ مگر مولانا نے ان سے اجازت طلب کی کہ کسی اور واقف کار کو اپنے ساتھ لائیں، راجیو نے کہا آپ جس کو چاہیں لاسکتے ہیں مگر کسی Politician یعنی سیاسی آدمی کو ساتھ نہ لایئے (غالباً اس کا اشارہ سید شہاب الدین صاحب کی طرف تھا) مولانا نے سید منت اللہ صاحب رحمانی کو دعوت دی اور جب بھی راجیو سے ملے مولانا رحمانی کی رفاقت میں ملے۔ ایک دوسرے کا احترام ولحاظ ملحوظ رکھتے تھے، اس سلسلہ میں ایک لطیفہ قابل ذکر ہے۔ کہ ایک مرتبہ راجیو گاندھی سے ملنے جارہے تھے۔ ساتھ میں کچھ کاغذات کے فائل بھی تھے۔ مولانا رحمانی نے ان کو اٹھالیا۔ مولانا نے اصرار کیا کہ آپ نہ زحمت فرمائیں میں ان فائلوں کو اپنے ہاتھ میں لے لیتا ہوں۔ مولانا رحمانی جب نہیں مانے تو مولانا نے فرمایا: یہ بتایئے کہ اگر حضرت مونگیری رحمۃ اللہ علیہ اور میرے والد مولانا سید حکیم عبدالحیؒ ایک ساتھ کسی مہم پر جاتے تو کاغذات کس کے ہاتھ میں ہوتے۔ (غالباً اشارہ اس طرف تھا کہ حضرت مونگیریؒ بانئ ندوہ اور ناظم اول تھے، اور حضرت حکیم عبدالحی صاحب مددگار ناظم تھے) مولانا سید منت اللہ رحمانی نے برجستہ جواب دیا، جس کو حضرت مونگیریؒ چاہتے۔

اسی طرح محترمہ نجمہ ہبۃ اللہ (۱) نے مولانا سے ندوہ آکر ملنے کی خواہش کی جب ان کی آمد کی تاریخ متعین ہوئی تو حضرت مولانا منت اللہ صاحب رحمانی کو تار سے اطلاع دی گئی اور وہ تشریف لائے، ملاقات میں شریک رہے، یہ سب باتیں صرف اس لئے تھیں کہ تنہا کسی خدمت کے سرانجام دینے کا سہرا اپنے سر نہیں لینا چاہتے تھے۔

---

(۱) موصوفہ مولانا ابوالکلام آزاد سے نسبی تعلق رکھتی ہیں، پارلیمنٹ میں ڈپٹی اسپیکر رہیں یا اسپیکر کے عہدہ پر مامور تھیں۔ اور اندرا گاندھی ان پر اعتماد رکھتی تھیں۔

معاصرین کا احترام اور ان کی خدمات کا اعتراف

علماء ومشائخ کے گھرانوں میں بڑوں کا احترام اور ان کے مراتب کے لحاظ سے ان کی بزرگ داشت آداب معاشرت میں داخل ہوتی ہے۔ وہ لوگ جو اس طرح کے آداب معاشرت سے واقف نہیں ہیں ان کو اس کی اہمیت کا بھی پتہ نہیں ہوتا۔ مولانا کا گھریلو ماحول پشتہا پشت سے علماء ومشائخ کا گھرانہ ہے۔ جہاں صلہ رحمی کو شریعت کا جزء سمجھا جاتا ہے۔ (مولانا کے خاندان کی ایک شاخ ٹونک میں آباد تھی۔ برسہابرس سے یہ لوگ آباد تھے۔ والیٔ ریاست کی شومیٔ بخت کہ بعض مفسد درباریوں کی سازش سے اس خانوادے کو ریاست کا باغی سمجھ لیا اور اچانک ان کو ریاست چھوڑنے کا حکم دیا۔ یہ قافلہ جب اپنے سابق وطن آیا تو اس موقعہ پر ہر ایک نے اپنے اپنے گھر کی پیشکش کی۔ حضرت مولانا کے والد ماجد حکیم مولانا عبدالحیؒ نے ان سے کہا کہ آپ ہمارے یہاں رہیں گے تو ہم پر احسان کریں گے۔)

مولانا معاصر علماء کا دل کھول کر اعتراف کرتے ہیں، جو عمر میں بڑے ہیں ان کو مخدوم ومحترم سے خطوط میں خطاب کرتے ہیں۔ اپنے شاگردوں کی ہمت افزائی میں بعض وقت ایسے الفاظ لکھ دیتے ہیں کہ ان کو واقعی غلط فہمی ہو جاتی ہے۔ گروہی عصبیت سے مزاج میں ہمیشہ سے تنفر رہا۔ بزرگ زادوں کا احترام دل سے ملحوظ رکھتے ہیں۔ ایک دفعہ کا ذکر ہے کہ ایک صاحب نے کہا فلاں صاحب نے آپ کے متعلق لکھنؤ سے متصل قریبی شہر کے ایک مدرسہ میں آپ کے متعلق یہ کہا اور وہ کہا۔ وہ اپنے ساتھ کیسٹ بھی لائے تھے۔ حضرت مولانا نے ان کو کچھ مزید کہنے کا نہ موقع دیا اور نہ کیسٹ سنا۔ غالباً اس لئے کہ وہ حضرت مولانا کے بزرگ زادہ تھے۔ اور یہ نہیں چاہتے تھے کہ ان کی طرف سے دل میں میل آئے۔

دور بیٹھا غبار میر اس سے
عشق بن یہ ادب نہیں آتا

معاصرین میں مولانا قاری طیب صاحبؒ، مولانا مفتی عتیق الرحمٰن صاحبؒ، مولانا ابواللیث صاحب ندویؒ، صوفی عبدالرب صاحبؒ، مولانا محمد یوسف صاحبؒ (جانشین حضرت مولانا محمد الیاس صاحبؒ)، مولانا محمد اویس صاحب نگرامی ندویؒ، مولانا محمد منظور نعمانیؒ، مولانا عبدالرشید صاحب نعمانی، ساتھیوں میں مولانا محمد ناظم صاحب ندویؒ، مولانا عبدالسلام صاحب قدوائیؒ، اوراسی طرح کے دوسرے بزرگوں اور علماء سے احترام باہمی کا تعلق رہا۔ان کی موجودگی میں جو احترام ملحوظ رکھتے بعینہٖ وہی احترام ان کی غیر موجودگی میں فرماتے تنقیص وتنقید تو خیر اپنے مخالف اور بدگو حاسدین کے حق میں بھی نہیں کرتے ہیں، اپنے معاصرین کی کتابوں پر اگر کوئی مقدمہ لکھا یا کوئی رائے دی تو دل کھول کر اعتراف وقدردانی کا اظہار فرماتے ہیں۔

دل اور زبان کی پاکی مولانا کا امتیازی وصف ہے۔زبان سے کوئی ایسا لفظ ادا نہیں ہوتا جس میں کسی کی تنقیص کا پہلو نکلتا ہو۔خواہ دوسرے حضرات ایسے مواقع پر اپنی کدورت کو چھپانے پر قادر نہیں ہوتے، روزمرہ کے طور پر بہت بے باکی سے بولا کرتے ہیں۔مولانا سے عمر میں زائد اور عرب ممالک میں شہرت بھی جن کی پہلے سے تھی، اپنے فن میں کامل علامہ عبدالعزیز میمن مولانا کا مقدمہ ''مختارات'' میں دیکھ کر متاثر ہوئے اور فرمایا: آپ بڑی خوبصورت عربی لکھتے ہیں۔یہی نہیں بلکہ انھوں نے مولانا کو علی گڈھ میں عصرانہ دیا۔لوگوں نے کہا کہ وہ تو بہت...... ہیں اتنی بڑی تعداد کی دعوت کیسے کر ڈالی، مولانا نے ان لوگوں کی گفتگو جب ہم لوگوں سے نقل کی تو وہ لفظ جو ان کے ناقدین نے کہا تھا حذف کر گئے اور کہا ان کے اقتصادی ہونے کی شہرت بہت تھی۔

۱۹۴۶ء میں رحیم آباد میں ایک بڑے تبلیغی جلسہ کے موقعہ پر ایک مشہور بزرگ کی ایک کتاب آئی، جو اس وقت نئی نئی چھپی تھی، مجلد مرصع گرد پوش اور اس کے اوپر ایک پلاسٹک کا غلاف چڑھا ہوا۔ اس میں خدائی انتظامات کی تفصیل اس طرح تھی کہ گویا آسمان پر ایک منسٹری قائم ہے۔ کوئی فرشتہ فوڈ منسٹر ہے، کوئی فرشتہ آب پاشی کا محکمہ سنبھالے ہوئے ہے، مولانا محمد منظور نعمانی کو غصہ سا آ گیا۔ اور چند لفظوں میں اپنی کدورت کا اظہار کیا۔ مولانا نے دیکھا تو مسکراتے ہوئے فرمایا: ذہانت بھی کیا کیا رنگ لاتی ہے۔

بڑوں کے اعترافات اور ان کی تحسین و توصیف سے مزاج کے اعتدال میں کبھی فرق نہیں آیا۔ اور نہ ان کے کہے ہوئے الفاظ کو دہرایا۔ آپ کاروان زندگی کے تمام حصے پڑھ جائیں ایسا محسوس ہوتا ہے کہ کہ ان الفاظ تحسین واعتراف کو مولانا نے دعاء اور فال نیک سمجھا۔ حضرت مولانا محمد الیاسؒ، حضرت مولانا شاہ عبدالقادر رائے پوریؒ، حضرت شیخ الحدیث مولانا زکریاؒ، حضرت مولانا احمد علی لاہوریؒ وقت کے اساطین رشد و ہدایت نے آپ کو بلند ترین الفاظ سے یاد کیا لیکن بجائے اس کے کہ طبیعت میں اپنی بڑائی کا احساس ہو مزاج کے اندر مزید فروتنی اور شکستگی پیدا ہو گئی۔

مولانا کی عقلیت کے مظاہر میں یہ بات بہت واضح نظر آئی کہ تصنع اور چالاکی سے مزاج کو قطعاً مناسبت نہیں اور ایسا نہیں ہے کہ وہ اللہ کی عطا کردہ نعمتوں کو سمجھتے ہی نہ ہوں۔ وہ اپنی مقبولیت، شہرت اور مقام سے بھی واقف ہیں اور جو لوگ ان سے چالاکی کا معاملہ کرتے ہیں ان کو بھی جانتے ہیں مگر طبیعت کا سانچہ ایسا بنا ہے کہ کہ عزت و مقبولیت نے آپ کے اندر عُجب، خود پسندی، خودستائی، خودنمائی کے بجائے فروتنی، رحم دلی، دوسروں کے احساسات کے احترام کا جذبہ پیدا کر دیا۔ کثرت ذکر و تلاوت و معمولات کی پابندی نے سیر چشمی کے ساتھ دل شکستگی اس درجہ پیدا کر دی

جس سے اپنے آپ کو بڑا سمجھنے کی حس ہی ختم ہوگئی ہاں یہ ضرور ہے کہ آپ ''چالاک'' قسم کے لوگوں سے گھبراتے ہیں، کیونکہ اس جنس سے آپ کے مزاج کو ہمیشہ دوری رہی، اور جہاں اخلاص کا جوہر دیکھا وہاں بڑے تو بڑے ٹھہرے اپنے ہمعصروں بلکہ اپنی عمر سے کم لوگوں کا دل سے احترام ملحوظ رکھتے ہیں، خواہ جسم پر جو بھی تکان اور نقاہت کا اثر ہو، ان سے جا کر ملتے ان کی عیادت کرتے، بعض حضرات کی بقدر وسعت مالی مدد بھی کرتے، اور ان کے ہدیہ قبول کرنے کا احسان مانتے اور حق یہ ہے کہ اخلاص سے آواز دینے والے کی دل شکنی کرنے کی گویا صلاحیت ہی نہیں ہے۔

مال سے بے نیازی، جاہ طلبی سے دوری

مولانا کی اقتصادی حالت شروع سے متوسط درجے کی رہی جس کو اہل عرب ''مستور الحال'' کہتے ہیں، اگرچہ کبھی رکھ رکھاؤ، مہمان نوازی میں فرق نہیں آیا مگر دولت مندی کی حالت کبھی نہیں تھی۔ مولانا کے والد ماجد علیہ الرحمہ کا مشغلہ طب تھا۔ طبابت کی آمدنی سے گذر بسر ہو جاتی تھی۔ والدہ ماجدہ زمیندار گھر کی بی بی تھیں، مگر ایسی زمینداری بھی نہیں جو رئیسانہ ٹھاٹ باٹ کی ہو۔ مولانا کے والد علیہ الرحمہ نے لکھنؤ میں اپنا کوئی مکان نہیں بنایا۔ کرایہ کے مکان (۳۷ گوئن روڈ) میں رہے اور آپ کے بعد آپ کے فرزند اکبر مولانا حکیم ڈاکٹر عبد العلی صاحب علیہ الرحمہ اور آپ کا پورا خاندان جس میں حضرت مولانا علی میاں رحمۃ اللہ علیہ بھی ہیں۔ اسی مکان میں رہے۔ اسی مکان میں آپ کا مطب تھا۔ اسی سے متصل مسجد بھی تھی جو آج بھی ہے۔ ڈاکٹر صاحبؒ نے اپنا کوئی مکان نہیں بنایا غالباً سوچا بھی نہیں۔ ۶۵ سال سے اس مکان میں یہ خاندان آباد رہا۔ اس مختصر سے مکان میں بڑی برکت اور نورانیت تھی۔ اس میں بارہا حضرت مولانا حسین احمد مدنی رحمۃ اللہ علیہ ٹھہرے۔ اور وقت کے بڑے

بڑے علماء بھی اس مکان میں آتے رہے۔ حضرت تھانویؒ نے بھی قدم رنجہ فرمایا۔ غیر متعلق لوگوں کو (جن میں کاتب الحروف بھی ہے) یہ نہیں معلوم تھا کہ یہ مکان کرایہ کا ہے۔ بالآخر حضرت مولانا کے زمانہ میں جب مالک مکان نے مکان خالی کرانے کا مطالبہ کیا تو مولانا نے اپنے افراد خاندان کو حکم دیا کہ مکان خالی کر دیں۔ ۶۵ سال قبضہ میں رہنے کے بعد کوئی دوسرا ہوتا تو مکان آسانی سے نہیں چھوڑتا۔ اور نہ معلوم کتنی مدت مقدمہ چلتا اور پھر ایک خطیر رقم لینے کے بعد مکان خالی ہوتا۔ بہر حال یہاں دکھانا یہ ہے کہ مولانا ان لوگوں میں نہیں تھے، جس کو مال کی ضرورت ہی نہ ہو، مولانا نے کاروان زندگی کے پہلے حصے میں اپنی اقتصادی حالت کی ابتری کا ذکر فرمایا ہے۔

ایسے شخص کو اگر حلال طریقہ سے ہدایا کی بڑی رقم ملے اور وہ بھی ایک بار نہیں کئی بار، تو اس کو چھوڑنا اور واپس کر دینا، اس زمانہ میں عقل مندی کا طریقہ نہیں ہے۔ اگر کسی کے اتنے تعلقات ہوں اور چوٹی کے مالداروں سے سابقہ ہو اور ان کی خواہش بھی ہو کہ کچھ فرمائش کریں تو اس کو پوری کرنے میں سعادت و مسرت محسوس کریں۔ مگر مولانا کی ''عقلیت'' نے کیا کیا اس کی مختصر روداد اس سے سنئے جس کے لئے یہ واقعات شنیدہ نہیں دیدہ ہیں۔ اور اس کا وہ چشم دید گواہ ہی نہیں بلکہ درمیان کا آدمی بھی رہ چکا ہے۔

محرم ۱۳۷۰ھ میں جب کہ مولانا حجاز میں مقیم تھے۔ حضرت رائے پوریؒ حج سے فارغ ہو کر ہندوستان تشریف لے جا چکے تھے۔ مولانا اور ان کے رفقاء و خدام کا قیام کسی ہوٹل یا محل میں نہیں بلکہ عام مسافروں کی جائے پناہ ''رباط'' میں تھا۔ کھانا صرف دن کا کھایا جاتا تھا۔(۱) بازار سے روٹی اور فول آتا اور سب مل کر ناشتہ کرتے۔ اور

---

(۱) سن ۱۳۷۰ھ کے حج میں ہندوستان سے مولانا محمد منظور نعمانیؒ تشریف لے گئے تھے، انھوں نے حج سے واپسی کے بعد اپنے سفر کی یادداشت اپنے ماہنامہ الفرقان میں لکھی تھی جس میں یہ تذکرہ بھی ہے کہ یہ لوگ (حضرت مولانا علی میاں اور ان کے رفقاء) رات کا کھانا نہیں کھاتے تھے (ایک تعجب کی بات)

مولوی محمد طاہر صاحب ندوی مظاہری (جو بعد میں حضرت ڈاکٹر صاحب کے خویش ہوئے اور اب دفتر نظامت کے ناظر اعلیٰ ہیں)(۱) کوئی سبزی یا گوشت پکا لیتے۔ دوسرے ساتھی کوئی بازار سے سودا سلف لاتا، کوئی برتن دھوتا، اور سب مل کر کھاتے۔ اس زمانہ میں رباط میں جہاں بڑے لوگ عام طور سے جایا بھی نہیں کرتے۔ مولانا سے ملنے کے لئے امام حرم شیخ عبدالرزاق حمزہ، مشہور ادیب وصاحب قلم استاذ احمد عبدالغفور عطار، شیخ عبدالقدوس انصاری، ایڈیٹر المنہل، سید علی حسن فدعق (مفتش مالیات) اور اسی قبیل کے لوگ آیا کرتے تھے۔ ایک روز خود شیخ عمر بن حسن بھی ناشتہ میں شریک ہوئے۔ اس زمانہ میں شیخ عمر کا درجہ وہی تھا جو آج کل شیخ بن باز کا ہے، ملک فیصل کے ماموں ہوتے تھے آل شیخ میں تھے۔ ھیئة الامر بالمعروف والنھی عن المنکر کے رئیس اعلیٰ تھے۔ ملک سعود مرحوم کے ساتھ طواف وسعی میں ساتھ رہتے تھے۔ ان کا رباط میں آنا ایسا ہی تھا جیسے کوئی گورنر کسی جھونپڑے میں قدم رنجہ فرمائے۔ شیخ عمر بن حسن آل شیخ نے مولانا کے چند رسائل "بین الصورة والحقیقة، بین الانسانیة وأصدقائھا، بین الھدایة والجبایة" دیکھے تھے۔ اور "الی ممثلی البلاد العربیة" بھی پڑھ چکے تھے۔ اس وقت تک ماذا خسر مصر سے چھپ کر نہیں آئی تھی۔ انھوں نے ایک روز مجھ سے حرم میں فرمایا کہ صبح میرے پاس آنا۔ ان کے حکم کے مطابق حاضر ہوا تو ایک تھیلی سونے کی گنیوں سے بھری دی اور کہا کہ یہ شیخ ابوالحسن کو پہونچا دو۔ اس زمانہ میں نوٹ کا چلن نہیں ہوا تھا۔ یا تو چاندی کے ریال چلتے تھے یا چالیس ریال قیمت کی ایک طلائی گنی (جس کو جنیہ سعودی کہا جاتا تھا) میں نے ایک تھیلی سونے کی اشرفیوں سے بھری ہوئی زندگی میں پہلی بار دیکھی تھی۔ اس کو لے کر ایک طرح کی خوشی کے ساتھ رباط آیا۔ حضرت مولانا کی خدمت میں پیش کی،

---

(۱) اب ریٹائر ہو چکے ہیں۔

غالباً ۴۵ منٹ یا ایک گھنٹہ بعد مولانا نے ایک خط لکھا اور تھیلی کے ساتھ مجھے دیا کہ شیخ کو دے آؤ، اس خط میں شکریہ کے جذبات احترام کے اظہار کے بعد یہ لکھا تھا کہ ہدیہ قبول ہے اور میں نے ایک گنی اپنے ذاتی خرچ کے لئے رکھ لی ہے، بقیہ واپس کررہا ہوں (بقیہ ۳۹ گنیاں) میں یہ رقم اور خط لے کر گیا تو شیخ ظہر کے بعد آرام کررہے تھے، ملاقات نہ ہوسکی، بعد عصر گیا تو پورا ہال بھرا تھا، قہوہ کا دور چل رہا تھا۔ سلام کرکے خط اور رقم کی تھیلی حاضر کی، شیخ نے پہلے خط پڑھا، پھر آواز سے اسے پڑھ کر سب کو سنایا۔ ایک صاحب نے کہا علمائے سلف کے نمونے ہر زمانہ میں مل جاتے ہیں، ایک صاحب بولے ''لاتزال أمة محمد علی خیر'' (رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی امت میں ہمیشہ خیر رہا ہے) پچاس برس پہلے کی بات ہے۔ ان لوگوں نے نجدی لہجہ میں اور کیا کہا یاد نہیں۔ لیکن اتنا یقین کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ مولانا کے اس استغناء سے ہندوستان کے علماء کا وقار بڑھ گیا۔ اور محسوس کیا گیا کہ سب یکساں نہیں ہوتے۔

میں سمجھا تھا کہ بات ختم ہوگئی مگر عرصہ دراز کے بعد شیخ عمر بن حسن کے برادر زادہ شیخ حسن بن عبداللہ آل شیخ (جو بعد میں وزیر تعلیم ہوئے اور پھر وزیر تعلیم اعلیٰ ہوئے) سے بیروت میں استاذ عبداللہ الغنیم کے مکان پر ملاقات ہوئی تو انھوں نے مولانا کی خیریت معلوم کی اور اس واقعہ کو میری موجودگی میں عبداللہ الغنیم کو سنایا۔ اسی زمانہ کا دوسرا واقعہ امیر سعود الکبیر (بادشاہ کے چچا) کے ہدیہ کا ہے۔ موصوف نے مولانا اور ان کے مرافقین کی دعوت کی۔ کھانے اور چائے کے بعد واپس آنے لگے تو مولوی رضوان علی صاحب (حال ڈاکٹر سید رضوان علی ندوی مقیم کراچی) کو اشارہ سے روک لیا۔ اور ان کے ساتھ چاندی کے ریالوں کی بڑی تھیلی جس میں پانچ سو ریال تھے ان کے حوالہ کی اور کہا اپنے شیخ کو دے دینا۔ وہ تھیلی بھی واپس کی گئی تفصیل معلوم نہیں کیوں کہ اس دعوت کے موقع پر میں موجود نہیں تھا۔ غالباً سعودی ریڈیو کے اردو سروس کے انچارج حکیم محمد نعیم

صاحب مرحوم نے اپنی قیام گاہ حجاج منزل جدہ میں کچھ ترجموں کے لئے بلالیا تھا۔

تیسرا واقعہ یہ پیش آیا کہ مولانا سے سعودی ریڈیو نے چند تقریریں ریکارڈ کرائیں۔ من العالم الی جزیرة العرب، اور من الجزیرة الی العالم وغیرہ۔ محکمہ ریڈیو کے انچارج اس وقت شیخ محمد سرور الصبان تھے، جو اس وقت نائب وزیر مال تھے۔ (بعد میں وزیر مال ہوئے اور آخر میں رابطہ عالم اسلامی کے پہلے جنرل سکریٹری) شیخ محمد سرور الصبان نے تقریروں کا معاوضہ (خصوصی) پیش کیا تھا مگر مولانا نے اس کو قبول کرنے سے انکار کیا۔

شیخ محمد سرور الصبان کے بہت قریبی حلقے کے ایک ادیب وصاحب قلم استاذ احمد عبد الغفور عطار نے ہم لوگوں سے کہا کہ شیخ ابوالحسن جیسی شخصیت رباط میں رہے اچھا نہیں معلوم ہوتا۔ تم اس مضمون کا ایک خط شیخ کی طرف سے محمد سرور الصبان کو لکھو وہ فندق التیسیر (جو اس وقت مکہ کا سب سے بڑا ہوٹل تھا) کو آرڈر دے دیں گے، وہاں چار پانچ کمرے معہ خورد ونوش کے مل جائیں گے۔ ہم لوگ مولانا کے مزاج سے واقف تھے، اس لئے ان سے کہہ دیا کہ وہ اس وقت بھی قبول نہیں فرمائیں گے۔ جب خود ان کی طرف سے پیش کش ہو چہ جائیکہ وہ اس کی درخواست کریں۔

ملک سعود کے بعد جب ملک فیصل تخت نشیں ہوئے، اس وقت مولانا کی کئی مرتبہ ملک فیصل سے تنہائی میں ملاقات ہوئی، ہر مرتبہ مولانا نے وہی باتیں کیں جن کا تعلق دینی شعور کی بیداری اور دولت کی فراوانی سے پیدا شدہ مسائل اور امریکہ کی تقلید سے تھا۔ جس کی تفصیل کاروان زندگی میں ہے۔ اپنی ذات یا ندوہ کے لئے ایک ہلکا سا اشارہ لاکھوں لاکھ کی دولت یہاں لا سکتا تھا۔ ۱۹۵۵ء میں مولانا کو دمشق یونیورسٹی میں ویزیٹنگ پروفیسر کی حیثیت سے دعوت دی گئی۔ (جس کی تفصیل عالم عرب سے تعلقات کے باب میں آئے گی) یہاں صرف یہ ذکر کرنا ہے کہ مولانا نے

اپنے محاضرات کا کوئی معاوضہ حکومت شام سے قبول نہیں کیا۔ اس کا علم مجھے اس طرح ہوا کہ ان خطبات کا مجموعہ رجال الفکر والدعوۃ جب شائع ہوا تو الاستاذ مصطفیٰ السباعی نے اپنے مقدمے میں اس کا خصوصیت کے ساتھ ذکر کیا ہے۔

الجامعۃ الاسلامیۃ (مدینہ یونیورسٹی) نے ۱۳۸۹ھ کے جلسے میں طے کیا کہ ممبروں کو ایک "اکرامیہ" کے نام سے رقم دی جایا کرے۔ (علاوہ سفر خرچ اور ضیافت کے) مولانا نے اس کو قبول نہیں فرمایا۔ اور جامعہ کی طرف سے جو ہوٹل میں رہائش کی سہولت دی جاتی تھی وہ بھی قبول نہیں فرمائی، اپنے محب و مخلص میزبان شیخ محمد نورولی کی میزبانی (قیام) کی قبول فرمائی۔ اور ان کے باغ والے مکان میں قیام کرتے رہے۔ اور جب وہ باغ بلڈنگ میں تبدیل ہوگیا تو ان کے ذاتی ملکیت کے ہوٹل میں ٹھہرا کئے۔ اور اب حرم شریف سے متصل ایک متوسط درجہ کا ہوٹل قصر الشریف ہے جس میں قیام رہتا ہے۔ شیخ ابن باز جب تک یونیورسٹی کے چانسلر رہے وہ باغ نورولی میں ملاقات کے لئے آیا کرتے تھے، اور اسی باغ میں مولانا سے ملنے کے لئے شیخ محمود احمدؒ (برادر حضرت مدنیؒ) تشریف لاتے اور عرب، غیر عرب اساتذہ وطلبہ آتے رہے۔ مولاناؒ جہاں بھی رہے خواہ وہ جگہ معمولی ہو یا بلند وبالا، آپ سے ملنے کے لئے وقت کی عظیم شخصیات آتی رہیں، یہی ہوٹل جس کا ذکر اوپر ہوا معمولی درجہ کا ہوٹل ہے، مگر اسی میں ملک سعود مرحوم کے پوتے امیر مشعل آکر ملے جامعہ اسلامیہ مدینہ منورہ کے موجودہ وائس چانسلر آئے، حرم شریف کے مشہور شیخ عطیہ آکر ملے۔

رابطہ عالم اسلامی کے مستقل ممبروں نے بھی یہ تحریک اٹھائی کہ ان کو ایک "اکرامیہ" دیا جائے۔ مولانا نے اس کی مخالفت کی اور فرمایا کہ کوئی کام تو ہم لوگ خالص دین کے لئے کریں۔ مگر لوگوں نے اصرار کیا، اور یہ تجویز پاس ہوگئی، اس میں مولانا کی ذات اور کویت کے رئیس کبیر شیخ عبداللہ علی المطوع کا استثناء ہے۔

اور اگر مولانا کا ایماء ہوتا تو بہت کچھ ہوسکتا تھا۔ یہی حال سعودی عرب کے عمائد، وزیروں سے ملنے کے وقت اور کسی نجی یا اجتماعی گفتگو میں رہا کبھی ایک اشارہ بھی چندہ کی طرف نہیں کیا، اگرچہ بعد میں جو ہوا مولانا ہی کے نام پر ہوا۔ اور ان اپیلوں کا اثر ہوا، جو کسی کے نام نہیں بلکہ عام مسلمانوں کے نام تھیں۔

یہ ایک رخ تھا، اہل دین اور علماء کے ساتھ معاملہ کا، دوسرا رخ یہ ہے کہ ملک عبداللہ بن حسین والئ اردن نے ایک رقم دی حضرت مولانا نے یہ رقم قبول کرنے سے عذر کیا تو ایوان شاہی کے بعض حضرات نے کہا کہ بادشاہ کا ہدیہ رد نہیں کیا جاتا تو آپ نے پوری رقم فلسطین فنڈ میں دے دی۔ جس کے شاہ عبداللہ صدر تھے۔ ملک فیصل ایوارڈ کی رقم مکہ مکرمہ میں قائم شدہ فنڈ برائے جہاد افغانستان کے لئے نصف، اور نصف مدرسہ صولتیہ اور تحفیظ القرآن کو دے دی، ایک پیسہ اپنے لئے قبول نہیں فرمایا۔(۱)

یہ اس شخص کے استغناء کا حال ہے جس کے بارے میں استاذ احمد عبدالغفور

---

(۱) اللہ تعالیٰ نے حضرت مولاناؒ کی عمر میں برکت عطا فرمائی آخر زندگی تک یہ سلسلہ جاری رہا۔ ۱۴۱۹ھ کے رمضان میں دبئی کے ولی عہد نے تجوید وقرأت میں ممتاز آنے والے قاریوں کو انعامات دینے کا سلسلہ شروع کیا اس میں ایک یہ کیا کہ وقت ۔ کے سب سے بڑے عالم دین (جس کو پوری دنیائے اسلام تسلیم کرتی ہو) کی خدمت میں ایک ہدیہ پیش کیا جائے چنانچہ ۱۴۱۸ھ مصر کے مشہور عالم ومفسر شیخ محمد الشعراوی کو یہ ہدیہ پیش کیا گیا اور ۱۴۱۹ھ میں مصر وشام، عراق، سعودی عرب، ملیزیا، انڈونیشیا اور خلیج کی ریاستوں کی یونیورسٹیز کے اساتذۂ فن کی کمیٹی نے حضرت مولانا علیہ الرحمہ کا نام اس ہدیہ کے لئے پیش کیا۔ حضرت علالت ونقاہت کی بناء پر رمضان المبارک کے مہینے میں سفر سے عذر کرتے رہے اور ادھر سے اصرار بڑھتا رہا، بالآخر مولانا تقی الدین مظاہری ندوی کی انتہائی کوشش سے حضرت مولانا راضی ہوگئے، وہاں ایک ملین درہم یعنی ایک کروڑ سترہ لاکھ روپیہ کا ہدیہ پیش کیا گیا، آپ نے اسی جلسہ میں اعلان کردیا کہ یہ رقم دینی تعلیم پر خرچ ہوگی اور جب رقم آئی تو اس کا ایک ایک پیسہ آپ نے دینی مدراس میں تقسیم کردیا۔

اس کے بعد برونائی (فارایسٹ) کے حاکم نے عالم اسلام کی سب سے بڑی شخصیت کے لئے ایک جائزہ دینا طے فرمایا حضرت مولانا وہاں تشریف نہیں لے گئے، وہاں کے وزیر تعلیم ایک وفد (باقی اگلے صفحہ پر)

عطار نے اپنی ریڈیائی تقریر میں کہا تھا کہ شیخ ابوالحسن کا لباس وزن اور قیمت دونوں کے لحاظ سے ہلکا ہوتا ہے۔(خفیف الوزن والثمن)ضرورت رہتے ہوئے استغناء کا یہ عالم اللہ تعالیٰ کے یہاں بھی مقبول ہے۔اوراس کے نیک بندوں کے یہاں بھی اس کی قیمت ہے۔اور یہ سب اسی عقلیت کا نتیجہ ہے جس کی تفصیل وتشریح اوپر کی جا چکی ہے۔

دارا و سکندر سے وہ مرد فقیر اولیٰ
ہو جس کی فقیری میں بوئے اسد اللہی

لیکن اس کا مطلب یہ بھی نہیں ہے کہ وہ مال سے نفرت رکھتے ہوں، یا اس سے الرجک ہوں، جب حضرت رائے پوریؒ کے یہاں تشریف لے جاتے تو وہ مولانا کو اصرار کے ساتھ کرایہ کی رقم دلوادیا کرتے تھے۔(روایت مولوی عبدالمنان صاحب مرحوم خادم حضرت رائے پوریؒ) جب دوسرے حج میں تشریف لے گئے ہیں جس میں حضرت رائے پوریؒ کا ساتھ تھا۔اور حج بدل تھا۔(حضرت شیخ الحدیثؒ کی ایک صاحبزادی کی طرف سے) جب حج ختم ہوگیا تو حضرت رائے پوریؒ نے کہا "بس اب شیخ کی ضیافت اور انتظام ختم ہوا،(اشارہ تھا کہ حج بدل کے سلسلہ میں جو اخراجات حضرت شیخ الحدیث نے دیئے تھے اس کا وقت ختم ہوا) اب تم ہمارے ساتھ رہو گے۔

(بقیہ حاشیہ صفحہ گزشتہ) کے ساتھ یہ جائزہ پیش کرنے آئے مگران کو لکھنؤ نہیں آنے دیا گیا فوراً حضرت مولانا کے بھانجے اور جانشین مولانا محمد رابع حسنی نے وہ ہدیہ دلی جا کر وصول کیا اس موقع پر راقم الحروف نے حضرت سے کہا کہ پہلے جو کروڑ روپیہ کی رقم آئی وہ آپ نے مدرسوں کے درمیان تقسیم فرمادی اب یہ رقم جو آئی ہے اس کو اپنے خاندان کے افراد میں تقسیم فرمادیں یہ لوگ بھی ضرورتمند ہیں، خاتون منزل جہاں ان کا قیام ہے وہاں سے رکشوں پر آتے ہیں اور اس کا کرایا اپنے پاس سے ادا کرتے ہیں حضرت نے تجویز قبول فرمائی مگر عملاً یہ ہوا کہ اپنے دور اور قریب کے تمام رشتہ داروں کے ساتھ خدام اور نیازمندوں کو بھی محروم نہیں رکھا، جن لوگوں کو اس رقم میں سے حصے ملے ان میں یہ خاکسار بھی ہے اور جناب مولانا عبدالکریم پاریکھ بھی ہیں اور دارالعلوم کے متعدد اساتذہ بھی۔

حضرت نے ہوائی جہاز سے مدینہ منورہ کے سفر کا فیصلہ فرمایا اور مولانا کا ٹکٹ اپنی طرف سے لیا۔

مدرسہ صولتیہ میں مولانا حکیم محمد یامین صاحب مولانا شمیم صاحب مرحوم کے پھوپھا مقیم تھے اور مدرسہ کی خدمات بھی ان کے سپرد تھیں، مدرسہ کے کتب خانہ کے نگراں تھے، انھوں نے پانچ ریال ایک لفافہ میں بند کر کے دیئے اور لکھا کہ اخلاص کے آنسو سے بسایا ہوا یہ ہدیہ قبول کریں، مولانا نے بہت شکر گذاری کے ساتھ قبول فرمایا۔

مولانا کے اس اصول استغناء سے ایک نازک صورت حال خدام ندوہ کو پیش آئی۔ سب جانتے ہیں کہ ندوہ اب نام ہے حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی مدظلہٗ کے وجود مبارک کا۔ اس کی ساری رونق اور بہار آپ ہی کے دم سے ہے۔ اندرون ملک میں یا باہر سے بھی مدرسہ کو چندہ آپ کی نسبت سے ملتا ہے اور مل سکتا ہے۔ مولانا اپنے کسی سفر میں ضمنی طور پر بھی اس کے لئے تیار نہیں ہوئے کہ چندہ کی کوئی بات کریں۔ ادھر مدرسہ کی ضرورت روز افزوں، مولانا معین اللہ صاحب ندویؒ کویت میں شریک سفر تھے۔ وہ کب خاموش رہنے والے تھے، حضرت مولانا کی موجودگی میں جو چندہ مل سکتا تھا وہ بعد میں نہیں مل سکتا تھا۔ مولانا معین اللہ صاحب نے اس کی طرف توجہ کی۔ اور ان کو کرنا چاہئے تھا، مگر مولانا کے مزاج کے خلاف تھا۔ مولانا معین اللہ صاحب عتاب کے شکار ہو گئے۔ مولانا نے ایک دو روز بات کرنا چھوڑ دی۔



داستان جذب وانجذاب

مولانا کی دلچسپی کا سب سے بڑا مشغلہ درس وتدریس رہا ہے، یا تصنیف و تالیف، جب دارالعلوم موسم گرمایا رمضان کی تعطیل میں بند ہوتا تو آپ ایک خلا محسوس فرماتے تھے۔اور تعطیل کی خوشی نہیں بلکہ طبیعت میں افسردگی پیدا ہوجایا کرتی تھی۔ ایک عرصہ تک کے لئے تدریس اور طلبہ سے جدا ہونے کا آپ کو ملال رہتا، راقم نے مولانا سے تین سال پڑھا ہے، ان تین برسوں میں مولانا کی طرف سے سوائے علالت کے کبھی سبق ناغہ نہیں ہوا۔ ہماری جماعت کے طلبہ مانوس تھے اور مولانا کو اپنے مضامین سے شغف تھا۔ میں جس زمانہ میں دارالعلوم میں داخل ہوا تھا، اس کی تفصیل گذشتہ صفحات میں آچکی ہے۔ یہ وہ زمانہ تھا جب مولانا کو مولانا مودودی کی تحریروں سے انس ہوا اور ان کا انداز تحریر اور مسائل کی تحلیل کا قدرتی ملکہ باعث کشش ہوا۔اور ایک مولانا پر کیا موقوف ہے، اس وقت کے معروف ومشہور علماء جیسے مولانا مناظر احسن گیلانی، علامہ سید سلیمان ندوی اور حضرت شیخ الحدیث مولانا محمد زکریا مہاجر مدنی رحمۃ اللہ علیہ (۱) ان کی کتابیں پڑھنے کی ترغیب دیا کرتے تھے۔اس وقت مولانا مودودی کے تفردات ظاہر نہیں ہوئے تھے اور نہ علماء سلف کی تقلیل شان کا اظہار

(۱) حضرت شیخ الحدیثؒ سے بلاواسطہ میں نے خود یہ بات سنی ہے۔مولانا مودودی سے اپنی بیزاری کا ذکر فرماتے ہوئے ارشاد فرمایا کہ شروع میں میں خود لوگوں کو ان کی کتابیں پڑھنے کی تاکید کرتا تھا۔

ہوا تھا۔ بہر حال یہاں حضرت مولانا سید ابوالحسن علی حسنی رحمہ اللہ علیہ کا ذکر کر رہا ہوں ،آپ مولانا مودودی اوران کی تحریک اسلامی سے ذہنی طور پر ہم آہنگ تھے، اسلام پر مغربی مصنفین کے پے بہ پے حملے ،اور یہود و نصاریٰ کے بہتان اور ان کی سازشوں کو کھول کر بیان کرنا اور اسلام کی طرف سے مدافعت کا جچا تلا انداز مولانا کو پسند آیا۔ پھر یہ تعلق کیوں اور کس طرح مضمحل ہو کر ختم ہوا اس کی تفصیل ''کاروان زندگی'' کے پہلے حصہ میں موجود ہے۔ اور اس کے دہرانے کی ضرورت نہیں ہے۔ البتہ میرے موضوع سے متعلق یہ بات ضرور قابل ذکر ہے کہ جماعت اسلامی سے عین تعلق کے زمانہ میں بھی مولانا نے تدریس نہیں چھوڑی اور نہ طویل رخصتیں لیں۔

لیکن اس عاجز اور اس کے ساتھیوں نے (جس میں مولانا سید وصی مظہر ندوی سابق وزیر امور پاکستان) مولانا مجیب اللہ ندوی ناظم مدرسہ جامعۃ الرشاد اعظم گڈھ، محمد شبیر صاحب ندویؒ (جامعہ ملیہ) (۱) میں سے جو مولانا کے اندر ایک محسوس تبدیلی اس وقت دیکھی جب آپ کا تعلق حضرت مولانا محمد الیاس رحمۃ اللہ علیہ سے ہوا۔ جیسے کسی غیبی طاقت نے ان کے کان میں کہہ دیا ہو۔

بر درِ مدرسہ تا چند نشینی حافظ   خیز تا از درِ میخانہ کشادے طلبیم

اب مدرسہ سے مولانا کا دل اچاٹ ہونے لگا، ایسا لگتا تھا۔

سودا جواب ہے سر میں وہ سودا ہی اور ہے

جب ہم لوگ درجہ ہشتم میں پہونچے اور امید تھی کہ الفوز الکبیر مولانا کے یہاں ہوگی، وہ تبلیغی جماعت کے لئے یکسو ہو چکے تھے۔ تبلیغی جماعت میں شرکت پورے جوش اور قوت کے ساتھ تھی، لیکن اس جوش اور قوت کا سر چشمہ حضرت مولانا محمد الیاس رحمۃ اللہ علیہ کی ذات تھی۔ مولانا کو دین پر جان دینے کی دھن اور دین کے

---

(۱) ۷؍ ذی الحجہ ۱۴۲۱ھ کو انتقال ہو گیا رحمۃ اللہ علیہ

لئے سب کچھ قربان کرنے کا جذبہ طبیعت کا خاصہ اور شخصیت کی پہچان کے درجہ میں تھا۔ لیکن دعوت کے اس اسلوب خاص کی طرف میلان حضرت دہلوی کی روحانی گرفت کا نتیجہ تھا، اگر چہ مولانا کو حضرت دہلوی سے ملنے سے پہلے تبلیغی مشن کے سلسلہ میں معلومات مولانا مودودی کے مضمون ''ایک اہم دینی تحریک'' کے ذریعہ ہو چکی تھی۔ اور یہ بھی اتفاق کی بات ہے کہ حضرت دہلوی سے پہلی ملاقات سے قبل میوات کے ضلع نوح میں گوڑ گاؤں کے اجتماع میں شرکت کر چکے تھے۔ تاہم جماعت میں انہماک کے ساتھ شرکت حضرت دہلویؒ کی کشش کا نتیجہ تھا۔ مولانا کو اس عظیم کام نے نہیں بلکہ اس عظیم کام کے داعی نے اپنی طرف کھینچا تھا۔ مولانا کے اندر جوش و سرمستی کی کیفیت اور والہانہ وارفتگی کا سرچشمہ حضرت دہلویؒ (مولانا محمد الیاس قدس سرہ) کی قوت جذب تھی۔ درحقیقت فطرت سلیمہ اور استعداد تام پہلے سے موجود تھی۔ قرآن اور سیرت نبوی پر ذہنی وفکری نشو ونما، والدہ ماجدہ اور برادر عالی مقام کی تربیت، شوق جہاد کا خون کے ذرات میں شامل ہونا، ضمیر و زبان کی پاکی، علو ہمت اور بلند حوصلگی، تعمیری اور خیر پسند ذہانت وعقلیت نے مزاج وافتاد طبع کو جس سانچے میں ڈھال دیا تھا، اس کو حضرت مولانا محمد الیاسؒ نے اپنی نظر کیمیا اثر سے اور تابناک بنا دیا اور اللہ تعالیٰ کی مشیت نے جو وقت مقرر کر دیا تھا اس مقررہ وقت میں یہ شعلہ بھڑک اٹھا۔ ہم طلبہ کو جو حقیقت حال یا قدرت کے اس سربستہ راز سے اس وقت تک واقف نہیں تھے، یہی نظر آ رہا تھا کہ مولانا کے اندر ایک غیر معمولی تبدیلی آ گئی ہے۔ اور اس تبدیلی کا سبب جماعت تبلیغ (نظام الدین) سے ذہنی وطبعی وابستگی اور انہماک ہے۔ اس وقت اتنی سمجھ نہیں تھی کہ اس پر غور کرتے کہ

آیا کہاں سے نالۂ نَے میں سرورِ مے
اصل اسکی نَے نواز کا دل ہے کہ چوب نَے؟

یہ بات بعد میں کھلی کہ ''چوب نے'' نہیں یہ ''نے نواز کا دل'' تھا جس نے اپنے جذب کامل کا تماشا دکھایا۔

وہ حضرت دہلویؒ سے تعلق کے بعد جب ندوہ واپس آئے تو تقریر کا موضوع اور نجی و عام مجلسوں میں گفتگو کا موضوع ''زندہ اور چلتا پھرتا اسلام'' ''سنت نبوی کی عملی شکل'' ہوتا تھا۔ یہاں تک کہ یہ جملے مولانا کے حوالے سے لوگ نقل کرتے۔

حضرت دہلویؒ سے تعلق جو بڑھا تو جذب و انجذاب کی تمام روایتیں تازہ ہو گئیں جن کا بزرگان سلف (صوفیائے کرام) کے حالات میں ذکر ملتا ہے۔ لکھنؤ سے دہلی جاتے تو غازی آباد اسٹیشن ہی سے ایک بے تابی شروع ہو جاتی اور وہ کیفیت جس کو عربی میں استبطاء کہتے ہیں یعنی یہ احساس کہ وقت بہت دیر میں گذر رہا ہے پیدا ہو جاتی۔

ایک تبلیغی قافلہ جس میں چند طلبہ کے ساتھ یہ ناچیز طالب علم بھی تھا اسٹیشن (دہلی) پر اس شان سے اترا کہ سب کے ہاتھ اور کاندھوں پر اپنا سامان اور بستر تھا۔ نظام الدین جانے کے لئے کوئی تانگہ نہیں مل رہا تھا اور اگر ایک ملا بھی تو کرایہ معمول سے بہت زیادہ طلب کر رہا تھا، امیر قافلہ مولانا تھے، آپ کے لئے انتظار کی گھڑیاں سوہان روح بن رہی تھی۔ تانگوں کے انتظار میں اسٹیشن پر کھڑے رہنا مشکل ہو گیا چنانچہ پیدل ہی چل پڑے اور محسوس طریقہ پر بڑی سرعت کے ساتھ راستہ کٹ گیا، مولانا پر بھی تکان کا کوئی اثر نہیں تھا۔ بنگلہ والی مسجد میں داخل ہوئے تو صحن مسجد میں حضرت دہلویؒ کھڑے تھے، مولانا سے معانقہ کیا۔ معانقہ بھی میرے لئے نئے قسم کا تھا۔ عام طور پر عید بقر عید میں، ہم نے بھی معانقے کئے ہیں، مگر سیکنڈ دو سکنڈ سے زیادہ بغلگیر ہوتے ہوئے کسی کو نہیں دیکھا تھا مگر یہاں تو معانقہ میں ایک امتداد تھا۔ گھڑی تو نہیں دیکھی تھی، مگر اندازہ یہ ہے کہ پانچ چھ منٹوں سے کم مدت نہیں ہوگی کہ حضرت دہلویؒ مولانا سے

معانق رہے۔ حضرت دہلویؒ کچھ بول رہے تھے، یا پڑھ رہے تھے، یاد پڑتا ہے کہ دوران معانقہ آپ کی زبان سے کچھ الفاظ بھی نکل رہے تھے، پھر ہم لوگوں کی باری آئی، حضرت نے ہر ایک کو شرف معانقہ بخشا، جیسا کہ عام طور پر معانقہ ہوتا ہے، بہتر ہوگا کہ داستان جذب و مستی کو بیان کرنے کے لیے کاروان زندگی سے چند سطریں نقل کریں۔

مولانا نے تفصیل سے یہ بتایا ہے کہ حضرت دہلویؒ کا نام پہلے کس سے سنا، پھر واقفیت کے کیا ذرائع ہوئے۔ "مولانا محمد منظور صاحب نعمانی" (۱) اور ماسٹر عبد الواحد صاحب" کے ہمراہ اسلامی مرکز دعوت و تعلیم کو دیکھتے ہوئے نظام الدین پہونچے، وہاں حضرت دہلویؒ موجود نہ تھے، اس لئے مولانا احتشام الحسن صاحب کاندھلویؒ جو مرکز کی رہنمائی اور خدمت کرتے تھے انھوں نے مولانا اور ماسٹر عبد الواحد صاحب کو میوات جانے کا مشورہ دیا۔ ان حضرات کو پھر دہلی آنا تھا، میوات کے قصبہ نوح میں تبلیغی اجتماع تھا، اس اجتماع میں شرکت کے بعد مولانا اپنے رفقاء کے ساتھ دہلی آگئے، مگر ابھی نظام الدین نہیں آئے تھے۔ کیونکہ حاجی عبد الواحد صاحب کو اپنے ایک ہندو دوست سے دہلی میں ملنا تھا۔ مولانا ان کے ساتھ تھے۔ حاجی صاحب اپنے پرانے دوست کے ساتھ گفتگو میں منہمک تھے، مولانا ان لمحات کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ:

"جس وقت حاجی صاحب اپنے دوست کے ساتھ گفتگو میں منہمک تھے اس کی وجہ سے نظام الدین جانے میں تاخیر ہورہی تھی۔ میرے اندر بے چینی کی ایک مبہم لیکن طاقتور کیفیت پیدا ہوئی اور ایسا مغلوب ہوا کہ قریب تھا کہ دیوانہ وار دروازہ کھول کر نظام الدین کی طرف دوڑ پڑوں، اس کے ساتھ دعا و انابت کی بھی ایک ایسی حالت پیدا ہوئی جو کبھی برسوں میں اور خاص روحانی فضا میں پیدا ہوتی ہے۔ میں نے

---

(۱) مولانا نعمانیؒ جو اس قافلہ کے امیر تھے نوح کے اجتماع کے بعد کسی سخت نجی ضرورت کی بناء پر واپس تشریف لے گئے تھے

اپنے آپ کو بہت سنبھالا کہ کہیں یہ نہ سمجھا جائے کہ مجھ پر دماغی دورہ پڑا ہے۔ اللہ اللہ کر کے وہ گفتگو اور ملاقات سے فارغ ہوئے اور ہم دونوں نظام الدین پہونچے۔
ہمارے پہونچنے کے کچھ دیر بعد مولانا تشریف لائے۔ اور اس شفقت اور گرم جوشی سے ملے جیسے برسوں کی جان پہچان تھی یا انتظار ہی میں تھے، خاص طور پر جب ان کو معلوم ہوا کہ میں سیرت سید احمد شہید کا مصنف ہوں، اور میرا صاحب سیرت سے خاندانی تعلق ہے تو شفقت و محبت اور یگانگت میں اور اضافہ ہوا۔ سب سے پہلی چیز جس نے ہم لوگوں کو (۱) متاثر کیا اور جس کا کم سے کم مجھے اپنی عمر میں پہلا تجربہ ہوا، وہ مولانا کی شفقت اور جذب دل کی خاص کیفیت تھی، پہلی ملاقات کے باوجود کہیں سے بھی کوئی اجنبیت، تکلف اور اپنی ذات اور مرتبے کا احساس نظر نہیں آتا تھا۔ دوسرے دن صبح کی مجلس میں بھی وہی دل نوازی کی شان تھی، جو روبہ ترقی تھی۔ میری رخصت کے دن جو میں نے دارالعلوم سے لی تھی، ختم ہو رہے تھے، دوسرے یا تیسرے دن مجھے واپس ہونا تھا، مولانا نے روانگی کے وقت ایسی طویل اور اثر میں ڈوبی ہوئی دعا کی جس سے دل و دماغ متاثر ہوئے اور دوبارہ اور جلد حاضری کا عزم پختہ ہوا۔ مولانا نے غالباً اسی قیام کے زمانہ میں فرمایا کہ مولانا! میں نے آپ کی کتاب (سیرت سید احمد شہیدؒ) پڑھی لیکن اس سے میری معلومات میں کچھ اضافہ نہیں ہوا۔ میں اپنے خاندان کی بیبیوں اور بزرگوں سے اس سے زیادہ سن چکا ہوں۔ بات پر بات یاد آتی ہے۔ ایک مرتبہ میں مسجد کے بالائی حصے میں ٹھہرا ہوا تھا، جہاں صاحبزادہ گرامی مولانا محمد یوسف صاحب کا قیام رہتا تھا۔ مولانا چائے کی ایک پیالی ہاتھ میں لے کر تشریف لائے، میری طرف پیالی بڑھاتے ہوئے فرمایا کہ مولانا! ابھی تک ہم لوگ حضرت سید صاحب

---

(۱) صیغۂ ''انا'' سے اجتناب کی یہ بھی ایک مثال ہے، کہنا یہ چاہتے ہیں کہ جس نے ''مجھ کو'' مگر ہم لوگوں کہہ کر عمومیت دے دی، یہ مولانا کا مزاج ہر جگہ نمایاں ہے۔

کی تجدید کے سایہ ہی میں ہیں، میں لکھنؤ آ گیا لیکن دل کا حال وہ تھا جو شاعر نے بیان کیا ہے۔

''دیرینہ سال پیرے بروش بہ یک نگاہے'' (۱)

مولانا کی ذہانت جب اس راہ پر چل پڑی تو جماعت (تبلیغ) کے ان عمائد میں آپ کا شمار ہونے لگا جو برسہابرس کے ریاض و جہد کا طالب تھا۔

منزل عشق بسے دور دراز است و لے

طے شود جادۂ صد سالہ بہ آہے گاہے

کا منظر سامنے آ گیا، حضرت دہلویؒ کا جذب اور مولانا کا انجذاب بڑھتا رہا، بڑھتا گیا رہا ہر لمحہ ہزاروں میل کی مسافت طے کرنے لگا، حضرت دہلویؒ ایک مرشد کامل اور رسم و راہ منزل کے آشنا تھے، وہ جانتے تھے کہ کس سے کیا کام لیا جائے اور کون کس کام کا اہل ہے۔ مولانا کو وہ اس وقت خاص طور پر بلاتے جب علماء و مشائخ سے بات کرنا ہوتی، دانشوروں اور عصری تعلیم کے حاملین سے گفتگو کرنا آسان تھا، مگر علماء و مشائخ جن میں اکثریت ان حضرات کی تھی جن کے اندر دین فہمی کا پندار تھا۔ ان سے بات کرنے کے لئے ایسی صلاحیت کی ضرورت تھی جو موتیوں میں سوراخ کرنے والے جوہری میں ہونا چاہئے۔ ان کے مقام کا لحاظ، ان کے پندار کا احترام، ان کی نازک مزاجی کا لحاظ رکھنا اور یہ جاننا کہ اگر ان کو کسی آیت یا حدیث کا حوالہ دیجئے تو وہ بول اٹھیں گے کہ یہ تو معلوم ہے، آپ اپنی بات کیجئے بہر حال ان نازک آبگینوں کو ٹھیس لگائے بغیر دعوت و تبلیغ کی اہمیت اور اس کے طریقہ کار کی افادیت کو ذہن نشین کرانا بہت نازک اور اہم کام تھا۔ جس کے لئے حضرت دہلویؒ نے مولانا کا انتخاب کیا، اور حضرت دہلوی کی توقعات کو بجا طور پر پورا کیا، بلاشبہ اس میں حضرت دہلوی کی قلبی

(۱) کاروان زندگی جلد اول، ص ۲۸۱۔ طبع دوم

توجہات کا اثر بھی ہوگا۔

مولانا کے تبلیغ ودعوت میں لگ جانے کی وجہ سے لکھنؤ کے مسلم اعیان اور حکومت کے اعلیٰ عہدہ دار اور اطراف لکھنؤ رحیم آباد ہسند یلہ وغیرہ کے باحیثیت اور سربرآوردہ اشخاص بھی اس کام کی طرف مائل ہوئے اور زور وشور سے اس کے جلسے ہونے لگے۔ جماعتیں نکلنے لگیں۔ ان اجتماعات میں مولانا نے جو تقریریں کیں وہ آئندہ پیش آنے والی منزلوں میں بھی کام آئیں، ان کے عربی ترجمے ہوئے جیسے ''صورت وحقیقت کا فرق''، ''آنکھوں کی سوئیاں''، ''خطرناک تکبر'' اور اس طرح کی تقریروں کے عربی ترجمے عرب علماء میں بھی مقبول ہوئے۔

حضرت دہلویؒ سے تعلق کے معاً بعد حضرت شیخ الحدیث مولانا محمد زکریا مہاجر مدنی نور اللہ مرقدہ سے تعلق قائم ہوا، مولانا ایک نیاز مند اور خرد کی طرح شیخ سے ملتے اور ان کی مجلس میں حاضری دیتے، اور حضرت شیخ اپنے عزیز ترین افراد کے ساتھ جو شفقت ومحبت رکھتے وہی تعلق مولانا سے کرتے بلکہ بسا اوقات اس سے بھی بڑھ کر معاملہ فرماتے جیسے اپنی سطح کے بزرگوں سے معاملہ فرماتے تھے۔ خطوط میں ''مخدوم ومکرم'' جیسے الفاظ سے خطاب کرنا خود حضرت شیخ کی عظمت کی دلیل اور خاصان خدا کے تواضع وانکسار کا انداز ہے۔ لیکن کچھ اور باتیں بھی مشاہدہ میں آئیں جن سے اندازہ ہوتا ہے کہ حضرت شیخ رحمۃ اللہ علیہ مولانا کو کس نظر سے دیکھتے تھے۔

ربیع الاول ۱۳۷۳ھ میں جب حضرت شیخ حج کے لئے تشریف لے گئے تھے اور مستقل قیام کی نیت تھی، مکہ مکرمہ میں قیام تھا اور تین چار روز رہ چکے تھے۔ مزید ایک ہفتہ قیام کا ارادہ فرما چکے تھے کہ بعد مغرب راقم عاجز نے حضرت کو خبر دی کہ حضرت مولانا علی میاں رحمہ اللہ علیہ مدینہ منورہ میں آچکے ہیں۔ آپ نے اسی وقت مکہ مکرمہ کے قیام کو مختصر کر کے مدینہ منورہ کا قصد فرمالیا اور یہ فرمایا کہ مدینہ منورہ میں

علی میاں تنہا ہیں میں جارہا ہوں۔

حضرت شیخ کی ایک کرامت بھی قابل ذکر ہے ۱۳۸۹ھ میں حضرت شیخ نے مولانا سے دریافت فرمایا کہ کیا اس سفر میں رفاقت ممکن ہے؟ چونکہ مولانا جامعہ اسلامیہ مدینہ منورہ کے رکن انتظامی ہونے کی وجہ سے تقریباً ہر سال شرکت فرمایا کرتے تھے، اس لئے حضرت شیخ نے یہ سوال کیا تھا۔ مولانا نے جواب دیا ابھی تک وہاں حاضری کی کوئی تقریب پیدا نہیں ہوئی ہے، مگر جب سہارنپور سے لکھنؤ آئے تو یہاں جامعہ اسلامیہ کا دعوت نامہ آچکا تھا۔ حضرت کو اس کی اطلاع دی۔ آپ نے مسرت کا اظہار فرمایا اور سفر میں ساتھ رہے۔

ایک مجلس میں حضرت شیخ نے ناچیز سے پوچھا کہ تم نے علی میاں کو بلانے میں کوشش کی ہوگی؟ عرض کیا: حضرت میں کیا کوشش کرسکتا ہوں وہ حکومت کی طرف سے بلائے جاتے ہیں یونیورسٹی سے دعوت نامہ اور ٹکٹ جایا کرتا ہے۔ فرمایا: کچھ تو کہا سنا ہوگا۔ عرض کیا! حضرت مجھے کچھ بھی معلوم نہ تھا، یہ تو حضرت کی کرامت ہوئی کہ آپ کی تشریف آوری کے وقت یہاں جامعہ کی انتظامیہ کا جلسہ ہورہا ہے۔ اس پر حضرت سر جھکا کر زیرلب مسکرائے۔

مولانا کو حضرت مولانا شاہ عبدالقادر رائے پوری کی طرف رجوع کرانے والے بھی حضرت شیخ ہی تھے۔ حضرت رائے پوری اور حضرت شیخ الحدیث کے درمیان وہ احترام متبادل تھا، یا باہمی بزرگ داشت کا تعلق کہ یہ فیصلہ نہیں کیا جاسکتا تھا کہ ان میں واقعی خرد کون اور بزرگ کون! اللہ تعالیٰ نے مولانا کو یہ سعادت بخشی کہ آپ دونوں کے منظور نظر رہے۔

حضرت رائے پوری رحمۃ اللہ علیہ جو مولانا کے پیرو مرشد تھے اور حضرت مولانا احمد علی صاحب لاہوریؒ کے بعد جن کی طرف آپ نے رجوع کیا اور آپ کے خلیفہ

ہوئے، ان کی شفقت کا حال کاروان زندگی کی ان چند سطروں سے معلوم ہوگا۔

"نماز کے اوقات میں حضرت کا قیام حرم شریف کے ایک خیمہ میں رہتا تھا۔ دوپہر کا کھانا بھی وہیں تناول فرماتے تھے، میں تبلیغی اجتماعات اور علماء وخواص کی ملاقاتوں میں ایسا منہمک رہتا کہ اکثر کھانے کے وقت دیر سے حاضری ہوتی۔ خیمے میں قدم رکھتا تو دیکھتا کہ حضرت بیٹھے ہوئے ہیں، سامنے رومال میں روٹیاں لپٹی ہوئی رکھی ہیں، مجھ کو دیکھ کر فرماتے علی میاں! تم کو کھانے کا بھی ہوش نہیں، یہ دیکھو میں تمہارے لئے چپاتیاں لئے بیٹھا ہوں کہ خمیری روٹی تم کو نقصان کرتی ہے۔

۲۰ رمحرم ۱۳۷۰ھ (۲ رنومبر ۱۹۵۰ء) کو حضرت کی مع اپنے رائے پوری رفقاء وخدام محمدی جہاز سے روانگی ہوئی مجھے حجاز میں قیام کرنا تھا اور کچھ مصر کے سفر کی نیت تھی، اس لئے واپسی کے سفر میں ہمرکابی نہیں رہی۔ ہم لوگوں نے جدہ کی بندرگاہ پر حضرت کو رخصت کیا، قدیم دستور کے مطابق حضرت ایک موٹر لانچ میں بیٹھ کر جہاز کے لئے روانہ ہوئے جو فاصلہ پر ٹھہرتا تھا۔ حضرت کے ایک خاص خادم راؤ حاجی فضل الرحمٰن خاں رائے پوری بیان کرتے ہیں کہ جب تک تمہاری صورت اوجھل نہیں ہوئی حضرت موٹر لانچ پر سے برابر تم کو دیکھتے رہے۔" (۱)



---

(۱) کاروان زندگی جلد اول، صفحہ ۳۵۷۔ طبع دوم

خلق سے تعلق خالق کی رضا کے لئے

قلبی تعلقات میں توازن اور اسوۂ نبوی کے سانچے میں ڈھلا ہوا مزاج اہل اللہ کی خاص پہچان ہے اللہ نے انسان کو گوشت پوست کا جسم دیا ہے۔اس کے اندر محبت اور کشش کا مادہ عطا کیا ہے۔اس کے اندر نرمی اور گداز بھی ہے انسانِ کامل رسول مقبول صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات گرامی تھی ،جن کے اندر پوری انسانیت کا درد تھا،اور اس کے ساتھ بشریت تامہ بھی آپ کے اندر موجود تھی۔اپنی صاحبزادیوں، نواسوں اور ازواج مطہرات ہر ایک کا پورا پورا حصہ بغیر کسی کمی وبیشی کے آپ نے عطا فرمایا۔اس کے ساتھ صحابۂ کرام انصار ومہاجرین سے تعلق میں کمی نہیں آئی۔ سیرت نبوی صلی اللہ علیہ وسلم کے مختلف ابواب کو یکجا کر کے دیکھا جائے تو محسوس ہوتا ہے کہ آپ نے مختلف مواقع پر اپنے خاندان کے افراد جیسے کہ حضرت فاطمہؓ، حضرات حسنین سے شفقت ومحبت کا اظہار مختلف انداز میں فرمایا۔اور ایسا ہی برتاؤ بھی کیا۔دوسری طرف صحابہ کرامؓ کی نصرت اور دین کے لئے ان کی جانثاری کے اعتراف میں کوئی کمی نہیں کی ، یہ دراصل اللہ کی طرف سے ودیعت کی ہوئی بشری خصوصیت ہے جس کا اعلاترین نمونہ حضورا کرم صلی اللہ علیہ وسلم کی حیات طیبہ میں ملتا ہے، ہمارے ممدوح حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی رحمۃ اللہ علیہ کی زندگی کا

قریب سے مطالعہ کرنے سے اندازہ ہوتا ہے یہی توازن جوسنت نبوی کا خاصہ ہے آپ کو عطا ہوا، جس میں کسی تصنع یا دکھاوے کا عنصر شامل نہیں ہے، یہ بات سب کو معلوم ہے کہ اللہ کی یہی مصلحت تھی کہ بہت سے انبیاء وصالحین کی طرح آپ کو صلبی اولاد نہیں عطا کی گئی، لیکن شفقت پدری کا خانہ مفقود نہیں ہوا۔ اور نہ بڑوں کی عزت واحترام میں کوتاہی ہوئی، مولانا نے اپنے والد ماجد کے بعد اپنی والدہ ماجدہ کے اشاروں پر اپنی پوری زندگی کی تعمیر کی۔ ان کے کہنے کے مطابق عصری تعلیم سے منھ موڑ کر دینی تعلیم حاصل کی، اور اہل اللہ کو اپنا مقتدا اور نمونہ بنایا۔ جس کی تفصیل ''کاروان زندگی'' کے پہلے حصہ میں موجود ہے۔ جب تک وہ زندہ رہیں، مولانا کبھی باہر جاتے تو ان سے اجازت طلب کرتے، سفر سے واپس آتے تو ان کی خدمت میں حاضر ہوتے۔ والدہ صاحبہ کے بعد سب سے بڑی شخصیت آپ کے برادر معظم حضرت مولانا ڈاکٹر عبدالعلی صاحبؒ کی تھی، جنھوں نے آپ کی تربیت اسی انداز پر کی جس انداز پر اگر والد ماجد زندہ ہوتے تو کرتے، مولانا کی تحریر میں تقریر میں آپسی گفتگو میں ایک بار نہیں بار ہا اس کا ذکر سنا۔

ڈاکٹر صاحب کے بعد مولانا کی محبتوں کا مرکز اور شفقت پدری کا خانہ پر کرنے والی ذات محمد میاں مرحوم کی تھی۔ جو حضرت مولانا کے مزاج وافتاد میں ان کا نقشِ ثانی تھے۔ تحریر میں تقریر میں، سوچنے کے انداز، یہاں تک رسم الخط میں، وہ مولانا کے مثنیٰ تھے۔ اگر ان کی زندگی وفا کرتی تو وہ عالم اسلام میں آفتاب و ماہتاب بن کر چمکتے۔ ان کی کم عمری کے لکھے ہوئے مقالات جب عرب ممالک کے رسائل واخبار میں نقل ہوئے تو لوگوں نے یہ سمجھا کہ کسی سن رسیدہ، تجربہ کار صاحب قلم کی تحریر ہے۔ جس کے دل میں ملت کا درد اور اسلام کا غم ہے۔ یہ خدا ساز بات تھی کہ عین نوجوانی میں یعنی صرف ۴۴ سال کی عمر میں وہ دنیا سے رخصت ہو گئے، جس غم کو سن کر غیر اور

دور کے لوگ بھی لرز گئے۔اس کا اثر خود مولانا پر کیا پڑا اس کا صرف اللہ ہی کو علم ہے۔

دوسرا حادثہ مولانا کی زندگی میں مولانا محمد ثانی مرحوم کا ہوا جن کے متعلق میں اپنی اس کتاب کے شروع میں لکھ چکا ہوں۔اب اللہ رکھے آپ کے صرف دو بھانجے رہ گئے ہیں، وہ آپ کی تربیت کا بہترین نمونہ ہیں، اخلاق وآداب، ضبط نفس، صبر وشکر اور زبان پر قابو رکھنے میں حضرت مولانا کا نقش ثانی ہیں ایک زخم خوردہ دل جس کی نگاہوں کے سامنے اس کے دل کے ٹکڑے ہونہار بھتیجے اور خاندان کے بیش بہا فرد اٹھ چکے ہوں اب اس کے سامنے جو فرد خاندان رہ گئے ہیں، ان کی طرف شفقت وگرویدگی قدرتی بات ہے بلکہ میں تو یہ عرض کرتا ہوں کہ جوہر انسانیت اور بشریت تامہ کا عکس خاص طور پر حضرت مولانا کے ضعف اور پیری میں جوان کے لئے عصائے پیری ہو سکے وہ یہی عزیز ہیں۔اور اللہ رکھے ان کی اولادیں ہیں، مولانا محمد میاں مرحوم کے صاحبزادگان جو ماشاءاللہ علم وفہم کے ساتھ تواضع وملنساری میں اپنے والد مرحوم کے نمونہ ہیں۔ان میں اگر کوئی تھوڑی دیر کے لئے بھی نظر سے اوجھل ہو جائے تو مولانا کو فکر لاحق ہو جاتی ہے۔

چنانچہ ایک سال حج کے موقع پر حمزہ میاں (مولانا محمد سید حمزہ حسنی ابن مولانا سید محمد ثانی حسنی مرحوم) شریک سفر تھے۔ایک شب حرم شریف سے ان کو اپنی قیام گاہ پر واپس آنے میں تاخیر ہوگئی تو وہ چند گھنٹے مولانا کے لئے بے تابی اور پریشانی کے امتحان کا وقت ثابت ہوا، ہر چند منٹ کے بعد دریافت فرماتے کہ حمزہ آئے کہ نہیں۔حضرت کے کئی خادم زادے حرم سے قیام گاہ تک کا راستہ ناپتے رہے مگر لاکھوں کے انبوہ میں ایک فرد کو حاصل کر لینا کچھ آسان نہ تھا، پھر خدا خدا کر کے جب وہ آئے تو مولانا کو سکون ملا اور دلی خوشی ہوئی، اور چند گھنٹوں کے لئے آرام کر سکے۔

سعودی عرب کے ایک سابق وزیرِ حج نے ایک مشہور ہندوستانی بزرگ

کی فرمائش پر ہندوستان کے مشاہیر علماء کو مدعو کرنے کی اجازت دی تھی اور انھوں نے اپنی نظر میں جن لوگوں کو اس کا اہل سمجھا اور جو واقعی مستحق تھے ان کو حج کرایا اس سلسلہ میں دو مرتبہ رابع میاں (مولانا سید محمد رابع حسنی ندوی حال ناظم ندوۃ العلماء) کو دعوت دی گئی لیکن حضرت مولانا نے اجازت نہیں دی، راقم دخل در معقولات اور گستاخی کا عادی رہا ہے۔ حضرت سے پوچھا کہ جب یہ موقع مل رہا ہے تو ان کو کیوں اجازت نہیں دی جا رہی ہے۔؟ مولانا نے فرمایا ہم لوگ خاندانی طور پر دل کے کمزور ہیں ان کے جانے سے جو مجھے گھبراہٹ رہے گی، وہ بہت زیادہ تکلیف دہ ہوگی۔

ادھر کئی سالوں سے اگر دستر خوان پر آنے میں ان دونوں حضرات سے تاخیر ہو گئی تو بار بار دریافت فرماتے کہ رابع کہاں ہیں؟ واضح کدھر گئے؟ راقم کے نزدیک حضرت مولانا کی اس بے چینی کی توجیہہ صرف یہی ہے کہ ایک زخم خوردہ کمزور دل، جس کے خاندان میں اب یہی دو امیدوں کی آماجگاہ ہیں اور جو پدری شفقت کا خانہ پر کئے ہوئے ہیں۔ حضرت مولانا کی بشری کیفیت کا مظہر ہیں، لیکن اس کے یہ معنی نہیں ہیں کہ مولانا دوسروں سے غافل ہیں۔ خود ان کی اولادیں محمد میاں کے صاحبزادے جو ماشاء اللہ ہر طرح سے نمونہ سلف ہیں، جن کی محبت و شفقت پورے توازن کے ساتھ حضرت کے دل میں ہے مگر وہ لوگ چونکہ ایک ساتھ نہیں رہتے اس لئے ان سے قلبی تعلق مکمل ہونے کے باوجود یہ بے چینی نہیں دیکھی جاتی دوسرے خدام جو مولانا کے گرد و پیش رہے کوئی بھی آپ کی نگاہ التفات سے محروم نہیں ہے۔ مولانا معین اللہ صاحب (مرحوم) جو ابتدائے عمر سے اپنی زندگی کے اخیر سانس تک مولانا کے رفیق، مشیر اور ہم خیال و ہم فکر رہے انکی قدر دانی کرنے اور جذبات کا اظہار کرنے میں کسی قسم کی کمی نہیں دیکھی۔ راقم جیسے بعض خدام بھی حضرت کی نگاہ التفات سے محروم نہیں رہے۔ آپ کے دست گرفتہ افراد یا وہ حضرات جن کے اندر آپ نے اخلاص کا جوہر

دیکھاان کی دلدہی اور دل جوئی میں ہمیشہ مبالغہ سے کام لیا یہ توازن محبت واخلاق میں صرف اہل اللہ اور نائبین انبیاء میں دیکھی جاسکتی ہے۔ کیوں کہ محبت وشفقت کے پلڑے اپنی جگہ پر ہمیشہ اپنا وزن برابر رکھتے ہیں۔

ایک خاص بات جو میرے مطالعہ میں آتی ہے وہ یہ کہ اللہ تعالیٰ نے آپ کو وہ بصیرت عطا فرمائی ہے جس سے کہ مخلص اور غیر مخلص، خدابیں اور مصلحت بیں دونوں طبقے کے افراد کو اچھی طرح پہچانتے ہیں۔ دین کے معاملہ میں جن کے اندر اخلاص ہے وہ خواہ دور بھی ہوں مگر مولانا کے دل میں ان کی قدر ہے۔ میں نے آگے انہی صفحات میں ڈاکٹر محمد اشتیاق حسین قریشی کی مثال دی ہے۔ کہ وہ ندوہ سے آزردہ خاطر ہوگئے تھے مگر مولانا نے ان کی عزیز داشت میں کبھی کمی نہیں کی۔ کیونکہ ان کے اندر مولانا کو اخلاص کا جوہر نظر آیا، مگر مولانا کی جگہ پر کوئی اور ہوتا تو شاید اتنی پرواہ نہ کرتا۔

اسی طرح امیر شریعت بہار مولانا سید نظام الدین صاحب کو مسلم پرسنل لاء کا سکریٹری بنانے کے لئے تجویز، خود مولانا نے پیش کی اور جب ان کی امارت کا مسئلہ زیر بحث تھا اور انتخاب میں کچھ الجھنیں پیش آرہی تھیں جس میں شرکت کے لئے مولانا جانے والے تھے، مگر عین وقت پر علالت نے پیر پکڑ لئے، اس وقت معلوم ہوا کہ پوری قلبی توجہ اور دعاؤں کے ساتھ مولانا ملتفت رہے تا کہ اللہ تعالیٰ مسلمانوں کی عزت رکھے اور ایک ایسی جمعیت کو انتشار سے بچائے جس کی خدمات کے مولانا معترف رہے ہیں۔

غرض محبت وتعلق کا پیمانہ مولانا کے یہاں محض صداقت اور اخلاص ہے یہ راقم اپنی دانست اور اپنے مطالعہ کی روشنی میں اللہ تعالیٰ کے حضور میں اس کی گواہی دیتا ہے۔

حضرت مولانا کے احباب جہاں اور جس میدان میں رہے ہوں ان سے اپنا تعلق مولانا نے ہمیشہ یکساں رکھا۔ اللہ تعالیٰ نے مولانا کو خواہ جتنا بھی عروج

اور اقبال مندی عطا فرمائی اور خصوصی انعامات سے نوازا ملک اور ملک کے باہر عزت و مقام عطا فرمایا اس کا کوئی اثر مولانا نے یا مولانا کے کسی فرد خاندان نے کبھی بھی اعلانیہ یا دبی زبان سے اظہار نہیں کیا، اور نہ اپنے برتاؤ میں اس کا اثر محسوس ہونے دیا، بلکہ جو لوگ سن میں بڑے تھے ان کی عمر کا احترام ملحوظ رکھا اور خطوط میں ایسے القاب سے مخاطب کیا جیسے کوئی چھوٹا اپنے بڑے کو مخاطب کرے، جہاں تک ان کے معاصرین کا تعلق ہے وہ دل سے ان کا محبت واحترام ملحوظ رکھتے تھے، حضرت مولانا نے آخر دم تک ان کے پاس و مقام کے مطابق اپنے برتاؤ میں ذرہ برابر کمی نہیں آنے دی۔ کہیں ایسا بھی ہوا کہ ان کی بعض اخلاف نے کسی وجہ سے مولانا کی بلندی اور عالمی مقبولیت کو پسند نہیں کیا، لیکن ان کی پسندیدگی یا عدم پسندیدگی اور وہ احساس برتری جو احساس کمتری کا نتیجہ ہوا کرتا ہے اس کا سطور اور بین السطور میں اظہار ہوتا رہا مگر مولانا نے اپنی طرف سے تعلق کی یکسانی میں فرق نہیں آنے دیا۔ جو لوگ بیمار رہے ان کی آخر وقت تک عیادت و خبر گیری کرتے رہے اور ان کی وفات کے بعد وہی کیا جو سادات ہاشمی کی مروت، نرم دلی اور صبر و حلم سے متوقع تھا۔

یہ بات اسی لائق ہے کہ اس کو اجمالا ہی رہنے دیا جائے اور مولانا کی عظمت اب ایسی نہیں رہ گئی جس کو کسی مقابلہ اور توازن سے ثابت کیا جائے۔

آفتاب آمد دلیل آفتاب

ہاں نئی نسل کے لئے مولانا کے برتاؤ میں وہ نمونہ ہے جو مینارۂ نور کا کام دے گا۔



معاشرتی آداب، معمولات

راقم ان خوش قسمت افراد میں نہیں ہے، جن کو بلا انقطاع مولانا سے قربت کا شرف حاصل رہا ہو، یہ خصوصیت صرف مولانا معین اللہ صاحب مرحوم کو حاصل رہی۔ یا مولانا کے افرادِ خاندان کو جو ہمیشہ رنج وراحت کے شریک رہے۔ نرم وگرم حالات میں ساتھ رہے اور سفر وحضر میں رفیق، لیکن ایک عجیب بات ہے کہ برسہا برس کی دوری ومحرومی کے باوجود جب بھی حاضر باشی کا موقع ملا۔ یہ نہیں محسوس ہوا کہ مولانا کے معمولات، معاشرتی آداب میں میرے ساتھ کوئی معمولی سا بھی فرق آیا ہو۔ عمر کے بڑھنے کے طبعی تغیرات، جیسے سیاہ بالوں کا سفید ہو جانا، جسم کا کمزور ہونا اس کو کون روک سکتا ہے۔ لیکن طور طریقہ، معمولات میں کوئی فرق بالکل محسوس نہیں کیا۔

۱۹۴۰ء کے دہے کا ایک واقعہ ہے کہ مولانا ندوہ سے پیدل گوئن روڈ گئے۔ خیال تھا کہ عشاء کی جماعت مولانا کے محلّہ کی مسجد میں مل جائے گی، لیکن جب وہاں پہنچے تو جماعت ختم ہو چکی تھی الٹے پاؤں دوسری مسجد کی طرف رخ کیا گیا، وہاں بھی جماعت ہو چکی تھی۔ اب مولانا کو گھبراہٹ شروع ہوئی۔ کسی نے کہا سب سے تاخیر سے جماعت گڑبڑجھالے کے قریب کی مسجد میں ہوتی ہے۔ وہاں پہنچے اتفاق سے جماعت مل گئی اس موقع پر مولانا کا چہرہ خوشی سے دمک اٹھا اور جماعت مل جانے

پر جو خوشی ہوئی وہ نا قابل بیان ہے۔

جس زمانہ میں مولانا سیتاپور ہاسپٹل میں زیر علاج تھے، ''گولوکوماں'' کی تکلیف ایسی ہوتی ہے کہ لوگ یہ تمنا کرتے لگتے ہیں کہ زندگی سے ہاتھ دھونا آسان ہے، اس زمانہ میں بھی کبھی بے جماعت نماز آپ نے نہیں پڑھی۔ اور ایسے سخت حالات میں جہاں جماعت کرنے کے لئے دشواریاں ہوئیں اور رخصت سے فائدہ اٹھانے کا پورا شرعی جواز تھا، وہاں بھی مولانا نے ہمیشہ عزیمت پر عمل کیا۔

ایک مرتبہ حضرت مولانا کے ساتھ دہلی کے سفر میں ساتھ تھا۔ مولانا معین اللہ صاحب مرحوم بھی رفیق سفر تھے۔ جس ٹرین سے جانا تھا وہ لکھنؤ سے بن کر جاتی تھی، عشاء کی نماز پڑھ کر چلے تو مسئلہ تراویح کا تھا۔ مولانا نے فرمایا کہ شہر سے اسٹیشن تک مسلسل آبادی ہے اسلئے ہم لوگ ابھی سفر میں نہیں ہیں چنانچہ ٹرین ہی پر پوری بیس رکعتیں مولانا نے خود پڑھائیں، جس میں سورہ بقرہ ختم کرلی، یہاں بھی عزیمت کا ایک پہلو نظر آتا ہے، وہ وقت تو مولانا کی نوجوانی کا تھا۔ اس کے بعد اب اس عمر شریف میں جب ۸۰ سے سن متجاوز ہے، چلنے پھرنے کی طاقت جواب دے چکی ہے سخت مرض کا حملہ ہو چکا ہے، ڈاکٹروں کی ہدایت ہے کہ اپنے بستر سے الگ نہ ہوں۔ لیکن کسی وقت جماعت نظر انداز نہیں کی گئی، اور متعدد خدام، مہمانوں اور عزیزوں کے ساتھ آپ کی جماعت ہوتی ہے، اور سوائے ایک دو وقت کی نمازوں کے تمام نمازیں بیٹھ کر ادا کیں۔

مولانا کو عرصہ سے وجعِ مفاصل کی تکلیف ہے اور جب تک کہ انڈے کے ساتھ چند کیپسول یا گولیاں نہ کھالیں دو قدم چلنا دشوار ہوتا ہے۔ اس لئے کئی برس سے معمول رہا ہے کہ فجر کی نماز اپنی قیام گاہ پر جماعت کے ساتھ پڑھ لیا کرتے ہیں، لیکن فرض نماز کھڑے ہی ہو کر پڑھی، بقیہ چار نمازیں مسجد میں ادا ہوتیں، فرض اور وتر

ہمیشہ کھڑے ہوکر پڑھی،اب رہانفل اور تہجد و مستحبات کی رکعتیں،تواس کا علم حاجی عبدالرزاق صاحب یادوسرے خاص خدام کو ہے۔راقم کوکوئی مولانا کی کرامتیں بیان کرنا مقصود نہیں ،اور نہ خود مولانا نے ان بزرگوں کی کوئی کرامت نقل کی جن کی سوانح خودان کے قلم سے نکلی ہیں۔کیونکہ اصل کرامت فرائض وشعائر کی پابندی ہے۔ ضمیر وزبان کی سچائی ،حقوق اللہ وحقوق العباد کی ادائیگی اور اس کی پابندی میں یکسانی، یکسانی میں طمانیت اور انشراح صدر ہے جواللہ تعالیٰ نے اپنے توفیق خاص سے مولانا کوعطا فرمائی اور جس پراس وقت بھی عمل پیرا ہیں، جب کہ حیات مبارکہ کے سورج پرزردی چھارہی ہے۔و الأمر للّٰہ من قبل و من بعد۔

جہاں تک صدق گفتار کا تعلق ہے،اس کی پابندی سخت سے سخت اوقات میں اور ایسے مواقع پر جہاں کے جان کا خطرہ ہو، مبینہ توہین کا امکان ہو، وہاں اللہ تعالیٰ نے ہمیشہ آپ کی زبان کوصادق وطاہر رکھا،اس کا ایک واقعہ مولانا نے کاروان زندگی میں برسبیل تذکرہ نقل فرمایا ہے:

’’میں ہنڈ کو دیکھنا بھی چاہتا تھا،اور ضروری مقامات کی تصویر اور نقشہ بھی لینا چاہتا تھا،اس کے لئے ارشد صاحب نے ایک نقشہ نویس کو بھی ہمارے ساتھ کردیا تھا، ہم لوگ سیدھے ہنڈ کی مسجد میں پہنچے،معلوم ہوا کیا کہ کوئی صاحب یہاں ایسے ہیں،جن سے کچھ تاریخی معلومات حاصل ہوسکیں؟لوگ سردار خاوی خاں کے خاندان کے ایک معزز فرد کو بلالائے جولاہور میں ریلوے میں کسی عہدے پر تھے،انھوں نے کہا کہ آپ اتنی دور سے یہاں کس کام کے لئے آئے ہیں؟ میں نے کہا کہ مجھے تاریخی ذوق ہے،اور میں یہاں کے حالات معلوم کرنا چاہتا ہوں، کہنے لگے کہ اتنے کام کے لئے تو کوئی اتنی دور سے نہیں آتا!پھر کہنے لگے کہ لکھنؤ کے ایک صاحب ابوالحسن علی ندوی ہیں انھوں نے ایک کتاب ’’سیرت سید احمد شہیدؒ‘‘ لکھی ہے اس میں

ہمارے بزرگوار سردار خاوی خاں کے متعلق سخت الفاظ آئے ہیں، جو غلط فہمی پر مبنی ہیں، میں نے ٹالنے کے لئے کہا کہ لوگ کتابیں لکھتے ہی رہتے ہیں۔ اس وقت نہ انھوں نے میرا نام پوچھا اور نہ میں نے بتایا، بات آئی گئی ہوگئی، انھوں نے اپنا مہمان بنایا، شام کو انھوں نے کہا کہ چلئے آپ کو دریائے اٹک کی سیر کرائیں، میں اور مولوی عبدالغفار صاحب گئے، ایک جگہ مولوی عبدالغفار صاحب تو وضو کے لئے بیٹھ گئے ہم اور وہ تنہارہ گئے انھوں نے کہا کہ آپ کا نام کیا ہے؟ میں نے کہا کہ علی، کہا کہ آپ ہی تو ابوالحسن علی نہیں ہیں، (خیال رہے کہ پٹھان حضرات بندوق ساتھ رکھتے ہیں، اور جگہ بالکل سناٹے کی تھی) میں بڑے مخمصہ میں پھنسا، میں نے کہا کہ لکھنؤ شیعوں کا شہر ہے وہاں سنیوں کے نام بھی علی، حسین کثرت سے ہوتے ہیں، اس پر انھوں نے مزید جرح نہیں کی، اور ہم لوگ مغرب کی نماز ادا کر کے قیام گاہ پر آ گئے، رات کو انھوں نے رئیسانہ اور شریفانہ ضیافت کی، اگلے دن جب میں رخصت ہونے لگا، میں نے ان کو دریافت کیا تو معلوم ہوا کہ کھیتوں پر گئے ہوئے ہیں، میں نے بلوایا، میں نے کہا کہ اب میں یہاں سے جارہا ہوں اب چھپانا مناسب نہیں سمجھتا، میں ہی ''سیرت سید احمد شہیدؒ'' کا مصنف ابوالحسن علی ندوی ہوں، وہ بڑے اخلاق سے ملے اور کہا کہ ابھی تک انجان بن کر آپ ہمارے مہمان رہے، اب آپ کچھ وقت یہاں رہیے، تاکہ ہمیں آپ کی میزبانی کا موقع ملے، انھوں نے یہ بات خلوص اور شرافت سے کہی تھی۔ مگر ہمارا پروگرام آگے کا بنا ہوا تھا، میں نے معذرت کی، اور مانیری کے لئے روانہ ہوگیا۔

مولانا کے چند خاص معمولات

مولانا کو جمعہ کا خاص اہتمام رہتا ہے۔ اکثر اذان سے پہلے ہی یا متصلاً اذان کے ساتھ مسجد تشریف لے جاتے ہیں، اور جمعہ کے اہتمام میں سنن و مستحبات کا

خصوصی اہتمام رہتا ہے، اپنا پوری عرفی لباس شیروانی پہنتے اور کبھی سر پر رومال رکھ لیتے ہیں، اس میں بھی کبھی تخلف نہیں دیکھا، خواہ کوئی بھی موسم ہو۔ ''خُذُوْ زِیْنَتِکُمْ عِنْدَ کُلِّ مَسْجِدٍ'' (تم مسجد کی ہر حاضری کے وقت اپنا لباس پہن لیا کرو) پر عمل رہا۔

نفاست اور ذوق

بعض مشائخ اور اہل طریقت ایسے بھی دیکھے گئے ہیں جن کو اپنے تن بدن کا ہوش نہیں رہتا، سامنے کی گھنڈیاں کھلی ہیں تو کھلی ہیں، سر اور داڑھی کے بال الجھے ہیں، تو الجھے ہیں، پگڑی باندھی تو لٹ پٹ، غرض درویشی کی علامت اور دنیا سے بے نیازی کا اظہار اس طرح کرتے ہیں کہ صفائی وستھرائی کی سنت بھی فراموش ہو جاتی ہے۔ شمائل ترمذی میں نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی عادات شریفہ میں سرمہ لگانا، بالوں میں کنگھی کرنا، مسواک کی کثرت، سر پر رومال ڈالنا جو کبھی کبھی خوشبو میں معطر رہتا تھا معمولات نبویہ میں مذکور ہیں، ہمارے مولانا بھی اس معاملہ میں سنت مطہرہ کے پابند ہیں، حجامت اور خط بنوانے میں اگر وقت سے تاخیر ہو جائے تو آپ پر گراں گذرتا ہے، سفر میں بھی اس کی پابندی فرماتے، اور اس سلسلہ میں بسا اوقات دشواریاں بھی سامنے آئیں، مگر کبھی اس معمول کو آپ نے فراموش نہیں کیا۔ بعض مرتبہ کوئی نائی نہیں ملا تو مولانا معین اللہ صاحب مرحوم نے یہ خدمت انجام دی لباس میں کوئی تصنع نہیں ہے، جو لباس ہمیشہ پہنتے آئے وہی لباس ہمیشہ زیب تن رہا خواہ وہ عرب گئے ہوں یا امریکہ، یمن یا افریقہ، ہمیشہ یہی لباس جو علماء کا عرفی لباس ہے۔ پہنا کرتے ہیں، شیروانی کے سب بٹن لگے ہوتے ہیں، رام پوری ٹوپی یا کشتی نما، شیروانی ہی کے کپڑے سے تیار کی جاتی ہے۔ آپ کے والد علیہ الرحمہ عمامہ باندھا کرتے تھے مگر مولانا نے

اس کو معمول نہیں بنایا، تصنع نام کی کوئی چیز آپ کے یہاں نہیں ہے، وہ بات جس کو عربی میں "انـــــاقة" کہا جاتا ہے اس کا آپ لحاظ رکھتے ہیں، کبھی کسی جلسہ میں خواہ دارالعلوم کے طلباء کی کسی انجمن نے مدعو کیا ہو، اس کے لئے بھی شیروانی پہن کر اسی طرح جاتے ہیں، جس طرح کسی آل انڈیا کانفرنس کی صدارت کے لئے، اور یہ صرف اپنی ذات کے لئے نہیں بلکہ اپنے خدام واعزا کے لئے یہی پسند کرتے ہیں۔ ایک مرتبہ راقم انجمن اصلاح میں طلباء سے خطاب کرنے کے لئے جارہا تھا اور بے پروائی میں سادہ گھریلو لباس پہنے ہوئے تھا۔ مہمان خانہ کے باہر مولانا تشریف فرما تھے، انھیں معلوم تھا کہ میں فلاں جگہ اور فلاں موضوع پر تقریر کرنے جارہا ہوں آپ نے فرمایا کہ کیا بغیر شیروانی کے بھی تقریر ہو جاتی ہے؟ مسکراتے ہوئے ارشاد فرمایا کیا کہ گھر واپس جاؤ اور شیروانی پہن کر جلسہ میں شرکت کرو!

اس میں اناقة کے علاوہ ایک پہلو اور ہے کہ طلباء کے مجامع کا احترام اور ان کو اہمیت دینا تا کہ وہ سمجھیں کہ اساتذہ اور بڑوں کی نگاہ میں ان کی کیا عزت ہے۔ اتنی باریک بینی اور نزاکت سے افراد کے احساسات، جماعتوں کے حقوق اور سنت کی پابندی کہاں دیکھی اور سنی جا سکتی ہے۔

غذا میں تنوع اور کثرتِ اصناف مرغوب نہیں ہے، لیکن لذیذ غذا اور میٹھی چیزوں کی خواہش رہتی ہے، چاول مولانا کے کھانے کا لازمی جزء ہے۔ گوشت کسی سبزی کے ساتھ پکا ہوا اور اچھا گلا ہوا مرغوب ہے، مولانا کو عربی کھانا طبعی طور پر زیادہ پسند ہے۔ ہو سکتا ہے کہ اس کا سبب عرب اور عرب کی ہر چیز سے فطری انس اور مزاجی رغبت ہو، وہاں دعوتوں میں "سلیق" کا رواج رہا ہے اور اب دوسرے متنوع اقسام بھی تیار ہوتے ہیں۔ جیسے کوزی یا مندی (تنور میں بھنا ہوا مسلم بکرا) جس کو سب مل کر ایک طشت میں کھاتے ہیں، لیکن "سلیق" چونکہ بہت ہلکی غذا ہوتی ہے، اور

مرچ مسالہ نہ ہونے کی وجہ سے مزاج زیادہ آسانی سے قبول کرلیتا ہے۔لہٰذا سلیق کو ترجیح دیتے ہیں اور آپ کے جاننے والے عرب احباب اسی کا زیادہ اہتمام رکھتے ہیں گذشتہ سال مدینہ منورہ میں وہاں کے رئیس کبیر سید حبیب صاحب (حضرت مدنی کے برادر زادہ) نے مجھ سے پوچھا کہ شیخ کی دعوت میں کیا تیار کرایا جائے۔میں نے عرض کیا کہ "سلیق" کافی ہوگی۔انھوں نے ہنستے ہوئے کہا "علــــــی مســــئـــولیتك" (آپ کی ذمہ داری پر) شیخ کا مطلب یہ تھا کہ وہ بہت متنوع اصناف تیار کرانا چاہتے تھے۔لیکن اتنی ہلکی قسم غذا پسند کرنے پر ان کو تعجب ہوا۔



ادب عربی کی تدریس

عربی زبان وادب سے مولانا کا تعلق اسی طرح رہا جیسے کسی کو مادری زبان سے تعلق ہو اور پھر اس زبان کے ادبیات کو پڑھا بھی ہو اور صحبتیں بھی ادباء اور اہل ذوق کی ملی ہوں، ایک غیر اہل زبان لغت کے الفاظ زیادہ سے زیادہ یاد کر کے زبیدی بن سکتا ہے۔ نحو کے مسائل کی باریکیاں اپنے مطالعہ سے اس درجہ میں سمجھ سکتا ہے کہ سیبویہ بن جائے۔ اس کے مقابلہ میں وہ شخص جس کے پاس الفاظ کا ذخیرہ تو نہ ہو اور نہ صرف ونحو اور بلاغت کے مسائل کا حافظ ہو مگر زبان سے فطری تعلق رکھتا ہو، اور بچپن سے اس کو اہل زبان سے سیکھتا آیا ہو، زبان وادب کا اعلیٰ ذوق رکھنے والوں کی صحبتیں اٹھائی ہوں، اچھے شعر، پاکیزہ جملوں، چبھتے ہوئے فقروں کی لذت اس کو حاصل ہو، اس کی سطح ''مفردات لغت کے بڑے بڑے جاننے والوں'' سے ممتاز ہوگی۔

مولانا نے عربی کی ابتدائی کتابیں اور نظم ونثر کا معتد بہ حصہ مولانا خلیل عرب صاحب سے پڑھا۔ یہ اہل زبان بھی تھے اور صاحب ذوق بھی، انھوں نے چند ابتدائی کتابیں پڑھانے کے بعد عربی میں گفتگو کرنے پر پابند کر دیا تھا، اور اردو بولنے پر جرمانہ کیا کرتے تھے۔ ادبیات کی اعلیٰ تعلیم علامہ تقی الدین ہلالی سے حاصل کی جو عربی زبان و ادب میں صف اول میں شمار کئے جاتے تھے۔ خود عرب نژاد، اور ماہر فن تھے۔ اس طرح

مولانا کی عربیت میں عجمی آمیزش نہیں ہے۔ مصر وشام کے لکھنے والوں، ادباء اور اہل فکر سے مولانا کی واقفیت اسی طرح کی رہی جیسے کوئی اپنی زبان کے مشہور نثر نگاروں اور شعراء سے واقف ہو۔ وہاں کی علمی تحریکات، سیاسی رجحانات، شخصیات سے واقفیت ہی نہیں بلکہ ان کے امتیازی اوصاف سے آگاہی ہمیشہ حاصل رہی۔

جن بزرگوں کی صحبتیں ملیں ان میں ان کے پھوپھا مولانا سید محمد طلحہ صاحب کا نام نمایاں ہے۔ یوں خود خاندان مصنفوں اور ادیبوں کا ہے۔ والد ماجد مؤرخ ہند، جد امجد مؤرخ وادیب، قریب ترین عزیزوں میں مولانا ابوالخیر صاحب تھے جن کو صحیح مسلم تقریباً ازبر تھی۔ والدہ ماجدہ خود صاحب دیوان طبع موزوں اور سوز دروں کی دولت پائی ہوئی بی بی تھیں۔ ادب کا ذوق صرف الفاظ یاد کرنے یا قواعد نحو کے ضوابط یاد کرنے سے نہیں بلکہ ماحول تعلیم، مطالعہ اور خاندانی اثرات سے تعمیر پاتا ہے۔ جس کے مجموعہ کو عربی میں سلیقہ کہتے ہیں۔ مولانا کو یہ سلیقۂ لغویہ، یا سلیقۂ ادبیہ قدرت نے پوری فیاضی کے ساتھ عطا فرمایا ہے۔

مولانا عربی ادب جس طرح پڑھاتے تھے وہ عام مروجہ طریقوں سے بہت مختلف تھا۔ وہ لفظ کی تشریح میں اس کا نسب نامہ اور تاریخ نہیں بتاتے تھے جس سے معلوم ہو کہ لغت میں اس کی اصل یہ ہے پھر فلاں مناسبت سے یہ معنی لئے جانے لگے، اور اس کو فلاں شاعر نے اس معنی میں باندھا ہے۔ یہ موضوع ادب کا نہیں ہے بلکہ مفردات لغویہ کی تاریخ کا ہے کہ ایک لفظ کے استعمال میں جو توسع ہوتا رہا اور ابتدائی مفہوم اور موجودہ مفہوم میں کیوں کر منتقل ہوا۔ اس کو انگریزی میں Semantics کہتے ہیں۔ یہ فن ادب نہیں ہے، بلکہ فن لسانیات کی ایک شاخ ہے۔ جس کو عصر حاضر کے علمائے لسانیات ادب میں شامل نہیں سمجھتے، اور اس کے معقول اسباب ہیں۔ ادب مفردات کی تحقیق کا نام نہیں ہے، اس میں گفتگو اس سے ہوتی ہے کہ کس بات کو کس طرح ادا کیا

جار ہا ہے۔ پھر یہ کہ اس کلام کا ادبی حس پر کیا اثر پڑ رہا ہے۔ مخاطب مفہوم کو کسیلے، کڑوے گھونٹ کی طرح برداشت کر رہا ہے۔ یا فرحت بخش شربت کی طرح قبول کر رہا ہے۔ اگر شربت کی طرح اس کا مزاج قبول کر رہا ہے تو دوسرے انواع کی مشروبات سے کس درجہ اور کس طرح مختلف ہے۔

الحمدللہ ندوہ کے درجہ پنجم میں مختارات پڑھتے وقت جس بات کو طبیعت نے قبول کیا ہے اس کی حرف بہ حرف تصدیق آج اس عمر میں ہو رہی ہے جب کہ بلاغت اور لسانیات پر پڑھنے پڑھانے کا اور لکھنے کا کافی موقع مل چکا ہے۔ مولانا کا طرز یہ تھا کہ عبارت جو سامنے آ گئی اس کے اندر عربیت کی جو روح ہوتی اس کو اس طرح اجاگر کرتے کہ پہلے اس کو ایک بار خود دہراتے جیسے کہ مصری کی ڈلی منہ میں پڑی ہے اور کام و دہن اس کی شیرینی سے حسی طور پر لطف اندوز ہو رہے ہوں، یا جس طرح کوئی چبھتا ہوا فقرہ یا اچھا مصرعہ سن کر پھڑک جائے۔ ادبی مقطوعہ کا اثر ادبی حس پر اس طرح ہوتا ہے جیسے بجلی کا کرنٹ کسی مادی جسم پر، برف کی ایک ڈلی یا آگ کی چنگاری جب جسم سے چھو جاتی ہے تو اس کا اثر قبول کرنے کے لئے آگ یا برف کے فارمولے اور اس کی حقیقت اولیٰ جاننے کی ضرورت نہیں ہوتی۔ بعینہٖ یہی حال کسی بات کے اثرات کا ہے۔ جس کے وقوع اور تاثیری کیفیت پیدا کرنے کے درمیان کوئی وقفہ نہیں ہوتا۔ جن لوگوں کو ادباء کی صحبت میں بیٹھنے سے ادبی ذوق ملتا ہے یا شعراء کی محفلوں میں شرکت سے شعر کے محاسن کی تمیز ہو جاتی ہے، وہ ان صحبتوں یا محفلوں میں حسن بیان کے اسرار و رموز پر لکچر نہیں سنا کرتے، بلکہ صاحب ذوق کی لذت اندوزی، اس کے وجدان پر اہتزازی کیفیت کسی لفظ کو مکرر سہ کرر دہرانا ان کے احساس، وجدان کے اندر ادبی قبولیت کا سوتا کھول دیتا ہے۔

ہمارے مولانا کا طرز تدریس بھی فطری و وجدانی تھا وہ خود لطف اندوز ہوتے

اوران کی لطف اندوزی اور وجدانی اہتزاز کا اثر غیر مرئی طور پر طلبہ پر پڑا کرتا۔

میرے استاذ گرامی مولانا محمد ناظم ندوی برصغیر میں نحو و مفردات لغویہ میں کامل دستگاہ رکھتے تھے، ہم مبالغہ اور جوش عقیدت میں یکتائے روزگار نہیں کہہ رہے ہیں، ہوسکتا ہے اللہ کے کچھ بندے ان خصائص میں ان کے شریک ہوں یا فائق ہوں، مگر ہم ان کو نہیں جانتے، جن کو ہم جانتے ہیں ان میں علامہ عبدالعزیز میمن بے شک ان کے مماثل تھے، بہر حال استاذی مولانا محمد ناظم ندوی فرمایا کرتے تھے کہ:

> ''آم کی لذت، رنگ و بو اور چاشنی پر تم ایک کتاب لکھ سکتے ہو، لیکن اپنے قاری کو اس کی لذت سے اس درجہ آشنا نہیں کر سکتے جس درجہ میں وہ شخص لذت آشنا ہوگا جس نے آم کی ایک قاش چکھ لی ہے''۔

بعینہ یہی حال ادب کے ذوق پروری کا ہے۔ آپ نحو بلاغت کی تمام باریکیاں جاننے کے باوجود زبان کی حلاوت، الفاظ کے صوتی محاسن جس کو فصاحت کہتے ہیں۔ ترکیبی امتیازات (جس کو علم المعانی کہا جاتا ہے) ایک بات کو متعدد انداز میں کہنا جس کو علم البیان کہتے ہیں اور رنگ و روغن اور گلکاریاں (جو علم بدیع کا موضوع ہے) ان تمام جزئیات پر کامل عبور اور استحضار کے باوجود زبان کے تیور، حسن ادا کی خوبی، لفظ کی اثراندازی کو سمجھنے میں اس شخص کا مقابلہ نہیں کر سکتے جو کسی صاحب ذوق، اہل زبان کا صحبت یافتہ ہو، ایسے شخص کا ذوق و مزاج بجائے خود معیار اور سند ہے اس کی پسند اور ناپسند کو کسوٹی سمجھئے۔

خواجہ الطاف حسین حالؔی نے ''یادگار غالب'' میں مرزا غالب کی شعر فہمی کی تصویر کشی کے لئے ایک واقعہ لکھا ہے چونکہ وہ میرے مدعا کو واضح کرنے میں معاون ہوگا اس لئے اس کو نقل کرتا ہوں۔

نواب ممدوح (نواب مصطفیٰ خاں مرحوم مصنف گلشن بے خار) نے مجھ سے (مولانا حالی سے) ایک واقعہ بیان کیا جس سے مرزا کی سخن سنجی کا بڑا ثبوت ملتا ہے، مولانا آزردہ نے "دور نہیں" "حور نہیں" اس زمین میں غزل لکھی تھی۔ اس میں اتفاق سے مطلع بہت اچھا نکل آیا تھا، مولانا نے اپنی غزل سنا کر ان سے کہا کہ اگر چہ بحر دوسری ہے مگر اسی ردیف وقافیہ میں نظیریؔ کی بھی ایک غزل ہے جس کا مطلع یہ ہے۔

عشق عصیا نست اگر مستور نیست
کشتۂ جرم زباں مغفور نیست

ظاہر ہے کہ اگر نظیری ہندی نژاد ہوتا اور اسی زمین میں جس میں میری غزل ہے اردو غزل لکھتا تو اس کا مطلع اس طرح ہوتا۔

عشق عصیاں ہے اگر مخفی و مستور نہیں
کشتۂ جرم زباں ناجی و مغفور نہیں

آؤ آج مرزا غالب کے ہاں چلیں اور بغیر اس کے کہ قائل کا نام لیا جائے، اپنا مطلع اور نظیری کے مطلع کا یہی اردو ترجمہ (جو اوپر مذکور ہوا) مرزا کو سنائیں اور پوچھا جائے کہ کون سا مطلع اچھا ہے، چونکہ نظیری کا مطلع اردو ترجمے سے بہت پست ہو گیا تھا، سب کو یقین تھا کہ مرزا نظیری کے مطلع کو ناپسند کریں گے، اور مولانا آزردہ کے مطلع کو ترجیح دیں گے، چنانچہ مولانا اور نواب صاحب اور بعض احباب مرزا کے ہاں پہونچے، معمولی بات چیت کے بعد مولانا نے کہا کہ اردو کے دو مطلع ہیں ان میں آپ محاکمہ کیجئے کہ کون مطلع

اچھا ہے۔اور بطور ریٹھن کے نظیری کے مطلع کا یہی ترجمہ پڑھا۔
ابھی مولانا اپنا مطلع پڑھنے نہیں پائے تھے کہ مرزا اس کو سن کر سر دھننے
لگے اور اور متحیر ہو کر پوچھنے لگے کہ یہ مطلع کس نے لکھا؟ اور اس قدر
تعریف کی کہ مولانا آزردہ کو یہ امید نہ رہی کہ اس سے زیادہ میرے
مطلع کو داد ملے گی، چنانچہ انھوں نے اپنا مطلع نہیں پڑھا۔اور سب
لوگ نہایت تعجب کرنے لگے۔‘‘

مولانا کے طرز تدریس کے ذکر میں مندرجہ بالا واقعہ اور اس سے پہلے مولانا محمد ناظم ندویؒ کے بیان کردہ حکیمانہ نکتہ کی وضاحت بات کو طول دینے یا پھیلانے کے لئے نہیں کی ہے، بلکہ قصداً اس کو بیان کیا ہے کہ ہمارے قاری اور خاص طور پر ہمارے ادب کے طلبہ کے ذہن میں ادب کا حقیقی مفہوم اور ذوقِ ادب کا معیار آ جائے۔

مناسب ہوگا کہ مولانا کے طرز تدریس کی خصوصیات اپنی یادداشت سے (جو الحمدللہ ابھی تازہ ہے) نقل کرتا ہوں۔

مختارات میں ایک ادب پارہ ہے جس کا عنوان ہے ”اطیب طعام وأشعر بيت“ اس عنوان کے تحت پہلا جملہ یہ ہے ”صنع عبدالملك بن مروان طعاماً فاكثر وأطاب“

مولانا نے ”فأكثر وأطاب ‘‘کی اس ترکیب کی داد دیتے ہوئے فرمایا ایک عرب مزاج ادیب ہی کہہ سکتا ہے، اگر کوئی غیر عرب یہ کہنا چاہتا تو کہتا کہ ”صنع عبد الملك طعاماً كثيراً ولذيذاً “ یا کہتا ’’كثيراً في مقداره ولذيذاً في مذاقه“ یا کہتا ’’ شهياً وافراً متوفراً “۔ ممکن ہے کسی مقفی عبارت میں اس مفہوم کو بیان کرتا، مگر ”فاكثر واطاب “میں جو اختصار اور احاطہ اور لطف ہے اس طرح کی تعبیر ایک اہل زبان ہی سے سنی جا سکتی ہے۔

طرز تدریس کا فرق اور امتیاز اس طرح بھی واضح ہوسکتا ہے کہ اس جملہ کے ادبی محاسن کو بیان کرنے کے لئے روایتی انداز کی تدریس کی محاکاۃ کردوں اسی جملہ کو اگر ادب کا کوئی بڑا مدرس بیان کرتا تو اس کی تشریح کا انداز یہ ہوتا۔

لفظ، صنع کے معنی ہیں بنانا، تیار کرنا، تربیت کرنا، باب فتح یفتح سے آتا ہے، صنع یصنع صنعاً و صناعة کھانا پکانے یا پکوانے، تیار کرنے یا کرانے کے تمام مفاہیم پر حاوی ہے، چونکہ ذکر خلیفہ عبدالملک بن مروان کا ہے۔ ظاہر ہے اس نے کھانا خود نہیں پکایا ہوگا، بلکہ پکوایا ہوگا، شاہی باورچی کو حکم دیا ہوگا کہ کھانا اس طرح تیار کرے، اس لئے لفظ صنع کا استعمال کیا گیا، جو اشارہ کررہا ہے کہ اس نے اپنی نگرانی میں اور اپنے حکم سے کھانا تیار کرایا۔

پھر طعاماً کو مفرد اور مفعول بہ بنا کر لائے۔ کیونکہ لفظ طعام جملہ اصناف اطعمہ پر دلالت کرتا ہے۔ اسی لئے صنع اطعمة کثیرة متنوعة نہیں کہا۔ فاکثر میں ف تعقیب کا نہیں بلکہ عاطفہ ہے اور فا عاطفہ تین مقاصد کے لئے آتا ہے، اولاً ترتیب، اور ترتیب کی دو قسمیں ہیں، ترتیب معنوی جیسے قام زید فعمر، اور ترتیب ذکری جس کو عطف مفصل علی مجمل بھی کہتے ہیں، جیسے فَاَزَلَّهُمَا الشَّيْطَانُ فَغَوٰى، اس میں عطف برائے ترتیب قسم ذکری ہے، تقدیر عبارت یہ ہوئی کہ صنع اطعمة فاکثر فی صنعه مقداراً، پھر دوسری صفت و أطاب کہہ کر بیان کی اور ف کی تکرار نہیں کی جس سے جملہ یہ ہوتا فاکثر فاطاب، کیونکہ حرف عطف ف کے بعد واؤ ہی مفید مطلب ہے، اور حرف کی تکرار سے ثقالت پیدا ہوتی۔

اگر کوئی علامۂ ادب اس جملہ کو پڑھاتا اور اس کی نظر وسیع ہوتی، تو فعل صنع کے مختلف معانی کو شواہد کے ساتھ بیان کرتا مثلاً یہ کہتا کہ مفہوم اصلی "بنانا" ہی ہے، اور چونکہ تربیت کرنا بھی ایک طرح کا بنانا ہی ہے اس لئے قرآن کریم میں وارد ہے، "وَلِتُصْنَعَ

عَلٰی عَیۡنِی ' اور عام طور سے بنانے ہی کا مفہوم ہے جیسے "وَاصۡنَعِ الۡفُلۡکَ بِاَعۡیُنِنَا میری نگاہوں کے سامنے یعنی میری ہدایت اور نگرانی میں کشتی تیار کرو۔ اس کا ایک مصدر صناعۃ بھی آتا ہے جو مہارت اور پیشہ اور اختیار کردہ حرفت کے لئے آتا ہے۔ کہا کرتے ہیں فلاں شخص کی صنعت یہ ہے، یہاں صنعت بمعنی پیشہ ہے۔

لیکن ان تمام انواع تشریحات سے جس میں اور بھی اضافہ کیا جا سکتا ہے۔ طلبہ کے ذہن میں زبان آموزی یا ادب آموزی کی صفت نہیں پیدا ہوئی اور اس طرز کی تشریح لفظی ونحوی کو ادب سمجھنا ادب سے ناواقفیت کی دلیل ہے۔

ادب عربی کی تاریخ جو احمد حسن زیات نے لکھی ہے وہ ندوہ میں داخل درس تھی (اب اس کی جگہ ندوہ کے دو ممتاز اساتذہ ادب (۱) نے اس فن کی تمام کتابوں کو کھنگال کر عصر اموی ورعصر عباسی پر علاحدہ علاحدہ کتابیں تیار کر لی ہیں) یہ کتاب ایک حسین اسلوب بیان کا نمائندہ ہے، شعراو ادباء کی سوانح اور ان کے تحریری نمونے اور محاکمہ بہت جامع ہے، جو زیادہ تر جاحظ اور اصمعی سے منقول ہے۔ اس مجموعہ میں نمونہ کلام کے ضمن میں جو نظم ونثر کے مقطوعات ہیں وہ بھی خوان ادب کے لئے خاصہ کی چیزیں ہیں۔

یہ کتاب مکمل ہم سب نے (راقم اور اس کے ساتھی طلبہ) درجہ ہفتم میں مولانا سے پڑھی ہے۔ مولانا کا طرز تدریس یہ تھا کہ مصنف کی رائے پر اکتفاء نہ کرتے بلکہ ہر شاعر ونثر نگار کے متعلق مزید معلومات بھی دیتے جو اس کے رنگ اور اسلوب بیان کو دوسرے سے ممتاز کرتا، اور ادباء کے اسالیب کا باہمی فرق اس طرح ظاہر ہو جاتا ہے جیسے رنگوں کا فرق سفید، سیاہ، نیلا رنگ ایک دوسرے سے ممتاز ہے۔ اسی طرح اسالیب کا فرق بھی ذہن قبول کر لیتا، قرآن کریم کے اعجازی پہلو کو بغیر تحلیل وتجزیہ اور فنی

---

(۱) مولانا سید محمد رابع حسنی ندوی اور مولانا سید واضح رشید ندوی

واصطلاحی موشگافیوں کے دل میں اتار دیتے کہ علم کلام (علم التوحید) پر لکھی ہوئی کتابوں کو پڑھ کر وہ تسکین نہیں ہوسکتی تھی جو مختلف پیرائے بیان کو سامنے رکھ کر قرآن کریم کی کسی آیت کو پڑھنے کے بعد حاصل ہوتی ہے۔ ہم غیر عرب جو عربی ادبیات پر عمریں گنواتے ہیں ان کا مقصد یہی ہے کہ قرآن کی عظمت اور اس کے وحی الٰہی ہونے پر ایمان اس درجہ پختہ ہوجائے۔ جس کو بشاشت قلب کہتے ہیں۔ جیسے سخت پیاس میں کسی کو ٹھنڈے میٹھے شربت کے گلاس سے آسودگی ہوتی ہے۔ اور روئیں روئیں میں ایک تازگی اور زندگی آجاتی ہے۔ وہ بات قرآن کی ایک آیت پڑھ کر حاصل ہوجائے اگر کسی نے قاضی الفاضل، حریری، جاحظ کے ادبی مقطوعات کو علاحدہ علاحدہ پڑھا ہے تو طبیعت میں ایک طرح کا اہتزاز پیدا ہوجائے گا۔ اور دماغ ان فن پاروں کی خوبیوں کا معترف ہوجائے گا، مگر انہی فن پاروں کو قرآن کریم کی کسی آیت کے مقابلہ میں رکھئے تو ایسا محسوس ہوگا کہ ساحران فرعون کی نظر بندیوں کے مقابلہ میں عصائے موسیٰ سامنے آگیا تو ''فاذا ھی تلقف مایأفکون) (تو ان کے تمام بنے بنائے دھندے نگلنا شروع کردیا)۔

مولانا سے استفادہ کی طلب یہاں سے فارغ ہونے کے بعد بلکہ خود مدرس تفسیر وادب ہوجانے کے بعد بھی باقی رہی۔ اور اپنی اس کوتاہی پر پشیمانی رہی جو تحصیل علم کے زمانہ میں ہوتی رہی۔ اس لئے جب ۱۹۴۸ء میں ندوہ میں نیا نیا مدرس ہوکر آیا اور مولانا نائب معتمد کی حیثیت سے ندوہ کی طرف ملتفت ہوئے، اس وقت گذارش کی کہ ہم مدرسین ادب کو کچھ وقت دیا جائے تاکہ عربیت میں ذوق کی تربیت کا کوئی وسیلہ نکلے۔ مولانا نے ازراہ شفقت اس کو قبول فرمایا اور ندوہ کی مسجد میں ایک عمومی حلقۂ درس قائم ہوا۔ کسی کتاب کی قید کے بغیر عام ادبی محاسن کو ذہن نشیں کرانے کے لئے محاضرات کا سلسلہ شروع کیا۔ اس حلقہ میں بہت سے طلبہ بھی ہوتے اور اسی

صف میں بڑی عمر و استعداد کے مدرسین بھی ہوتے تھے۔اس سلسلہ محاضرات میں مولانا نے حماسہ کے چند قصائد کا درس دیا۔اس حلقہ درس میں ادب کے نصوص اور بلاغت پر لکھی ہوئی نادر کتابوں کا تعارف حاصل ہوا۔جیسے العسکری کی کتاب ''الصناعتین ''علی القالی کی ''امالی ''(۱) جاحظ کی مشہور کتابیں ''البخلاء ،البیان والتبیین وغیرہ''لیکن مولانا کا مذاق کہئے یا قرآن کریم سے والہانہ وابستگی کا نتیجہ کہ بات کہیں سے شروع ہو گھوم پھر کر قرآن ہی پر آکر مرکوز ہو جاتی۔وہ بات جو دل سے لگی ہو اور دماغ کی باریک سے باریک رگوں میں پیوست ہو اگر اس کا ذکر آجائے تو طبیعت کا جوش زبان کی روانی اور مضمون کی آمد کا ایک سلسلہ لگ جاتا۔یہ تو یاد نہیں کہ کس کا ذکر تھا مگر اتنا اچھی طرح یاد ہے کہ موضوع یہ تھا کہ اندرونی کیفیات کو کبھی ایک لفظ یا ایک جملہ اس طرح ظاہر کر دیتا ہے جس کی تصویر بڑے سے بڑے قصیدے یا طویل کلام سے بھی نہیں کھینچی جا سکتی۔اس کو بیان کرنے کے لئے قرآن کریم کی سورہ اعراف کی وہ آیتیں پڑھیں جن میں حضرت شعیب علیہ السلام کی دعوت اور دعوت سے انکار کے بعد زلزلہ سے پوری قوم کے ہلاک ہو جانے کا تذکرہ ہے اس کے آخر میں ہے۔

اَلَّذِیْنَ کَذَّبُوْا شُعَیْباً کَاَنْ لَّمْ یَغْنَوْ فِیْهَا ۚ اَلَّذِیْنَ کَذَّبُوْا شُعَیْباً کَانُوْ هُمُ الْخَاسِرِیْنَ۔ فَتَوَلّٰی عَنْهُمْ وَقَالَ یٰقَوْمِ لَقَدْ اَبْلَغْتُکُمْ رِسٰلَاتِ رَبِّیْ وَنَصَحْتُ لَکُمْ فَکَیْفَ اٰسٰی عَلٰی قَوْمٍ کَافِرِیْنَ ۔

(اعراف ۹۲-۹۳)

جنھوں نے شعیبؑ کی تکذیب کی تھی (ان کی یہ حالت ہوگئی) جیسے

---

(۱) اس کتاب کی شرح سمط اللآلی پر علامہ عبدالعزیز میمن کی شرح ایک عظیم تحقیقی کارنامہ ہے، جس کے عربی النسل اساتذہ ادب معترف ہیں۔

ان گھروں میں کبھی بسے ہی نہ تھے۔ جنھوں نے شعیب کی تکذیب کی
تھی وہی خسارے میں پڑ گئے۔ اس وقت وہ (یعنی شعیبؑ) ان سے
منہ موڑ کر چلے گئے اور فرمانے لگے کہ اے میری قوم! میں نے تم کو اپنے
پروردگار کے احکام پہونچا دیئے تھے اور میں نے تمہاری خیر خواہی کی،
پھر ان کافر لوگوں پر کیوں کر رنج کروں۔

اس آیت کے صوتی و بلاغی محاسن کو الفاظ میں بیان کرنا محال ہے۔ اَلَّذِیْنَ کَذَّبُوْا شُعَیْبًا کی تکرار کتنی گہرائی اور رنج والم کی تصویر پیش کر رہی ہے۔ اس کو کس طرح ترجمہ میں نقل کیا جاسکتا ہے۔ مولانا نے فرمایا کہ آیت کریمہ کا آخری ٹکڑا فَکَیْفَ اٰسٰی عَلٰی قَوْمٍ کٰفِرِیْنَ میں صرف یہ لفظ کیف اٰسٰی شفقت نبوی اور رنج وحسرت کے اظہار دونوں سے پوری طرح جلوہ گر ہے کہ ایک پیغمبر جس کے دل میں قوم کا درد ہے۔ جس کی اصلاح حال کے لئے اس نے جان توڑ کوشش کی مگر وہ لوگ مُصر رہے جس کی پاداش میں ان کو تباہ کر دیا گیا، جس کی آگاہی پیغمبر وقت نے دے دی تھی۔ جو انجام کار سامنے آیا وہ پہلے سے معلوم تھا۔ سنت الٰہی کا قطعی علم تھا، مگر پھر بھی وہ اپنے تھے، اپنی ہی قوم کے افراد تھے۔ ان کی تباہی پیغمبر کے لئے فتح مندی نہیں ہے بلکہ ان کا حسرت ناک انجام موجب درد والم ہے۔ یہ تمام نفسیاتی کیفیت اس لفظ کیف اسی میں پورے جمال وکمال کے ساتھ موجود ہے۔

واقعہ یہ ہے کہ اس آیت کو بار بار پڑھا جائے تو حسرت والم کی تصویر سامنے آجاتی ہے اور پیغمبر کے دل کا اندوہ، اس کی شفقت پدری کی تصویر بھی سامنے آتی ہے۔ دوسری طرف حکم ربی سے چارۂ کار نہیں ہے، اس کو یوں سمجھئے کہ ایک شخص اپنے فرزند کو زہر کھانے سے منع کرتا رہا اور بار بار اس کو جتلاتا رہا کہ اس کا نتیجہ موت ہے، مگر وہ لڑکا بات ماننے پر تیار نہیں ہوا۔ پھر جب وہ زہر کھا کر مر جاتا ہے تو اس کا باپ

اس کی لاش پر جاتا ہے اور کہتا ہے کہ آہ میں غم کا اظہار کن الفاظ میں کروں۔ اس جملہ میں اس کے دل کا درد اور صورت حال کا اعتراف دونوں نگاہوں کے سامنے آجاتا ہے۔ یہی صورت حال حضرت شیعبؑ کی نظر آتی ہے جب وہ اپنی تباہ شدہ قوم کی لاشوں اور زلزلے سے تباہ شدہ بستی کے ملبوں کے سامنے کھڑے فرما رہے تھے فَكَيْفَ اٰسٰی عَلٰی قَوْمٍ كَافِرِيْنَ۔

خلاصہ یہ کہ تفسیر کی طرح عربی ادب میں بھی تدریس وتفہیم کا انداز من قلب الی قلب (دل سے نکلے اور مخاطب کے دل میں اتر جائے) جہاں نحو بلاغت کی اصطلاحیں اور لفظ کا شجرۂ نسب حائل نہیں ہوتا، یہ بات ذرا نازک ہے اور ادب وزبان کے متعلق جو عمومی غلط فہمی پھیلی ہوئی ہے اس کے خلاف ہے، اس لئے اگر کسی کی سمجھ میں نہ آئے تو تعجب کی بات نہ ہوگی۔

لذت بادہ نشناسی بخدا تا نچشی



مولانا کا مطالعہ قرآن کریم اور طریق درس

چونکہ "میر کارواں" کا موضوع حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ کی تاریخی ترتیب سے سوانح حیات نہیں ہے، بلکہ سوانح کے وہ زاویے ہیں جو راقم کی یادداشت اور شخصی مطالعہ کا حاصل ہیں۔اس لئے گذشتہ صفحات میں اپنی وابستگی کا ذکر کیا۔اور اب مولانا کے طرز تدریس کو پہلا عنوان بنا رہا ہوں، کیونکہ میرا سابقہ مولانا سے بحیثیت شاگرد کے رہا ہے۔اور آپ کا اختصاصی مضمون تفسیر وادب رہا ہے۔اور راقم انہی دونوں میں آپ کے حلقۂ درس میں شریک رہا ہے، ادب میں آپ کی تعلیم مولانا خلیل عرب صاحب اور علامہ تقی الدین ہلالی مراکشیؒ سے ہوئی، تفسیر آپ نے حضرت مولانا احمد علی لاہوریؒ سے پڑھی، انہی دونوں مضامین (تفسیر وادب عربی) میں مولانا کے طرز تدریس کو اعتماد کے ساتھ ذکر کر سکتا ہوں۔

(الف) تفسیر کے سبق میں تلاوت اور ترجمہ کے بعد اگر کسی آیت کریمہ میں نحوی ترکیب طلبہ کے فہم سے بلند ہوتی، اس کی توضیح فرما دیتے، اسی طرح لفظ کی اسی قدر تحقیق فرماتے جو مفید مطلب ہو، مثلاً حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے متعلق عیسائیوں کے دو گروہ ہیں، ایک وہ گروہ جو سمجھتا ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام اللہ تعالیٰ کے (معاذ اللہ) اسی طرح فرزند ہیں جس طرح ایک باپ کا جسدی فرزند ہوتا ہے، ان

لوگوں کو قرآن نے جواب دیا:

اِنَّ مَثَلَ عِیْسٰی عِنْدَ اللّٰهِ کَمَثَلِ اٰدَمَ ؕ خَلَقَهٗ مِنْ تُرَابٍ ثُمَّ قَالَ لَهٗ کُنْ فَیَکُوْنُ ۔ (آل عمران ۵۹)

بے شک عیسیٰ کی مثال آدم کی سی ہے اسے مٹی سے بنایا پھر اس سے کہا ہو جا، پھر ہو گیا۔

دوسرا گروہ ہے جو اللہ تعالیٰ کی طرف جسدی باپ ہونے کی نسبت نہیں کرتا بلکہ اس کا عقیدہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت عیسیٰ کو اپنا متبنیٰ بنالیا ہے۔

وَقَالُوْا اتَّخَذَ اللّٰهُ وَلَدًا (البقرہ ۱۱۶)

اور انھوں نے کہا، اللہ نے ایک بیٹا بنالیا ہے۔

فرمایا: "اتخذ ولدا" کا صحیح ترجمہ ہے۔ "لے رکھا ہے ایک بیٹا" "بنا رکھا ہے ایک بیٹا" یہاں عیسائیوں کا یہ قول نقل نہیں ہو رہا ہے کہ حضرت عیسیٰ خدا کے فرزند ہیں بلکہ یہ کہ خدا نے ایک بیٹا بنالیا ہے۔ اتخذ کا لفظی مفہوم بعینہ وہی ہے جو انگریزی میں ToAdopt کا ہے۔ مسیحیوں کے یہاں ایک فرقہ ہے جس کو Adoptionist کہا جاتا ہے۔ ان کے مرکزی عقیدہ کے لئے اصطلاح تبنیت کی وضع کی گئی ہے۔

اس انداز کی ضروری تشریح جس کے ساتھ کسی لفظ کا کوئی خاص پس منظر ہو وہ مولانا بتادیا کرتے تھے۔ اس سے زیادہ لفظی تشریح نہیں فرماتے۔ ترکیب نحوی میں جہاں طلبہ کے معیار کو دیکھتے ہوئے وضاحت کی ضرورت محسوس فرماتے وہ بھی بیان کر دیتے مثلاً وَاُشْرِبُوْا فِیْ قُلُوْبِهِمُ الْعِجْلَ بِکُفْرِهِمْ میں اُشْرِبُوْا فِیْ قُلُوْبِهِمْ حُبُّ الْعِجْل کا مفہوم واضح کیا کہ گوسالہ کی محبت ان کے رگ و پے میں رچ گئی تھی، اور بِکُفْرِهِمْ میں "ب" سببیہ ہے۔ یعنی اپنے کفر کے سبب گوسالہ کی محبت میں وہ مست تھے۔ اسی سال سبق کے دوران مولانا رحمۃ اللہ علیہ نے بتایا تھا

کہ قرآن کریم میں لفظ نور جہاں جہاں آیا ہے وہ مفرد کے صیغہ میں ہے اور ظلمات ہمیشہ جمع کے صیغہ میں وارد ہوا ہے، کیونکہ روشنی ایک ہی ہے اور وہ خدا کی بخشی ہوئی روشنی ہے بلکہ وہ خود نور ہے اَللّٰہُ نُوْرُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ اور ظلمتیں اتنی ہیں جن کا شمار نہیں، راقم کے ذہن میں یہ علمی نکتہ درجہ پنجم سے اس درجہ راسخ رہا کہ جب قرآنی الفاظ کی ڈکشنری قاموس الفاظ القرآن الکریم لکھی اس میں بھی نور کے ضمن میں اسی کو ذکر کیا ہے۔

لیکن ان معمولی تشریحات کے علاوہ جس پر زور دیتے وہ قرآن کریم کا دائمی پیغام ہے جو ہر زمانہ ہر جگہ کے لئے ہے۔ اور آج بھی اس درجہ تازہ ہے اور حالات کے مطابق ہے جس طرح نزول کے وقت تھا۔ اور جو واقعات امم سابقہ اور انبیائے سابقین کے بیان کئے گئے ہیں وہ تصویر ہے انسانی عقل کے معارضہ کی جو انبیاء کرام کی دعوت کے مقابلہ میں ہمیشہ سامنے آتا رہا ہے اور جب بھی وہ دعوت اپنی صحیح روح کے ساتھ پیش کی جائے گی وہی صورت پیش آئے گی۔ مثلاً حضرت موسیٰ علیہ السلام کا سامنا جب فرعون سے ہوا اس مکالمہ سے پہلے حضرت موسیٰ علیہ السلام کے اندر ایک بشری جھجک تھی کہ کہیں جھٹلا نہ دیئے جائیں اور ایک قانونی الزام بھی ان کے سر تھا۔ آپ نے سوچا کہ ہوسکتا ہے کہ وہ بات بھی نہ سنے اور سر قلم کرنے کا حکم دیدے۔ لیکن حکم الٰہی اصرار کے ساتھ ہوا تھا۔ کَلَّا فَاذْهَبَا بِآيَاتِنَا اِنَّا مَعَكُمْ مُسْتَمِعُوْنَ خوف کی قطعاً ضرورت نہیں ہے، حکم ہوتا ہے کہ جاؤ اور برملا کہہ دو کہ ہم خدا کے فرستادہ ہیں اس سے مطالبہ کرو کہ وہ بنی اسرائیل کو آزاد کرے (کہ بھیج دے ہمارے ساتھ بنی اسرائیل) فرعون نے بجائے دعوت حق کی طرف التفات کرنے کے پہلے اپنا احسان جتلایا "اَلَمْ نُرَبِّكَ فِيْنَا وَلِيْداً" کیا ہم نے تم کو بچپن میں پالا نہیں؟ وَلَبِثْتَ فِيْنَا مِنْ عُمُرِكَ سِنِيْنَ تو نے ہم میں اپنی عمر کے کئی سال

گذارے۔ "وَفَعَلْتَ فَعْلَتَكَ الَّتِیْ فَعَلْتَ وَاَنْتَ مِنَ الْکَافِرِیْنَ "اور تو اپناوہ کرتوت کر گیا جو کر گیا اور تو ناشکروں میں سے ہے۔ (یعنی ناشکرا ہے) فرعون کی غرض یہ تھی کہ ان احسانات کے بعد اور ایک کھلا ہوا جرم ثابت ہونے کے بعد دربار میں بے محابا آنے کی جرأت کرنا اور اپنی پیغمبری کا دعویٰ کرنا، بڑی جسارت کی بات ہے، حاکم وقت کی متکبرانہ ادا کی یہ تصویر ہے کہ دعوتِ حق کو تو وہ حقیر سمجھتا ہے۔ اور ہر حق بات اس کو چال، مکروفریب معلوم ہوتی ہے۔ کسی ظالم حکومت کو دیکھ لیجئے۔ جہاں آپ نے شہری حقوق کے تقاضے پورا کرنے کا نام لیا فوراً وہ کہنا شروع کریں گے کہ ہم نے تمہاری قوم پر یہ احسان کئے اور وہ احسان کئے۔ اور اپنے سب سے بڑے جرم کو بھول جائیں گے۔ کہ اس نے پوری قوم کو غلام بنا رکھا ہے۔ حضرت موسیٰ کا یہ ارشاد" وَتِلْكَ نِعْمَةٌ تَمُنُّهَا عَلَیَّ اَنْ عَبَّدْتَّ بَنِیْ اِسْرَآئِیْلَ "یہ احسان تو مجھ پر جتا رہا ہے کیا یہی ہے کہ تو نے (پوری قوم) بنی اسرائیل کو غلام بنا رکھا ہے؟ پھر فرعون نے کہا وَمَا رَبُّ الْعَالَمِیْنَ ؟ اور رب العالمین ہے کیا چیز؟ تحقیر کے ساتھ بجائے "من" کے "ما" کہہ رہا ہے جو غیر ذی روح کے لئے آتا ہے۔ یہاں واؤ عطف کا نہیں ہے۔ کیونکہ سلسلہ کلام میں اس سے پہلے معطوف علیہ نہیں ہے۔ بلکہ اس کا مفہوم اردو میں یہ ہوگا۔ اچھا چھوڑو ان باتوں کو یہ تو بتاؤ کہ رب العالمین ہے کیا چیز۔ یہاں فرعون اصلی سوال سے گریز کرنا چاہتا ہے کہ "تم نے بنی اسرائیل کو غلام بنا رکھا ہے"۔ اس کو نظر انداز کر کے ایسی بات کہتا ہے جس سے دعوت دینے والے کو غصہ آجائے۔ اور وہ کوئی ایسی بات کہہ ڈالے جس سے بات کا رخ پھر جائے۔ مگر پیغمبر حق نے وہی کہا اور اسی کو دہراتے رہے جو ان کی دعوت کی روح تھی۔" قَالَ رَبُّ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَمَا بَیْنَهُمَا اِنْ كُنْتُمْ مُّوْقِنِیْنَ "اگر تمہیں یقین آئے (تو کہوں) کہ وہ آسمان وزمین اور ان کے درمیان جو کچھ ہے اس کا رب ہے۔

فرعون اس جواب کو بھی استہزاء کے انداز میں نظر انداز کرتا ہے۔اور اپنے گرد بیٹھنے والوں (ظاہر ہے وہ سرداران حکومت، وزراء قسم کے لوگ ہوں گے) سے کہتا ہے۔ اَلَا تَسْتَمِعُوْنَ؟ کیا تم سنتے نہیں ہو؟ یا اپنی زبان میں یوں کہیے کہ فرعون نے اپنے وزراء سے کہا کہ سنتے ہو یہ کیا کہہ رہا ہے؟ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی جگہ کوئی غیر پیغمبر ہوتا تو رعب میں آجاتا، اور خاموش ہوجاتا، یا پھر کہتا کہ میں کیا غلط کہہ رہا ہوں؟ جو بات میں نے کہی اس میں کیا غلط ہے؟ مگر نہیں۔حضرت موسیٰ علیہ السلام اپنی ہی بات کہتے ہیں جس کا ان کو حکم دیا گیا تھا۔ قَالَ رَبُّكُمْ وَرَبُّ اٰبَاءِكُمُ الْاَوَّلِيْنَ کہا: تمہارا اور تمہارے باپ دادا کا رب ہے۔فرعون اس کا بھی جواب نہیں دیتا ہے اور حضرت موسیٰ علیہ السلام کو الجھانے اور غصہ دلانے کی بات کرتا ہے قَالَ اِنَّ رَسُوْلَكُمُ الَّذِيْ اُرْسِلَ اِلَيْكُمْ لَمَجْنُوْنٌ یہ جو تمہارا رسول ہے جو بھیجا گیا ہے پاگل ہے۔اس صریح ہتک اور گالی کے بعد حضرت موسیٰ علیہ السلام اپنا پیغمبرانہ توازن باقی رکھتے ہوئے فرماتے ہیں: قَالَ رَبُّ الْمَشْرِقِ وَالْمَغْرِبِ وَمَا بَيْنَهُمَا اِنْ كُنْتُمْ تَعْقِلُوْنَ فرمایا: مشرق و مغرب اور جو ان کے درمیان ہے سب کا پروردگار ہے، اگر تم عقل رکھتے ہو۔غرض پورا مکالمہ ظالم حکمراں اور داعی حق کی اس منطقی گفتگو اور طرز کلام کا آئینہ ہے جو ہمیشہ اور ہر دور میں دیکھا جاسکتا ہے۔تفسیری سبق کی ایک تقریر کا یہ مفہوم و اقتباس ہے جس کو میں نے اپنے الفاظ میں نقل کیا ہے۔لیکن طرز اور اسلوب فکر یہی ہے۔

پانچویں درجہ میں جو طرز تدریس ذہن نے قبول کیا وہ قرآن کریم کی عظمت اور عظمت کے ساتھ اس کے جلال و جمال کا وہ شعور ہے جو دل و دماغ پر ہمیشہ محیط رہتا ہے، اور اس کی آفاقیت اور ہمہ گیری غیر مرئی طور پر دل میں اترتی جاتی ہے۔ دوسری اہم خصوصیت یہ دیکھی کہ کبھی مدعیانہ بات نہیں سنی مثلاً یہ کہتے۔میرے نزدیک یہاں پر یہ حرف جر دوسرے جر کے معنی میں ہے، مثلاً رازی نے یہ کہا اور کشاف میں

زمخشری نے یہ کہا اور "میں" یہ کہتا ہوں۔

قرآن کریم کے درس کے زمانہ میں تو ہم طلبہ کا مطالعہ اسی محور پر گھومتا رہا جس قدر استاد نے بتا دیا، مگر جب بیضاوی اور کشاف پڑھ کر فارغ ہو چکے اور دوسری تفسیریں پڑھنے کا وقت آیا تو یہ معلوم ہوا کہ مولانا کا طرز تدریس اس نہج سے مختلف ہے جو ان کے استاد حضرت مولانا احمد علی لاہوریؒ کا تھا۔ حضرت لاہوریؒ کی تفسیر کا اصل جوہر، نظم آیات اور ربط معانی میں کھلتا ہے۔ وہ ہر سورہ کے موضوعات کا تعین فرماتے ہیں اور اس کے حوالے دیتے ہیں کہ یہ موضوع فلاں اور فلاں آیات سے ماخوذ ہیں، پھر ہر رکوع کا مرکزی مضمون ذکر فرماتے ہیں، خود مولانا نے اپنے زمانہ طلب علم اور حضرت لاہوریؒ سے شاگردی کے زمانہ کا ذکر ان الفاظ میں کیا ہے۔

"۱۳۵۱ھ کے شعبان کے آخر یا رمضان کے اوائل میں (۱۹۳۲ء کے غالباً دسمبر میں) میں نے لاہور کے لئے رخت سفر باندھا اور مدرسہ قاسم العلوم کا باقاعدہ طالب علم بن گیا۔ اس درس میں جس میں پورا قرآن مجید پڑھایا جاتا تھا۔ صرف مدارس عربیہ کے فارغین اور منتہی طلبہ شریک ہوتے تھے اور یہ علماء کلاس کہلاتی تھی۔ آخر شعبان سے شروع ہو کر وسط ذی قعدہ تک اس کا سلسلہ جاری رہتا۔ میں جب پہنچا ہوں تو اس درجہ میں پچاس کے قریب طلبہ تھے، جن میں اکثریت دارالعلوم دیوبند کے فضلاء کی تھی۔ انھیں میں ہمارے درس حدیث کے ساتھی مولانا سید صبغۃ اللہ بختیاریؒ بھی تھے۔ یہ درس بڑی محنت اور قوی حافظہ کا طالب تھا کہ ہر رکوع کا خلاصہ اور اس کا ماخذ یاد کرنا پڑتا تھا اور نیا درس شروع ہونے سے پہلے پچھلے درس کا امتحان ہوتا تھا۔ اور جس کی جس رکوع کی باری آجائے اس

کو اس کا خلاصہ مولانا سندھی کے مقرر کیئے ہوئے لفظوں میں اور اس
کا قرآنی ماخذ سنانا پڑتا تھا۔ میرا حافظہ خاندانی طور پر کمزور ہے اس
لئے مجھے بڑی محنت پڑتی تھی۔ اس کے بعد وہاں کی سردی ہوسٹل
کے کھانے کا ذکر اور پھر امتحان میں نمایاں کامیابی، آخر میں سند کے
حصول کا ذکر ہے تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو۔

(کاروان زندگی صفحہ ۱۳۲-۱۳۳ جلد اول)

حضرت مولانا احمد علی لاہوریؒ مولانا سندھی کے شاگرد تھے۔ مولانا سندھی اور مولانا عبد الحمید فراہی کے درمیان اتحاد فکر تھا اور قرآن کریم کی تفسیر کے بارے میں دونوں کا رجحان یکساں تھا۔ اس کا تذکرہ حضرت مولانا سید سلیمان ندویؒ نے حضرت مولانا احمد علیؒ کے ترجمہ کی تقریظ وتصویب کرتے ہوئے فرمایا: جو حضرت لاہوری کے ترجمہ قرآن میں چیدہ ترین علماء کرام کی آراء کے ضمن میں چھپا ہے۔ سید صاحب علیہ الرحمہ اس تقریظ میں تحریر فرماتے ہیں۔

''قرآن پاک کے علوم میں سب سے زیادہ دقیق اور نازک
علم آیات وسور کے باہم ربط کا ہے، امام رازی اور بقاعی نے اس پر
بہت کچھ محنت کی ہے۔ اور دوسرے علماء نے بھی اس میں کافی غور
وخوض کیا، ہمارے زمانے میں مولانا حمید الدین فراہی صاحب
نظام القرآن اور مولانا عبید اللہ صاحب سندھی خاص ذکر کے قابل
ہیں۔ دونوں مدت تک اتحاد مذاق کے باعث کراچی میں باہم ملتے
جلتے رہتے تھے۔ مولانا عبید اللہ صاحب کے درس نے متعدد
باکمال پیدا کیئے جن میں سب سے پہلی جگہ مولانا احمد علی صاحب
امیر انجمن خدام الدین کو حاصل ہے۔ موصوف نے اس درس میں

جو کچھ پایا۔ اس کو وقف عام کر دیا"۔(۱)

حضرت لاہوریؒ کی تفسیر و فہم قرآن کی بنیاد ان دو مذکورہ اقتباس سے معلوم ہوتی ہے۔ اور مولانا سید ابوالحسن علی رحمہ اللہ علیہ کو جو اپنے اساتذہ و شیوخ سے مناسبت تھی اس کا صرف یہی مظہر نہیں ہے کہ مولانا ان کے درس سے مستفیدین کے درمیان سب سے فائق تھے۔ کاروان زندگی کا جو اقتباس اوپر نقل کیا گیا، اس کی چند سطروں کے بعد تحریر فرماتے ہیں:

"اوائل ذی قعدہ ۱۳۵۱ھ اور شروع مارچ ۱۹۳۳ء میں امتحان ہوا مولانا کی دعوت پر خواجہ عبدالحی فاروقی دہلی سے کاپیاں جانچنے کے لئے آئے، تقدیری (۲) بات کہ انھوں نے مجھے سب سے زیادہ نمبر دیئے جو غالباً ستر یا اس سے کچھ اوپر تھے۔ رفقاء نے جو سب مدارس کے فضلاء تھے ایک احتجاجی جلسہ کیا جس میں ممتحن صاحب پر نمبر دینے میں ناانصافی اور جانب داری کا الزام لگایا اس پر حضرت مولانا احمد علی صاحب نے خود کاپیوں کو دیکھنے کا اعلان کیا۔ قسمت کی بات کہ جب انھوں نے کاپیاں دیکھیں تو شرکاء امتحان کے نمبروں میں تھوڑا تھوڑا اضافہ کیا اور میرے نمبر بڑھا کر اٹھانوے کر دیئے۔

۱۵/ذی قعدہ ۱۳۵۱ھ ۱۲/مارچ ۱۹۳۳ء کو مدرسہ قاسم العلوم میں جو ہم لوگوں کی قیام گاہ تھی، اور انجمن خدام الدین دروازہ شیرانوالہ لاہور کے زیر نگرانی اور سرپرستی میں تھا۔ تقسیم اسناد کا جلسہ ہوا۔ مولانا مدنی رحمۃ اللہ علیہ، مولانا کی خاص دعوت پر تشریف لائے اور اپنے

---

(۱) قرآن کریم ۱۳۸۲ھ بہ خلاصہ ہر سورہ و ہر رکوع و ماخذ و ربط آیات مرتبہ حضرت مولانا حاجی احمد علی ص ۸

(۲) فرط تواضع میں اپنے تفوق کو کمتر دکھانے کے لئے تقدیری بات کہنا مولانا کے مزاج کا خوش نما پہلو ہے۔ ع ع ن

دست مبارک سے وہ سند عطا فرمائی جس کا عربی مضمون علامہ انور شاہ کشمیری کا ترتیب دیا ہوا ہے۔ آخر میں خود ان کے، مولانا مدنی کے، اور مولانا شبیر احمد عثمانی اور حضرت مولانا احمد علی لاہوری صاحب امیر انجمن خدام الدین لاہور کے دستخط ہیں"۔

(کاروان زندگی جلد ۱ صفحہ ۱۳۳)

حضرت مولانا احمد علی صاحبؒ سے اس درجہ قربت۔ جس کو جلاء ان کی روحانی سرپرستی نے دیا۔ اور ان کی بے انتہا شفقت کے باوجود مولانا نے اپنے درس میں اپنے استاد کی تقلید نہیں کی۔ نہ دارالعلوم کے درجات میں جہاں وہ پڑھاتے رہے۔ اور نہ عمومی درس قرآن میں، اگر ان کے اندر کوئی رنگ تلاش کیا جائے تو صرف حضرت شاہ ولی اللہ دہلوی علیہ الرحمہ کا رنگ مل سکتا ہے۔

جس طرح شاہ صاحب کی نظر قرآن کے عمومی تذکیر اور اس کی آفاقی دعوت پر ہے اور جیسے وہ فرماتے ہیں کہ نماز کی مشروعیت (داخل شرع ہونا) اللہ تعالیٰ کے ذکر اور مناجات کے لئے ہے جیسا کہ ارشاد ہے اَقِمِ الصَّلٰوۃَ لِذِکْرِیْ (سورہ الحج۔ ۳۷) یعنی نماز میرے ذکر کے لئے قائم کرو۔ اور تاکہ انسان کے حواس وقوی رویت باری تعالیٰ کے لئے آخرت میں تیار ہو سکیں، جیسا کہ حدیث میں ہے۔

"سترون ربکم کما ترون هذا القمر لا تضامون فی رؤیته فان استطعتم ألا تغلبوا علی صلاة قبل طلوع الشمس وصلاة قبل غروبها فافعلوا" (صحیح بخاری ح ۵۵۴)

تم اپنے رب کو اس طرح دیکھو گے جیسے اس چاند کو دیکھ رہے ہو، اس رویت میں کوئی دھندلکہ نہیں ہے جہاں تک ہو سکے فجر اور عصر کی نمازوں سے غافل نہ رہو۔

اور جیسا کہ زکوٰۃ کے بارے میں شاہ صاحب لکھتے ہیں کہ اس کی مشروعیت اس لئے ہے کہ طبیعت کے اندر سے بخل کا مادہ نکلے اور ضرورت مندوں کی ضرورت پوری کرنے کا جذبہ ابھرے۔ اللہ تعالیٰ نے زکوٰۃ نہ ادا کرنے والوں کے لئے فرمایا:

"وَلَا يَحْسَبَنَّ الَّذِيْنَ يَبْخَلُوْنَ بِمَا اٰتَاهُمُ اللّٰهُ مِنْ فَضْلِهٖ هُوَ خَيْرًا لَّهُمْ ۭ بَلْ هُوَ شَرٌّ لَّهُمْ ۭ سَيُطَوَّقُوْنَ مَا بَخِلُوْا بِهٖ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ ۭ (آل عمران ۱۸۰)

اور جو لوگ اس مال میں بخل کرتے رہتے ہیں جو کچھ اللہ تعالیٰ نے اپنے فضل سے دے رکھا ہے وہ ہرگز یہ نہ سمجھیں کہ یہ ان کے حق میں اچھا ہے۔ نہیں بلکہ ان کے حق میں بہت برا ہے یقیناً انھیں قیامت کے روز طوق پہنایا جائے گا اس مال کا جس میں انھوں نے بخل کیا۔

یا یہ کہ حج کی فرضیت اس لئے ہوتی ہے کہ شعائر اللہ کی عظمت لوگوں کے دل نشیں کردی جائے جیسا کہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

اِنَّ اَوَّلَ بَيْتٍ وُّضِعَ لِلنَّاسِ لَلَّذِىْ الخ

(آل عمران ۹۶)

بے شک پہلا گھر جو لوگوں کے لئے بنایا گیا جو کہ ....

یا یہ آیت کریمہ

اِنَّ الصَّفَا وَالْمَرْوَةَ مِنْ شَعَآئِرِ اللّٰهِ

(البقرہ ۱۵۸)

صفا اور مروہ اللہ کے شعائر میں ہیں

اسی طرح قصاص، جہاد، احکام و معاملات کی آیات میں شاہ صاحب کی نظر عمومی حقیقت کی طرف رہتی ہے (۱) بعینہ یہی انداز تفسیر اپنے استاذ محترم مولانا سید

(۱) ملاحظہ ہو مقدمہ حجۃ اللہ البالغہ

ابوالحسن علیؒ کے یہاں دیکھا اور طالب علمی کے زمانہ سے اب تک یہی رنگ ان پر غالب ہے۔ یہی نہیں بلکہ تمام دینی واختلافی مسائل میں ان کی نظر ایک عمومی حکم پر رہتی ہے۔ ان کا پہلا دعوتی رسالہ ''دعوتان متنافستان'' دیکھئے اس میں حق وباطل کا معرکہ کسی خاص واقعہ سے متعلق نہیں ہے۔ بلکہ ایمان کی دعوت اور اس کے مقابلہ میں جاہلیت کی دعوت دونوں کے مزاج سے بحث کی ہے اور جس طرح شاہ صاحب نماز، روزہ، حج، زکوٰۃ کی مشروعیت پر کوئی آیت اور احادیث پیش کرتے ہیں۔ مولانا بھی سیرت وسیر صحابہ کا کوئی واقعہ بطور استشہاد لے آتے ہیں اس کی ایک تازہ مثال ہے کہ رد شیعیت میں سیکڑوں کتابیں مناظرنہ انداز میں لکھی گئی ہیں جن میں شیعہ عقائد، ان کی صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم کی شان میں گستاخی و بے ادبی، تقیہ اور متعہ کا ان کی کتابوں سے ثابت ہونا، اور اس کی نوعیت پر بحث ہوتی ہے، زیادہ تر ان کے عقائد شنیعہ کو ان ہی کی کتابوں سے ثابت کیا گیا ہے۔ اس طرز کی بیسوں نہیں بلکہ سیکڑوں کتابیں مناظرانہ انداز کی موجود ہیں، مگر اس موضوع پر مولانا کا رسالہ ''صورتان متضادتان''(۱) ''دومتضاد تصویریں'' ایک عمومی رنگ لئے ہوئے ہے۔ اور اس میں اصولی باتیں ہیں جن کو عقل عام تسلیم کرے اور پھر کسی مناظرہ کی ضرورت بھی نہ رہ جائے (۲) یہی حال تفسیر کا ہے۔ ان کے درس تفسیر میں انسانیت کے لئے عام دعوت جو ہر زمانہ اور ہر مقام کے لئے یکساں طور پر فطرت کا تقاضہ بن کر سامنے آتی ہے، نمایاں ہے۔

---

(۱) یہ کوئی مستقل کتاب نہیں تھی بلکہ مولانا محمد منظور نعمانیؒ کی ردّ شیعیت پر کتاب کا مقدمہ تھا۔ اس مقدمہ کے شاہزادہ طلال بن عبدالعزیز نے اپنے خرچ پر ۵۰ ہزار نسخے چھپوائے۔

(۲) یہی وجہ ہے کہ ایران وہند کے شیعہ علماء اور اہل قلم نے اس کا نوٹس لیا اور اس کے جواب میں دس سے زیادہ رسائل شائع ہو چکے ہیں بقیہ اعتراضات تو وہ ہمیشہ سے سنتے آئے ہیں، اور اس پر مناظرے ہو چکے ہیں اور اپنی ضد پر قائم ہیں۔

حضرت مولانا احمد علی صاحب علیہ الرحمہ سے خصوصی استفادہ کے بعد بھی ان پر تفسیر کے معاملہ میں شاہ ولی اللّٰہی رنگ غالب رہا، اس کی توجیہ صرف یہی ہو سکتی ہے کہ مولانا کے مزاج کا رخ خاندانی طور پر یہی ہے۔ پھر ہوش سنبھالتے ہی مسلمانوں کے جہاد میں کارناموں کا گھر میں پڑھا جانا۔ (فتوح الشام وغیرہ) خود خاندانی بزرگوں کا ۲۵ ہزار اشعار میں رزمیہ داستان (صمصام الاسلام) تیار کرنا۔ گردو پیش اسی کا چرچہ ہونا، ایسا تھا کہ اسلام کی عالمگیر محبت رگ و پے میں سرایت کر گئی۔ لہٰذا جزئیات سے بحث، عقائد باطلہ میں سے الگ الگ ہر عقیدہ کی مذمت کے بجائے الکفر ملة واحدة کے تحت کفر کے مجمل و مفصل سے نفرت نے سب کو ایک کٹہرے میں کھڑا کر دیا۔

ایک خاص بات اس سلسلہ میں قابل ذکر ہے کہ مولانا کا تفسیر کے معاملہ میں رجحان رازی اور بقاعی کے یا مولانا عبید اللہ سندھی صاحب کے نظام آیات کی طرف نہ ہونا اس بات کی دلیل نہیں ہے کہ وہ اس رنگ کے مخالف ہوں، یا جو ان کی تفسیر و قرآن فہمی کا رخ ہے وہ مولانا احمد علی صاحب لاہوریؒ کا متعارض ہے۔ واقعہ صرف یہ ہے کہ تفسیر کے ہر زاویہ فکر کو دیکھنے کے بعد جو زاویہ طبیعت نے قبول کیا وہ شاہ صاحب کا تھا۔ اور اسی کو مزاج و ذوق کے ہم آہنگ پایا۔ اس لئے کسی دوسرے زاویے کا انکار یا استخفاف نہیں ہوتا۔ بہر حال نوعیت تفسیر اپنی جگہ پر ہے مگر سب کچھ یہی نہیں ہے، جو بات مولانا کے درس کو ممتاز کرتی ہے۔ اس میں دخل مضامین کی آمد اور نکات کے بیان کا نہیں، بلکہ قرآن سے قلبی اور روحانی شغف کا براہ راست اثر تھا۔ تعلق باللہ اور محبت و یقین کی قوت سے ایک قسم کی سکینت کا نزول تھا۔ جو غیر مرئی طور پر اثر انداز ہوتا تھا۔ مولانا نے جس انداز سے قرآن کریم کی تفسیر پڑھی اس سے ان کے مزاج کا ہم آہنگ نہ ہونا میرے لئے ایک عقدہ تھا۔ جس کا حل اپنی عقل کے مطابق اوپر لکھ رہا ہوں۔ اس مسودے کی آخری ترتیب کے وقت حسنی

خاندان کے ایک نوجوان فاضل مولوی سید محمود حسن حسنی سلمہ نے مولانا کا ایک قدیم مضمون دکھایا جو رسالہ صبح صادق (لکھنؤ) کے قرآن نمبر میں شائع ہوا تھا۔ ”میرے مطالعہ قرآن کی سرگذشت“ اس کو نقل کرنا بہت مناسب ہوگا وہ مضمون یہ ہے:

میرے مطالعہ قرآن کی سرگذشت

”میں نے بچپن میں ناظرہ قرآن اسی طرح پڑھا جیسے مسلمان گھرانوں میں اب تک دستور رہا ہے۔ قرآن مجید پختہ ہو جانے کے بعد اس کی تلاوت کرتا تھا، لیکن باوجود بزرگوں کی تاکید کے کبھی اس کی پابندی نہ کر سکا جب میری عربی تعلیم کا سلسلہ شروع ہوا اور کچھ عربی کی شد بد ہوئی تو قرآن مجید کی آیتیں کچھ کچھ سمجھنے لگا، میرے استاد شیخ خلیل بن محمد عرب قرآن مجید کا بڑا پاکیزہ ذوق رکھتے ہیں، ان کو اس کا بڑا اشغف ہے۔ اس زمانہ میں وہ اکثر ہماری مسجد میں صبح کی نماز پڑھاتے تھے، ان کا نسبی تعلق عرب کے اس قبیلہ سے ہے جس کے متعلق حدیث میں آتا ہے اتاکم اهل اليمن ارق افئدة و الين قلوباً اللہ تعالیٰ نے ان کو رقت اور اثر پذیری کی دولت سے حصۂ وافر عطا فرمایا ہے قرآن مجید پڑھتے ہیں تو قابو میں نہیں رہتے، آنکھوں سے بے اختیار آنسو جاری ہو جاتے ہیں۔ آواز گلوگیر ہو جاتی ہے ان کے اندر درد کوٹ کوٹ کر بھرا ہے آواز بھی بڑی دردناک اور لہجہ بڑا پر تاثیر ہے، مجھے خوب یاد ہے کہ فجر کی نماز میں وہ آخری پاروں کی کوئی بڑی سورہ شروع کرتے لیکن فرط تأثر اور شدت گریہ سے اس کو مکمل کرنے کی نوبت کم آتی اور سامعین کو حسرت رہ جاتی کہ وہ پوری سورہ نہیں سن سکے۔

میری تعلیم قرآن کا آغاز بھی انہی کے یہاں ہوا، شیخ پر توحید کا بڑا غلبہ تھا اور وہ بڑا کھرا اور صاف عقیدہ رکھتے تھے اور اپنے شاگردوں کو بھی اسی عقیدہ کا قائل بنانا

چاہتے تھے، یہ اللہ تعالیٰ کا بڑا احسان ہے کہ اس نے ایسے صحیح العقیدہ آدمی سے پڑھنے کا موقع عطا فرمایا۔ سورہ زمر جس میں توحید کی بڑی صاف اور طاقتور تعلیم ہے ان کی محبوب اور منتخب سورہ تھی، جب ہم لوگ عربی میں کچھ چلنے لگے تو انھوں نے اس سورہ کا درس شروع کیا اس کے بعد سور مومن سورہ شوریٰ پڑھائی، عرب صاحب کو چند خاص رکوعوں سے خاص عشق تھا، جو خاص جوش اور لطف سے پڑھتے تھے، ان میں سورہ آل عمران کا آخری رکوع اِنَّ فِیْ خَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَاخْتِلَافِ الَّیْلِ وَالنَّهَارِ لَاٰیٰتٍ لِّاُولِی الْاَلْبَابِ جس کے متعلق حدیثوں میں آتا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم جب پچھلے پہر کو تہجد میں اٹھتے تھے تو نماز سے پہلے ان آیتوں کو پڑھتے تھے اور سورہ فرقان کا آخری رکوع وَعِبَادُ الرَّحْمٰنِ الَّذِیْنَ یَمْشُوْنَ عَلَی الْاَرْضِ هَوْنًا وَّاِذَا خَاطَبَهُمُ الْجَاهِلُوْنَ قَالُوْ سَلَامًا خاص طور پر یاد ہیں اور عرب صاحب کا پر درد اور پر تاثیر لہجہ گویا کان میں گونج رہا ہے، عرب صاحب سے سنتے سنتے ہم کو بھی یہ رکوع اچھے معلوم ہونے لگے اور اس طرح سے قرآن مجید سے ایک ذوقی تعلق پیدا ہوا۔

جب عربی کی استعداد پیدا ہوگئی تو تلاوت میں کچھ جی لگنے لگا اس وقت ہمارے خاندان میں کچھ ایسے خاص حالات پیش آئے تھے کہ قرآن مجید کی بہت سی آیتوں کی خود تفسیر ہوتی تھی، اور یہ صاف نظر آتا تھا کہ اللہ تعالیٰ کا قانون مجازات بڑا عالمگیر و ہمہ گیر ہے قوموں اور جماعتوں کے عروج وزوال میں ان کے اعمال و کردار کو بہت بڑا دخل ہے، اور اِنَّ اللّٰهَ لَا یُغَیِّرُ مَا بِقَوْمٍ حَتّٰی یُغَیِّرُوْا مَا بِاَنْفُسِهِمْ ایک ابدی صداقت ہے اس وقت قرآن مجید کی تلاوت میں یہ صاف محسوس ہونے لگا کہ یہ ایک زندہ کتاب ہے اور اس میں زندہ انسانوں ہی کے حالات و واقعات ہیں، یہ زندگی کا ایک مرقع ہے جس میں ہر شخص اپنی تصویر پا سکتا ہے، اور اپنے کو

تلاش کرسکتا ہے، سورہ انبیاء کی یہ آیت لَقَدْ اَنزَلنآ اِلَیکُمْ کِتٰباً فِیهِ ذِکرُکُمْ
کی مختلف تفسیریں ہیں، ان میں سے ایک تفسیر یہ بھی ہے کہ فیہ حدیثکم (اس
میں تمہارا تذکرہ ہے) اسی بنا پر ایک جلیل القدر تابعی حضرت احنف بن قیسؒ نے
ایک دن یہ آیت سن کر قرآن شریف منگوایا اور کہا لاؤ دیکھوں میرا اس کتاب میں کن
الفاظ میں تذکرہ ہے کچھ ورق گردانی کے بعد وہ اس آیت پر جا کر رک گئے اور انھوں
نے کہا مجھے اپنا تذکرہ مل گیا وہ آیت یہ تھی۔

وَاٰخَرُوْنَ اعْتَرَفُوْا بِذُنُوْبِهِمْ خَلَطُوْا عَمَلاً صَالِحاً
وَّاٰخَرَ سَيِّئاً ۔ عَسَى اللّٰهُ اَنْ يَّتُوْبَ عَلَيْهِمْ ۔ اِنَّ اللّٰهَ
غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ۔ (سورہ توبہ۔۱۰۲)

یہی مجھے صاف نظر آتا تھا کہ اس عجیب و غریب کتاب میں قوموں، خاندانوں
اور افراد کا تذکرہ اور ان کے عروج و زوال کے اسباب اور وجوہ موجود ہیں اپنی کم ہمتی
اور کوتاہی علم کی وجہ سے چونکہ قوموں کی تاریخ پر نظر نہیں تھی اور واقفیت کا دائرہ محدود تھا
اس لئے اپنے خاندان اور حلقہ تعارف کے اندر قرآن کی صداقت صاف نظر آتی تھی
اس انکشاف سے قرآن مجید سے دلچسپی اور وابستگی میں خاص اضافہ ہوا، اس زمانہ
میں مجھے یاد آتا ہے کہ سورہ مائدہ، سورہ انعام، سورہ اعراف خاص طور پر لطف لے کر
پڑھتا تھا۔

میری تعلیم کے سلسلہ میں ایک عجیب اتفاق ہوا جس کو میں محض حسن اتفاق
نہیں تائید غیبی کہوں گا کہ میں نے ایک ایک فن کی علاحدہ علاحدہ تحصیل کی اور مخلوط
نصاب پڑھنے کا اتفاق نہیں ہوا، ہمارے صاحبِ نظر اور صاحب ذوق استاذ خلیل
عرب صاحب نے سب سے پہلے عربی ادب کی تکمیل کرائی چنانچہ عربی زبان کی
ابتدائی ریڈر المطالعہ العربیہ سے نہج البلاغہ و حماسہ اور دلائل الاعجاز تک تین سال تک

کاملاً عربی ادب اور اس کے متعلقات ہی پڑھتا رہا، صحیح الذوق استاذ کے فیض صحبت اور عربی ادب کی شبانہ روز مصاحبت سے عربی زبان وادب سے ایسی مناسبت ہوگئی کہ اس کی حلاوت اور لذت محسوس ہونے لگی اور کسی لطیف کلام کی لطافت کے لئے کسی دلیل کی ضرورت نہ رہی، اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ قرآن مجید کا اعجاز وجدانی وذوقی طور پر محسوس ہونے لگا اور وہ ایک ایسی بدیہی حقیقت بن گئی جس کے لئے قطعاً کسی خارجی شہادت کی ضرورت باقی نہ رہی، اس کا ایک ایک لفظ پکار پکار کر کہتا ہے کہ وہ اللہ کا کلام ہے اور ساری دنیا کا انکار اور شک بھی اس پر اثر انداز نہیں ہوسکتا، عربی زبان وادب کے اشتغال کا یہ فیض کچھ کم فیض نہیں کہ اس سے قرآن مجید کا صحیح ذوق پیدا ہوا اور اس کا سارے ادبی ذخیرہ میں نرالا پن اور البیلا پن صاف نظر آنے لگا، اس فیض کے لئے میں اپنے محسن استاذ اور اپنے مربی اور شفیق بھائی کا مدۃ العمر ممنون احسان رہوں گا۔

روح پدرم شاد کہ فرمود بہ استاذ
فرزند مرا عشق بیاموز دگر ہیچ

میرے خیال میں ہمارے عربی مدارس میں جس طرح عربی زبان وادب کی تعلیم دی جاتی ہے اس سے یہ نتیجہ حاصل نہیں ہوسکتا، زبان کا صحیح ذوق پیدا کرنے اور اس کا لذت آشنا بنانے سے قدیم نصاب کی وہ بے جان اور وہ بے رونق کتابیں نیز معانی وبیان کی وہ تالیفات بالکل قاصر ہیں جو عربیت کے دور انحطاط میں تالیف ہوئیں اور جن کے مصنف عجمیت کے زخم خوردہ ہیں، ان کتابوں کی بنیاد پر اور فن و بلاغت کے سہارے پہلے قرآن مجید کا اعجاز اور پھر اس کی لطافت وبلاغت کا سمجھنا تقریباً ناممکن ہے اور اگر اس میں کوئی استثناء ہے تو محض خارق عادت اور الشاذ کالمعدوم کے حکم میں ہے۔

ادب کے نصاب کی تکمیل کے بعد جو شیخ خلیل عرب کا طبع زاد اور خود ایجاد تھا مجھے خوش قسمتی سے علامہ تقی الدین ہلالی مراکشی کی صحبت میسر آئی جو عربیت اور نحو میں عصر حاضر کے یگانہ اشخاص میں سے تھے۔ اور ان کو امام فن کہنا بجا ہوگا۔ ادب کے بعد میں نے کچھ فقہ کی تعلیم حاصل کی اور دو سال ندوۃ العلماء میں مولانا حیدر حسن خاں صاحب کے درس میں حدیث کی تکمیل کی اسی زمانہ میں کچھ تفسیر بیضاوی کا حصہ مولانا سے پڑھا جو درس نظامی کے بڑے فاضل استاذ اور کہنہ مشق مدرس تھے کچھ عرصہ کے لئے میں نے لاہور جا کر مولانا عبید اللہ صاحب سندھی کے طرز پر ان کے شاگرد ارشد مولانا احمد علی صاحب کے تفسیر کے درس میں شرکت کی، اس درس پر قرآن مجید سے سیاسی نکات کے استنباط کا ذوق غالب تھا، اس طرز سے مجھ کو زیادہ مناسبت نہیں ہوئی لیکن مولانا کے اخلاق ان کی زاہدانہ زندگی اور ان کے جذبہ توحید سے بہت نفع ہوا۔

لاہور سے آنے کے بعد اور حدیث سے فارغ ہونے کے بعد کا زمانہ کلیۃً تفسیر کے مطالعہ میں گذرا، میں یہ کہنا بھول گیا تھا کہ میں نے شیخ الاسلام بن تیمیہؒ کی بعض مختصر تفسیریں اور مولانا حمید الدین فراہی کے رسائل بھی پڑھے اب سارا وقت تفاسیر کے مطالعہ میں گذرنے لگا، زیادہ تر خود مطالعہ کرتا تھا، اور جو اشکال پیش آتا اس کو دوسری کتابوں سے حل کرنے کی کوشش کرتا اس زمانہ میں تفسیر جلالین، نیز علامہ بغوی کی ضخیم تفسیر معالم التنزیل، علامہ زمخشری کی کشاف کا لفظ لفظ پڑھا۔ علامہ نسفی کی مدارک کا نصف حصہ تو مجھے یاد ہے لفظاً لفظاً پڑھا، دوسرے حصہ پر نظر ڈالی۔

تفسیر کے مطالعہ کے سلسلہ میں ایک عجیب تجربہ یہ ہوا کہ ہر شخص کی کسی ایک کتاب سے تشفی نہیں ہوسکتی ذہن وعقلیت کے مدارج اتنے مختلف اور متضاد ہیں کہ ایک شخص سب کو بیک وقت مطمئن نہیں کرسکتا۔ بعض اوقات ایک غبی آدمی کو ایک

شبہ پیش آتا ہے، ذہین آدمی کا ذہن بھی اس شبہ کی طرف منتقل نہیں ہوتا وہ اس سے تعرض کئے بغیر گذر جاتا ہے، میرے بعض اشکالات معروف تفسیروں سے حل نہیں ہوئے کسی حاشیہ یا کسی غیر معروف تفسیر میں ان کا جواب مل گیا، اس سلسلہ کی تفصیلات طویل ہیں۔

جب دار العلوم ندوۃ العلماء میں قرآن مجید کا درس میری حقیر ذات سے متعلق ہوا تو تفسیر کا زیادہ گہرا مطالعہ کرنے کا موقعہ ملا، اس زمانہ میں علامہ آلوسی کی تفسیر روح المعانی سے بڑی مدد ملی ایک تجربہ یہ ہوا کہ تفسیر کبیر ہمارے جدید حلقوں میں جس قدر بدنام ہے یہاں تک کہا گیا ہے فیہ کل شئ الا التفسیر، اس بدنامی وحقارت کی وہ ہرگز مستحق نہیں بہت سے زوائد کے باوجود اس میں بعض بڑی کام کی باتیں ہیں اور بعض ایسی چیزیں ہیں جو عام کتابوں میں نہیں ملتیں، اس زمانۂ تدریس میں اگرچہ احیاناً بعض اور تفسیروں کے دیکھنے کا بھی اتفاق ہوا مثلاً ابوحیان کی البحر المحیط لیکن ان کا ذہن پر کوئی خاص اثر نہیں۔ علامہ رشید رضا کی تفسیر المنار بھی قابل استفادہ ہے اور اس سے بھی جدید مباحث میں مدد مل سکتی ہے مدرسانہ نقطۂ نظر سے فی الجملہ بڑی مفید ثابت ہوئی اعراب القرآن سے بھی کافی مدد ملی۔

اس وقت تک مولانا عبدالماجد دریابادیؒ کی تفسیر ماجدی شائع نہیں ہوئی تھی، انگریزی میں ان کے حواشی تیار ہو رہے تھے، مجھے بعض اشکالات کے سلسلہ میں جن کا تعلق قدیم تاریخ اور دوسرے مذاہب وصحف سے تھا کبھی کبھی استفادہ کے لئے دریاباد جانے کا اتفاق ہوا، اور بعض بڑی کام کی باتیں معلوم ہوئیں۔ اب یہ معلومات تفسیر ماجدی میں نشر ہو چکی ہیں۔ اور قرآن مجید کے طالب علم کے لئے اس کا مطالعہ نہایت مفید ہے، خصوصاً ان لوگوں کے لئے جن کے پاس اصل ماخذ کی طرف رجوع کرنے کا وقت یا ذریعہ نہ ہو۔

زمانہ تدریس کے بعد جب اپنی بعض علمی ضرورتوں کی بناپر تفسیر طبری کے دیکھنے کا اتفاق ہوا تو آنکھیں کھل گئیں، اور معلوم ہوا کہ یہ نہ صرف تفسیر کا بلکہ تاریخ وادب کا بھی ایک وسیع کتب خانہ ہے جس کا کسی کے پاس موجود ہونا ایک نعمت عظمیٰ ہے۔ عرب جاہلیت کے عادات، عقائد، معاشرت اور احکام قرآنی کا ماحول اور پس منظر جاننے کے لئے اس سے زیادہ مستند اور وسیع ذخیرہ نہیں۔

اس سلسلہ میں بڑی کوتاہی وناسپاسی ہوگی اگر ایک ایسی کتاب کا ذکر نہ کیا جائے جو اگر چہ کوئی مفصل تفسیر نہیں ہے لیکن فہم قرآن کا بہت بڑا نمونہ ہے اور تفسیر کے طالب علموں کے لئے ایک نادر تحفہ ہے شاید بہت سے قارئین کا ذہن متوجہ نہ ہو، یہ حضرت شاہ عبدالقادر علیہ الرحمہ کا ترجمہ ہے اس کی قدر ان لوگوں کو ہوسکتی ہے جو تفسیر کا تفصیلی اور اعلیٰ مطالعہ کر چکے ہوں اور ان کو مشکلات قرآن کا اندازہ ہو، اور یہ معلوم ہو کہ اہل تفسیر کو قرآن مجید کے بعض مطالب کے ادا کرنے میں اور اس کے بعض مفردات کی شرح وتفسیر میں کیسی کیسی دقتیں پیش آتی ہیں، اس کے بعد جب وہ شاہ صاحب کا ترجمہ پڑھیں گے تو ان کو اندازہ ہوگا کہ شاہ صاحب نے کس خوبی اور کامیابی کے ساتھ ان مشکلات کو عبور کیا ہے اور ان قرآنی الفاظ کے لئے وہ اردو کے کیسے موزوں الفاظ لے آئے ہیں، جو بعض اوقات بالکل برمحل معلوم ہوتے ہیں اس کے لئے مثال کے طور پر صرف ایک آیت پیش کرتا ہوں سورہ شعراء کی آیت ہے قَالُوا بِعِزَّةِ فِرْعَوْنَ إِنَّا لَنَحْنُ الْغَالِبُوْنَ عربی میں عزت کا لفظ نہ صرف غلبہ کا مرادف ہے اور نہ صرف شرف کا اور دونوں لفظ مل کر بھی اس موقع پر اس مفہوم کو ادا نہیں کر سکتے، زمخشری جیسے صاحب ذوق اور راسخ الفہم ادیب کو بھی اس کا پورا مترادف نہیں مل سکا، شاہ صاحب نے اس کا جو ترجمہ کیا ہے اس میں اس لفظ کی صحیح ترجمانی آگئی ہے، وہ فرماتے ہیں: ''اور بولے کہ فرعون کے اقبال سے ہم ہی زبر

رہیں گے“ یہی اس آیت کا صحیح ترجمہ ہے، شاہ صاحب کے بعد جس نے بھی اس ترجمہ کو اختیار کیا سب نے شاہ صاحب کے تتبع میں اختیار کیا یہ ایک مثال ہے۔ شاہ صاحب کے ترجمہ میں ایسے نوادر اور جواہرات بہت ملتے ہیں، ہمارے استاذ مولانا حیدر حسن صاحبؒ فرماتے تھے کہ مدرسہ سہارنپور کے بانی مولانا محمد مظہر صاحب نانوتویؒ سب تفسیریں پڑھانے کے بعد آخر میں شاہ صاحب کا ترجمہ پڑھاتے تھے۔

ان تعلیمی تجربات میں اب اتنا اضافہ کرتا ہوں کہ قرآن مجید کے فہم کا اصل دروازہ تب کھلتا ہے۔ جب آدمی بغیر کسی انسانی حجاب کے اس کلام کے ذریعہ صاحب کلام سے ہمکلام ہو اس کا راستہ قرآن مجید کی بکثرت تلاوت ہے اور نوافل اور ان بندگان خدا کی صحبت جو اس کتاب کے حقیقی لذت آشنا اور حقیقت شناس ہیں، اور جن کے رگ و پے میں یہ کلام بس گیا ہے، ضرورت اس کی ہے کہ پڑھنے والا اس کتاب سے براہ راست تعارف وانس حاصل کرے اور اس کو ایسا محسوس ہو کہ براہ راست مخاطب ہے شاعر نے کچھ غلط نہیں کہا کہ۔

ترے ضمیر پہ جب تک نہ ہو نزول کتاب
گرہ کشا ہے نہ رازی، نہ صاحب کشاف

مضامین قرآن

ہماری جماعت کے طلبہ جب دار العلوم کے درجہ ششم میں پہونچے (۴۱۔ ۱۹۴۰ء) تو قرآن کا گھنٹہ مولانا کے یہاں تھا، اس میں بجائے ترجمہ وتفسیر پڑھانے کے، مولانا نے مضامین قرآن سے روشناس کرانے کا سلسلہ شروع کیا۔ پہلے تو طلبہ کو ہدایت کی کہ مختلف موضوعات پر قرآن کریم کی آیات جمع کریں۔ مثلاً توحید، رسالت

،آخرت، ہر ایک کو ایک عنوان دیا گیا، مگر طلبہ نے جس میں یہ کمزور وحیلہ جو سب سے آگے تھا۔ بجائے قرآن مجید کی خود تلاوت کر کے ایسی آیات جمع کرتا جن کی ہدایت کی گئی تھی۔ حضرت مولانا احمد علی لاہوریؒ کے حواشی ربط آیات اور حضرت شاہ عبدالقادر دہلویؒ کا ترجمہ ڈھونڈ نکالا اس کے ابتدائی صفحات میں ہر عنوان کے تحت آیات جمع کردی گئی ہیں۔ اسی طرح ڈپٹی نذیر صاحب مرحوم کے ترجمہ(۱) کی ابتدا میں بھی اس طرح کے عناوین قائم کر کے مضامینِ قرآن جمع کئے گئے ہیں، ظاہر ہے ایک استاذ فن کے لئے طلبہ کی یہ سہل انگاری پسندیدہ نہیں ہوسکتی تھی۔ اس لئے بجائے اس کے کہ طلبہ سے یہ کام لیتے خود ہی مضامین قرآن پر مقالات لکھنا شروع کئے اور ایک اچھا مجموعہ تیار ہوگیا۔(۲) ان مقالات میں پہلا مقالہ ''قرآن کا تعارف خود قرآن کی زبان سے'' اس کے بعد دوسرا ''قرآن سے استفادہ کے شرائط اور اس کے موانع''۔ تیسرا ''اعجاز القرآن''۔ چوتھا ''قرآن کا مرکزی مضمون''۔ پانچواں ''قرآن مجید کی پیش گوئیاں''۔ چھٹا ''توحید، رسالت اور معاد'' تھے۔ ان مضامین کو بعد میں شائع کردیا گیا تھا۔ اور اس میں کچھ اضافے بھی ہوئے ہیں۔ ''مضامین قرآن'' میں ایک حد تک حضرت مولانا احمد علی لاہوریؒ کے انداز کا سراغ ملتا ہے، لیکن پوری چھاپ ان کے طرز کی نہیں ہے۔ جہاں قرآن مجید سے استفادہ کے شرائط اور موانع کا بیان ہے وہاں بجائے نام لے کر یہود و مجوس اور نصاریٰ کی تعیین کے ایک عمومیت دی گئی ہے۔ جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ موانع کے وجوہ استکبار و عصیان اور عدم انقیاد ہیں۔ جس نے یہود و مجوس کو قرآن کے استفادہ سے محروم رکھا۔ اور یہ بات جہاں پائی جائے گی۔ قرآن سے استفادہ ممکن نہ

---

(۱) ڈپٹی نذیر احمد صاحب کا ترجمہ دلی کی روزمرہ زبان میں ہے علماء نے اس کو رد کردیا ہے۔
(۲) جس کا نام مطالعہ قرآن کے اصول و مبادی ہے۔

ہوگا۔ پھر بھی قرآن کے مرکزی مضمون توحید و رسالت، ایمان بالغیب پر جو مقالات مرتب ہوئے ان میں حضرت لاہوریؒ کے اسلوب سے کسی درجہ میں مماثلت تلاش کی جاسکتی ہے۔ مضامین قرآن پڑھنے کے بعد اسی موضوع پر ایک صاحب کا رسالہ دیکھا جس کو انھوں نے اپنے ترجمہ قرآن کا مقدمہ بنایا ہے۔ اس کو پڑھ کر معلومات میں کوئی اضافہ نہیں ہوا۔ اور مولانا کے ان مضامین کی عظمت بڑھ گئی۔ ندوہ کے درس قرآن کے بعد مولانا نے مضامین قرآن کے مختلف مضامین پر اور بھی مقالات تحریر فرمائے ہیں جو ان کے طرز فہم اور طرز تدریس کا نمائندہ ہیں۔ المعهد العالي للدعوة والفكر الاسلامی کے لئے انبیائے کرام کے منہج دعوت پر محاضرات کا ایک سلسلہ شروع کیا جس میں حضرت یوسفؑ کے طرز دعوت پر جو روشنی ڈالی ہے وہ مطالعہ قرآن میں ایک نئی یافت ہے۔ اسی طرح دعوت کے مختلف مناہج کا ذکر کیا ہے جو قرآن کریم کے مطالعہ کے لئے رہنما اصول کا کام دے سکتے ہیں، اس ضمن میں سورۂ کہف کے ان چار واقعات (قصص) کی علمی وفنی تحلیل وتجزیہ کا نام بھی لیا جاسکتا ہے جو فکر کی نئی راہ کھولتے ہیں۔

مولانا کا طرز تدریس ان کے مطالعہ قرآن کی نوعیت کا نمائندہ تھا۔ اور یہ طرز مطالعہ ان کی ذہانت، طباعی، جودتِ فکر اور قرآن کریم سے شغف کی بھی نشاندہی کرتا ہے۔ ہر زمانہ اور تمام حالات میں قرآن کریم سے ہدایت طلبی اور ہر عقدہ مشکل کی قرآن سے گرہ کشائی پر یقین مولانا کے مزاج میں رچ گیا ہے۔ اس کا سبب جو بھی ہو، خاندانی مناسبت، یا تعلق باللہ کی بناء پر اللہ تعالیٰ کا خصوصی انعام وفضل کہ وہ قرآن کریم سے اس جگہ سے وہ نکتہ حاصل کر لیتے ہیں جہاں عام نگاہیں نہیں جاتی ہیں۔ اس سلسلہ میں مضامینِ قرآن کا ایک محاضرہ مثال کے طور پر یہاں دیا جاتا ہے۔

محاضرہ

قرآن مجید کا سب سے پہلا اور بڑا معجزہ اسلام ہے

قران مجید نے دنیا میں مذہب وعقائد کا ایک آخری ہدایت نامہ پیش کیا ہے، جس سے زیادہ محکم اور مفصل مذہبی ہدایت نامہ دنیا میں آج تک پیش نہیں ہوا، اس سے پہلے کے مذاہب بھی (چونکہ وہ اپنے اپنے وقت کے لئے تھے) اس لئے اس کے مقابلہ میں ناقص ہیں، اور چونکہ آسمان کا آخری صحیفہ زمین پر آچکا ہے، اس لئے یہ آخری ہدایت نامہ ہے۔ اس سے زیادہ انسان کو اپنے خالق سے مربوط کرنے والا، اور اس کی زندگی میں للّٰہیت اور روحانیت پیدا کرنے والا، ان تمام گمراہیوں اور بے اعتدالیوں سے دور رکھنے والا، جس میں مذہبی قومیں مبتلا ہوئیں، اور مبتلا ہیں، کوئی ہدایت نامہ انسانی تصور کی گرفت میں نہیں آسکتا، اسی طرح اس نے انسان کی اس زندگی کے لئے ایک آسمانی، اخلاقی ومدنی دستور عطا کیا، جو دنیا میں بہترین اخلاقی واجتماعی نتائج پیدا کرنے کا ذمہ دار ہے، اور اس نے پیدا کر کے دکھلائے۔ جو کسی اور طریقہ پر آج تک ظہور پذیر نہیں ہوئے۔ وہ اجتماع انسانی کے ان تمام مسائل و مشکلات کو جو آج تک پیش آئے، یا قیامت تک پیش آسکتے ہیں، اپنے معجزانہ طریق پر ذرا ذرا سے اشارات سے حل کر دیتا ہے۔ وہ ایسے اصول وکلیات عطا کرتا ہے، جن کی بنیاد پر ہر زمانہ میں دنیا کا بہترین معاشرہ قائم کیا جاسکتا ہے۔ اور ہر جگہ حیات انسانی کی نئی تنظیم ہوسکتی ہے۔ وہ چونکہ آئین الٰہی ہے اس لئے تمام انسانی غلطیوں قانون سازی کے نقائص اور قیاسات سے پاک ہے، وہ چونکہ آخری ہے اس لئے ہر قسم کی تکمیل واضافہ سے بے نیاز ہے، وہ چونکہ عالم گیر ہے، اس لئے قومی ومقامی خصوصیات سے منزہ ہے، وہ چونکہ دائمی ہے اس لئے ہر قسم کے تغیر ونسخ سے آزاد ہے،

وہ چونکہ کامل ہے اس لئے اس کے لئے کسی قسم کے الحاق کی ضرورت نہیں۔

اَلْیَوْمَ اَکْمَلْتُ لَکُمْ دِیْنَکُمْ وَاَتْمَمْتُ عَلَیْکُمْ نِعْمَتِیْ وَرَضِیْتُ لَکُمُ الْاِسْلَامَ دِیْناً ۔ (سورہ مائدہ۔۳)

آج ہم نے تمہارے لئے تمارا دین کامل کردیا، اور اپنی نعمتیں تم پر پوری کردیں، اور تمہارے لئے اسلام کو دین کی حیثیت سے پسند کیا۔

اس کے نفاذ کی حالت میں وہ مسائل ومباحث پیش نہیں آتے، جنھوں نے ہزاروں برس نوع انسانی کے مفکرین، اور علم الاجتماع کے ماہرین کے دماغوں کو مشغول رکھا ہے۔ اور جن کا آخری حل کبھی بھی پیش نہیں ہوا، اور کتنے معاشی وسیاسی مسائل ہیں، جو اس ماحول میں پیدا نہیں ہوتے، ہزاروں برس کی غلطیوں اور تجربہ کے بعد دنیا کے مفکر جس نتیجے پر پہونچے ہیں قرآن نے تیرہ سو برس پہلے ایک امی کی زبان سے پہلے ہی بیان کردیا، یہ ہدایت نامہ اور دستور جس کا نام اسلام ہے خدا کی کاریگری اور حکمت کا اعلیٰ نمونہ ہے۔

صُنْعَ اللّٰہِ الَّذِیْ اَتْقَنَ کُلَّ شَیْءٍ ۔ (سورہ النمل۔۸۸)

خدا کی کاریگری ہے جس نے ہر چیز کو مضبوط بنایا۔

اور چونکہ اس اسلام کے اصول وکلیات قرآن سے ماخوذ ہیں اور قرآن ہی نے ان کو دنیا کے سامنے پیش کیا، اس لئے وہ اسی کا پیش کیا ہوا ایک معجزہ ہے۔

هُوَ الَّذِیْ بَعَثَ فِی الْاُمِّیّٖنَ رَسُوْلاً مِّنْهُمْ یَتْلُوْا عَلَیْهِمْ اٰیَاتِهٖ وَیُزَکِّیْهِمْ وَیُعَلِّمُهُمُ الْکِتَابَ وَالْحِکْمَةَ وَاِنْ کَانُوْا مِنْ قَبْلُ لَفِیْ ضَلَالٍ مُّبِیْنٍ ۔ (سورہ الجمعہ۔۲)

وہی تو ہے جس نے ان پڑھوں میں انھیں میں سے (محمد کو) پیغمبر بنا کر بھیجا جو اس کی آیتیں پڑھتے اور ان کو پاک کرتے اور انھیں (خدا کی)

کتاب اور دانائی سکھاتے ہیں اور اس سے پہلے تو یہ لوگ صریح
گمراہی میں تھے۔

قرآن کے اس معجزہ کی تشریح اور اس کے وجوہ اعجاز کو نمایاں کرنا درحقیقت اسلام کی پوری تشریح ہے جس کے لئے کتب خانے بھی کافی نہیں، ان میں بعض چیزیں اپنے اپنے محل پر بھی آئیں گی، عقائد کے باب میں اس کے عقائدی معجزانہ ساخت اور ان کی معجزانہ تکمیل، اخلاق و معاشرت کے ضمن میں قرآن کی معجزانہ جامعیت و حکمت پر غور کرنے کی ضرورت ہے، ان نکات و اسرار کا استقصاء اور اس کے محاسن کا احاطہ کسی انسان سے کسی زمانے میں بھی ممکن نہیں۔

وَلَوْ اَنَّ مَا فِي الْاَرْضِ مِنْ شَجَرَةٍ اَقْلَامٌ وَّالْبَحْرُ يَمُدُّهٗ مِنْۢ بَعْدِهٖ سَبْعَةُ اَبْحُرٍ مَّا نَفِدَتْ كَلِمٰتُ اللّٰهِ ۭ اِنَّ اللّٰهَ عَزِيْزٌ حَكِيْمٌ ۔ (سورہ لقمان۔۲۷)

اگر یوں ہو کہ زمین میں جتنے درخت ہیں (سب کے سب) قلم ہوں، اور سمندر (کا تمام پانی) سیاہی ہو (اور) اس کے بعد سات سمندر (سیاہی ہو جائیں) تو خدا کی باتیں ختم نہ ہوں، بیشک خدا غالب و حکمت والا ہے۔

قُلْ لَّوْ كَانَ الْبَحْرُ مِدَادًا لِّكَلِمٰتِ رَبِّيْ لَنَفِدَ الْبَحْرُ قَبْلَ اَنْ تَنْفَدَ كَلِمٰتُ رَبِّيْ وَلَوْ جِئْنَا بِمِثْلِهٖ مَدَدًا ۔

(سورہ الکہف۔۱۰۹)

کہہ دو کہ اگر سمندر میرے پروردگار کی باتوں کے لکھنے کے لئے سیاہی ہو، تو قبل اس کے کہ میرے پروردگار کی باتیں تمام ہوں سمندر ختم ہو جائے گا، اگر چہ ہم ویسا ہی اور (سمندر) اس کی مدد کو لائیں۔

قرآن کا دوسرا معجزہ اس کے علوم و معارف ہیں

قرآن کا دوسرا معجزہ اس کے وہ بے پایاں علوم و معارف اور حقائق و اسرار ہیں، جو اس کتاب میں پھیلے ہوئے ہیں، اور جن میں سے ہر ایک، ایک مستقل معجزہ ہے، انسان کا علم جتنا ترقی کرے گا، اور اس کی آنکھوں سے جتنے پردے اٹھتے جائیں گے۔ قرآن کا جمال اس کو بے نقاب نظر آئے گا۔

درحقیقت انسانی فہم کا ظرف تنگ ہے، قرآن کی وسعتوں کا متحمل نہیں اس لئے جو کچھ حصہ میں آئے غنیمت ہے۔

اَنْزَلَ مِنَ السَّمَآءِ مَآءً فَسَالَتْ اَوْدِيَةٌ بِقَدَرِهَا

(سورہ الرعد۔۱۷)

اسی نے آسمان سے مینھ برسایا پھر اس سے اپنے اپنے اندازے کے مطابق نالے بہہ نکلے۔

ان معجزات میں اعجاز کے کئی پہلو ہیں، ایک پہلو قرآنی حقائق کی ابدیت اور قطعیت ہے یہ ابدیت اور قطعیت حقیقت میں علم الٰہی اور کتب الٰہیہ کا حصہ ہے، تغیر انسانی معلومات کے لوازم میں سے ہے، چونکہ قرآن مجید پورے طور پر محفوظ ہے، اس لئے اس کے حقائق کی ابدیت اور قطعیت میں کوئی فرق نہیں پڑا۔

قدیم مذہبی صحیفوں میں انسانی علم کی آمیزش

مذہب اور مذہبی کتابوں میں جب انسانی دست برد اور مداخلت شروع ہوجاتی ہے تو اس میں بہت سی ایسی چیزیں داخل ہوجاتی ہیں جن کی صحت کی ضمانت خدا کی طرف سے نہیں ہوتی اس وقت اس میں انسانی علوم اور نظریات داخل ہوجاتے ہیں۔ اور چونکہ انسانی علم غیر معصوم غیر قطعی اور محدود ہے، اس لئے ان صحیفوں کی قطعیت

اور ان کے حقائق کی ابدیت قائم نہیں رہتی۔قرآن مجید اول سے لے کر آخر تک ابدی اور قطعی ہے، اس میں انسانوں کے تغیر پذیر نظریات اور ان کی تحقیقات وتجارب شامل نہیں، دنیا کے علوم وفنون جس قدر ترقی کریں، طبعیات وفلکیات میں انسانوں کے نظریات جو شکل بھی اختیار کریں، زمین مرکز کائنات ثابت ہو، یا آفتاب، زمین مسطح ثابت ہو یا کروی الشکل، سیاروں پر آبادی اور عوالم کا تعدد ثابت ہو نہ ہو، قرآن کے حقائق پر کوئی اثر نہیں پڑتا وہ ''بطلیموسی'' نظام نہیں ہے جو کہ ''پرنیکی'' نظام سے باطل ہو جائے لیکن اس کے برعکس بائبل انسانی تحریف واجتہاد سے نہ بچ سکی اس میں عوام کے مشہور اور مقبول عقائد ونظریات شامل ہو گئے، اس کی رو سے دنیا کی عمر چھ ہزار سال ہے۔زمین ایک چپٹی سطح ہے۔سورج، چاند اور ستارے متحرک ہیں، زمین مرکز کائنات ہے، اور باقی تمام اجرام فلکی اس کے تابع ہیں، زمین کی دوسری طرف آبادی کا ہونا محال ہے، اس لئے کہ بقول سینٹ اگسٹائن ''حضرت آدم علیہ السلام کی اولاد میں سے کوئی نسل اس قسم کی بیان نہیں کی گئی'' زمین کے کروی الشکل ہونے کے سب سے بڑی دلیل یہ ہے کہ ہر طرف کے باشندوں کو حشر کے دن خداوند خدا کا ہوا سے زمین پر اترنا کس طرح نظر آئے گا؟

یہ ''الہامی'' تاریخ ممکن ہے مؤلفین وشارحین کتب مقدسہ کے زمانے کے مشہورات یا مسلمات کے مطابق ہو لیکن اس کا حقیقت کے مطابق ہونا ضروری نہیں تھا، یہ انسانی علم کی ایک خاص منزل ہوگی مگر انسان کا علم مسافر ہے، مقیم نہیں۔ وہ جتنا آگے بڑھتا گیا اس منزل کو پیچھے چھوڑتا گیا، یہاں تک کہ ایک وقت آیا کہ مذہب وعقل کا ساتھ چلنا محال ہو گیا، مذہب وسائنس کا تصادم، یورپ میں مذہب کے زوال کا پہلا دن تھا، لیکن اسلام کی تاریخ میں واجبی طور پر یہ دن بھی پیش نہیں آسکتا، انسانوں کے علوم آپس میں ٹکرائیں گے اور ٹکرا سکتے ہیں۔ان میں سے ایک

غلط ہوگا اور ایک صحیح، اور یہ بھی ہوسکتا ہے کہ دونوں غلط ہوں، لیکن خدا کی محفوظ کتاب کے حقائق اور بیانات اور صحیح علم میں کوئی تصادم ممکن نہیں، جو علم اس سے ٹکرائے گا وہ صحیح علم نہیں ہوسکتا۔

علم وتحقیق جدید کی تصدیق

قرآن کریم میں جدید علمی (سائنٹفک) حقائق کو تلاش کرنے اور ایک طرف اس کے بعض اشارات اور اجمالی بیانات، اور دوسری طرف جدید تحقیقات و اکتشافات میں تطبیق (جس کی سب سے بڑے پیمانے پر کوشش اس صدی میں علامہ طنطاوی جوہری مصری نے اپنی مشہور تفسیر ''جوہر القرآن'' میں کی ہے) بڑا نازک اور کسی حد تک پرخطر کام ہے، اس لئے کہ اس کا قوی امکان ہے (اور علم وتحقیق کی تاریخ میں اس کا کئی بار تجربہ ہو چکا ہے) کہ علم وتحقیق کے یہ نتائج جو اس وقت بالکل بدیہی اور ثابت شدہ حقائق سمجھے جارہے ہیں، بالکل بدل جائیں، یا ان کا ثبوت اور قطعیت مجروح ومشکوک ہوجائے، نیز اس علمی کاوش میں (جس کی نیک نیتی اور کسی قدر افادیت میں شک نہیں کیا جاسکتا) قرآن مجید کے اصل موضوع ومقصد سے دوری اور جدید علم وتحقیق سے مرعوبیت کا شائبہ بھی پایا جاتا ہے، فلسفہ قدیم اور مشہور متعارف تاریخی روایات کے سلسلہ میں بعض قدیم مفسرین سے بھی یہ لغزش ہوئی ہے، لیکن چونکہ اس کا حصہ قرآن مجید کی تفاسیر کے عظیم وموقر ذخیرہ میں بہت قلیل رہا ہے اور وہ مسلمانوں کے علمی حلقوں میں زیادہ شہرت اور وقعت حاصل نہیں کرسکا ہے، اس لئے قرآن مجید کو کسی دور میں بھی اس ابتلاء کا سامنا نہیں کرنا پڑا، جو عہد قدیم کے صحیفوں (بائبل) کو ان رائج الوقت طبیعاتی فلکی اور جغرافیائی تشریحات واضافات کی شمولیت سے پیش آیا، اور جن کا نام ہی قرون وسطیٰ کی مسیحی دنیا میں (Christian

Topography) ''مسیحی جغرافیہ مقدس'' پڑ گیا تھا۔

لیکن ایک سلیم الطبع اور منصف مزاج طالب علم (جو بیک وقت جمود اور علم جدید کی مرعوبیت سے پاک ہے) مطالعۂ قرآنی کے وقت یہ حقیقت معلوم کر کے ششدر و حیران رہ جاتا ہے کہ اگرچہ یہ کتاب ایک امی پر آج سے چودہ سو برس پہلے عرب کے محدود اور علمی دنیا سے منقطع ماحول میں نازل ہوئی تھی، اور اس میں بڑی تعداد میں ان حقائق و اشیاء کا ذکر آیا ہے جن کا تعلق تاریخ، جغرافیہ، طبعیات، فلکیات، اجرام سماوی، علم الحیاۃ، طب، انسان کی خلقت اور اس کے جسم کی تکوین و ترکیب اور ایسے بہت سے علوم سے بہت گہرا ہے، جن کے بارے میں ان پچھلی صدیوں میں حقائق و معلومات کا ایک نیا عالم منکشف ہو گیا ہے، اور علم انسانی کے زمین و آسمان بدل گئے ہیں، اس میں کوئی ایسی بات نہیں کہی گئی ہے جس کو علم جدید نے خلاف واقعہ ثابت کر دیا ہو، بلکہ اس سلسلے میں بہت سے ایسے حقائق و مضمرات آ گئے ہیں جن کی علم جدید نے ابھی حال میں نقاب کشائی کی ہے، اور اس کو ان تک ابھی حال میں رسائی حاصل ہوئی ہے، اس اجمال کی تفصیل ایک کتاب نہیں بلکہ کتابوں کے ایک سلسلہ کی طالب ہے، ہم یہاں پر ایک فرانسیسی فاضل و محقق کی صرف ایک شہادت پیش کرنے پر اکتفا کرتے ہیں۔ حال میں مشہور فرنچ فاضل مورس بوکائی (Maurice Bucaiue) کی کتاب ''بائبل، قرآن اور سائنس'' (The Bible,the Quran and Science) اور اس کا عربی ترجمہ ''دراسة الكتب المقدسة في ضوء المعارف الحديثة'' کے نام سے شائع ہوا ہے محقق موصوف اس کتاب میں لکھتا ہے

''ان علمی پہلوؤں نے جو قرآن کے ساتھ مخصوص ہیں، ابتداء ہی میں مجھے ششدر و حیران بنا دیا، میرے ذہن میں کبھی بھی یہ بات نہیں تھی کہ ایک ایسی کتاب میں، جس پر تیرہ سو برس سے زیادہ مدت گذر چکی ہے، اتنی بڑی تعداد میں

مختلف موضوعات سے تعلق رکھنے والے دعوے، اور اعلانات ہوں گے جن میں شدید تنوع پایا جاتا ہے۔ اور وہ جدید علمی تحقیقات سے پورے طور پر مطابق پائے جائیں گے۔"(۱)

مصنف موصوف نے اس سلسلہ میں آسمانوں، زمین کی پیدائش، کائنات کے وجود، اجرام فلکی، ماہیت آسمانی، فلکی دنیا کے ارتقاء، فضا آسمانی، پانی اور سمندروں کے حیات انسانی میں بنیادی کردار ادا کرنے، (۲) سطح زمین اور پہاڑوں، نباتات اور حیوانات کی دنیا، زندگی کے مبدأ و آغاز، انسانی توالد و تناسل، ترتیب جنین، نیز اہم تاریخی واقعات (طوفانِ نوح، مصر میں بنی اسرائیل کا زمانۂ قیام، مصر سے حضرت موسیٰ علیہ السلام کے خروج، حضرت موسیٰ کے زمانہ کے فرعون، اس کی کیفیت موت وغیرہ) پر بحث (۳) اور طبعیات وفلکیات، علم الحیات، طب اور تاریخ کی جدید تحقیقات کی روشنی میں قرآن مجید اور بائبل کا تقابلی مقابلہ کرنے کے بعد یہ فیصلہ کیا ہے کہ:

> "تورات وانجیل کی ان تصریحات کے مقابلہ میں قرآن مجید کی تصریحات علم وتحقیق کے جدید ترین نتائج سے مطابقت میں بالکل منفرد اور ممتاز ہیں"۔ (۴)

وہ اپنی فاضلانہ کتاب کو ان سطروں پر ختم کرتا ہے:

> "انسان اس کا تصور بھی نہیں کرسکتا کہ وہ کثیر التعداد بیانات ودعاوی جو خالص علمی انداز کے ہیں، کسی انسان کی تصنیف ہو سکتے

---

(۱) دراسۃ الکتب المقدسۃ فی ضوء المعارف الحدیثۃ" (دار المعارف القاہرہ) صفحہ ۱۴۴

(۲) مشہور شاعر مہجر ایلیاء ابو ماضی نے اسی نظریہ کو اپنی مشہور نظم "طلاسم" میں پیش کیا ہے۔ (ع ع ن)

(۳) ان مفصل ومستقل مباحث کے لئے ملاحظہ ہو کتاب کے صفحات از ۱۵۷ تا ۲۷۱

(۴) دراسۃ الکتب المقدسۃ فی ضوء المعارف الحدیثۃ" (دار المعارف القاہرہ) صفحہ ۲۸۶

ہیں، علوم و معارف کی سطح کو سامنے رکھتے ہوئے جو محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں پائی جاتی تھی، اس لئے یہ نتیجہ نکالنا ہر طرح قرین انصاف وعقل ہوگا کہ یہ قرآن وحی خداوندی پر مبنی ہے اور اس کو اس لحاظ سے خصوصی مقام دیا جانا چاہئے کہ اس کی صحت ہر شک وشبہ سے بالاتر ہے اور اس حیثیت سے بھی کہ وہ ایسے علمی نتائج اور مضامین پر مشتمل ہے جن کا عصر حاضر میں پورے طور پر مطالعہ اور ان کے بارے میں تحقیق کی گئی ہے، پھر بھی ان کی صحت ثابت ہوئی''۔(۱)

اسی طرح قرآن مجید پر انسانوں کے وقتی، معاشی، اجتماعی اور سیاسی رجحانات کا کوئی اثر نہیں، اس کا ہدایت نامہ ان مسائل میں بھی ابدی اور دائمی ہے۔



(۱) ایضاً

نکتہ آفرینی کا وہبی ذوق

مولانا کی ذہانت اور نکتہ آفرینی کی صلاحیت دینی مضامین خاص طور پر قرآن کریم کی تفسیر میں ظاہر ہوتی ہے، مولانا نے اپنی کتابوں کے جو نام تجویز کیے ہیں، یا مقالات کے عناوین اختیار کیے ہیں ان میں طباعی کے ساتھ دینی رخ پر طبیعت کا چلنا ایک امتیازی وصف ہے۔

مولانا کی ایک دعوتی تقریر کا محور حضرت سیدنا ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کا یہ جملہ ہے "أینقص الدین وانا حی"" کیا میرے رہتے دین میں کتر بیونت کی جائے گی؟ ادبی لحاظ سے یہ ایجاز واعجاز کا نمونہ اور حوصلہ بشری کا شاہکار ہے۔ تاریخ کے خزانوں میں ہیروں میں تولا جانے والا جملہ نہ جانے کب سے پڑا تھا۔ جس کی طرف سے مؤرخین سرسری طور پر گذر جاتے تھے۔ مولانا نے دعوت اسلام کا ایک اہم ترین عنوان بنالیا اور یہ دکھایا کہ دعوت اسلامی کا کام جہاں بھی ہوا ہے اور جب بھی ہوگا اس کے اندر یہ روح ضرور ہوگی۔

اسی طرح حضرت یعقوبؑ کا اپنے فرزندوں سے سوال " مَاتَعْبُدُوْنَ مِنْ بَعْدِیْ"" میرے بعد کس کو پوجو گے؟ سے یہ استدلال کہ انبیاء کرام سلام اللہ علیہم

کے نزدیک اپنی نسل کے لئے سب سے بڑی فکرمندی کی بات یہی ہے۔ جب حضرت یعقوب علیہ السلام پر نزع کا وقت آیا اور معلوم ہوا کہ اب لمحہ دو لمحہ میں وہ دنیا سے رخصت ہو جائیں گے۔ اس وقت اپنی اولاد کو جمع کر کے نصیحت کرتے ہیں، یوں اہل دنیا بھی آخری وقت میں اپنی اولاد کو نصیحت کرتے ہیں۔ اولاد کو نصیحت کی جاتی ہے کہ دیکھو میرے بعد آپس کے افتراق واختلاف سے بچتے رہنا، مل جل کر رہنا، پرانے قصوں میں آتا ہے کہ ایک شخص نے اپنی موت کے وقت اپنے فرزندوں کو بلا کر ایک رسی دی اور کہا اس کو توڑو، سب نے توڑ دیا۔ پھر اسی طرح کی تمام اکہری رسیوں کو ایک ساتھ ملا کر دیا کہ اب اس کو توڑو، کوئی توڑ نہ سکا، کہا یہی طاقت اتحاد سے آتی ہے کوئی باپ اپنے دشمنوں سے آگاہ کرتا ہے، کوئی کسی خاص دوست یا فرد خاندان کے حقوق کی طرف توجہ دلاتا ہے، مگر ایک پیغمبر کو صرف یہ فکر ہے کہ میری نسل خدا پرست رہے گی یا نہیں۔ سب سے بڑی فکر کی بات دین اور دین کی حفاظت ہے۔

۱۹۹۴ء میں ترکوں سے مولانا نے خطاب کیا، وہاں حق وباطل کی جو کشمکش جاری ہے اس سے اہل علم واقف ہیں۔ یورپ میں فوجی ٹریننگ حاصل کرنے والے ملیٹری افسروں نے اسلام کی دشمنی بلکہ اس کی بیخ کنی کو سیکولرازم کا نام دیا ہے۔ حالانکہ اکثریت ایسے مسلمانوں کی ہے جو اسلامی نظام کو حکومت کی اساس بنانا چاہتی ہے۔ ان تاریک حالات میں امید کی ایک شمع مولانا نے ان کے دلوں میں روشن کی اور یہ بتایا کہ آج نہیں تو کل اسلام اس سرزمین پر غالب ہو کر رہے گا۔ آپ نے سورہ کہف کے اس واقعہ سے استدلال کیا کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام جب حضرت خضر علیہ السلام کے ساتھ چلے ہیں تو ایک گاؤں سے کھانا طلب کیا۔ انہوں نے انکار کیا۔ حضرت خضر علیہ السلام وہاں ایک کمزور دیوار کی مرمت کرنے لگے۔ پیغمبر وقت (حضرت موسیٰ علیہ السلام) نے نکیر کی کہ آپ اس کی مزدوری لے سکتے تھے۔ آخر میں جب

حضرت خضر علیہ السلام نے بتایا کہ اس زمین کی دیوار کے نیچے یتیموں کا ایک خزانہ ہے، اس کی حفاظت مقصود تھی، استدلال یہ فرمایا کہ جب ایک صالح فرد کی اولاد کے لئے اللہ تعالیٰ یہ انتظام فرما سکتا ہے کہ اس کا اندوختہ ضائع نہ ہو تو صالح قوم کے اندوختہ دین کی بھی وہ حفاظت فرما کر رہے گا۔



فہم قرآنی میں یکسانی

اوپر جو تفسیری حوالے نقل کیے گئے ان میں ''قرآن کا سب سے پہلا بڑا معجزہ اسلام ہے'' مولانا کے عہد شباب کا مرتب کردہ محاضرہ ہے۔ بعد میں حضرت یعقوب علیہ السلام کی وصیت، ترکوں سے خطاب، مولانا کے عہد پیری کے خطابات کے اقتباسات ہیں، دونوں میں فکر وفہم کا طرز، مضامین کی آمد، قرآن کا ذوق، یکساں نظر آتا ہے، حالانکہ اکثر وبیشتر دیکھا گیا ہے کہ فکر کا انداز ہر عمر میں یکساں نظر نہیں آتا۔ مثال کے طور پر مولانا ابوالکلام آزاد کی تفسیر دیکھئے پہلے وہ تصور الٰہ کو انسانی فکر کا ارتقاء سمجھتے تھے، پھر بعد میں ان کا نظریہ بدل گیا اور تصور الٰہ کو ارتجاعی کہنے لگے۔ لیکن مولانا کے فکروذوق میں یکسانی ملتی ہے اور یہی نہیں بلکہ فکر کی شادابی اور طرز بیان کی شگفتگی جو جوانی میں تھی وہی الحمد للہ آج بھی نظر آتی ہے۔ ۱۴۰۰ھ میں المعہد العالی للدعوۃ میں جو محاضرات دیئے گئے اور ان کو اپنی نگرانی میں تحریری شکل میں مرتب فرمایا ان میں بھی وہی تازگی ہے۔ راقم کو یہ سعادت حاصل ہوئی ہے کہ ان کو عربی سے اردو میں منتقل کرے، ترجمہ کی خدمت انجام دینے کے بعد میرا جو تأثر تھا اور بلا وجہ نہیں تھا، جس میں عرض کیا گیا۔

''ان خطبات کا ترجمہ شروع کرتے وقت اتنا تو مجھے یقین تھا کہ قرآن فہمی کی راہ میں کچھ نئے نکات سامنے آئیں گے، جیسا کہ مخدوم ومربی حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ کی ہر تقریر وتحریر میں کوئی نہ کوئی فکر انگریز پہلو ضرور ہوتا ہے، ان خطبات میں بھی یقیناً کوئی ندرت ہوگی، لیکن یہ خیال نہیں گزرا تھا کہ محاضرات کا یہ مختصر مجموعہ (جو کسی مستقل تصنیف کی ضخامت نہیں رکھتا) قرآن کریم سے استفادہ کی نئی شاہراہ کھولنے والا ثابت ہوگا۔ ان میں اس کی حیثیت ایک علمی ''دریافت'' کی ہوگی۔ قرآن کریم کے وصف میں حضرت رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے ''لا تنقضی عجائبہ'' یعنی قرآن کے عجائبات کبھی ختم نہیں ہوتے، یہ مجموعہ محاضرات بھی اس کا بیّن ثبوت ہے کہ ڈیڑھ ہزار برس گزرنے کے بعد بھی اور جبکہ ہزاروں نہیں بلکہ لاکھوں کام قرآن کریم کے سلسلہ میں ہو چکے ہیں، اب بھی ایک ایک موضوع ایسا نظر آتا ہے کہ گویا یہ آیتیں آج ہی اتری ہیں، ان کی تازگی وشادابی میں کوئی فرق نہیں معلوم ہوتا۔

دعوت الی اللہ کی اہمیت وفرضیت سب جانتے ہیں ''حکمت وموعظت حسنہ'' کے دو کلیدی اصول سے تمام اہل علم واقف ہیں۔ لیکن اس کی طرف کسی کی نگاہ نہیں گئی کہ قرآن کریم نے ''حکمت وموعظتِ حسنہ'' کو مبہم نہیں چھوڑا ہے، بلکہ انبیائے کرام کی دعوت کے نمونے دے کر اس کے خطوط وحدود واضح کر دیئے ہیں۔ جن کی موجودگی میں دعوت دین کا کام کرنے والوں کو کسی تحریک یا ازم سے طریق کار (Tactics) مستعار لینے کی ضرورت نہیں ہے۔

اس لحاظ سے یہ کتاب قرآنی علوم میں ایک اہم اضافہ ہے جو اپنے اختصار کے باوجود ضخیم جلدوں پر بھاری ہے۔

یہ مجموعۂ محاضرات اگرچہ انبیائے کرام کی دعوت کے نمونوں پر مشتمل ہے

اور یہی اس کا موضوع ہے، لیکن اس سے دو ضمنی فوائد بھی حاصل ہوں گے، ایک یہ کہ قرآن کریم کی بلاغت کی چند جھلکیاں نظر آئیں گی، انبیائے کرام، خصوصاً حضرت ابراہیمؑ وحضرت یوسفؑ کے تذکروں میں قرآنی بلاغت کے نازک ترین پہلوؤں کی بہت دلنشیں انداز میں وضاحت کی گئی ہے، مثال کے طور پر حضرت ابراہیمؑ نے جب اپنے والد کو دین حق کی دعوت دی تو کیا لہجہ اختیار کیا، کس طرح ان کی پدرانہ شفقت کو مائل کیا، حضرت رحمۃ اللہ علیہ نے جس والہانہ انداز میں اس کو واضح کیا ہے، اس کی اصلی قدر تو عرب یونیورسٹیوں کے اساتذۂ ادب و بلاغت ہی کریں گے، یا وہ حضرات جنھوں نے شیخ عبد القاہر جرجانی کی ''اسرار البلاغه'' اور ''دلائل الاعجاز'' امام یحیٰ بن حمزہ کی ''الطرّاز'' ابو ہلال العسکری کی ''کتاب الصناعتین'' اور امام سیوطی کی ''معترك الاقران'' کا مطالعہ کیا ہے۔

یہ بات اپنی جگہ پر فکر اور افسوس کی ہے کہ قرآن کریم کی بلاغت جو ایک بدیہی حقیقت ہے اور جس کے بارے میں قرآن کریم نے متعدد مقامات پر چیلنج کیا ہے کہ کوئی اس کے مماثل چند آیات وضع نہیں کرسکتا، یہ معجزہ عربیت کا صحیح مذاق نہ ہونے کی وجہ سے ہمارے لئے ''ایمان بالغیب'' کے درجہ میں داخل ہوگیا، اور اب ہم قرآن کریم کی بلاغت پر اس طرح ایمان رکھتے ہیں، جس طرح حشر ونشر اور بعث بعد الموت پر، حالانکہ یہ حسی چیز ہے، اور حق یہ تھا کہ اس کی عظمت کا ادراک ہمیں بلا واسطہ اور براہ راست ہوتا، ان محاضرات کے ذریعہ پورے قرآن کریم کی نہ سہی چند آیات کی بلاغت کی ایک جھلک ضرور مل جائے گی، اور قرآن کریم پر اپنی محنت و ذہانت صرف کرنے والے طالبین کو کام کرنے کی ایک مستقل راہ مل جائے گی۔

ان محاضرات میں جہاں دعوتوں کے نمونے دیئے گئے ہیں، وہاں دعوت دینے والوں (دُعاۃ) کی سیرتیں بھی نظر آجاتی ہیں، ان کی صداقت وامانت،

خیال وعمل کی پاکیزگی، ہر حال میں اپنے مقصد اصلی، دعوت توحید کو پیش نظر رکھنا، مثلاً حضرت موسیٰ پر دوہری ذمہ داری تھی، اپنی قوم کو فرعون کی غلامی سے نجات دلانا، اور توحید کی دعوت دینا، لیکن انھوں نے دعوت الی اللہ کے کام کو مؤخر نہیں کیا، یہ ترتیب نہیں قائم کی کہ پہلے غلامی سے نجات حاصل کرلیں، پھر اللہ تعالیٰ کی ذات و صفات کی تبلیغ کریں گے، دوسری بات یہ نظر آتی ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام سے لے کر حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم تک ہر ایک نے دعوت الی اللہ کا کام انتہائی بے بسی اور کس مپرسی کے عالم میں شروع کیا، اور اللہ تعالیٰ نے انھیں بعد میں قوت وغلبہ عطا فرمایا اور یہی دین فطرت کا تقاضا تھا، تمام مخلوقات کی ابتداء (وھنا علی وھن) کمزوری وناتوانی سے ہوتی ہے۔ پھر قوت وصلابت بخشی جاتی ہے، لہٰذا دعوت الی اللہ کی ترتیب فطرت کے مطابق اور سنت الٰہی کے موافق وہی ہے جس کی تصویر انبیائے کرام علیہم السلام کے نمونوں میں ملتی ہے۔

اللہ تعالیٰ کا شکر واحسان ہے، اس کتاب کے ذریعہ قرآن کریم اور اسلام کی ابدیت پر یقین میں اضافہ کا ایک نیا سامان حاصل ہوگیا، اللہ تعالیٰ حضرت مصنف مدظلہ کی عمر وصحت میں برکتیں عطا فرمائے، جن کے "نفس گرم" سے علم ومعرفت کا بازار گرم ہے"۔

اس سلسلۂ محاضرات میں سے ایک محاضرہ بطور مثال کے پیش ہے، جس میں تفسیر کی وہ روح جھلکتی ہے جو مولانا کے منفرد اسلوبِ فکر اور اسلوب نگارش اور ادبی حس کا آئینہ دار ہے۔

حضرت ابراہیمؑ کی دعوت کے دو نمونے

مناسب ہوگا کہ آج ہماری مجلس کا موضوع حضرت ابراہیم علیہ السلام کی دعوت ہو۔

حضرت ابراہیم علیہ السلام کی دعوت کے دونمونے ہمیں ملتے ہیں، اگر ہم ان دونوں نمونوں کو سامنے رکھیں اور ان کا باہمی موازنہ کریں تو محسوس ہوگا کہ "حکمت" (جو دعوت کا اولین عنصر) کس درجہ کمالِ حسن کے ساتھ ان کی دعوت میں جلوہ گر ہے، اور پیغمبرانہ انداز تبلیغ کی مکمل نمائندگی ان کے طرز خطاب میں موجود ہے

ایک نمونہ تو وہ ہے جبکہ انھوں نے اپنے والد کو دینِ حق کی دعوت دی، اور دوسرا نمونہ وہ ہے جس میں انھوں نے اپنی قوم کو مخاطب فرمایا، ان دونوں دعوتوں کے انداز بیان میں حکیمانہ تنوع پایا جاتا ہے، صرف انداز گفتگو اور پیرایۂ بیان ہی میں فرق نہیں بلکہ موقع کا لحاظ اور مخاطب کی نفسیات کا گہرا علم بھی جھلکتا ہے اور یہ کہ کس طرح دل کی پہنائیوں میں بات اتار دی جائے۔ آپ اگر ان آیات کو پڑھیں جن میں حضرت ابراہیمؑ کی اُس گفتگو کو نقل فرمایا گیا ہے، جو انھوں نے اپنے والد کو دین کی طرف بلانے۔ کے سلسلے میں کی پھر اس خطاب کو ملاحظہ فرمایئے، جو انھوں نے اپنی قوم سے کیا، تو آپ کو دونوں میں واضح فرق نظر آئے گا۔

ایک فرزند اپنے باپ کو دین کی دعوت دیتا ہے۔

وَاذْكُرْ فِي الْكِتٰبِ اِبْرَاهِيْمَ اِنَّهٗ كَانَ صِدِّيْقًا نَّبِيًّا ۝ اِذْ قَالَ لِاَبِيْهِ يٰٓاَبَتِ لِمَ تَعْبُدُ مَا لَا يَسْمَعُ وَلَا يُبْصِرُ وَلَا يُغْنِيْ عَنْكَ شَيْئًا ۝ يٰٓاَبَتِ اِنِّيْ قَدْ جَآءَنِيْ مِنَ الْعِلْمِ مَا لَمْ يَاْتِكَ فَاتَّبِعْنِيْٓ اَهْدِكَ صِرَاطًا سَوِيًّا ۝ يٰٓاَبَتِ لَا تَعْبُدِ الشَّيْطٰنَ ۭ اِنَّ الشَّيْطٰنَ كَانَ لِلرَّحْمٰنِ عَصِيًّا ۝ يٰٓاَبَتِ اِنِّيْٓ اَخَافُ اَنْ يَّمَسَّكَ عَذَابٌ مِّنَ الرَّحْمٰنِ فَتَكُوْنَ لِلشَّيْطٰنِ وَلِيًّا ۝ (سورہ مریم ۴۱-۴۵)

اور کتاب میں ابراہیم علیہ السلام کو یاد کرو، بیشک وہ نہایت سچے پیغمبر
تھے جب انھوں نے اپنے باپ سے کہا کہ ابا آپ ایسی چیزوں کو کیوں
پوجتے ہیں جو نہ سنیں اور نہ دیکھیں اور نہ آپ کے کچھ کام آسکیں؟ ابّا
مجھے ایسا علم ملا ہے جو آپ کو نہیں ملا تو میرے ساتھ ہو جایئے میں آپ
کو سیدھی راہ پر چلا دوں گا ابّا شیطان کی پرستش نہ کیجئے، بیشک شیطان
خدا کا نافرمان ہے، ابا مجھے ڈر لگتا ہے کہ آپ کو خدا کا عذاب آپکڑے تو
آپ شیطان کے ساتھی ہو جائیں۔

ان آیات میں حسب ذیل امور واضح طور پر نظر آئیں گے۔

۱۔ پدرانہ شفقت کے جذبہ کو ابھارا گیا ہے۔

یاأبتِ کے طرز خطاب پر غور کیجئے، میرے باپ (یا میرے ابا جان، میرے بابا جس طرح بھی آپ ترجمہ کریں) اس انداز خطاب میں بیٹے کی سعادت مندی، محبت اور فروتنی پوری طرح نمایاں ہے، اس انداز خطاب کے لطف کو سمجھنا ذوق سلیم پر موقوف ہے، حقیقت یہ ہے کہ جن لوگوں کو اللہ تعالیٰ نے قرآن کریم کی زبان سے آشنا کیا ہے، اور وہ اس کے لہجے کی روح کو سمجھتے ہیں، ان کے بارے میں نقل کیا گیا ہے کہ جب وہ ایسی آیت پڑھتے تھے، جن میں عذاب الٰہی کا ذکر ہوتا ہے تو ان کی آواز میں لرزش آجاتی تھی، اور چہرہ ڈر سے سرخ ہو جاتا تھا، اور جب ان آیات کو پڑھتے جن میں اللہ تعالیٰ کی بخشش ورحمت کا ذکر ہے تو ان کے دل کا درد اور آواز میں محبت کا سوز اور نرمی نمایاں ہوتی ہے، جب ایک فرزند اپنے باپ کو میرے بابا یا مرے ابا جان کہہ کر مخاطب کرتا ہے تو وہ اس کے جذبہ شفقت پدری کو بیدار کرتا ہے، اگر داعیانہ تکبر کے ساتھ وہ کہتا: جناب والا! سنئے یا اے کاہن بزرگ! غور کیجئے!! (آزر حضرت ابراہیمؑ کے والد کاہن معبد کے پروہت بھی تھے) تو اور ہی بات ہوتی، مگر وہ فرماتے

ہیں: ”میرے ابا جان!(یٰاَبَتِ) اور سمجھ بوجھ کر قصداً انھوں نے یہ انداز مخاطبت اختیار فرمایا تھا کہ ان کی بات دل کی گہرائیوں تک پہونچ جائے، اور پدرانہ محبت دل کے دروازے کھول دے، ایک باپ خواہ وہ جتنا بھی اپنے فرزند سے خفا ہو، لیکن جب وہ اس کو ”میرے ابا جان“ کہہ کر مخاطب کرتا ہے تو اس کا دل نرم پڑ جاتا ہے، اور اس کی بات سننے کی طرف وہ مائل ہو جاتا ہے، حضرت ابراہیمؑ نے اپنی دعوت میں جذبۂ ایمانی سے پہلے شفقت پدری کے خوابیدہ تاروں کو چھیڑا، اور یہ دیکھا گیا ہے کہ بسا اوقات محبت ایمان سے پہلے دل میں گھر کرتی ہے۔ ایسا بھی ممکن ہے کہ ایک شخص شفیق باپ تو ہو مگر مومن نہ ہو، اس کی شفقت کا سوتا جاری ہے، اور ایمان کا سوتا خشک ہے، لہٰذا اگر اس کو دعوت دینا ہے تو اس دروازے سے داخل ہونا ہوگا جو کھلا ہوا ہے، ایک داعی و مبلغ جسے ”حکمت“ کی نعمت ملی ہے، کبھی اس پہلو کو نظر انداز نہیں کر سکتا ہے، اگر وہ اس پہلو کو نظر انداز کرے گا تو خود اپنی ذات کو بھی نقصان پہونچائے گا اور دعوت کو بھی، داعی و مبلغ اگر درشت مزاج ہو تو کامیاب نہیں ہو سکتا۔

وَلَوْ كُنْتَ فَظًّا غَلِيظَ الْقَلْبِ لَا انْفَضُّوا مِنْ حَوْلِكَ ؂

(سورہ آل عمران-۱۵۹)

اور اگر تم بدخو اور سخت دل ہوتے تو یہ تمہارے پاس سے بھاگ کھڑے ہوتے۔

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے جب اپنے چچا ابو طالب کو مخاطب فرمایا اور ایک انتہائی نازک صورت حال کے موقع پر، تو خطاب اس طرح فرمایا ”یا عم“ (چچا جان!) یہ وہ موقع ہے جب اسلام کے بارے میں ابو طالب گومگو کے عالم میں تھے، اور قریش کے مقاطعہ کا خوف ان پر طاری تھا، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

يا عم ! لو وضعوا الشمس في يميني والقمر في يساري على ان اترك هذا الأمر حتى يظهره الله او اهلك دونه ماتركته۔

(السيرة النبوية لابن هشام ۱/ ۲۹۹ ۔تاریخ الطبری ۱/ ۵٤٥)

چچا جان! اگر یہ لوگ میرے داہنے ہاتھ میں آفتاب اور بائیں ہاتھ میں ماہتاب بھی رکھ دیں اور کہیں کہ اس مہم سے باز آجاؤ تو بھی میں اس کو نہیں چھوڑوں گا اور اس وقت تک اس میں لگا رہوں گا تا آنکہ اللہ اس دین کو غالب کر دے یا میں اس کے پیچھے اپنی جان قربان کر دوں۔

اس نرم گفتاری (جو اپنے مسلک پر پختگی کے ساتھ تھی) کا نتیجہ یہ ہوا کہ ابوطالب کا انسانی جذبہ ہمدردی وشفقت ابھر آیا اور باوجود اس کے کہ وہ اپنے آبائی دین پر قائم رہے مگر انھوں نے کہا "یاابن اخی !" اے میرے بھائی کے بیٹے (لفظی ترجمہ تو یہی ہوا مگر اس لہجہ میں شفقت کا اثر ہے جیسے کوئی کہے میرے بیٹے ! میرے بچے !) جیسے حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے خطاب فرمایا تھا، چچا جان! کہہ کر اسی طرح جواب بھی میرے عزیز! میرے بیٹے کہہ کر ابوطالب نے دیا، اور فرمایا:

اذهب يا ابن اخي فقل ما احببت فوالله ما اسلمك ابداً

میرے بیٹے! تم اپنا کام کرتے رہو اور جو جی چاہے کہو میں اللہ کی قسم تمہیں کسی کے حوالے نہیں کروں گا۔

حضرت ابراہیمؑ اور دلائل کا حسن انتخاب

حضرت ابراہیمؑ نے اپنے والد سے گفتگو کے وقت منطقی گرفت سے کام نہیں لیا اور نہ ایسی باتیں کیں جن کو صرف بڑے ذہین قسم کے لوگ (Intelligence) ہی سمجھ

سکیں بلکہ روز مرہ کی، آئے دن کی اور جانی بوجھی باتوں سے ابتدا کی، ایسی بات کی جو ایک بچے کی بھی سمجھ میں آسکے، اور واقعہ بھی یہی تھا کہ ان کے والد اگر چہ عمر رسیدہ تھے مگر "عقل کا بچپن" ختم نہیں ہوا تھا، لہٰذا ان سے کہا: ابا جان! آپ کیوں ایسی چیز کی پرستش کرتے ہیں جو نہ سنتی ہے نہ دیکھتی ہے اور نہ کسی کام آسکے، پھر فرمایا کہ مجھ پر وہ حقیقت آشکارا ہوگئی ہے، جس کی آپ کو خبر نہیں ہے، یہ بات بھی بجائے خود ایک باپ کو خوش کرنے والی ہے کہ اس کا بیٹا علم وفہم میں، سمجھ بوجھ میں اس سے بڑھ جائے، اور یہ کوئی اچنبھے کی، یا خرق عادت قسم کی بات نہیں تھی، بہت دیکھا گیا ہے کہ باپ ناخواندہ ہے، اور بیٹا پڑھ لکھ کر عالم فاضل ہوگیا ہے، یا باپ نے کم پڑھا ہے بیٹا باپ سے بڑھ گیا ہے، چنانچہ حضرت ابراہیمؑ نے فرمایا: ابا جان! مجھ پر وہ حقیقت آشکارا ہوگئی ہے جس کی آپ کو خبر نہیں ہے، لہٰذا میری پیروی کیجئے، میں آپ کو صحیح راستہ بتاؤں گا، ابا جان شیطان کی پرستش نہ کیجئے، شیطان رحمٰن کا نافرمان ہے، ان آیات میں سے ہر آیت بڑی گہرائی رکھتی ہے، معنی وحکمت کے خزانے ان کے اندر بند ہیں، شیطان کا نام تو لیا مگر اس کی ماہیت اور کوئی علمی باتیں نہیں کیں، کیونکہ وہ جانتے تھے کہ ان کے والد جب اس درجہ سادہ لوحی کا کام کرسکتے ہیں کہ بت تراشی کو اپنا پیشہ بنالیں تو ان سے یہ توقع بیکار تھی کہ وہ گہری اور نازک قسم کی بات سمجھ سکیں گے، لہٰذا ان کو صرف اس قدر بتانے پر اکتفا کیا کہ ابلیس کا سب سے بڑا گناہ یہ ہے کہ وہ خدائے رحمٰن ورحیم کا نافرمان ہے، آخر میں کہا ابا جان! مجھے ڈر لگتا ہے کہ کہیں (رحمٰن) سب سے بڑے رحم فرمانے والے کا عذاب آپ پر نہ آجائے جس کے نتیجہ میں آپ شیطان کے گروہ کے ایک فرد بن جائیں۔

حضرت ابراہیمؑ کی اپنی قوم کو دعوت،
فطرت انسانی اور حقائق کی بنیاد پر گفتگو

ایک انداز بیان یا دعوت کا اسلوب وہ تھا جو حضرت ابراہیمؑ نے اپنے والد کو مخاطب کرتے وقت اختیار کیا تھا، جو ابھی آپ نے سنا، اب دوسرا انداز بیان یا اسلوب دیکھئے جو حضرت ابراہیمؑ نے اپنی قوم کو مخاطب کرتے وقت اختیار کیا، دونوں کا فرق خود ظاہر ہو جائے گا۔

وَاتْلُ عَلَيْهِمْ نَبَأَ إِبْرَاهِيمَ إِذْ قَالَ لِأَبِيهِ وَقَوْمِهِ مَا تَعْبُدُونَ ۝ قَالُوا نَعْبُدُ أَصْنَاماً فَنَظَلُّ لَهَا عٰكِفِينَ ۝ قَالَ هَلْ يَسْمَعُونَكُمْ إِذْ تَدْعُونَ ۝ أَوْ يَنْفَعُونَكُمْ أَوْ يَضُرُّونَ ۝

(سورہ الشعراء۷۳-۶۹)

اور ان کو ابراہیمؑ کا حال پڑھ کر سنا دو، جب انھوں نے اپنے باپ اور اپنی قوم کے لوگوں سے کہا کہ تم کس چیز کو پوجتے ہو؟ وہ کہنے لگے ہم بتوں کو پوجتے ہیں اور ان کی پوجا پر قائم ہیں ابراہیمؑ نے کہا کہ جب تم ان کو پکارتے ہو تو کیا وہ تمہاری آواز سنتے ہیں؟ یا تمہیں کچھ فائدے دے سکتے ہیں یا نقصان پہنچا سکتے ہیں۔

ان آیات کریمہ پر غور کیجئے، اور حضرت ابراہیمؑ کی پیغمبرانہ فراست، اور حکیمانہ بالغ نظری کا اندازہ کیجئے، انھوں نے اپنی قوم کے معبودان باطل کی کوئی ہجو نہیں کی، اور نہ ان کو برے نام سے یاد کیا، اگر ایسا کرتے تو عین ممکن تھا کہ ان کے مخاطب بپھر جاتے اور سرے سے بات سننے ہی کے لئے تیار نہ ہوتے، لہٰذا حضرت ابراہیمؑ نے بجائے خود کچھ کہنے کے انہی کو مجبور کیا کہ وہ بولیں، فرمایا: ماتعبدون؟ کس

چیز کی تم لوگ پرستش کرتے ہو؟

قَالُوا نَعْبُدُ اَصْنَاماً فَنَظَلُّ لَهَا عٰكِفِيْنَ ۝ قَالَ هَلْ يَسْمَعُوْنَكُمْ اِذْ تَدْعُوْنَ ۝ اَوْ يَنْفَعُوْنَكُمْ اَوْ يَضُرُّوْنَ ۝

(الشعراء۷۳-۷۱)

وہ کہنے لگے ہم بتوں کو پوجتے ہیں اوران کی پوجا پر قائم ہیں ابراہیم نے کہا کہ جب تم ان کو پکارتے ہو تو کیا وہ تمہاری آواز کو سنتے ہیں؟ یا تمہیں کچھ فائدے دے سکتے ہیں یا نقصان پہنچا سکتے ہیں۔

حضرت ابراہیمؑ نے یہاں منطقی دلائل سے کام نہیں لیا اور نہ فلسفیانہ موشگافی کی،صرف یہ سوال کیا کہ آیا جب تم ان کو پکارتے ہو تو کیا یہ تمہاری پکار سنتے ہیں؟ نفع یا نقصان پہونچاتے ہیں؟ کیونکہ انسانی زندگی انہی بنیادوں پر قائم ہے، انسان کو جب پکارا جائے تو سنے، پھر نفع کی اس سے امید ہو یا نقصان کا خوف ہو، یہ وہ دو سرے ہیں، جن سے انسانی زندگی بندھی ہوئی ہے،ایک انسان کا دوسرے انسان سے،ایک سوسائٹی کا دوسری سوسائٹی سے تعلق انہی بنیادوں پر قائم ہے،نفع کی امید اور نقصان کا خوف، سچ یہ ہے کہ زندگی کی پوری گردش اسی بنیادی نقطہ سے مربوط ہے۔

''قَالُوا بَلْ وَجَدْنَا اٰبَاءَ نَا كَذٰلِكَ يَفْعَلُوْنَ'' کہنے لگے(یہ بات نہیں کہ وہ ہمیں فائدہ یا نقصان پہونچاتے ہیں) بلکہ بات یہ ہے کہ ہم نے اپنے آباء واجداد کو اسی طرح کرتے دیکھا ہے۔

یہی وہ بات تھی، جو حضرت ابراہیم علیہ السلام ان کے منہ سے کہلانا چاہتے تھے، کیونکہ یہ جواب دراصل جہل وعاجزی کا اعتراف ہے،وہ کوئی جواب دے ہی نہیں سکتے تھے،یعنی یہ جو نام وہمی معبودوں کے رکھے ہیں،ان کا کہیں وجود بھی ہے؟ یہ ہاتھوں سے تراشے ہوئے اور پتھروں کے سہارے کھڑے کئے ہوئے بت، یہ وہمی اور

افسانوی معبود جن کا کہیں وجود نہیں، ان کا زندگی سے کیا رشتہ ہے، اور انسانوں کے لئے کیا کر سکتے ہیں کس درجہ کا مداوا بن سکتے ہیں؟ کس مصیبت سے نجات دلا سکتے ہیں، کوئی علمی توجیہ کوئی حقیقت اور علم پر مبنی بنیاد بھی ان کی ہے؟؟

ذہانت، قوت گفتار اور مخاطب کی مدافعانہ صلاحیت سے فائدہ اٹھانا

ان آیات کریمہ کو بار بار پڑھئے، آپ محسوس کریں گے کہ ان میں ایک جہانِ معانی آباد ہے، ایک معنی سے دوسرے معنی روشن ہوں گے، ایک بات سے دوسری کارآمد بات نکلے گی، اور ان دونوں انداز بیان (والد کو دعوت دینے اور قوم کو مخاطب کرنے) کا فرق واضح ہوگا۔ اور یہ انداز ہوگا کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے پیغمبر برحق حضرت ابراہیم علیہ السلام کو کس درجہ انسانی نفسیات پر عبور عطا فرمایا تھا، اور ذہن و قلب کے باریک سے باریک سوتوں کو جگانے اور صلاحیتوں کو بیدار کرنے میں مہارت انھیں حاصل تھی، اپنے مخاطبین سے کس درجہ انھوں نے وہ سب کچھ اگلوالیا جوان کے دل ودماغ میں محفوظ تھا، ان کی ذہانتیں، قوت گفتار، مدافعانہ صلاحیتیں سب ظاہر ہوگئیں، اور آخر میں ان کے ترکش کا آخری تیر بھی نکلوالیا (بَلْ وَجَدْنَا اٰبَآءَ نَا كَذٰلِكَ يَفْعَلُوْنَ) "بات یہ ہے کہ ہم نے اپنے آباء و اجداد کو اسی طرح کرتے پایا ہے" حضرت ابراہیم علیہ السلام نے یہ جواب کہلا کر گویا ان سب کی جھولی خالی کروائی، اب وہ دیوالیہ ہو چکے تھے، ان کے پاس کچھ کہنے کو رہ نہیں گیا۔

اب اس کے بعد اپنی دعوت شروع کی، اللہ تعالیٰ کی ذات اور توحید سے ان کو آشنا کرنا شروع کیا فرمایا:

اَفَرَءَيْتُمْ مَّا كُنْتُمْ تَعْبُدُوْنَ ۙ اَنْتُمْ وَاٰبَآؤُكُمُ الْاَقْدَمُوْنَ ۚ فَاِنَّهُمْ عَدُوٌّ لِّيْٓ اِلَّا رَبَّ الْعٰلَمِيْنَ ۙ الَّذِيْ خَلَقَنِيْ فَهُوَ

يَهْدِيْنِ۝ وَالَّذِيْ هُوَ يُطْعِمُنِيْ وَيَسْقِيْنِ۝ وَاِذَا مَرِضْتُ فَهُوَ يَشْفِيْنِ۝ وَالَّذِيْ يُمِيْتُنِيْ ثُمَّ يُحْيِيْنِ۝ وَالَّذِيْ اَطْمَعُ اَنْ يَّغْفِرَلِيْ خَطِيْئَتِيْ يَوْمَ الدِّيْنِ ۝ (سورہ الشعراء ۸۲-۷۵)

تم نے دیکھا کہ جن کو تم پوجتے رہے ہو تم بھی اور تمہارے اگلے باپ دادا بھی، وہ میرے دشمن ہیں، لیکن خدائے رب العالمین (میرا دوست) جس نے مجھے پیدا کیا اور وہی مجھے رستہ دکھاتا ہے، اور مجھے کھلاتا اور پلاتا ہے اور جب میں بیمار پڑتا ہوں تو مجھے شفا بخشتا ہے، اور وہ جو مجھے مارے گا اور پھر زندہ کردے گا، اور جس سے میں امید رکھتا ہوں کہ قیامت کے دن میرے گناہ بخشے گا۔

قرآن کریم کا طرز، اثبات مفصل اور نفی مجمل

یہاں قرآن کریم کا ایک عجیب دل آویز نکتہ ہے جس کی طرف سب سے پہلے شیخ الاسلام ابن تیمیہؒ کے ایک جملہ سے توجہ ہوئی، وہ فرماتے ہیں: فلاسفۂ یونان جب اللہ جل شانہ کی صفات کا ذکر کرتے (جس کو وہ اپنی فلسفیانہ زبان میں ''واجب الوجود'' یا ''مبدأ فیاض'' سے یاد کیا کرتے تھے) تو وہ ان صفات کی زیادہ تفصیل اور گہرائی میں جاتے تھے، جو ان کے نزدیک اللہ تعالیٰ کے لئے مناسب نہیں ہیں، یعنی سلبی صفتیں (وہ ایسا نہیں ہے، اور اس بات سے مبرا ہے) اور جب اثباتی صفات کا ذکر ہوتا (اللہ ایسا ہے اور اس کی یہ صفت ہے) تو اس میں اجمال سے کام لیتے، اس طرح فلسفہ میں سلبیات کا بیان مفصل ہے، اور ایجابیات کا ذکر اجمالاً ملتا ہے، برخلاف قرآن کریم کے اس میں ایجابیات کی تفصیل ہے اور سلبیات کا اختصار ہے، دوسرے آسمانی مذاہب اور انبیاء کرام کی تعلیمات میں یہی مشترک وصف ملے گا کہ اثبات مفصل اور نفی مجمل ہے۔

اللہ تعالیٰ کی صفات کا اثباتی بیان قرآن کریم کی ان آیات میں پڑھئے:

هُوَ اللّٰهُ الَّذِیْ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ عٰلِمُ الْغَیْبِ وَالشَّهَادَةِ ۚ هُوَ الرَّحْمٰنُ الرَّحِیْمُ ۝ هُوَ اللّٰهُ الَّذِیْ لَا اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ۚ اَلْمَلِكُ الْقُدُّوْسُ السَّلٰمُ الْمُؤْمِنُ الْمُهَیْمِنُ الْعَزِیْزُ الْجَبَّارُ الْمُتَكَبِّرُ ؕ سُبْحٰنَ اللّٰهِ عَمَّا یُشْرِكُوْنَ ۝ هُوَ اللّٰهُ الْخَالِقُ الْبَارِئُ الْمُصَوِّرُ لَهُ الْاَسْمَآءُ الْحُسْنٰى ۝ یُسَبِّحُ لَهٗ مَا فِی السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ۚ وَهُوَ الْعَزِیْزُ الْحَكِیْمُ ۝ (سورہ الحشر ۲۴-۲۲)

وہی خدا ہے جس کے سوا کوئی معبود نہیں، پوشیدہ اور ظاہر کا جاننے والا، وہ بڑا مہربان نہایت رحم والا ہے، وہی خدا ہے جس کے سوا کوئی لائق عبادت نہیں، بادشاہ حقیقی، پاک ذات (ہر عیب سے) سالم، امن دینے والا، نگہبان، غالب، زبردست، بڑائی والا، خدا ان لوگوں کے شریک مقرر کرنے سے پاک ہے، وہی خدا (تمام مخلوقات کا) خالق، ایجاد و اختراع کرنے والا، صورتیں بنانے والا، اس کے سب اچھے سے اچھے نام ہیں، جتنی چیزیں آسمانوں اور زمینوں میں ہیں، سب اس کی تسبیح کرتی ہیں اور وہ غالب حکمت والا ہے۔

اور سلبی صفت کا ذکر پڑھئے:

لَیْسَ كَمِثْلِهٖ شَیْءٌ ۚ وَهُوَ السَّمِیْعُ الْبَصِیْرُ ۝

(سورہ الشوریٰ-۱۱)

اس جیسی کوئی چیز نہیں، اور وہ دیکھتا سنتا ہے۔

امام ابن تیمیہؒ نے مزید فرمایا کہ سلبی صفات خواہ سیکڑوں کی تعداد میں ہوں، ان کا وہ اثر نہیں پڑتا جو ایک اثباتی بیان کا ہوتا ہے۔ امام ابن تیمیہؒ نے بالکل سچی

بات کہی ہے، حقیقت یہی ہے کہ ہماری یہ زندگی اور گزری ہوئی نسلوں کی زندگیاں گواہ ہیں کہ انسانی زندگی اثبات پر قائم ہے، نہ کہ نفی پر، نفی کی نسبت انسانی زندگی اور تمدن میں بہت معمولی ہے۔

دلی جوش اور امنگ کے ساتھ اللہ کا تذکرہ

حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اس جواب کو سن کر کہ "ہم بتوں کی پرستش کرتے ہیں، اور انھیں پر جمے بیٹھے رہتے ہیں" فرمایا کہ کیا تمہاری وہ سنتے ہیں، جب تم ان کو پکارتے ہو، کیا تم کو فائدہ پہونچاتے ہیں، یا ضرر پہونچاتے ہیں؟ اس ارشاد میں "نفی مجمل" ہے، اور جب اللہ کا تذکرہ ہوا، اور دعوت کی بات آئی تو اس میں وسعت بیانی اور فراخ دامانی سے کام لیا، اور اثبات مفصل کا رنگ آ گیا، اور فرمایا:

فَإِنَّهُمْ عَدُوٌّ لِّيٓ إِلَّا رَبَّ الْعٰلَمِينَ ۝ الَّذِي خَلَقَنِي فَهُوَ يَهْدِينِ ۝ وَالَّذِي هُوَ يُطْعِمُنِي وَيَسْقِينِ ۝ وَإِذَا مَرِضْتُ فَهُوَ يَشْفِينِ ۝ وَالَّذِي يُمِيتُنِي ثُمَّ يُحْيِينِ ۝ وَالَّذِي أَطْمَعُ أَنْ يَّغْفِرَ لِي خَطِيٓئَتِي يَوْمَ الدِّينِ ۝ (سورہ الشعراء ۷۷-۸۲)

وہ میرے دشمن ہیں، لیکن خدائے رب العالمین (میرا دوست ہے) جس نے مجھے پیدا کیا اور وہی مجھے رستہ دکھاتا ہے، اور وہ مجھے کھلاتا اور پلاتا ہے اور جب میں بیمار پڑتا ہوں تو مجھے شفا بخشتا ہے، اور وہ جو مجھے مارے گا اور پھر زندہ کردے گا، اور جس سے میں امید رکھتا ہوں کہ قیامت کے دن میرے گناہ بخشے گا۔

ان آیات کریمہ میں اللہ تعالیٰ کی پانچ صفات کا ذکر ہے (تخلیق، ہدایت، رزق، شفا اور موت وحیات پر قدرت) جبکہ بتوں کے سلسلہ میں جو سوال کیا اس میں صرف دو باتیں دریافت کی تھیں، کیا وہ دعا سنتے ہیں؟ اور کیا وہ نفع وضرر پر قدرت

رکھتے ہیں، لیکن جب اللہ تعالیٰ کا نام آیا اور اس کا ذکر شروع کیا تو ایسا محسوس ہوتا ہے کہ جیسے ان کی روح جھوم اٹھی ہو اور وجد سا آ گیا ہو، جوش اور امنگ کے ساتھ بیان کرنے لگے، فطری بات ہے کہ انسان جب کسی شے میں لذت محسوس کرتا ہے تو اگر وہ کھانے کی ہوتی ہے تو دیر تک منھ میں رکھتا ہے، کام و دہن کو زیادہ سے زیادہ مزہ لینے کا موقع دیتا ہے، لیکن اگر کوئی تلخ شئ ہوئی، اور اس کا استعمال ضروری ہوا تو جلد سے جلد اس سے چھٹکارا حاصل کرنا چاہتا ہے، اور ایک ہی گھونٹ یا ایک ہی نوالہ میں اس کو حلق سے اتار لیتا ہے۔

چنانچہ انھوں نے جب اللہ تعالیٰ کا ذکر چھیڑا تو جذبات میں جوش اور ایمان میں حرکت آ گئی، اور فرمایا: "یہ میرے لئے باعث ضرر ہیں، مگر ہاں رب العالمین! جس نے مجھے پیدا کیا اور پھر وہی میری رہنمائی کرتا ہے، اور جو کہ مجھے کھلاتا پلاتا ہے، اور جب میں بیمار ہو جاتا ہوں وہی مجھ کو شفا دیتا ہے، اور جو مجھ کو موت دے گا، پھر مجھے زندہ کرے گا، اور جس سے مجھے امید ہے کہ قیامت کے روز میری غلط کاریوں کو معاف کر دے گا۔

دل کی آواز موقع ومناسبت کی جستجو نہیں کرتی

اتنا کہنے بعد بھی ان کی طبیعت سیر نہیں ہوئی، جیسے ہی اللہ کا نام زبان پر آیا دل امنڈ آیا موقع ومناسبت سے بے نیاز ہو کر دل کی آواز دعا بن کر نکلنے لگی:

رَبِّ هَبْ لِيْ حُكْماً وَّأَلْحِقْنِيْ بِالصَّالِحِيْنَ. وَاجْعَلْ لِّيْ لِسَانَ صِدْقٍ فِي الْاٰخِرِيْنَ ۔ وَاجْعَلْنِيْ مِنْ وَّرَثَةِ جَنَّةِ النَّعِيْمِ ۔ (سورہ الشعراء۔۸۳۔۸۵)

اے پروردگار مجھے علم و دانش عطا فرما اور نیکوکاروں میں شامل کر اور پچھلے لوگوں میں میرا ذکر نیک کر اور مجھے نعمت کی بہشت کے وارثوں

میں کر۔

اتنا عرض کرنے کے بعد باپ کی یاد آ گئی، کیونکہ وہ بت پرستوں کے قائد اور مندر کے بڑے پجاری اور مشہور کاہن تھے، اور فرمایا:

وَلَا تُخْزِنِیْ یَوْمَ یُبْعَثُوْنَ ۝ یَوْمَ لَا یَنْفَعُ مَالٌ وَّلَا بَنُوْنَ ۝ اِلَّا مَنْ اَتَی اللّٰہَ بِقَلْبٍ سَلِیْمٍ ۝ (سورہ الشعراء ۸۹-۸۷)

اور جس دن لوگ اٹھا کر کھڑے کئے جائیں گے، مجھے رسوا نہ کیجیو جس دن نہ مال ہی کچھ فائدہ دے سکے گا اور نہ بیٹے، ہاں جو شخص خدا کے پاس پاک دل لے کر آیا (وہ بچ جائے گا۔)

ان آیتوں کے بعد یہ بھی پڑھئے:

اِنَّ اِبْرَاهِیْمَ کَانَ اُمَّةً قَانِتاً لِّلّٰہِ حَنِیْفاً ؕ وَلَمْ یَكُ مِنَ الْمُشْرِکِیْنَ ۝ شَاکِراً لِّاَنْعُمِہٖ ؕ اِجْتَبٰہُ وَھَدٰہُ اِلٰی صِرَاطٍ مُّسْتَقِیْمٍ ۝ وَاٰتَیْنٰہُ فِی الدُّنْیَا حَسَنَةً ؕ وَاِنَّہٗ فِی الْاٰخِرَةِ لَمِنَ الصّٰلِحِیْنَ ۝ (سورہ النحل ۱۲۰-۱۲۲)

بے شک ابراہیمؑ (لوگوں کے) امام (اور) خدا کے فرمانبردار تھے جو ایک طرف کے ہو رہے تھے، اور مشرکوں میں سے نہ تھے اس کی نعمتوں کے شکر گزار تھے خدا نے ان کو برگزیدہ کیا تھا، اور (اپنی) سیدھی راہ پر چلایا تھا، اور ہم نے ان کو دنیا میں بھی خوبی دی تھی، اور وہ آخرت میں بھی نیک لوگوں میں ہوں گے۔



مولانا کا اسلوب بیان

ا۔ اردو

حضرت مولانا رحمۃ اللہ علیہ کا اسلوب تحریر وتقریر ان کے سوز دروں، حمیت وغیرت اور جوش طبیعت کا پیدا کردہ ہے۔ وہ اپنی عربی یا اردو تحریر میں کوئی چبھتا ہوا فقرہ یا تراشا ہوا لفظ یا نئے طرز کا ڈھالا ہوا جملہ استعمال کرنے کے لئے مضمون نہیں لاتے، بلکہ مضمون کا بہاؤ، اور خیالات وافکار کا سیل رواں جملوں میں صوتی آہنگ پیدا کر دیتا ہے، اور جیسا کہ ہمارے شیخ عبد القادر جرجانی کہتے ہیں کہ الفاظ معانی کے خادم ومطیع بن کر ایک خوبصورت لڑی میں پروئے ہوئے معلوم ہوتے ہیں مولانا کے یہاں تمثیلات کی بہتات نہیں ہے، اور نہ تشبیہات (مفرد ومرکب) کا سہارا لیتے ہیں، اور نہ کسی موضوع میں قافیہ یا ازدواجیت کی کاوش نظر آتی ہے، قلب سلیم کا عطیہ فکر سلیم ہے، اور سلاست روی خود اپنی جگہ پر ایک حسن ہے، جو ہر طرح کے زیور وزیبائش سے بے نیاز ہے۔

حضرت مولاناؒ کے ''اسلوب بیان'' بیان کرنے کے لئے ضروری ہے کہ کچھ مثالیں دی جائیں۔ آپ کی تحریریں اردو اور عربی دونوں میں ہزاروں صفحات

میں پھیلی ہوئی ہیں۔ مقالات و بیانات، خطبے اور محاضرات اہل علم اور عامۃ الناس ہر طبقہ کو آپ نے اپنی تحریر یا تقریر کے ذریعہ مخاطب فرمایا، جہاں تفصیل کی ضرورت تھی اور مخاطب عامۃ الناس تھے وہاں تفصیل سے کام لیا، اور جہاں اشارات اور حوالوں سے متنبہ کرنا تھا وہاں حسب حال طرز کلام اختیار کیا گیا۔ آئندہ صفحات میں جہاں ہم آپ کی تالیفات کا ذکر کریں گے مثلاً صفحہ ۳۶۹ پر سیرت سید احمد شہیدؒ کے مقدمہ کی عبارت آپ کی نظروں سے گذرے گی، جو آپ کے ابتدائی زمانہ تحریر کی یادگار ہے۔ ہم یہاں پر ایک ایسی تحریر کا نمونہ دے رہے ہیں جو خودنوشت سوانح عمری کی ابتدائی صفحات ہیں، یہاں کوئی تصنع، بناوٹ اور آورد کا شائبہ بھی نہیں پایا جاسکتا۔ قلم برداشتہ سیدھی سادی تحریر ہے جو آپ کے حالات اور افکار کی تصویر بھی ہے۔ کاروان زندگی کے حصہ دوم کے صفحہ ۱۵ سے صفحہ ۱۸ تک کی عبارت اس غرض سے پیش کی جارہی ہے کہ حضرت مولاناؒ کے اسلوب کو قاری اچھی طرح سمجھ لیں۔

اپنے مستقر پر

حیات مستعار کا کمزور اور بوسیدہ دھاگہ ''کاروان زندگی'' کے صفحہ ۵۱۸ پر اس حالت میں چھوڑا تھا کہ ۱۹۶۶ء کا سال شروع ہو چکا ہے، اور میں سیتاپور اسپتال سے فرصت کر کے اپنے وطن رائے بریلی آگیا ہوں، اس جگہ اس دھاگہ میں عمر کے باون سال کی گرہ پڑ گئی تھی، اب اس دھاگہ کو جو ستر سال کی عمر میں اور کمزور پڑ گیا ہے (مارچ ۱۹۶۶ء سے) وہیں سے پکڑتا ہوں جہاں سے چھوڑا تھا ''وَلِلّٰهِ الْأَمْرُ مِنْ قَبْلُ وَمِنْ بَعْدُ''۔

مناسب یہ معلوم ہوا کہ پہلے ان اہم تصنیفی و تحقیقی کاموں کا ذکر ایک سلسلہ میں کر دیا جائے جو ۱۹۶۶ء سے ۱۹۷۰ء تک انجام پائے، اس کے بعد ان واقعات وحوادث کا تذکرہ کیا جائے جو اس عرصہ میں پیش آئے، پھر اس مدت کی ان اہم

مشغولیتوں ،تحریکوں اور مہموں کا ذکر کیا جائے ،جنھوں نے پوری توجہ اپنے اوپر مرکوز کر لی تھی ،اور ان کو میں نے وقت کا اہم تقاضہ اور دین وملت کی خدمت وحفاظت کا کام سمجھ کرانجام دیا تھا۔

جلد اول کے آخری دو صفحات پر جن تصنیفی کاموں کی طرف اشارے کئے گئے ہیں،ان کو اس باب میں قدرے تفصیل سے لکھا جاتا ہے کہ وہ دعوتی وعلمی اہمیت کے حامل ہیں۔

"ارکان اربعہ" کی تالیف

سیتاپور کے قیام کے دن ایک طرح موت وحیات کی کشمکش کے دن تھے، تصنیف وتالیف کا مشغلہ تو الگ ،میں اپنے عزیز رفیقوں سے پوچھتا تھا کہ کیا وہ دن پھر آئیں گے کہ میں معمول کے مطابق دن گذاروں گا ؟ آزادی سے چلوں پھروں گا، اور دوستوں اور عزیزوں کی مجلس میں شرکت کروں گا؟ لیکن اس امید وبیم کی حالت میں بھی شدت سے اس کا تقاضہ پیدا ہوا کہ میں یہاں چھٹی پاتے ہی اسلام کے عملی ارکان اربعہ پر مکمل کتاب تیار کرنے کی کوشش کروں، یہ خیال قلب و ذہن پر ایسا مستولی ہوا کہ اس کو اسپتال کا بیمار وسوگوار ماحول اور آنکھ کی بار بار کی تکلیف بھی نہ ہٹا سکی۔

اس خیال کا بڑا محرک یہ احساس اور علم تھا کہ اسلام کے ان عظیم بنیادی عملی ارکان (نماز ،زکوٰۃ ،روزہ اور حج) کی روح ،ان کی حکمتوں اور حقیقتوں ،مصالح اور فوائد اور ان کے مقاصد کے سمجھنے اور بیان کرنے میں ہمارے مصنفین واہل قلم کے یہاں عرصہ سے ایک عجیب قسم کا انتشار اور بے اعتدالی نظر آرہی ہے، ان کو بڑے بے تکلفی کے ساتھ عصر حاضر کے فلسفوں ،اقتصادی وسیاسی مکاتیب خیال اور ان کی محدود اصطلاحات وتعبیرات کا پابند وخوشہ چیں بنایا جارہا ہے ،اس کی وجہ

سے اس کا قوی اندیشہ پیدا ہو گیا ہے کہ اس مخصوص طرز فکر سے متاثر ہونے والے قارئین کہیں خدانخواستہ دین کے ان بنیادی ارکان کی حقیقت اور اس کی اصلی طاقت سے محروم نہ ہو جائیں، اور ان مقاصد سے ہی ہاتھ نہ دھو بیٹھیں، جن کے لئے ان ارکان کی تشریع عمل میں آئی ہے، جدید مادی تعبیر اور عصری تشریح کے دائرہ اثر میں آ کر ایمان واحتساب کا مفہوم ہی ہمارے ذہنوں اور دلوں سے نکل جائے اور مادی طرز فکر عبادت اور اخلاص کی روح پر غالب آ جائے، یہ بات امت کے لئے ایک بڑا خطرہ اور ایک عمیق معنوی تحریف کا پیش خیمہ ہے۔

آنکھ کی تکلیف، صحت کی کمزوری اور احتیاط کے طبی تقاضوں کے باوجود اس اہم اور نازک کام کی تکمیل کی ہمت کچھ اس لئے بھی پیدا ہوئی کہ اپنے عزیز دوست ڈاکٹر سعید رمضان کی تحریک اور تقاضہ پر حج کے مقاصد واسرار پر (جو اس حیثیت سے ارکان اربعہ میں سب سے مظلوم رکن ہے کہ اس کو ایک ''بین الاقوامی اسلامی مؤتمر'' کا مرادف عرصہ سے قرار دیا جا رہا ہے، اور راقم نے منیٰ وعرفات تک میں اس کا اسی طرح سے تعارف کیا جانا اپنے کانوں سے سنا ہے) مصنف حج پر ایک سلسلہ مضامین لکھ چکا تھا، جو تین قسطوں میں تین سال حج کے موقعہ پر ''المسلمون'' میں شائع ہوئے تھے، اور سعودی ریڈیو اسٹیشن سے بھی کئی بار نشر کئے گئے، اور تعلیم یافتہ نوجوانوں اور علمی حلقوں میں عام طور پر پسند کئے گئے، اس میں ایک ایسا نیا اسلوب تحریر نظر آتا ہے جو موجودہ عربی طرز نگارش سے الگ ہے، یہ کاتب کی کسی قابلیت اور زور قلم کا نتیجہ نہیں ہے، خود اس موضوع کے مزاج وروح کی کارفرمائی ہے، اور اس عاشقانہ ووالہانہ نسبت کا اثر ہے، جو اس رکن کے مؤسس وبانی ابراہیم خلیل اللہؑ کا امتیاز تھا، بقول شاعر

این ہمہ مستی ومدہوشی نہ حد بادہ بود
باحریفاں انچہ کرد آں نرگس مستانہ کرد

حج کے علاوہ مجھے دو سال رمضان سے متعلق بھی ''المسلمون'' ہی کی فرمائش پر روزہ اور اس کے مقاصد پر دو مقالے لکھنے کا موقع ملا تھا، اور وہ بھی ''المسلمون'' میں شائع ہوئے تھے۔ اس طرح اس وسیع اور نازک کام کو اس خیال نے ہلکا بنا دیا کہ اس سلسلہ کا آدھا کام تو ہو گیا ہے، اب صرف نماز اور زکوٰۃ پر لکھنا ہے، ۱۹ / ۲۰ / فروری ۱۹۶۶ء کو اسپتال سے واپسی ہوئی تھی کچھ دن ضروری آرام اور ایک دو سفر کے بعد ۸ / اپریل ۱۹۶۶ء (۱۶ / ذی الحجہ ۱۳۸۵ھ) سے اللہ کا نام لے کر اس کام کا آغاز کر دیا، گرمیاں شروع ہو چکی تھیں، اور آنکھ کی کیفیت کے لحاظ سے گرمی میں زیادہ احتیاط کی ضرورت تھی، میں نے حضرت شاہ علم اللہؒ اور سید احمد شہیدؒ کی بابرکت مسجد (واقع دائرہ شاہ علم اللہ رائے بریلی) میں جانب مغرب عقبی حصہ میں بیٹھ کر لکھوانے کا کام شروع کر دیا، عزیزی مولوی نثار الحق ندوی لکھتے تھے، میں بولتا تھا، کتاب کو اصلاً عربی ہی میں لکھنا تھا، اپنے طرز تصنیف کے مطابق پہلے میں نے مواد جمع کیا، مثلاً نماز کے لئے پہلے ایک بار پورے قرآن مجید پر نظر ڈالی، متعلق آیات نوٹ کرائیں، حدیث کے لئے ''جمع الفوائد و مجمع الزوائد'' کے ان ابواب پر نظر ڈالی جو ان ارکان کے فضائل، مقاصد و فوائد کے متعلق تھیں، اور ان کو نوٹ کیا، پھر خصوصیت کے ساتھ امام غزالیؒ حافظ ابن قیمؒ اور شاہ ولی اللہؒ نے اپنی تالیفات احیاء العلوم، زاد المعاد، اور حجۃ اللہ البالغہ وغیرہ میں اس پر جو کچھ لکھا ہے اور جو خاص نکتے ان کی تحریروں میں آئے ہیں ان کو قلم بند کیا، پھر ان کو سامنے رکھ کر لکھوانا شروع کیا، گرمی کی شدت شروع ہونے تک یہ سلسلہ جاری رہتا، ذہن و دماغ پر کتاب کا موضوع اس طرح طاری ہو گیا کہ دوسرے اوقات میں بھی وہ ساتھ نہیں چھوڑتا تھا، یہ عرصہ سے میری زندگی میں ہر اہم تصنیف کا خاصہ بن گیا ہے، اور اس کے خلاف کرنا عام حالات میں اب ممکن نہیں رہا ہے، یہ ایک طرح کا ''تصنیفی

اعتکاف" ہوتا ہے، جس سے نکلنا اسی وقت ہوتا ہے، جب کتاب کی تائے تمت ہلال عیدبن کرنمودار ہوتی ہے، حج اور روزہ پر اگرچہ بنیادی مضمون پہلے سے تیار تھے، پھر بھی کتاب کے وسیع خاکہ اور معیار کے مطابق ان میں خاصہ اضافہ کرنا پڑا، اس سلسلہ میں سب سے زیادہ مدد اور رہنمائی شاہ صاحب کی کتاب حجۃ اللہ البالغہ سے ملی۔

۲۔ عربی

ہندوستان میں عربی کے سب سے بڑے اسکالر جن کا لوہا مصروشام کے اساتذۂ فن نے مانا ہے، وہ علامہ عبدالعزیز میمن تھے، جن کی تصنیفات سمط اللآلی، ابو العلاء و ماالیہ ادب عربی کے ماخذ میں شمار ہوتی ہے، انھوں نے متعدد بار اپنی مجلسوں میں اس کا اظہار کیا کہ عربی زبان لکھنے پر جو قدرت علی میاں کو ہے وہ اس ملک میں کسی کو حاصل نہیں، گذشتہ صفحات میں یہ ذکر آچکا ہے کہ مولانا اپنی نوجوانی کے زمانہ میں جب علی گڈھ گئے تو علامہ میمنی نے فرمایا کہ آپ بہت خوبصورت عربی لکھتے ہیں۔

مولانا کی تحریر کا اگر تجزیہ کیا جائے تو محسوس ہوگا کہ آپ کی تحریر میں تمثیل مرکب، اور تشبیہات و توشیحات شاذ ونادر پائی جاتی ہیں کہیں کہیں ایسا محسوس ہوتا ہے کہ مصطفیٰ لطفی المنفلوطی کا اثر پڑا ہے، اور جملوں میں قافیے بھی لائے ہیں، جیسے مولانا کا وہ مضمون جو مصر سے شہنشاہیت کے خاتمے پر لکھا تھا، احمد حسن زیات کے ماہانہ مجلّہ "الرسالہ" میں شائع ہوا تھا، اس کا ایک جملہ ابھی یاد ہے "فلیسمع ترومان ومن له اذنان" (ترومان عربی میں دراصل ٹرومین ہے جو امریکہ کا صدر تھا اور عرب اخباروں میں اسی طرح لکھا جاتا تھا) دوسری خصوصیت فصل ووصل کی مکمل رعایت، عبدالقاہر الجرجانی "اسرار البلاغہ" میں لکھتے ہیں، "مجھ سے کوئی پوچھے کہ ادب کیا ہے؟ تو میں کہوں گا کہ فصل ووصل کی پہچان، اور اس کی صحیح جگہ کا انتخاب" تیسری خصوصیت جوش بیان و خطابت کی ہے، اور اس کا سبب طبیعت کی

جولانی، اور جذبات کی فراوانی، اور عقیدہ پر پختہ یقین، چوتھی خصوصیت یہ ہے کہ ان کی تحریر اور تقریر دونوں میں مدعیانہ انداز نہیں ہوتا، مولانا کو اپنی ''انا'' چھپانے میں کمال حاصل ہے، اور یہ بات ان کو نہ صرف معاصرین میں بلکہ متقدمین میں بھی ممتاز کرتی ہے، انھوں نے عربوں کو دعوت دی، اور پوری صراحت کے ساتھ ان کو اس فرض منصبی کی یاد دلائی جو ان سے متوقع تھی، انھوں نے حجاز کے ٹھیٹ بدوؤں میں بھی گفتگو کی، اور مصر کے بازار علم وادب میں بھی صدائیں لگائیں، لیکن کہیں مدعیانہ اسلوب نہیں پایا گیا، کہیں کہیں ہلکے قوافی یا ازدواجیت کا رنگ ملتا ہے، مگر اس کی پابندی کبھی نہیں کی ہمیشہ مقصود ومعانی کو ترجیح دی، اور الفاظ کے گھروندے بنانے کی کوشش نہیں کی، اہل علم جانتے ہیں کہ تحریر میں کاتب کا سب سے بڑا کمال کسی واقعہ کا تجزیہ کرنا، اور وصف نگاری ہے جس سے بات آئینے کی طرح قاری کی سمجھ میں آجائے، اور اس کی آنکھوں کے سامنے ایک نقشہ دکھائی دے، یہ بات خداداد حضرت مولانا کو اس وقت حاصل تھی جب ان کے پاس الفاظ کا ذخیرہ کم، قوت بیان محدود، اور عمر صرف سولہ سال کی تھی، اس وقت کے انشاء کا نمونہ ملاحظہ ہو، لفظ کے صحیح استعمال کو عربی تحریر کی روشنی میں دیکھا جائے۔

فماظنك برجل قام لمعالجته ، ماظنك بمن قام في مثل هذا الوقت، لرأب الصدع ورتق الفتق، ما ظنك برجل قام للمدافعة عن المسلمين لما ضاقت عليهم الارض وكادت تميد بهم،ماظنك برجل جاهد في سبيل الله حق جهاده وسقى الشجر الاسلامي في الهند بدمه بعدما عراه الذبول:

اس شخص کے بارے میں آپ کیا سوچیں گے جو بگڑے ہوئے
حالات کے سدھار کے لئے کھڑا ہوا ہو، اور اُس شخص کے متعلق آپ
کیا سوچیں گے جو ایسے وقت میں خلیج کو پاٹنے اور پھٹے ہوئے دامن
کو رفو کرنے کی کوشش میں لگا ہو، آپ کا کیا خیال ہے اس شخص کے
بارے میں جبکہ مسلمانوں کے لئے زمین تنگ ہو رہی ہو، اور ان کے
پیروں کے نیچے سے نکل رہی ہو، اس وقت ان کی مدافعت کے لئے
کھڑا ہوا ہو، کیا خیال ہے آپ کا جس نے اللہ کے راستہ میں جہاد کا
حق ادا کر دیا ہو، اور اس سرزمین ہند میں اسلام کے پودے کو اس
وقت پانی دیا ہو جبکہ وہ سوکھ رہا تھا۔

سید صاحب علیہ الرحمہ کے کارنامۂ جہاد کو مختصر الفاظ میں اس طرح بیان کرنا خام عمر میں یہ پختہ کاری محض اللہ کی دین اور قدرت کا عطیہ ہے۔

وصف نگاری کا ایک نمونہ ہمیں اسی کتابچہ میں ملتا ہے، طول طویل عربی عبارت نقل کرنا مناسب نہیں، عربی داں حضرات براہ راست اس رسالہ کا مطالعہ کر سکتے ہیں، جو ۱۳۵۰ھ میں شائع ہوا تھا، اس کے صفحہ ۳۹ پر مولانا نے سید صاحبؒ کی زندگی کے آغاز کا واقعہ لکھا ہے کہ کسب رزق کے لئے وہ کس طرح رائے بریلی سے لکھنؤ آئے اور اس وقت ان کے اخلاق، بے نفسی اور خدمت خلق کا ان کے اندر بھرپور جذبہ تھا، اس عبارت کے چند جملوں کا ترجمہ سنئے۔

''سترہ سال کی عمر سے ابھی آگے نہیں بڑھے تھے، کہ ان کو یتیمی کا داغ اٹھانا پڑا، اور اپنے کنبہ کی نگہداشت کا باران پر آ پڑا، وسائل کی کمی نے گھر سے نکلنے پر مجبور کیا، سات رفقاء کے ساتھ لکھنؤ کا رخ کیا، (مولانا کا استعمال کردہ ادبی لفظ شخص الی لکناء بجائے، توجہ الی، یا ذھب الی، کا استعمال بہت حسن دے رہا ہے) سواری کے لیے صرف ایک گھوڑا تھا، جس پر باری باری لوگ سوار ہوتے، رفقاء

سفر کو ضرورت تھی کہ ایک مزدور بھی ہو، جو سامان لے کے ساتھ چلے، سید صاحب نے اصرار کر کے بوجھ اپنے سر پر اٹھالیا، اور ایک مزدور کی طرح بوجھ اٹھائے پیدل لکھنؤ آئے، لکھنؤ پہنچنے پر ایک قومی کارکن جو سید صاحب کی شخصیت اور گھرانے سے واقف تھے، انھوں نے ان کا اکرام کیا، اور معزز مہمان کی حیثیت سے رکھا، اور ایک فوجی خدمت میں کام دلایا، اور ان کے ساتھ مزید دو افراد کو آتے ہی کام مل گیا، سید صاحب اپنے ساتھیوں کے لئے کھانا تیار کرتے اور خود نانِ خشک پر اکتفا کرتے۔

ایک روز سید صاحب نے دیکھا کہ ایک پولیس کا آدمی ایک مزدور پر بھاری بوجھ اٹھوا کر لے جارہا ہے، مزدور اپنی کمزوری کے باوجود ہانپتا کانپتا چل رہا ہے، سید صاحب کو رحم آیا، اور اس پولیس والے سے کہا کہ اس پر رحم کرو، اور اتنا بھاری بوجھ اس سے نہ اٹھواؤ، مگر اس شخص نے اس سفارش کو قبول نہیں کیا، اور کہا کہ اگر وہ نہیں اٹھاتا ہے تو تم اٹھالو، سید صاحبؒ نے اس مزدور کا کام اپنے سر لے لیا، اور وہ بوجھ اپنے سر پر اٹھا کر پہنچادیا۔

اس عبارت میں جو صرف ترجمہ ہے، آپ نے محسوس کیا ہوگا کہ اس کو مختصر الفاظ میں اور صحت کے ساتھ ترجمانی کرنے میں کتنی پختہ عربیت کی ضرورت ہے، الحمد اللہ کہ حضرت مولانا نے جب قلم پکڑنا سیکھا اس وقت اس طرح کے مضامین کو سلیس عربی میں لکھا کرتے تھے۔

ایک پختہ کار اہل قلم بننے کے بعد آپ کی تحریروں کے سینکڑوں بلکہ ہزاروں فقرے ادبی تحفے کی حیثیت سے پیش کئے جاسکتے ہیں، جس کے متحمل اس کتاب کے صفحات نہیں ہوسکتے، چند سطریں مختارات کے مقدمہ سے نقل کرتا ہوں جو آپ کی سادہ اور خوبصورت عربیت کی نمائندہ ہیں۔

امابعد! فقد انتهت بنا معالجة التعليم والتربية ، والاتصال بطبقات الامة الاسلامية ورجالها فى البلاد الأعجمية۔ كالهند۔ خاصة، ودراسة نفسيات الشباب وعقولهم ،ومايبدرمنهم بين حين وآخر من آراء غريبة ونظريات شاذة فى الدين والأخلاق والاجتماع، انتهى بنا كل ذلك الى ان للغة وماتحويه من ادب وثقافة دينية اثرا بليغافى العقلية ومنهج التفكير وان للدين لغة كما أن للشعب لغة، وان للدين ثقافة تحفظها لغته، ومن جهل هذه اللغة لم يتشبع بروح الدين ولم يروم من معينه ولم يستق من منا بعه الصافية۔

واللغة العربية ،مفتاح كنوز الكتاب والسنة، وباب تلك المكتبة العامرة الزاخرة التى تحتوى على انفس ماانتجته القرائح البشرية، وابدعته العقول السليمة ،وفاضت به خواطر وسالت به محابر، من ادب وشعر وتاريخ وفن وحكمة فى مساحة زمانية واسعة كمساحة التاريخ الاسلامى، وفى مساحة مكانية شاسعة كمساحة العالم الاسلامى۔

سبق اللغة العربية فى الهند عهد زاهر وسوق نافقة فنبغ فيها بعض كبار المؤلفين فى

العربية و اللغويين والشعراء، كالامام الصغانی اللاهوری (م٦٥٠هـ)صاحب العباب الزاخر ومجمع البحرين وكتاب الاضداد فى اللغة ومشارق الانوار فى الحديث[1] والقاضی عبدالمقتدر الدهلوی (م٧٩١هـ) صاحب القصيدة اللامية والشيخ احمدالتهانيسری (م٨٢٠هـ) صاحب الدالية، والعلامة محمود الجونبوری (م١٠٦٢هـ) صاحب الفرائد فی علوم البلاغة ،وشيخ الاسلام ولی الله بن عبد الرحيم الدهلوی (م ١١٧٦هـ) صاحب حجة الله البالغة واطيب النغم، والشاعر المؤرخ السيدغلام علی آزاد البلكرامی (٠م١١٩٤هـ) صاحب السبع السيارة وسبحة المرجان، واللغوی الشهير السيد مرتضى البلكرامی الزبيدی (م١٢٠٥هـ)صاحب تاج العروس وتكملة[2] القاموس

اس تحریر میں "فقد انتهت بنا معالجة التعليم والتربية" کا سادہ مفہوم یہ ہے کہ تعلیم وتربیت کی مشغولیت نے ہمیں اس نتیجہ پر پہونچایا، یہ ترکیب،

---

(١) راجع تاج التراجم لابن قطلوبغا وكشف الظنون للحلبی وتاريخ "آداب اللغة العربية لجرجی زيدان"

(٢) انظر تراجمهم فی نزهة الخواطر وبهجة المسامع والنواظر العلامة السيد عبدالحی رحمة الله مدير ندوة العلماء سابقا

''انتهت بنا'' اور مشغولیت کے لئے معالجة کا لفظ کسی غیر عرب سے متوقع نہیں تھا، نیز یہ نظریہ کہ جس طرح صحافت کی ایک زبان ہوتی ہے، شاعری کی زبان ہوتی ہے، مدح و مرثیے کی زبان ہوتی ہے، رزم و بزم کا میدان جداگانہ ہوتا ہے، اسی طرح دین کی بھی ایک زبان ہے، اس کا بھی اپنا خاص اسلوب ہے۔

اس ضمن میں یہ بات واضح ہوگئی کہ ادب عربی سے اعتناء اور اس پر توجہ دینا دین فہمی کے لئے لازمی عنصر ہے، اور اس کو مصنوعی انشاء پردازی، یا اشعار پڑھ کر نہیں حاصل کیا جاسکتا۔

ایک انگریز کو عربی پڑھانے کے لئے ایک شیعہ عربی داں نے ''نفحة الیمن'' کے نام لطیفوں اور چٹکلوں کا ایک مجموعہ تیار کیا تھا، جس کا بدقسمتی سے ہمارے مدارس میں رواج تھا، اور اس میں اس طرح کے چٹکلے کہ ضاع کو ضاء کردیا تو معنی بدل گئے، ادب کی جان سمجھے جاتے تھے، اور اس کے بعد صنائع وبدائع کے نمونے جو عربیت کے انحطاط اور عصر اسلامی کی عصبیت کے ختم ہونے کے بعد فارسی اثرات سے زبان میں داخل ہوگئے تھے، ان کو پڑھنا پڑھانا، یاد کرنا اور رٹنا ادبیت سمجھا جاتا تھا مختارات کی ان سطور میں جو اوپر نقل کی گئی اس فریب کا جس خوبصورتی سے پردہ چاک کیا گیا ہے، وہ مولانا کے اسلوب کا بہترین نمونہ ہے۔



عربی تحریر و تقریر

حضرت مولانا کی عربی تحریر میں عجمیت کا کوئی شائبہ نہیں ہے، یہ راقم کا تجزیہ نہیں ہے، بلکہ عرب علماء وادباء کی رائے ہے، اور اس کا سبب معلوم ہے کہ انھوں نے عربی عرب اساتذہ سے پڑھی ہے اور مطالعہ خالص عربی نژاد ادباء اہل قلم کی تحریروں کا رہا۔ عنفوانِ شباب میں وہ ''الضیاء'' کے معاون اڈیٹر تھے جہاں اس وقت کے عالمی شہرت یافتہ اصحاب فکر وقلم سے رابطہ رہا، علامہ شکیب ارسلان جن کو ''امیر البیان'' کے لقب سے عرب علماء یاد کرتے تھے، انھوں نے مولانا کے مضمون کے حسن انشاء اور حسن ترجمانی کی داد دی، جو ''الضیاء'' میں اکبرالہ آبادی پر شائع ہوا تھا، اور یہ بات گزشتہ صفحات میں آچکی ہے کہ آپ کی وہ تحریر جو حضرت سید احمد شہید علیہ الرحمہ کی مختصر سوانح کی شکل میں ''المنار'' میں شائع ہوئی تھی اور اس کو خود علامہ رشید رضا نے کتابی شکل میں شائع کیا تھا۔ بعد میں جب ''ماذا خسر'' شائع ہوئی تو اس کی فکر اور حسن ادا کی تعریف کرنے والوں میں مفتی اعظم فلسطین شیخ امین الحسینی، امیر عبدالکریم الریفی، اللواء صالح حرب باشا، عبدالرحمٰن باشا، امین محمود خطاب جیسے عالم عرب کے زعماء تھے۔ دعوت واصلاح کے عرب علمبرداروں میں سید قطب شہیدؒ،

استاذ محب الدین الخطیب ، شیخ محمد الشرباصی ،شیخ محمد الغزالی ، ڈاکٹر سعید رمضان ، استاذ صالح عشماوی، شیخ بہی الخولی، ڈاکٹر یوسف سلامۃ جیسے صاحب علم ونظر لوگ تھے۔ادباء میں جن حضرات نے آپ کی ایک ایک تحریر کو بار بار پڑھا اور احترام ومحبت کے کلمات سے یاد کیا، ڈاکٹر شکری فیصل، استاذ عباس محمود العقاد، استاذ احمد حسن زیات، استاذ محمد محمود شاکر، ڈاکٹر حسین ہیکل، تھے، استاذ علی الطنطاوی جو ایک تسلیم شدہ مصلح وادیب اور وسیع النظر صاحب قلم تھے، ان کی تعریفیں تو مدح وقصیدہ کے نوعیت کی تھیں، لطف یہ ہے کہ فکری اباظہ اور ان کے علاوہ ایسے لوگ بھی تھے جو اسلام کی نشاۃ ثانیہ کے طرف سے مایوس اور اپنے خاص نظریات کے حامل تھے، مگر مولانا کی دو باتوں کے سب قائل تھے، اخلاص وحسن نیت اور صحیح عربیت پر اقتدار اور تحریر کی دل آویزی، چنانچہ وہ رسائل اور ریڈیائی تقریریں جن کا تذکرہ سفر مصر کے سلسلے میں کیا جا چکا ہے، اور وہ خطابات جس میں ملکوں کو خطاب کیا ہے، جن کا مجموعہ ''اسمعیات'' ہے جیسے اسمعی یا مصر ، اسمعی یا سوریا، اسمعی یا ایران اور اسی طرح تھوڑے عنوان کے فرق کے ساتھ ہر ملک کو الگ الگ خطاب کیا ہے۔اور اس وقت کے مضامین تھے جب آپ دوسری مرتبہ حجاز اور پہلی مرتبہ مصر تشریف لے گئے تھے۔

مولانا کی عربی زبان میں تقریریں سب یکجا کردی جائیں تو قاری کو مضمون میں یکسانی (وحدت موضوع) تلاش کرنے میں دشواری نہیں ہوگی اسلام کا نئے سرے سے مطالعہ کرنے کی ضرورت، دین کی اساس توحید اور رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت پر یقین ہے یہ وہ قوت کا راز ہے جس کو دنیا نے فراموش کردیا ہے۔یہ بات عربوں سے کرنے کے لئے بڑی جسارت کی ضرورت ہے۔جہاں سے دینی چشمہ پھوٹا، جہاں سے دنیا بھر کو امن کی دعوت ملی، اسی سرزمین پر یہ دعوت! وہ بھی عوام، بدوؤں کو نہیں، اونٹ اور بھیڑ کے چرواہوں کو نہیں، بلکہ ان کو جو اپنے فن کے

ماہر ہیں، کتاب وسنت کے شارح اور محقق ہیں، جو اپنی زبان کی ایک ایک ادا سے واقف ہیں مگر اللہ تعالیٰ جب کسی سے کوئی کام لینا چاہتا ہے تو ایسے اسباب بھی پیدا کردیتا ہے جو اس کام کے انجام پانے میں معاون ہوں، اللہ پر توکل ویقین اور دنیاوی یافت سے بے نیازی، پھر زبان وبیان کی فصاحت، موقع ومحل کی رعایت اور یہ کہ کہنے والے کے اندر طبعی طور پر جو انکساری اور تواضع ہے جس میں تصنع اور بناوٹ کا دخل نہیں یہ وہ صفات ہیں جو اس دعوت کو پہنچانے میں معاون ہوں یہاں نمونے کے طور پر ایک مختصر سی تقریر نقل کرتا ہوں۔ عربی سے واقف حضرات مضمون کے زور طبیعت کا اندرونی جوش اور بلاغت وحسن کلام کا لطف لیں گے اور دعوت وتبلیغ کا کام کرنے والے بات کرنے کا سلیقہ سیکھیں گے۔

یہ ایک محاضرہ (لکچر) ہے جو مدینہ یونیورسٹی کے ایک ایسے اجتماع میں ''ارتجالاً'' (Extempore) (بغیر کسی تیاری کے زبانی) دیا گیا جس میں کوئی شاہزادہ غالباً امیر مدینہ بھی تھے۔ (کیونکہ سموکم (Your Highness) سے خطاب بھی ہے) اس جلسہ میں علامہ شیخ بن باز مرحوم، امام حرم مدینہ اور قاضی شہر شیخ عبدالعزیز صالح کے علاوہ جامعہ اسلامیہ کے شعبوں کے صدر صاحبان اور اساتذہ جمع تھے، اس لکچر پر شیخ بن باز نے تعلیق (تبصرہ) بہت استحسان وتائید کے ساتھ کی، اس کو ٹیپ سے نقل کرکے ۲۲؍اکتوبر ۱۹۹۹ء کو ایک چھوٹے سے رسالے کی شکل میں شائع کیا گیا ہے۔ پہلے یہاں اصل تقریر نقل کی جاتی ہے تاکہ عربی جاننے والے حضرات اور ہمارے عربی کے طلبہ مستفید ہوں، عربی کے بعد اردو ترجمہ دیا گیا ہے۔

بسم الله الرحمن الرحيم

الحمد لله رب العالمين وصلى الله تبارك وتعالىٰ

على خير خلقه سيدنا ومولنا محمد وآله وصحبه

اجمعين وبارك وسلم ـ امابعد:

حضرات السادة الأجلاء ! لقد اعتادالمؤلفون القدامى اذا افتتحوا كتاباً والتمسوا العذر للتأليف قالو ا: أمرنى فلان،أمرنى من أمره حكم وطاعته غنم ، يحلو لى أن أردّدُ هذه الكلمة باستحقاق مناسب للحال ، وما كان يجول بخاطري أني سأسهم فى هذا الحفل الكبير الذى له قيمة كبيرة بتشريف صاحب السمو الملكى وحضرة رئيس القضاة صاحب الفضيلة الشيخ عبد العزيز الصالح ،وسماحة الشيخ عبد العزيز بن عبدالله بن باز، وهذه صفوة مختارةنخبة من أعلام العالم الاسلامي اليوم ،حاشاي اذاذكرت نفسى الصغيرة، ولكن هذا شرف وهذه فرصة كريمة يجب أن تنتهز، ولعل الله يفتح عليّ بما ينفعنى قبل كلّ واحد،ومايكتب عندالله من حسناتى ومن حسنات هذه الساعة ـ

ما عساي أقول لكم أيها الاخوان !أيهاالسادة الأجلاء!ان من سبقني من أهل الفضل قد أشبع الكلام وأحاط بالأطراف وأفاد وأجاد، ولكني اذا رأيت مندوحة فى الكلام ومبرراً، فذلك ما ألهمت فى هذه الساعة، عفوالساعة فيض الخاطر،

وهو أن أبلغ اليكم أمانة عزيزة فى عنقى، أمانة الشعوب التى زرتها ،والبلاد التى أ تاح الله لى الفرصة لزيارتها ،وابلغ اليكم رسالة من الشعب الذى أنتمى اليه، الشعب المسلم الغيور الذى يقطن شبه القارةالهندية، والشعوب الاسلامية وغير الاسلامية۔

أيهاالسادة ! ان هنالك كل شئي ، ان العالم قد اتخم ،قد اتخم بلحضارة،واتخم بالآ لات،واتخم بالمعلومات، واتخم بالمكتبات، واتخم بالمطبوعات، واتخم بالصحافة، واتخم بنتائج حصاد العقل الانسانى النابغ،ولكنه يشكو فراغا،يشكو فراغاً فى هذا المجتمع ،يشكو فراغاً فى هذه الحياة ، وفراغ القلب المخلص المتألم المؤمن ، فراغ العقل الواعى المؤمن ، فراغ الاخلاص ، فراغ التألم للبشرية ، انكم تجدون فى أروبا ، تجدون فى آسياوافريقياعلى تخلفهما،كل ما أنتجته القرائح البشرية، وكل مادبّجته الأقلام،كل ماخلفه السلف للخلف ، ولكن هذا العالم يشكو فراغاً، الفراغ الذى أفقد رونق كل شئي ، الفراغ الذى طمس معالم النور ، معالم الحياة، الفراع الذى جعل كل ذلك هباء اً منثوراً،وياليته كان هباء اً

منثوراً،لا ، ولكنه قد حول هذه الآلات الى آلات
مدمّرة ،وحول هذا العقل الى عقل مدمّر، الى
عقل مفسد، الى عقل شيطانى ابليسى، وحوّل
هذه المدنية جحيماً، انه قد استفاد، قد استمد
فى العهد الذى تحدث عنه سماحة الشيخ أستاذنا
الشيخ عبد العزيز ، وتحدث عنه العالم الجليل
الشيخ محمد الحبيب الخوجة ،قد استمد هذا
العالم كله ذلك النور ، تلك الهداية ، وملأذلك
الخواء، ملأ ذلك الفراغ الهائل الواقع فى ما
كانت تملكه البشرية فى ذلك العهدالراقى
المتمدن ، انه استمد من هذه المدينة التى كانت
تعيش فى عزلة عن العالم ، وفى أقصى العالم ، فى
هذه البلاد التى زهد فيها الطماعون ،وزهد فيها
الطامحون، وزهد فيها عباد النفس وعباد
الشهوات، وعبادالملك والسلطان، زهدوافيها
لقلةخيراتها،زهدوا فيهالقلة حولها وطولها ،
زهدوا فيهالقلة الآثار المدنية فيها ،ولكن هذه
المدينة، هذه المدينة المنطوية، المنطوية على
نفسها قد أفاضت على العالم الايمان بعد ما
فقده العالم كله بدياناته وبنظمه وباخلاقه
وبمفكريه وبفلاسفته ، كان العالم يحتاج الى

الايمان، والايمان قد فقد من مراكز كانت محتكرة للايمان ، كانت مظنة للايمان اذا صح التعبير ، ان المسيحية قد فقدت الايمان نفسها ، ان اليهودية قد فقدت الايمان نفسها، ان البوذية قد فقدت الايمان نفسها، ان البرهمية قدفقدت الايمان نفسها ان المجوسية قد فقدت الايمان نفسها،وكلها كانت تعيش ، تعيش فى تذبذب ، تعيش فى السراب ،تعيش فى شكوك ،تعيش فى ظلمات بعضها فوق بعض، اذاأخرج يده لم يكد يرا ها ، ومن لم يجعل الله له نوراً فما له من نور ، استفاد هذاالعالم من هذه المدينة، أقسم بالله ان هذا العالم، ان أثمن ماوجده هنا، ليست المدنية، وليست الحضارة، وليست هذه الحواشى الرقيقةللمد نية، وليست هذه الفلوس التى كان يعيش بها العالم كله ،انه استفادالايمان القوى، الثقة بالله، التوحيد الخالص النقى، الايمان بوحدانية الله تبارك وتعالىٰ ، ثم الايمان بكرامة الانسان ، الايمان بأن الانسان هو أشرف خلق الله، هوأشرف صنائع الله ،وأفضل صنائع الله، وأجمل صنائع الله، هذه التحفة ، هذه القوة، القوة الكامنة ،القوة الدافقة، التى استفادها العالم

من هذه الجزيرة ، فعاد كل شيئى له معنى ، قد كان قد أصبخ كل شئى ليس له معنى،ألفاظ وأسماء بلامسميات، وألفاظ بلامعانى، وصور ودمى لاروح فيها ولاحياة "أو من كان ميتاً فاحييناه وجلعناله نوراً يمشى به فى الناس كمن مثله فى الظلمات ليس بخارج منها " هذا كان مثل العالم كله ، فالشيئى العزيز ، الشيئى النادر الذى يئست منه الانسانية ،ونفضت منه يدها، وقطعت منه رجائها ، الشيئى الذى كان يحول العالم كله عالماً انسانياً ،قد أ صبح غابة تحكم فيها شريعة الغابات وقانون العصابات ، بحراً يأكل فيه الحوت الكبير الحوت الصغير ، امتهن الانسان نفسه ففقد القيمة وصار يعبد كل ما كان دونه فضلاً عما كان فوقه ، من هنا وجد الايمان بعد آلاف من السنين ، بعد فترة قصيرة قضتها المسيحية ، على هدى من الله ،وبعد فترة قصيرة قضتها الرسالات السماوية التى اكر م الله بها الأنبياء عليهم الصلوٰة والسلام ، ولكنه أصبح نورهم ونورها ضعيفاً كاليراعة التى تلمع فى ليلة باردة مطيرة ،هنا طلعت الشمس الوهاجة ،هنا طلعت الشمس المشرقة التى تملأ القلوب ايماناً

وحماساً وحرارة وحياة، فأبلّغكم أيها الاخوان !
واتشرف بهذا التبليغ ،وأستحل به هذه الجسارة
التى ارتكبتها امامكم ،ابلغكم رسالة الانسانية
المعذبة ، ابلغكم رسالة الانسانية التعسة ،ابلغكم
رسالة الانسانية الشقية ،بنفسها وبعلمها وبعقلها
وبمدنيتها،هؤلاء الملايين من البشر فى الهند،
والله انهم متهيئون ولى حق أن اتحدث عنهم
بحكم أنى مواطن، بحكم أنى ابن الهند، وبحكم
أنى ولدت ونشأت وتعلمت هناك، ابلغكم أنين
هذا الشعب،ابلغكم زفرات هذا الشعب، ابلغكم
تأوّهات هذا الشعب،هذا الشعب يقول بلسان
الحال وبلسان القال أين المنجدون !! أين
المغيثون !! أين النجدة !! انهم ينظرون الى هذه
الجزيرة، لانهم عرفوا ان هذه الجزيرة أفاضت
عليهم هذاالنور بعد ما انطفأ النور كله،وأفاضت
عليهم الحياة بعد ما فقدوا الحياة كلها،ان هؤلاء
المجوس، ان هؤلاء البوذيين، ان هؤلاء الوثنيين،
والله متهيئون لقبول الرسالة كما كان يتفضل
بها فضيلة الشيخ عبد العزيز وصاحب السمو
الملكى ، اننى أقول لكم وأحلف بالله وأنا هنا
فى رحاب مسجد الرسول ﷺ ،أنا تحدثت فى

حفل حاشد فى احدى عواصم الولاية المتحدة الشمالية فى الهند، فى ظل أكبر محكمة قانونية فى الهند فى اله آباد، تحدثت اليهم وكان يرأس هذا الحفل محامى حقوقى كبيربارزمن كبار الحقوقيين، تحدثت عن الاسلام ، وتحدثت عماتقاسيه الانسانية والبشرية ، فلما جاء دوره أثنى عليّ وأيّدني، وكلهم عيون شاخصة ، وقلوب متطلعة، وآذان واعية الى أن ينجدهم الاسلام، ان هذه الأرواح انى اقول لكم يجب علينا أن نتقي فى هذه الارواح المتعطشة، فى هذه القلوب الخاوية ،فى هذه النفوس الزاوية، اتقوا الله أيها الاخوان وأنا أقول أوصى نفسي اولاً واياكم، وأنا انما اعتبر نفسي أحد أعضاء هذه الأسرة الكريمة، واتشرف بذلك ـ اتقوا الله فى هذه الشعوب التى تتسكع فى الدياجير ،ألتى تتسكع فى الظلام ،التى ترزح تحت نير الاستعباد، والاستعباد ليس حكماً،ليس حكم الأجانب،ان حكم الاجانب شئى موقت ،شئى قصير وزائل ، لقد زال هذا الظل البغيض من الهند من غير رجعة، فلا يرجع اليها أبداً ،ولكن حكم الخرافات، حكم الجهالة،حكم عبادة النفس ،

هذه أطول أمداً، وأعمق مدىً وأوسع أرجاءاً من
هذا الحكم الذى هو خلاف الطبيعة، الذى
هوضد الطبيعة،والذى هو غيرصالح للبقاء،ان
تقليد حكم أمة لأمةعلى أساس الاستعباد ،وعلى
أساس الاستغلال قد زال، ان العصر قد تنكر له
وأصبح شيئاً لامحل له ولامجال له فى هذه
الحياة المتمدنة ، ولكن علينا أن نهزم هذا الحكم،
حكم الشهوات ،حكم النفوس،وحكم المادة ،
المادة الرعناء ، التى قد مجها الناس ،وما هذه
الطرق التى تستنكرها الخنافس وغير الخنافس
الاآثار ذلك المرض الذى قد تسرب، قد نفذ الى
الأعماق، انه كالجدرى، اذا كان حمى فانه
يظهر، يثبت وجوده بالجدرى، ان المدنية
الاوربية قد أثبتت مرضها وعلتها بهذا الجدرى،
الذى ظهر على وجه المدنية الباهر
الجميل، فهذه كلها حركات التذمر، حركات
السآمة التى قد بدت طلائعها من أمريكا ومن
أوربا،ماهى الاآثارالسآمةوآثارالضجر،آثار الضجر
النفسى، وآثار اليأس من صلاحيةهذه المدنية
للقيادة،وهنادورالاسلام،هنادوركم أيها الأماجد!
هنا دوركم يا أشبال الأسود ! هنا دوركم يا قادة

البشرية ! هنادوركم يا أسا تذة المدنية! ياأساتذة أساتذةأساتذةالعالم! هنادوركم،وحرام علينا أن نفوت هذه الفرصة، أن تفوتنا هذه الفرصة الكريمة، هنا الشعب الهندي البرهمى ، هنا الشعوب المسيحية، هنا الشعوب البدوية ، التى نصف متعلمة فى افريقيا وفى غيرافريقيا، هذه كلها تمد اليكم يد الاستغاثة، وترفع اليكم صوتها النابع من أعماق النفس ، تقول لكم الى متى أيها العرب! الى متى أيها السادة! ننتظركم تغيثوننا وتبلون غلتنا، وتشبعون جوعتنا، وتنقذوننا من هذه البرائن الوحشية ،من برائن الجهالة ، من برائن عبادة النفس ، من برائن عبادة المادية، فهذايطلب منكم ذلك الايثار، تلك التضحية ،ذلك الزهد، ذلك الاستنكاف من الجري وراء المادية، ووراء المظاهركما فعل أسلافكم ، وفيكم كل أمل وفيكم كلّ صلاحية ، وانى أستميحكم العفواذا كنت قد تعديت حدودى وتخطيت، واذا كانت صدرت منى كلمة لاتليق بفضلكم ، ولاتليق بحقكم، ولاتليق بكرامتكم، ولا تليق بمنتكم علينا، بتوجيهكم الدعوة لزيارة الجامعة، وماأبصرنا بعيوننا۔

ونحمدالله على ذلك۔من الانجازات الكبيرة ومن البشائر العظيمة۔

والسلام عليكم ورحمة الله وبركاته

ترجمہ:

بسم اللہ اور حمد وصلوٰۃ کے بعد:

بزرگان مجلس! قدیم مصنفین کا یہ دستور رہا ہے اپنی کتاب کی تمہید میں چند روایتی الفاظ لکھا کرتے تھے، کہ مجھ سے یہ تحریر (یا کتاب) لکھنے کی فرمائش فلاں شخص نے کی ہے اور ان کا حکم ٹالا نہیں جاسکتا۔ اس لئے یہ لکھ رہا ہوں۔ مجھے بھی آج اس طرح کی بات دہرانا مناسب معلوم ہوتا ہے، درحقیقت میرے ذہن مین یہ نہیں تھا کہ مجھے اس مبارک مجلس میں کچھ عرض کرنے کی ضرورت پڑے گی۔ اس مجلس میں جس کی اہمیت یہ ہے کہ اس میں شاہزادہ محترم تشریف فرما ہیں اور رئیس قضاۃ، فضیلت مآب شیخ عبدالعزیز صالح ہیں، اور سماحۃ الشیخ عبدالعزیز بن عبداللہ بن باز موجود ہیں، اور عالم اسلامی کے چیدہ علماء ہیں میں نے کبھی اپنے آپ کو اس زمرہ میں شمار نہیں کیا لیکن یہ ایک شرف وسعادت کی بات ہے اور مبارک موقعہ ہے میرے لئے ضروری ہے کہ اس سے فائدہ اٹھاتے ہوئے کچھ عرض کروں اللہ تعالیٰ سے امید ہے کہ وہ میری زبان سے ایسی بات کہلائے گا جو دوسروں سے پہلے، خود میرے لئے نفع بخش ہوں گی۔

میرے محترم بھائی وبزرگان دین! میں اس موقع پر کیا عرض کرسکتا ہوں، جب کہ مجھ سے پہلے عالی قدر اصحاب علم وفضل نے

گفتگو کے کسی گوشہ کو تشنہ نہیں رکھا، دینی موضوع کے تمام پہلوؤں پر بہت خوبی وخوش اسلوبی کے ساتھ روشنی ڈالی ہے۔ لیکن مجھے اگر کچھ کہنے کا جواز ہوسکتا ہے تو وہ عرض کروں گا، جو بات ابھی ابھی میرے دل میں آئی ہے۔ اور میرے دل پر چھائی ہوئی ہے، وہ بات جو میری طبیعت کا ابال اور میرے دل کی پکار ہے وہ یہ کہ ایک بڑی امانت آپ کی خدمت میں پیش کروں۔ وہ امانت ان اقوام وملل کا پیغام ہے جن کو میں نے قریب سے جا کر دیکھا ہے۔ خاص طور سے میں وہ پیغام پہنچانا چاہتا ہوں جو اس وطن کا ہے جس کی طرف میری نسبت یعنی برصغیر کے رہنے والوں مسلم وغیر مسلم افراد و جماعت کا پیغام۔

بزرگو! اس دنیا میں سب کچھ موجود ہے۔ بلکہ اس قدر وافر مقدار میں موجود ہے کہ لوگ ان سے سیر ہو چکے ہیں۔ وہ لوگ تمدن، اور تمدن کی پیدا کردہ تہذیب سے سیر ہو چکے ہیں۔ وہ صحافت کے ہتھکنڈوں سے سیر ہو چکے ہیں، وہ عقل انسانی کے ابھرتے ہوئے نتائج اور نت نئے تجربات سے آسودہ ہو چکے ہیں۔ بلکہ اس سے اکتا چکے ہیں، صرف ایک چیز کی کمی ہے، اور صرف ایک خلا ہے جس کو عصر حاضر کی سوسائٹی بے چینی کے ساتھ محسوس کرتی ہے، ایک دردمند، مخلص قلب سے خالی ہونے کا شکوہ اخلاص کا خلا ایک ایسے دل کا ناپید ہونا جو بشریت کے لئے فکر مند اور دردمند ہو، آج آپ کو یورپ میں ایشیا میں، یہاں تک کہ افریقہ میں جو تمدن میں پیچھے بتایا جاتا ہے۔ اس کے پاس وہ سب کچھ موجود ہے جس کو انسانی صلاحیتوں نے اور طبیعت کی اپج نے پیدا کیا ہے۔ اب قلم کاروں کی جدتیں پچھلے زمانوں کی

وراثتیں سب کچھ اور ہر جگہ موجود ہیں۔لیکن پھر بھی دنیا کو ایک خلا محسوس ہوتا ہے، جس کو پر کرنے والا کوئی نہیں، اور جس خلا نے زندگی کو بے لطف کر رکھا ہے، جس نے روشنی کے میناروں کو تاریک کر دیا ہے، اور ہر لذت کو کرکرا بنا دیا ہے۔اور ہوا میں اڑنے والے بے وزن تنکوں کی طرح تمدن کے لائے ہوئے فیشن اور گرم بازاری کو ٹھنڈا کر دیا ہے، اور کاش کہ یہ آلات، یہ مشینیں، واقعی بے وقعت تنکوں کی طرح اڑ جاتے، مگر ایسا نہیں ہوا۔ ہوا یہ کہ جو آلات اور اسلحہ انسانی ہاتھوں نے بنائے اور عقل بشری نے جسے ایجاد کیا وہ آلات ہلاکتوں کا ذریعہ بن گئے۔اور یہ ایجاد کرنے والی عقلیں بشریت کو ہلاک کرنے میں اپنا کمال دکھلانے لگی۔ یہ عقلیں فساد برپا کرنے والی، ابلیسی و شیطانی عقلیں ہیں جنھو نے شہروں کو جہنم بنا دیا، وہ زمانہ جس کا ذکر علامہ شیخ عبدالعزیز (بن باز) نے کیا اور ہمارے فاضل دوست شیخ محمد الحبیب الخوجہ نے اشارہ کیا کہ دنیا نے اس روشنی سے استفادہ کیا اور ہدایت کو لے کر کامران ہوئے جو اسلام کی بدولت دنیا کو حاصل ہوئی تھی وہ نور اور روشنی دنیا کو اسی شہر سے ملی تھی۔وہ شہر جو ایک زمانہ میں دنیا کی نگاہوں میں کوئی وقعت نہیں رکھتے تھے، جن کی طرف لوگوں کی نگاہیں نہیں اٹھتی تھیں، جس کی پیداوار کی طرف مال کے طلب گار توجہ نہیں کرتے، نفس اور خواہش کے پجاری جس کی طرف آنکھ اٹھا کر نہیں دیکھتے۔ حکومت و فرماں روائی کے طلب گار اس کو خاطر میں نہیں لاتے۔ جہاں کی پیداوار کی کمی اسباب و قوت سے محرومی اور تمدن سے دوری ایسی تھی کہ جس کو حاصل کرنے کی کوئی

خواہش نہیں کر سکتا تھا۔ یہی شہر جو اپنے آپ میں سمٹا ہوا تھا، اور جو دنیا کی نگاہوں میں کھویا ہوا تھا ایک وقت ایسا آیا کہ اس نے دنیا کو ایمان کی نعمت دی انسانیت کا نور بتایا، وہ ایمان جس سے دنیا کی بڑی بڑی آبادیاں محروم تھیں، اور بڑے بڑے بازار اور منڈیاں جس روشنی سے بے بہرہ تھیں اور جو صرف ناہموار، بے ترتیب، عارضی سایوں کی طرح یہودیت ونصرانیت کی جاگیر سمجھی جاتی تھی، اس زمانہ میں جب کہ بودھشٹ اپنے ایمان کی دولت کھو چکے تھے، جب کہ برہمنیت کو اپنی ذات پر اعتماد نہیں رہا تھا۔ اور سب ایک مشکوک اور غیر یقینی شعائر کو اپنا دین سمجھ رہے تھے، سراب کو حقیقت سمجھ رہے تھے ایسی تاریکی میں تھے جو تہہ بہ تہہ جمی ہوئی تھی۔ ایسی تاریکی کہ اگر کوئی ہاتھ نکالتا تو اس کو دیکھ نہیں سکتا، اور جس کو اللہ نے روشنی نہیں عطا کی ہو تو اس کے نصیب میں روشنی کہاں سے آسکتی۔

ظُلُمَاتٌ بَعۡضُهَا فَوۡقَ بَعۡضٍ ط اِذَا اَخۡرَجَ يَدَهٗ لَمۡ يَكَدۡ يَرَاهَا ط وَمَنۡ لَّمۡ يَجۡعَلِ اللّٰهُ لَهٗ نُوۡرًا فَمَالَهٗ مِنۡ نُوۡرٍ ٥

(اوپر تلے اندھیرے ہی (ہی اندھیرے) ہیں، اگر کوئی اپنا ہاتھ نکالے تو دیکھنے کا احتمال بھی نہیں، اور جس کو اللہ ہی نور (ہدایت) نہ دے اس کو (کہیں سے) نور میسر نہیں ہو سکتا)

اور میں قسم کھا کر کہتا ہوں کہ اس دنیا نے جو اس شہر سے پایا ہے وہ تمدن نہیں تھا اور نہ اس تمدن کے پیدا کردہ اسباب، وہ پیسے نہیں تھے، جس سے دنیا والے اپنی زندگی بناتے ہیں، دنیا نے یہاں سے ایک طاقتور ایمان حاصل کیا تھا۔ اللہ پر بھروسہ کرنے کا سبق لیا تھا۔

اس کو یہاں سے صاف اور ستھرے عقیدے توحید کا درس ملا تھا۔ اس کو اللہ تعالیٰ کے تنہا بلاشرکت غیر خالق اور قادر ہونے کا سبق ملا تھا، یہاں سے اس کو معلوم ہوا تھا کہ انسان کیا ہے اور اس کی عزت کیا ہے۔ اور انسان اشرف المخلوقات ہے، اللہ کی تخلیق کا بہترین نمونہ ہے بخشش خداوندی کا اعلاترین عطیہ ہے، حسین ترین صنعت ہے، دنیا کو اس سرزمین سے یہی نعمت حاصل ہوئی تھی۔ عالم انسانیت نے اس جزیرے سے یہی بیش بہا دولت پائی تھی۔ جس کی وجہ سے ہر شے میں ایک روح آ گئی مقصدیت نمایاں ہوگئی، ہر وہ شے جس میں مقصدیت نہ پائی جائے وہ کھوکھلے الفاظ ہیں اور ایسے نام ہیں جن کا کوئی مسمی نہیں ہے، ڈھانچے ہیں جن میں روح نہیں، مجسمے ہیں جن میں زندگی نہیں ہے ﴿ اَوَ مَنْ كَانَ مَيْتًا فَاَحْيَيْنَاهُ وَجَعَلْنَالَهٗ نُوْرًا يَّمْشِي بِهٖ النَّاسِ كَمَنْ مَّثَلُهٗ فِيْ الظُّلُمَاتِ لَيْسَ بِخَارِجٍ مِنْهَا ﴾ (ایسا شخص جو کہ پہلے مردہ تھا، پھر ہم نے اس کو زندہ بنادیا اور ہم نے اس کو ایک ایسا نور دے دیا کہ وہ اس کو لئے ہوئے آدمیوں میں چلتا (پھرتا) ہے کیا اس شخص کی طرح ہوسکتا ہے جس کی حالت یہ ہے کہ وہ تاریکیوں میں ہے، ان سے نکلنے ہی نہیں پاتا) یہ ساری دنیا کا حال تھا وہ نادر شے جس سے انسانیت مایوس ہوچکی تھی، اور اپنی محرومیت کو تسلیم کرچکی تھی، اس کا رشتۂ امید کٹ چکا تھا، وہ یہ تھا کہ اس دنیا کو انسان کے رہنے کے لائق بنادیا جائے۔ کیونکہ یہ دنیا ایک جنگل کے مانند تھی، جس میں بڑی مچھلیاں چھوٹی مچھلیوں کو نگل رہی تھیں، انسانیت رسوا ہوچکی تھی،

انسان اپنی قیمت کو کھو چکا تھا اور اسے پہچان نہیں رہا تھا، وہ ہر بڑی طاقت کو پوجتا تھا جس میں اس کو قوت نظر آتی تھی، یہی نہیں بلکہ جو اس سے کم تر درجے اور حقیر درجے کی قوت رکھنے والی چیزیں تھیں، ان کو بھی پوجتا تھا، انسان نے ہزار ہا ہزار برسوں کے بعد اس سرزمین سے ایمان کی دولت حاصل کی اس سے کچھ زمانہ پہلے عیسائیت نے ہدایت خداوندی کی چند جھلکیاں دکھائی تھیں، اور آسمانی پیامات کے کچھ عکس اس دنیا پر پڑے تھے۔ جو اللہ نے انبیاء کرام علیہ الصلوٰۃ والسلام کو بھیج کر دنیا کو بتایا تھا۔ لیکن وہ کمزور روشنی تھی جیسے جگنو کی روشنی جو برسات کی اندھیری راتوں میں نظر آتی ہوں۔ اسلام نے آفتاب کی روشنی عطا کی۔ اور یہی وہ سرزمین ہے جہاں سے ہدایت خداوندی کا آفتاب طلوع ہوا اور اس کی کرنیں سارے عالم میں پھیل گئیں۔ اس کی روشنی اور گرمی عالم انسانیت کو حاصل ہوئیں، جنھوں نے دلوں کو ایمان سے عزائم کو جوش سے اور زندگی کو جرأت سے بھر دیا۔

بھائیو اور بزرگو! میں اسی پیغام کو آپ کے سامنے دہراتا ہوں، اور شرف و عزت محسوس کرتا ہوں کہ اس سرزمین کے سوغات آپ کی خدمت میں پیش کروں..... اور اس جسارت کا میرے نزدیک شرعی جواز ہے کہ مظلوم کے پیغام کو آپ تک پہنچاؤں۔ انسانیت ستم زدہ ہے، زخمی ہے، مرہم کے لئے ترس رہی ہے اس کے حق میں اس کی ذات، اس کے علوم، اس کی عقلیت، اس کی شہریت سب دشمن بنی ہوئی ہے۔ یہ ہندوستان کے کروڑوں باشندے اپنی زبانِ حال سے اعلان کررہے ہیں کہ وہ پیاسے ہیں۔ ان کو ایمان سے سیراب کرنے

کی ضرورت ہے، مجھے ایک ہندوستانی ہونے کے ناطے جہاں میں پیدا ہوا اور پلا بڑھا ہوں، اور تعلیم حاصل کی ہے، میں اس سرزمین کی کراہ آپ تک پہونچاتا ہوں۔ اس کی بے چینی اور غم واندوہ میں ڈوبی ہوئی صدائیں سنانا چاہتا ہوں جو ان کی زبان حال سنا رہی ہے۔ وہ زبان سے نہیں کہہ رہے ہیں بلکہ اس کے خلاف نجات دہندہ لوگوں سے عقلی طور پر بہت دور ہیں۔ مگر ان کی فطرت چیخ رہی ہیں، ان کے اندر کا انسان فریاد کر رہا ہے۔ وہ ٹکٹکی لگائے اس جزیرے کو دیکھ رہی ہیں، کیونکہ وہ جانتے ہیں کہ یہاں سے دنیا کو اس وقت روشنی ملی تھی، جب ہدایتوں کے تمام چراغ بجھ چکے تھے، انھوں نے اس سرزمین میں انسانیت کو سانس لیتے ہوئے دیکھا، جس وقت ساری دنیا کی نبض حیات ڈوب رہی تھی، یہ مجوسی، یہ بودھسٹ، یہ صنم پرست، پیغام حق کو قبول کرنے کے لئے تیار ہیں، اور ابھی جیسا کہ فضیلت مآب شیخ عبدالعزیز اور (ہز ہائی نس) شاہزادہ صاحب کہہ رہے تھے میں عرض کرتا ہوں، اور اس وقت کہتا ہوں کہ مسجد نبویؐ کی بارگاہ میں حاضر ہوں، میں نے یہ بات شمالی ہندوستان کے ایک دارالحکومت میں کہی تھی، جہاں کہ ہندوستان کا ہائی کورٹ ہے (الہ آباد) اور ایسے جلسے میں کہی تھی جس کی صدارت ایک چوٹی کے بیرسٹر کر رہے تھے۔ میں نے اسلام کے متعلق کچھ عرض کیا تھا، اور اس بات کی تشریح کی تھی کہ زندگی دین کے بغیر ایک عذاب ہے، دوزخ ہے، جہنم کی آگ ہے، اس مجمع میں جب ان بیرسٹر کی تقریر کا وقت آیا تو انھوں نے میری تحسین کرتے ہوئے میری تائید کی، نگاہیں ہمیں

اوران کو حیرت سے دیکھ رہی تھیں، ہرایک کے چہرے پر ایک سوالیہ نشان تھا۔لوگ کان لگائے سن رہے تھے، اسلام ان کے لئے ایک نجات دہندہ مذہب ہے؟ میں آپ سے کہنا چاہتا ہوں کہ بشریت کی روح پیاسی ہے اس کو آب حیات کی ضرورت ہے اور یہ آب حیات صرف اسلام دے سکتا ہے۔ان کے دل وجگر جل رہے ہیں، ان کو ٹھنڈا کرنے کے لئے آب حیات آپ کے پاس ہے۔میں صراحت سے عرض کرنا چاہتا ہوں میرے بزرگو اور دوستو! کہ حقوق انسانیت کی ادائیگی کے معاملہ میں خدا سے ڈریئے، میں آپ سے پہلے خود اپنے نفس کو آگاہ کرتا ہوں کیونکہ میں بھی اسی برادری کا ایک فرد ہوں اور جس کو اپنی شرف وسعادت سمجھتا ہوں۔خدا سے ان قوموں کے حقوق کی ادائیگی کے بارے ڈرتے رہئے، یہ قومیں جو تاریکی میں بھٹک رہی ہیں، اور جن کی گردنوں میں غلامی کے پھندے پڑے ہیں۔غلامی سے میرا مطلب سیاسی غلامی نہیں ہے جو ایک عارضی شے ہوا کرتی ہے اور ایک وقت متعین کے بعد زنجیریں کٹ جاتی ہیں۔ ہندوستان پر بھی ایک اجنبی حکومت قابض تھی، جو اپنا وقت پورا کر کے ہمیشہ کے لئے رخصت ہوگئی۔لیکن خرافات کی حکومت، جہالت کی سلطنت، نفس پرستی کی سطوت، یہ وہ حکومتیں ہیں جو مزاج اور فطرت کو بدل دیتی ہیں جو انسانی طبیعت کو غلط سانچے میں ڈھال دیتی ہے۔وہ بہت دیرپا ہوتی ہیں۔ان کو بدلنے کے لئے اور صحیح رخ پر لانے کے لئے دل ودماغ کا خون اور پوری توانائی صرف کرنے کی ضرورت ہے۔خواہشات کی حکومت، مادیت کی

کشش، جب جگہ پکڑ لیتی ہے تو اس کے آثار ان حیوانی شکلوں میں آج ظاہر ہو رہے ہیں جن کو آپ خواہ پسند کریں یا نہ پسند، دراصل یہ اس مرض کا نتیجہ ہے جو برسہا برس سے پرورش پانے والے جراثیم نے پیدا کر دیا ہے اور جو رگ و پے میں پیوست ہو چکے ہیں، یہ چیچک کے داغ کی طرح ہے جو جسم پر اپنا اثر چھوڑ جاتے ہیں، یورپین شہریت نے اسی طرح کے چیچک کے داغ اپنے جسم پر پیدا کر لئے ہیں، آج وہاں کی آئے دن اٹھنے والی تحریکیں، اور تمدن سے بیزاری پیدا کرنے والی لہریں ابھرنا شروع ہو گئی ہیں (مولانا کا اشارہ غالباً ہپی ازم کی طرف تھا) یورپ اس تہذیب کے خول سے نکلنا چاہتا ہے جس سے پتہ چلتا ہے کہ نظام تمدن قیادت کی صلاحیت سے محروم ہے، یہ وقت ہے کہ آپ اٹھیں! یہ وقت ہے کہ اسلام کو سامنے لایا جائے۔ اب آپ کی باری ہے۔ شیر بچہ ان جنگلی حقیر جانوروں کا مقابلہ کر سکتا ہے۔

اے تمدن کے اساتذہ! دنیاوی تہذیبوں کے استاذوں کے استاذ آپ ہیں اور اب آپ کے کام کا وقت آیا ہے، اور اب آپ کی باری ہے، بہت بڑا گناہ ہوگا اگر ہم اس موقع کو ہاتھ سے نکل جانے دیں، یہ ہندی برہمی قوم، یہ عیسائی اقوام، یہ جنگل باشی گروہ، یہ افریقہ وغیر افریقہ کے نیم مہذب و نیم تعلیم یافتہ افراد آپ کے آگے ہاتھ پھیلائے کھڑے ہیں، ان کے دل کی گہرائیوں سے آواز نکل رہی ہے، وہ کہہ رہے ہیں کہ اے بزرگو! ہمیں انتظار ہے کہ ہماری آپ فریاد سنیں گے، ہماری پیاس بجھائیں گے، ہم بھوکوں کو خوراک دیں گے اور ان وحشی پنجوں سے ہمیں نکالیں گے۔ جہالت کے پنجے،

عبادت نفس کے پنجے، مادیت کے آگے جھکانے والے پنجے، آپ کو دعوت دیتے ہیں کہ بجائے ان کے پیچھے دوڑنے سے ان کو اپنے پیچھے لے کر چلنے کی کوشش کریں، ان دکھاوؤں اور نمائشوں سے بلند ہو کر کام کرنے کی ضرورت ہے جو آپ کے اسلاف کا راس المال تھا۔ آپ سے امیدیں وابستہ ہیں، اور آپ کے اندر اس بات کی صلاحیت ہے۔

بزرگانِ مجلس! اگر میں نے جذبات کے بہاؤ میں کچھ ایسی باتیں کہہ دی ہوں جو آپ کے شایانِ شان نہیں ہیں، تو مجھے معاف رکھیں۔

رکھیو غالب مجھے اس تلخ نوائی میں معاف

آج کچھ درد مرے دل میں سوا ہوتا ہے

(یہ اردو شعر کا اضافہ مترجم نے کیا ہے، مگر حسبِ حال ہے)



"مدرسہ" مولانا کی تمناؤں کا مرکز

حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی مدظلہ دینی مدارس کو اپنی آرزوؤں اور تمناؤں کا مرکز سمجھتے ہیں، آپ کے تصور میں "مدرسہ" مسلمانوں کی بقاء اور اسلام کا آہنی قلعہ ہے، دارالعلوم ندوۃ العلماء، دارالعلوم دیوبند، جامعہ رحمانیہ مونگیر کے طلبہ سے خطاب کرتے ہوئے آپ نے جس دل کی گہرائیوں سے "مدرسہ" کی عظمت کا اظہار کیا ہے اور اس کے فارغ ہونے والے طلبہ کو مخاطب کیا ہے ان کے اقتباسات سے اس حقیقت پر روشنی پڑتی ہے کہ مولانا مدرسہ کو کس نظر سے دیکھتے ہیں، اور مزید یہ کہ "مدرسہ" کے لفظ سے آپ کے ذہن میں صرف دارالعلوم ندوۃ العلماء کے طلباء نہیں اور نہ صرف دارالعلوم ندوۃ العلماء کا نصاب تعلیم ہے بلکہ آپ کی وسعت قلبی اور وسیع النظری نے تمام مدارس دینیہ کو ایک لڑی میں پرویا ہوا قلادہ سمجھا ہے، وہ "مدرسہ" کے معاملہ میں فرق ایں وآں کا امتیاز نہیں رکھتے وہ "مدرسہ" کو اس لئے نہیں عزیز رکھتے کہ آباواجداد کی میراث ہے یا اس لئے کہ اگر مدرسہ نہ رہا تو ہمارا "تشخص" ختم ہوجائے گا بلکہ ایک منصف مزاج، اعتدال پسند، وحدت کلمہ کے داعی ہونے کی حیثیت سے ہر مدرسہ کو اپنا مدرسہ سمجھتے ہیں۔ یہ خصوصیت جو اس دور

میں نادر بلکہ عنقا ہے۔

مولانا کا یہ مزاج آج سے نہیں اور اس وقت سے نہیں جب کہ آپ کی شہرت ومقبولیت کا مشرق ومغرب میں چرچہ ہے، اور ''مراکش'' سے لے کر ''برونائی'' تک کے علماء ومشائخ آپ کو ''عالم اسلام کی سب سے بڑی شخصیت'' تسلیم کرتے ہیں بلکہ اس زمانہ میں جب کہ آپ کی شہرت ملک کے پڑھے لکھے افراد تک محدود تھی۔ اور آپ کی عمر صرف ۲۸ سال کی تھی، الندوۃ کا سہ بارہ اجراء مولانا سید سلیمان ندوی رحمۃ اللہ علیہ کی سرکردگی میں ہوا تھا، اور رسالہ کے سرورق پر لکھا ہوتا تھا سید ابوالحسن علی ندوی (استاد تفسیر وادب) اور عبدالسلام قدوائی ندوی (استاد تاریخ واقتصادیات) اس سال مئی ۱۹۴۰ء ربابت ربیع الثانی ۱۳۵۹ھ میں مولانا کا مضمون شائع ہوا تھا، وہ اس لائق ہے کہ اس کو یہاں نقل کردیا جائے:

اسلام کے قلعے

''جدید اجتماعی وسیاسی تغیرات نے بہت سے قومی ومذہبی مسائل کو موضوع بحث بنادیا ہے اور زندگی کے بہت سے شعبوں اور اداروں کی ضرورت اور فائدہ پر بحث وتنقید کا دروازہ کھل گیا ہے۔ مسلمانوں کے بعض حلقوں میں سنجیدگی کے ساتھ یہ سوال پیدا ہوگیا ہے کہ عربی مدارس کی اس انقلابی زمانہ میں کیا ضرورت ہے؟ اور ان کے نہ ہونے سے ہماری زندگی کا کون سا خانہ خالی رہتا ہے، آج کی صحبت میں ہم اسی سوال کے جواب دینے کی کوشش کریں گے۔

اس سلسلہ میں چند بنیادی حقائق کا سمجھ لینا ضروری ہے جو اس مسئلہ میں مبادی کا کام دیں گے۔

پہلی چیز یہ ہے کہ مسلمان قوم کا مزاج اور اقوام دنیا کی تمام

قوموں سے مختلف ہے۔ مذہب ''امت مسلمہ'' کے خمیر اور ترکیب میں داخل ہے، یہ قوم کسی جگہ اور کسی وقت بھی غیر مذہبی نہیں ہو سکتی بلکہ مذہب اور ایک متعین مذہب (اسلام) کے بغیر اس کا تصور ہی ممکن نہیں، مذہب اس کے فکر و عمل کا مرکز، اس کے کاموں کی صحت و غلطی اور اس کی ترقی و تنزل کی میزان اور اس کی صحت طبعی اور انحراف مزاج کا مقیاس ہے۔

دوسری بات یہ ہے کہ اس امت کی بنیاد ایک خاص قانون (شریعت) اور ایک خاص دستور (قرآن وحدیث) پر ہے۔ یہ قانون مکمل اور دستور منضبط ہے۔ اس امت کو دنیا کی دوسری قوموں کے مقابلہ میں یہ امتیاز حاصل ہے کہ اس کی زندگی اور فکر کا سرچشمہ تغیر پذیر، انسانی اجتہادات و تجربات اور غیر قطعی نظریات کے بجائے وحی الٰہی ہے، دنیا کی دوسری تہذیبوں کے برخلاف اس کی تہذیب و تمدن کی بنیاد دیواروں اور ستونوں، میناروں اور گنبدوں، کاغذ کے شیرازوں، تصویروں کے نقوش اور موسیقی کے آلات پر نہیں ہے، بلکہ چند ابدی حقائق، چند اصول و نظریات اور اس مخصوص اخلاقی فلسفہ پر ہے جو وحی سے ماخوذ اور اس کا پیدا کیا ہوا ہے، دنیا کی دوسری ''خودرو'' اور ''خود ساختہ'' قوموں کے برخلاف اس کے مستقبل کی بنیاد اس کے ماضی پر ہے، اس کے سامنے زندگی کا ایک بلند ترین معیار اور ترقی کا آخری نمونہ ہے اور یہ نمونہ گذر چکا ہے لیکن تاریخی و تحریری طور پر محفوظ ہے، یہ سنت رسول صلی اللہ علیہ وسلم، اسوہ صحابہؓ اور خلافت راشدہ کا عہد ہے

''سنت'' اور ''سلف'' کی جو اہمیت اسلامی تعلیمات میں ہے غالباً کسی دوسرے مذہب کی تعلیم میں نہیں ہے۔

یہ چیز بھی قابل ذکر ہے کہ دین کا مفہوم جتنا اسلام میں وسیع اور ہمہ گیر ہے کسی دوسرے مذہب میں نہیں ہے بلکہ اگر دیکھا جائے تو اسلام کے صحیح نقطۂ نظر اور تعلیمات نبویؐ کے مطابق سچے مسلمان کی پوری زندگی دین ہے، اور نیت کے تغیر سے اس کا ہر کام عبادت ہے، اس لئے اس میں دین و دنیا کی وہ تقسیم نہیں ہے جو مسیحی مذہب میں ہے۔ نہ دین و دنیا کے شعبے اور ان کے اشخاص اس طرح علاحدہ علاحدہ اور ان کے حدود ایک دوسرے سے اس طرح ممتاز ہیں جس طرح عیسائیوں میں، مذہب مسلمان کی زندگی میں جلد مؤثر ہوتا ہے، اور جلد متأثر، اگر اس کی زندگی کے مسائل نہایت ہوشیاری اور احتیاط کے ساتھ دین کی روشنی میں، اور اس کی مصالحت اور سمجھوتہ سے طے نہ کئے جائیں تو نہایت آسانی سے وہ دین سے ٹکرا جاتے ہیں اور مسلمان کی زندگی اور اس کے مذہب پر ان کا اثر پڑتا ہے۔ مثال کے طور پر صلح و جنگ کے قوانین، تعزیرات، لین دین کے معاملات اور کتنے اجتماعی و معاشرتی، سیاسی اور معاشی مسائل ہیں جن کا مذہب سے گہرا تعلق، اور اسلامی قانون سے ارتباط ہے، ان مسائل کو طے کرنے کے لئے کتنی دینی بصیرت اور کس قدر علم کی ضرورت ہے

جس قوم کا مزاج اتنا نازک اور پیچیدہ ہو اور جس کے مذہب و قانون کا دائرہ اتنا وسیع ہو اس کے علاج و طبی مشورہ کے

لئے کیسے مزاج داں ونباض اور کیسے حاذق کی ضرورت ہے۔

جوطبقہ یا جماعت مسلمانوں کی رہنمائی کے منصب کی امید وار ہواس کے لئے ضروری ہے کہ وہ اس کے قانون اور دستور سے واقف ہو، اس سرچشمہ سے سیراب ہو جس سے اس کی زندگی کی نہریں پھوٹی ہیں اور اس کی رگوں میں اس کا آب حیات جاری ہے۔ان ابدی حقائق کا علم اور ان اصول ونظریات پر ایمان رکھتا ہو، اس اخلاقی فلسفہ کا قائل اور عامل ہو جس پر اس کے تمدن وتہذیب کی بنیاد ہے۔اس کے ماضی سے باخبر اور اس بلند معیار اور نمونہ سے متاثر ہو جس پر امت کے حال ومستقبل کی تعمیر ہونی چاہیے۔

اس سلسلہ میں ایک اور حقیقت سمجھ لینی چاہئے، اسلام دراصل نام ہے اس مستقل واضح اور متعین دینی واخلاقی اور اجتماعی نظام کا جو محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم دنیا میں لے کر آئے۔اسی کا نام شریعت محمدیؐ ہے، اس میں عقائد بھی ہیں، اعمال، اخلاق ومعاملات بھی، باقی جو کچھ ہے یا اس کے لئے وسیلہ ہے یا اس کا نتیجہ۔امت کا سب سے بڑا فریضہ اس نظام کی حفاظت ہے، عقائد کی حفاظت بھی ضروری ہے اور احکام کی بھی، ضرورت ہے کہ عقائد ان تمام تحریفات سے محفوظ رہیں جو دوسرے مذاہب میں پیش آئیں اور جن کا اس امت میں بھی ہر وقت خطرہ ہے۔ضرورت ہے کہ نبوت محمدیؐ نے ذات وصفات باری تعالیٰ، توحید ورسالت، قضا وقدر، حشر ونشر، امور غیب اور وحی کے متعلق جو تشریح کی ہے اور ان

کے جو حدود قائم کیے ہیں وہ باقی رہیں اس لئے کہ ان تمام مسائل کی بنیاد قیاس وتخمین پر نہیں بلکہ وحی ونبوت پر ہے اور نبوت محمدیؐ نے تکمیل کر دی ہے۔

احکام پر عمل اسی طرح ہو جس طرح آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے کیا اور صحابہ کرامؓ کے زمانہ میں ہوا۔ شرعی احکام وعبادات میں ترمیم واضافہ (بدعت) سے مذہب کو محفوظ رکھا جائے۔ پرانے آسمانی مذاہب ان بدعات کی وجہ سے اس طرح مسخ ہوئے کہ اب ان کے انبیاء کے لئے ان مذاہب کا پہچاننا ناممکن ہے۔

پھر اس کی بھی ضرورت ہے کہ ان عقائد واحکام کی برابر اشاعت وتعلیم ہوتی رہے اس لئے کہ دین کی بقا اسی پر منحصر ہے۔

اس کے علاوہ امت محمدیؐ کی بعثت کا مقصد یہ بتایا گیا ہے کہ وہ دنیا میں بھلائی کی تلقین (امر بالمعروف) اور برائی کی ممانعت (نہی عن المنکر) کرتی رہے ایک آیت میں امت کی پیدائش وظہور کا مقصد بتایا گیا ہے۔

كُنْتُمْ خَيْرَ أُمَّةٍ أُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ تَأْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَتَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ وَتُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ (سورہ آل عمران۔۱۱۰)

تم سب امتوں سے بہتر ہو جو عالم میں بھیجی گئی۔ اچھے کام کا حکم کرتے ہو اور برے کاموں سے منع کرتے ہو اور اللہ پر ایمان لاتے ہو۔

لیکن یہ امت کا بحیثیت مجموعی فریضہ ہے اگر اس میں سے ایک معتد بہ جماعت یہ فرض انجام دے تو گویا پوری امت یہ فریضہ انجام دے رہی ہے۔ اس لئے دوسری آیت میں امت کے ایک بڑے گروہ کا جس پر خود امت کا اطلاق ہو سکے یہ فریضہ

بتایا گیا ہے، مگر اس ''امت صغریٰ'' کا پیدا کرنا اور اس کو اس کا موقع دینا خود ''امت کبریٰ'' کا فرض قرار دیا گیا ہے فرمایا:

وَلْتَكُنْ مِّنْكُمْ اُمَّةٌ يَّدْعُوْنَ اِلَى الْخَيْرِ وَيَاْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَيَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ ط (سورہ آل عمران۔۱۰۴)

تم میں سے ایک جماعت ایسی ہونی چاہئے جو خیر کی دعوت دے۔ نیکی کا حکم کرے اور برائی سے روکے۔

اس تقسیم عمل کے اصول کو یہ آیت اور زیادہ واضح کرتی ہے۔

وَمَا كَانَ الْمُؤْمِنُوْنَ لِيَنْفِرُوْا كَآفَّةً فَلَوْ لَانَفَرَ مِنْ كُلِّ فِرْقَةٍ مِّنْهُمْ طَآئِفَةٌ لِّيَتَفَقَّهُوْا فِي الدِّيْنِ وَلِيُنْذِرُوْا قَوْمَهُمْ اِذَا رَجَعُوْا اِلَيْهِمْ لَعَلَّهُمْ يَحْذَرُوْنَ ۝

(سورہ توبہ۔۱۲۲)

اور یہ تو ہو نہیں سکتا کہ مومن سب کے سب نکل آئیں، تو یوں کیوں نہ کریں کہ ہر جماعت میں سے چند اشخاص نکل جائیں تا کہ دین کا علم سیکھیں اور اس میں سمجھ پیدا کریں اور جب اپنی قوم کی طرف واپس آئیں تو ان کو خوف دلائیں تا کہ وہ کچھ خوف کریں۔

نہایت آسانی سے فیصلہ کیا جا سکتا ہے کہ مندرجہ بالا فرائض نظام شرعی کی حفاظت، عقائد واحکام کو اپنے مقام پر رکھنا اور ان کو تحریف وبدعات سے بچانا، شریعت وتعلیم اور تبلیغ واصلاح کے فرائض قوم کا کون سا طبقہ انجام دے سکتا ہے۔

اس کو اچھی طرح سمجھ لینا چاہئے کہ اسلام کے نظام شرعی کی حفاظت اور اس کے لئے ایثار وقربانی صرف وہ طبقہ کر سکتا ہے جس کی ذہنی اور عملی تربیت اس کے موافق ہوئی ہو جس کے رگ وریشہ

میں اس نظام کی محبت اور اس کا عشق واحترام پیوست ہوگیا ہو اور جس کے قلب ودماغ کی گہرائیوں میں اس کا یقین اتر گیا ہو۔ اسلام کی تاریخ گواہ ہے کہ جب اس نظام پر کوئی ضرب لگائی گئی یا اس کے خلاف کوئی سازش کی گئی تو ہمیشہ یہی طبقہ بے چین ہوا، اور سر سے کفن باندھ کر میدان میں اتر آیا۔ حضرت حسینؓ، زید شہیدؒ، محمد ذوالنفس الزکیہؒ، ابراہیم بن عبداللہؒ کی قربانیاں اور سرفروشی اور اموی وعباسی محرف نظام سلطنت کے خلاف تحریک جہاد اسلامی نظام کی حفاظت کی کوششیں ہی تھیں۔ پھر ان خونی معرکوں کے مظلوم شہداء اگر عالم کہلانے کے مستحق نہیں تو روئے زمین پر پھر عالم دین کہلانے کا مستحق کون ہے؟ ان کے حامیوں اور مددگاروں میں بھی سرفہرست نام امام ابوحنیفہؒ اور امام مالکؒ کا ہے۔

جب عباسی سلطنت کی طرف سے امت پر جبریہ "خلق قرآن" کا عقیدہ مسلط کیا جانے لگا تو اس خطرناک تحریف والحاد اور اس غیر اسلامی عقیدہ کے خلاف وقت کی سب سے بڑی شہنشاہی کے مقابلہ میں حفاظت دین کے لئے جو شخص تنہا میدان میں آیا وہ جماعت علماء کا ممتاز فرد امام احمد ابن حنبلؒ تھا جس کے عزم و استقامت اور ایمان کے سامنے حکومتِ وقت کو جھکنا پڑا۔ اور یہ عقیدہ تاریخی یادگار بن کر رہ گیا ہے۔ آج کتنے مسلمان ہیں جو اس کا مطلب بھی سمجھتے ہیں؟

تیسری صدی کے آغاز میں جب عباسی سلطنت کی غفلت سے بغداد میں سخت ابتری، فسق وفجور اور بدامنی پھیلی تو دو عالموں

خالد الدرویش اور سہیل بن سلامۃ الانصاری نے قانون کو اپنے ہاتھ میں لیا اور قوت وجمعیت کے ساتھ "من رای منکراً فلیغیرہ بیدہ" پر عمل کرنا شروع کر دیا۔ جس کی پاداش میں وہ دونوں گرفتار ہوئے اور قید کر دیئے گئے۔ (۱)

بعد کے زمانے میں دو جلیل القدر عالم حضرت شیخ عبدالقادر جیلانیؒ اور امام ابن جوزیؒ نے اسلامی نظام اخلاق کی حفاظت اور مسلمانوں کی روحانی و دینی اصلاح کے سلسلہ میں جو خدمات انجام دیں ان کے اظہار کی ضرورت نہیں۔

اس کے بعد اسلامی نظام کو اپنے مرکز اصلی پر لانے کے لئے عقائد کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تفہیم اور صحابہؓ کے فہم کے مطابق سمجھنے کے لئے امام ابن تیمیہؒ نے جو علمی وملی خدمات انجام دیں وہ اہل علم سے پوشیدہ نہیں۔

ہمارے ہندوستان میں اسلام کے نازک ترین دور میں جب (مؤرخ اسلام کے الفاظ میں) عجم کے ایک جادوگر نے بادشاہ کے کان میں منتر پھونکا کہ دین عربی کی ہزار سالہ عمر پوری ہوگئی اب وقت ہے کہ ایک شہنشاہ امی کے ذریعہ نبی امی علیہ الصلوٰۃ والسلام کا دین منسوخ ہو کر دین الٰہی کا ظہور ہو، مجوسیوں نے آتش کدہ گرمائے، عیسائیوں نے ناقوسیں بجائیں، برہمنوں نے بت آراستہ کئے اور جوگ وتصوف نے مل کر کعبہ اور بت خانہ کو ایک ہی چراغ سے روشن کرنے پر اصرار کیا (۲) تو جو مسلمان مجاہد اس "فتنہ

---

(۱) ملاحظہ ہو طبری جلد ۱۰ ص ۲۴۱ و مقدمہ ابن خلدون ص ۱۳۴

(۲) مقدمہ سیرت سید احمد شہید از مولانا سید سلیمان ندوی رحمۃ اللہ علیہ۔

اکبرؒ" کے مقابلہ کے لئے میدان میں آیا اور جس نے سلطنت مغلیہ کا رخ ہی بدل دیا اور جس کی عہد آفریں تحریک اور انقلاب انگیز تجدید نے اکبر کے گھرانے میں عالمگیر جیسا متشرع فرمانروا اور حامی دین پیدا کیا وہ علماء ہی کا سرتاج مجدد الف ثانی شیخ احمد سرہندی تھا۔ رحمہ اللہ۔

اس کے بعد آج اس وقت تک ان عجمی دیار میں اس غریب الوطن عربی مہمان کی جس نے سرپرستی اور حفاظت کی، اور ہوا کے طوفانوں میں اس چراغ کو جو بارہا چراغ سحری بنا، گل نہ ہونے دیا وہ علماء دہلی کا مشہور بابرکت خاندان ہے جس میں شاہ ولی اللہ صاحبؒ اپنے مجددانہ علمی کارناموں اور ان کے پوتے شاہ اسماعیل شہیدؒ اپنی قربانی اور سرفروشیوں کی بنا پر خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔

اس کے علاوہ بھی حفاظت دین، رد بدعات، اصلاح رسوم اور الحاد و زندقہ کے مقابلہ کا جتنا کام اس وقت تک ہوا اور اس وقت بھی ہو رہا ہے وہ سراسر اسی طبقہ سے ہو رہا ہے۔

اگر دین اور اس کے شرعی نظام کی ضرورت ہے اور مسلمانوں کو محض ایک قوم بن کر نہیں بلکہ ایک صاحبِ شریعت و کتاب قوم بن کر رہنا ہے تو مذہب کے محافظین و حاملین اور شریعت کے ترجمان و شارحین کی ضرورت ہے اور اگر ان کی ضرورت ہے تو لامحالہ ان مرکزوں اور اداروں کی ضرورت ہے جو ایسے اشخاص پیدا کر سکتے ہیں اور یہ ضرورت مسلمانوں کی ہر قومی ضرورت سے اہم ہے۔

خلافت راشدہ کے طرز کی اسلامی سلطنت میں بھی دینی

مدارس اور تربیت گاہوں کی ضرورت ہے تاکہ امت کے اسلامی جسم میں ہر دم تازہ خون پہنچتا رہے، اہل نظر جانتے ہیں کہ جس نظام کی پشت پر ایسا ادارہ یا تربیت گاہ نہ ہو جو اس قسم کے اشخاص پیدا کرتا رہے جو اس نظام کو چلا سکیں، اگلوں کی جگہ لے سکیں اور اُس مشین میں فٹ ہو سکیں، اس نظام کی جڑیں ہمیشہ کھوکھلی اور اس کی عمر ہمیشہ کم ہوتی ہے۔

اگر برائے نام اسلامی سلطنت بھی ہے تو بھی ایسے اداروں کی ضرورت ہے تاکہ حکومت کو اپنے ذمہ دارانہ عہدوں کے لئے دین دار امین اور مسلمانوں کی ضرورت سمجھنے والے کارکن مل سکیں۔

لیکن اگر کسی ملک میں بدقسمتی سے اسلامی حکومت نہ ہو تو وہاں ایسے اداروں کی ضرورت شدید تر ہو جاتی ہے۔ اگر کوئی جماعت کسی صحیح اسلامی حکومت کی کچھ نہ کچھ قائم مقامی کر سکتی ہے اور حفاظت دین کا فرض انجام دے سکتی ہے تو وہ صرف جماعت علماء ہے، چنانچہ اِسی نکتہ کی وجہ سے اسلامی سلطنت کے زوال کے وقت حضرت شاہ ولی اللہ صاحبؒ اور ان کے خاندان نے اسلامی تعلیم اور دینی درس وتدریس کا نظام قائم کیا، جس نے بڑی حد تک ایک اچھی اسلامی ریاست کی دینی ضرورتیں پوری کیں، اہل بصیرت جانتے ہیں کہ عملی حیثیت سے اسلام ہندوستان میں ان ممالک سے بہتر حالت میں ہے جہاں برائے نام اسلامی سلطنت موجود ہے، مگر دینی آزاد مدارس کا کوئی نظام یا خاندان

ولی اللٰہی کی شان کے علماء نہیں پیدا ہوئے۔

جب ہندوستان میں حکومت مغلیہ کا چراغ گل ہوگیا اور مسلمانوں کا سیاسی قلعہ ان کے ہاتھوں نے نکل گیا تو بالغ نظر اور صاحب فراست علماء نے جابجا اسلام کی شریعت وتہذیب کے قلعے تعمیر کردیئے۔ انھیں قلعوں کا نام ''عربی مدارس'' ہے اور آج اسلامی شریعت وتہذیب انھیں قلعوں میں پناہ گزیں ہے۔ اور اس کی ساری قوت واستحکام انھیں قلعوں پر موقوف ہے۔''

مولانا کی یہ فکر اور مدارس اسلامیہ کی ضرورت واہمیت کا احساس آپ کی زندگی کے ہر دور میں حاوی رہا۔ جس طرح علامہ اقبال نے علی گڈھ مسلم یونیورسٹی کے طلبہ کو مخاطب کرتے ہوئے کہا تھا۔

اوروں کا ہے پیام اور میرا پیام اور ہے
عشق کے دردمند کا طرز کلام اور ہے
طائر زیرِ دام کے نالے تو سن چکے ہو تم
یہ بھی سنو کہ نالہ طائر بام اور ہے
جذبِ حرم سے ہے فروغ انجمن حجاز کا
اس کا مقام اور ہے اس کا نظام اور ہے

مولانا بھی مدارس اسلامیہ کے طلبہ کو اسی طرح مخاطب کرتے رہے اور ان کو ان کا مقام یاد دلاتے رہے، وہ تمام مدارس عربیہ اسلامیہ کو اس نظر سے دیکھتے ہیں جیسے کہ کوئی مسلمان قرآن کریم کے نسخوں کو جو مختلف مطابع میں چھپے ہوئے اور مختلف سائز میں ایک جگہ رکھے ہوں۔ ان کی بلند نگاہی، وسعت قلب ونظر نے کبھی اپنے مدرسے کا تفوق، اور کسی مدرسہ کی تحقیر تو کجا؟ اس کی افادیت میں کمی کی طرف بھی

اشارہ نہیں کیا۔ مناسب ہوگا کہ ہم یہاں پر ان کی مختلف تقریروں اور مقالات کے بعض اجزاء بطور اقتباس آپ کے سامنے پیش کریں۔ دارالعلوم دیوبند کے طلبہ کے سامنے ۱۹۵۲ء میں جو ایک مضمون پڑھا تھا، اس میں لکھتے ہیں۔

مدرسہ کیا ہے؟

دوستو! ہم کو سب سے پہلے معلوم ہونا چاہئے کہ ایک دینی مدرسہ کا مقام اور منصب کیا ہے؟ مدرسہ کیا ہے؟ مدرسہ سب سے بڑی کارگاہ ہے، جہاں آدم گری اور مردم سازی کا کام ہوتا ہے، جہاں دین کے داعی اور اسلام کے سپاہی تیار ہوتے ہیں۔ مدرسہ عالم اسلام کا بجلی گھر (پاور ہاؤس) ہے، جہاں سے اسلامی آبادی بلکہ انسانی آبادی میں بجلی تقسیم ہوتی ہے، مدرسہ وہ کارخانہ ہے جہاں قلب ونگاہ اور ذہن ودماغ ڈھلتے ہیں، مدرسہ وہ مقام ہے جہاں سے پوری کائنات کا احتساب ہوتا ہے، اور پوری انسانی زندگی کی نگرانی کی جاتی ہے، جہاں کا فرمان پورے عالم پر نافذ ہے، عالم کا فرمان اس پر نافذ نہیں، مدرسہ کا تعلق کسی تقویم، کسی تمدن، کسی عہد، کسی کلچر، زبان وادب سے نہیں کہ اس کی قدامت کا شبہ اور اس کے زوال کا خطرہ ہو، اس کا تعلق براہ راست نبوت محمدی صلی اللہ علیہ وسلم سے ہے جو عالمگیر بھی ہے، اور زندۂ جاوید بھی۔ اس کا تعلق اس انسانیت سے ہے جو ہر دم جواں ہے، اس زندگی سے ہے جو ہمہ وقت رواں اور دواں ہے، مدرسہ درحقیقت قدیم وجدید کی بحثوں سے بالاتر ہے، وہ تو ایسی جگہ ہے جہاں نبوت محمدیؐ کی ابدیت اور زندگی کا نمو اور حرکت دونوں پائے جاتے ہیں۔“

اسی مضمون کو دوسرے الفاظ میں حضرت مولانا نے ۱۹۷۶ء کو جامعہ ہدایت جے پور کے سنگ بنیاد کے موقعہ پر اپنی تقریر میں اس طرح فرمایا:

مدرسہ کس درد کی دوا ہے؟

''میں اب آپ سے یہ عرض کرنا چاہتا ہوں کہ یہ مدرسہ کس درد کی دوا ہے؟ یہ مدرسہ جو قائم ہو رہا ہے، خدا اس پودے کو پروان چڑھائے اور اس کو ایک شاداب اور سایہ دار درخت بنائے، جس کے نیچے نسلیں آرام پائیں اور اس سے ہدایت حاصل کریں۔ یہ جامعہ کس خلا کو پر کرتا ہے کس ضرورت کی تکمیل کرتا ہے۔

حضرات! صحیح دینی مدرسہ کے بارے میں میرا نقطہ نظر بہت سے بھائیوں سے اور ان پڑھے لکھے دوستوں سے مختلف ہے جو مدرسوں سے واقفیت کا دعویٰ رکھتے ہیں، یا اس سے تعلقات رکھتے ہیں، میں مدرسہ کو پڑھنے پڑھانے اور پڑھا لکھا انسان بنانے کا کارخانہ نہیں سمجھتا، میں مدرسہ کی اس حیثیت کو تسلیم کرنے کے لئے تیار نہیں ہوں، میں اس سطح پر آنے کو تیار نہیں ہوں کہ مدرسہ اسی طریقہ سے پڑھنا لکھنا سکھائے یا یوں کہنا چاہئے کہ پڑھنے لکھنے کا ہنر سکھانے کا ایک مرکز ہے، جیسے کہ دوسرے اسکول اور کالج ہیں، میں اس کو مدرسہ کے لئے ازالۂ حیثیت عرفی کے مرادف سمجھتا ہوں۔ یعنی اگر میں مدرسہ کا وکیل ہوں یا میں خود مدرسہ بن جاؤں تو میں اس پر ازالۂ حیثیت عرفی کا مقدمہ قائم کر سکتا ہوں، مدرسہ کو صرف اتنا حق دینے اور مدرسہ کو صرف اتنا ماننے کے لئے تیار نہیں کہ صاحب! جیسے پڑھنے

لکھنے کا ہنر سکھانے کے لئے بہت سے کارخانے ہیں، بہت سے مرکز ہیں، کوئی اسکول کہلاتے ہیں، کوئی کالج کہلاتے ہیں، ان کے مختلف معیار اور مختلف سطحیں ہیں، اسی طرح سے مدرسہ بھی عربی زبان یا عربی فنون، فقہ اور دینیات، تفسیر وحدیث سکھانے کا ایک مرکز یا ایک کارخانہ ہے۔ میں مدرسہ کو نائبین رسول وخلافت الٰہی کا فرض انجام دینے والا اور انسانیت کو ہدایت کا پیغام دینے والا اور انسانیت کو اپنا تحفظ و بقاء کا راستہ دکھانے والا، افراد پیدا کرنے والوں کا ایک مرکز سمجھتا ہوں، میں مدرسہ کو آدم گری اور مردم سازی کا ایک کارخانہ سمجھتا ہوں، جس طرح فیکٹریاں ہوتی ہیں مختلف قسم کی، کوئی گن فیکٹری ہوتی ہے، کوئی شوگر فیکٹری ہوتی ہے، کوئی کسی اور قسم کی مشین ڈھالتی ہے، ہیوی الیکٹرک کا سامان پیدا کرنے کے بہت سے کارخانے ہیں، ہم ان کی بہت قدر کرتے ہیں، ہم ان کی ملک میں ضرورت تسلیم کرتے ہیں، ہم ان کی تحقیر نہیں کرتے، لیکن چیزوں کے مختلف درجے ہوتے ہیں، مدرسہ اس طرح کے پڑھے لکھے آدمی پیدا کرنے کا مرکز نہیں، مدرسہ ایسے لوگوں کے پیدا کرنے کا مرکز ہے، جن کا ابھی آپ کے سامنے ذکر کیا گیا ہے، یہ الگ بات ہے کہ مدرسہ ایسا کر رہا ہے یا نہیں اور ہر مدرسہ یہ کرنا چاہتا ہے یا نہیں؟ اس کا اس اصولی بحث سے کوئی تعلق نہیں۔

میں مدرسہ کے ایک خادم کی حیثیت سے اور مختلف مدارس سے تعلق والے کی حیثیت سے اس بات کو تسلیم کرتا ہوں کہ بہت سے مدارس یہ فرض انجام دینے سے قاصر ہیں یا قاصر ہو گئے

ہیں، پہلے یہ فرض انجام دیا کرتے تھے، اب یہ فرض وہ انجام نہیں دے رہے ہیں۔ کیوں؟ لیکن مدرسہ کو کیا فرض انجام دینا چاہئے، مدرسہ کا فرض کیا ہے؟ مدرسہ کے سپرد کون سا کام کیا گیا ہے؟''

جامعہ رحمانیہ مونگیر کی طرف سے ۱۹۷۳ء میں ایک سپاس نامہ کا جواب دیتے ہوئے مولانا نے دلی درد کے ساتھ فرمایا:

''جو لوگ عربی مدارس کی وکالت اوران کی سفارش اس انداز سے کرتے ہیں کہ بھئی آپ کے یہاں بڑے بڑے میوزیم ہیں، آپ کے یہاں بڑے بڑے دارالآثار ہیں، برطانوی قوم کا حال یہ ہے کہ اس کو سب سے زیادہ شغف میوزیم سے ہے، شاید جتنے بڑے بڑے میوزیم لندن میں ہوں، دنیا کے کسی شہر میں نہ ہوں، اس لحاظ سے یہ عربی مدرسے آثار قدیمہ کی حیثیت سے باقی رکھے جائیں تو میں کم از کم ایسی پوزیشن کو ہرگز قبول کرنے پر تیار نہیں، میں سمجھتا ہوں کہ جس نظام کی وکالت حضرت مولانا محمد قاسم صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے کی، اور حضرت مولانا محمد علی صاحب مونگیریؒ نے کی جس کے لئے ندوۃ العلماء کی درسگاہ قائم ہوئی، جس سے ہم سب لوگوں کو تعلق ہے، اس کی بنیاد ہرگز اس پر نہیں تھی، یہ رحم کی کوئی درخواست نہیں تھی، یہ رحم کے لئے کوئی استغاثہ نہیں تھا کہ صاحبو! بہت سی چیزیں آپ نے چھوڑ دی ہیں، قبرستان بھی باقی ہیں، بڑے بڑے آباد اور ایسے شہر میں کہ جہاں پر ایک گز زمین کا ملنا بھی مشکل ہے، وہاں پر بہت رقبہ میں قبرستان پڑے ہوئے ہیں، اور وہ ایک بہت بڑی جگہ گھیرے ہوئے ہیں، آپ کا کیا حرج ہے اگر

آپ ان مدرسوں کو بھی اسی طرح چھوڑ دیں، کم سے کم میں اس پوزیشن کو قبول کرنے کے لئے بالکل تیار نہیں ہوں۔

بہر حال ایک فریق تو یہ سمجھتا ہے کہ یہ مدرسے اپنی افادیت اور اپنی زندگی کی صلاحیت ختم کر چکے ہیں، اور اب ان کو آثار قدیمہ کے طور پر باقی رکھنا چاہئے، تو میں آپ سے یہ کہہ رہا تھا کہ اول تو میں اس پوزیشن کو قبول نہیں کرتا، دوسرے یہ دنیا میں جو اس مقام پر آجائے، جو اپنے لئے یہ مقام پسند کر لے اس کے لئے پھر زندگی کی زیادہ گنجائش نہیں ہوتی، آج اگر قبرستانوں کو لوگوں نے کسی وجہ سے چھوڑ رکھا ہے تو کل ان کو نہیں چھوڑیں گے، چنانچہ آپ دیکھ لیجئے کہ دہلی میں حضرت خواجہ باقی باللہ کا قبرستان کتنا بڑا تھا، اس کو دیکھنے والے یہاں بھی موجود ہوں گے، میں بھی جب شروع میں دہلی جایا کرتا تھا، دہلی کی سیر کرتا تھا، تو ایک لق ودق میدان تھا، ہزاروں قبریں تھیں، اب ان کو تلاش کرتے رہئے اب جہاں حضرت خواجہ کا مزار ہے اس کے آس پاس کا تھوڑا سا حصہ باقی رہ گیا ہے، اس لئے کہ شہر کی ضروریات بڑھتی جاتی ہیں، اور شہر کی ضرورت کو ایک حقیقت سمجھا جاتا ہے، اور یہ چیزیں محض ایک رعایت اور مجبوری کے دائرہ میں آتی ہیں، اور رعایت و مجبوری حقیقت کا مقابلہ نہیں کر سکتی اس لئے اول تو ان مدارس کی یہ پوزیشن صحیح نہیں، دوسری بات یہ کہ تاریخ یہ ثابت کرتی ہے کہ ان چیزوں کو رواں دواں اور حقیقت پسند زندگی (جو زندگی کی صلاحیتوں سے نہ صرف معمور بلکہ مخمور اور مدہوش ہے، اور جو کسی کو قبول کرنے یا اپنے حصے میں

سے حصہ دینے کے لئے تیار نہیں ہے) زیادہ دیر تک برداشت نہیں کر سکتی۔

دنیا میں کوئی ادارہ محض اس وجہ سے نہیں چل سکتا کہ یہ ادارہ آج سے سو برس دو سو برس پہلے قائم ہوا، اور اس نے کچھ مفید خدمت انجام دی تھی، محض تاریخ کے بل پر محض تاریخ کے سہارے کوئی ادارہ کوئی تحریک، کوئی فلسفہ، کوئی نظام نہ چلا ہے نہ چلے گا، اگر آپ کسی ادارہ کو قائم رکھنے کے لئے اور اس کے لئے کچھ مراعات حاصل کرنے کے لئے اس کی تاریخ پیش کرتے ہیں کہ اس نے دور ماضی میں یہ خدمات انجام دیں، تو لوگ اس کو بالکل نہیں سنیں گے، اور اگر کوئی آج خاموش ہو جائے گا، تو کل اس کے اندر سے نہایت پر زور اور پر جوش تقاضہ پیدا ہوگا کہ اس کو ختم کر دینا چاہئے۔"

مذکورہ بالا اقتباسات سے صرف یہ پہلو نمایاں کرنا تھا کہ مولانا مدرسہ کو کس عظمت کی نگاہ سے دیکھتے ہیں، مدرسہ جس کو عرب "مصنع الرجال" کہتے ہیں یعنی انسان سازی کا کارخانہ، یہ مولانا کے ذہن میں آج سے نہیں بلکہ ابتدائے نوعمری سے رہا اور اس نے ایک عقیدہ اور یقین کی شکل اختیار کر لی، جو لوگ مدرسوں کی تحقیر کرتے ہیں اور اس کو ایک کاروباری نقطۂ نظر سے دیکھتے ہیں، ان کے لئے مولانا کے احساسات تصحیح فکر کا ذریعہ ہوگا، اہل ثروت جو اپنے مال کا میل کچیل (زکوٰۃ، صدقہ وغیرہ) دے کر یہ سمجھتے ہیں کہ انھوں نے اسلام پر کوئی احسان کر دیا، اور دین کا حق ادا کر دیا، وہ لوگ درحقیقت مدرسوں کی عظمت سے واقف نہیں ہیں، غلام ملک میں اور دشمنوں کے یلغار اور اپنوں کی تحقیر کو دیکھتے ہوئے مدرسے کو جرأت و صراحت کے ساتھ پیش کرنا، اور اس کو اسلامی عظمت کا مینار بتانا مولانا کی اہم خصوصیات میں

قابل ذکر ہے۔ مولانا کی اس طرح کی تقریر جو آپ نے دارالعلوم ندوۃ العلماء کے طلباء کے سامنے مختلف مواقع پر کی، ان کو مشورے دیئے اور انھیں بتایا کہ دنیا کے نقشہ میں ان کا کیا مقام ہے؟ ان کو کیا پڑھنا چاہئے؟ اور کس طرح کام کرنا چاہئے؟ احساس کہتری کو کس طرح دور کریں، طالبان علوم نبوت کا مقام اور ان کی ذمہ داریاں کیا ہیں؟ مدارس کی فضاء میں افسردگی کیوں ہے؟ خودداری اور خودشناسی سے مدرسہ کے طلبا کیوں محروم ہوگئے؟ ان تمام مسائل پر مولانا نے تفصیل سے گفتگو کی ہے، بدلتے ہوئے حالات میں مدرسے کس خلا کو پر کر سکتے ہیں، ان تمام باتوں کی تفصیل مولانا کے ان خطبات میں ملتی ہیں جن کا مجموعہ ''پا جا سراغ زندگی'' کے عنوان سے مولانا محمد میاں مرحوم نے جمع کر دیا ہے۔ اہل مدارس اور خاص طور سے طلباء کے مطالعہ کی چیز ہے۔

راقم نے صرف ایک پہلو بیان کرنے کی کوشش کی ہے، جو مولانا کی سیرت کا جزء ہے کیونکہ جب تک یہ نہ دیکھا جائے کہ صاحب سوانح کی پسند اور ناپسند کیا ہے؟ ان کے نزدیک عظمت کا معیار کیا ہے؟ محبت وعقیدت کا رشتہ کس فکر سے قائم ہے؟ اس وقت تک صاحب سوانح کا صحیح رخ سمجھ میں نہیں آسکتا۔ تفصیلات سے دلچسپی رکھنے والے مذکورہ بالا کتاب میں اس حقیقت کا مطالعہ کر سکتے ہیں۔

عالم عربی سے تعلقات

اور عربوں میں دعوت کا کام

مولانا کا نسلی تعلق عرب سے ہے، اور عرب میں بھی ہاشمی قریشی شاخ سے۔ آپ کا خاندان ان چند نادر خاندانوں میں ہے جس نے وطن سے ہزاروں میل کی دوری کے باوجود اپنے نسب وخون کی حفاظت کی ہے، زبان عربی سے زندہ تعلق رکھا ہے، اور عرب کی سب سے بڑی دولت اور سرمایہ افتخار اسلام کی دعوت ہے۔ اس دولتِ بیدار کو کبھی اس خاندان نے فراموش نہیں کیا، اس کے لئے جان بھی قربان کی اور جگر کا خون بھی دیا، اللہ نے جو ذہانت وقوتِ فہم دی، وعظ ونصیحت کی صلاحیت دی، لکھنے اور لوگوں کو سمجھانے کی صلاحیت دی، سب اس دین پر قربان کیا اور نسلاً بعد نسلٍ یہ سلسلہ اب تک قائم ہے، عربی اور عربیت سے تعلق والہانہ اور جذباتی بھی رہا اور علمی وتحقیقی بھی۔

مولانا کے والد ماجد مولانا حکیم سید عبدالحی صاحبؒ کی اہم تصنیفات عربی زبان میں ہیں۔ خوش قسمتی سے آپ کو اساتذہ بھی عرب نژاد ملے، شیخ خلیل عربؒ اور

ڈاکٹر تقی الدین ہلالی مراکشیؒ، اس طرح صحیح عربیت پر آپ کی نشو ونما ہوئی، زبان و بیان کی بہت سی باریکیاں جو ایک عمر گذرنے کے بعد اور سالہا سال کی دیدہ ریزیوں اور درس وتدریس کے طویل تجربوں کے بعد سمجھ میں آتی ہیں، وہ آپ کی طبیعت کے اندر ابتداہی سے رچ گئیں، اور عہد طفولیت ہی سے مزاج کا جزء بن گئیں۔

عربی زبان سے تعلق نسبی عصبیت کی وجہ سے نہیں بلکہ اس دعوت کی وجہ سے رہا جس کا خزانہ عربی زبان میں ہے، اور جو زبان تمام دینی علوم کی کنجی (مفتاح) ہے۔

دعوت دین کا ذوق بھی آپ کو اپنے گھر سے ملا، آنکھ کھلی تو تلاوتیں سنیں، حفظ قرآن کا چرچا سنا، اندر باہر سب ایک ہی دھن میں مست تھے، ہوش سنبھالا تو سیرت نبویؐ سے واسطہ پڑا، لہٰذا ''قرآن اور سیرت نبویؐ'' کے ماحول میں عقلی وذہنی پرورش ہوئی، عرب ممالک میں قدم رکھنے سے پہلے ہی عرب دنیا کی گلی کوچوں سے واقف ہو چکے تھے، وہاں کے علماء وادباء اور اصحاب نگارش سے، ان کی فکر اور نقطۂ نگاہ سے واقفیت تھی، جس طرح اپنی مادری زبان (اردو) کے ادباء، مصنفین، شعراء اور تاریخ نویسوں سے واقفیت تھی۔ ۱۶ر سال کی عمر تھی جب آپ کا مضمون علامہ رشید رضا نے المنار میں شائع کیا (۱) اور آپ کی اجازت سے کتابی شکل میں پیش کیا تھا، مصر سے شائع ہونے والے رسائل ومجلات کا مطالعہ آغاز نوجوانی سے کرتے رہے۔

ندوۃ العلماء سے پہلا عربی ماہنامہ ''الضیاء'' نکلا تو آپ اس کے مقالہ نگار بھی تھے، اور معاون ایڈیٹر بھی، جس کی وجہ سے عرب علماء وادباء سے خط وکتابت کرتے، ان کے مضامین کے ذریعہ ان کی شخصیات کو سمجھنے کا آپ کو ابتداء ہی سے موقع ملا۔

بہتر ہوگا کہ اس وقت جب کہ آپ نے عرب کا پہلا سفر حج کے لئے کیا ہے عرب ممالک کی کیا حالت تھی اس کا جائزہ لیا جائے، عرب ممالک میں سب سے پہلے

---

(۱) یہ کتاب ''سیرۃ احمد بن عرفان'' جو دراصل ایک مقالہ تھا، اس کو علامہ رشید رضا نے اپنے مؤقر ماہنامہ ''المنار'' میں شائع کیا اور مصنف کی اجازت سے اس کو کتابی شکل میں شائع کیا۔

جس ملک پر ہماری نظر پڑتی ہے اور جس سے ہم مسلمانوں کا براہ راست واسطہ ہے وہ حجاز مقدس کا علاقہ ہے۔ جہاں مکہ مکرمہ اور مدینہ منورہ واقع ہے، اور جو ہمارے عقیدہ کی شہہ رگ ہے۔

آپ نے حجاز مقدس کا پہلا سفر ۱۹۴۷ء میں کیا۔ سعودی حکومت کو قائم ہوئے ۳۸ سال ہو چکے تھے، پٹرول نکلنے کی ابتداء ہو چکی تھی، مگر دولت کی اس وقت تک ریل پیل نہیں ہوئی تھی، صدیوں سے فقر وافلاس کا جو سلسلہ جاری تھا وہ ختم ہو رہا تھا۔ مگر پوری طرح ختم نہیں ہوا تھا اور اہل حرمین کی معاشی حالت میں تبدیلی کی ہلکی شروعات تھی۔ اور اس وقت تک کوئی نمایاں تبدیلی نہیں آئی تھی، دفتری نظام تقریبا وہی تھا، جو ترکوں نے چھوڑا تھا، ہاں امن وامان قائم ہو چکا تھا، مگر صدیوں کے افلاس نے ذہانتوں کو متزلزل کر دیا تھا، اور بیرونی مذہب دشمن تحریکوں سے کچھ کچھ لوگ متاثر ہونے لگے تھے، علمی باگ ڈور مصریوں اور شامیوں کے ہاتھ میں تھی، مدرسوں کے لئے اساتذہ مصر سے آیا کرتے (۱) معالجہ کے لئے ڈاکٹر اور تعمیرات کے لئے انجینئر یہاں تک کہ کاریگر اور اہل حرفت سب مصری یا شامی ہوتے تھے، دوکانداری اور بار برداری، آب رسانی کا کام یمنی کرتے تھے، خال خال دوسرے ممالک کے لوگ بھی تھے، مکہ مکرمہ میں خاندانی اور اصل عرب بہت کم ہیں زیادہ تر مشرقی ممالک، برصغیر، جاوا، سماترا، کے حجاج جو وہاں بس گئے تھے، یا ترکی، مصری، بخاری نسلوں کے لوگ اور مخلوط انساب سے پیدا ہونے والی نسلیں تھیں، زبان اور مذہب سب کے درمیان قدر مشترک تھا۔ غیر عرب نسل کے افراد رہے تو مکہ اور مدینہ میں تھے، مگر ذہنی طور پر مصر وشام سے بہت متاثر تھے، اور کیوں نہ ہوں، کتابیں وہی

---

(۱) اور اب تک آتے ہیں مگر بہت کم تعداد میں آتے ہیں، کیونکہ سعودی عرب اب خود کفیل ہو چکا ہے، ابتدائی مدرسوں سے لے کر یونیورسٹی تک ہر جگہ سعودی اعلیٰ تعلیم حاصل کر رہے ہیں، اور اب خود اپنے ہی ملک میں ایم۔ فل اور پی۔ ایچ۔ ڈی کر رہے ہیں۔

پڑھتے جوان ملکوں کے ادباء اور مصنفین نے لکھی تھیں، اخبارات انہی ممالک کے پڑھتے (۱) شہری معاشرت کا سب سے بڑا نمونہ ان کو قاہرہ اور بیروت میں نظر آتا ،جن کی معاشرت کئی پشتوں سے یورپین انداز کی ہوچکی تھی ،سنیما، تھیٹر، رقص گاہیں چھوٹے اور پسماندہ عرب ممالک کے باشندوں کے لئے بڑی کشش کا سبب تھیں، حجاز مقدس کے باشندے خالص عرب عدنان وقحطان کی اولاد نہیں ہیں، یہ وہ لوگ ہیں جن کے آباء واجداد حج کے لئے وہاں گئے تھے اور وہیں کے ہوکر رہ گئے، ان کو وہاں کی اصطلاح میں ''بقایا الحج'' کہا جاتا ہے، یعنی حج کرنے کے بعد جو حجاز میں باقی رہ گئے، سعودی عرب کے ثانوی مدارس میں جو کتاب انساب وقبائل کے متعلق ہے اس میں یہ تصریح ہے کہ مکہ ومدینہ وجدہ کے باشندوں کا کوئی نسب نہیں ہے، یہ سب غیر ملکی، ''بقایا الحج'' ہیں، ان مہاجروں میں سے ترکی مغربی، (الجزائر، مراکش وغیرہ کے رہنے والے) یمنی ، ہندی (قبل تقسیم برصغیر کے باشندے) جاوی، انڈونیشی، اور بخاری ہیں۔ ان کے آپس میں شادی بیاہ ہوتے رہے ان کی اولادیں بھی سب عرب ہیں، ان کے آبا واجداد، بے شک حرمین کا عشق تھا وہ اس زمانہ کی اقتصادی سختیاں جھیل کر رہ پڑے تھے، ان کے بعد جو نسل پیدا ہوئی ان میں ایسے دولت مند بھی دیکھے گئے جن پر یہ آیت صادق آتی ہے ﴿فَخَلَفَ مِنۢ بَعۡدِهِمۡ خَلۡفٌ أَضَاعُوا الصَّلٰوةَ وَاتَّبَعُوا الشَّهَوَاتِ﴾ اگر چہ اکثریت پر الحمدللہ خیر غالب ہے اور اللہ کے بندے ایسے بھی ہیں جن کے اندر عرب حمیت اور اسلامی غیرت تھی، اور اب بھی ہے، لیکن اس وقت صدیوں کے افلاس نے ایک بڑی تعداد میں مایوسی پیدا کردی تھی ، اور متمدن عرب ممالک سے اپنے آپ کو کمتر اور حقیر سمجھنے لگے تھے، تعلیمی پسماندگی نے ان کو اپنی نگاہ میں کمتر بنادیا تھا۔

---

(۱) اب پانچ روزنامے جدہ سے اور تین ریاض سے ایک دمام سے شائع ہوتے ہیں۔

ایک نجدی عالم جو ملحد ہوگیا تھا، اس کا نام عبداللہ القصیمی تھا اس نے ایک کتاب لکھی تھی جس کا نام تھا "ھذہ ھی الاغلال" (یہی پیر کی بیڑیاں ہیں) اس نے دکھایا تھا کہ مذہب کی قید بند نے ہمیں ترقی یافتہ دنیا سے الگ تھلگ جزیرہ میں قید کر رکھا ہے۔ دوسرا طبقہ وہ تھا جس کا مطمح نظر یہ تھا کہ اصل ترقی کارخانوں اور ملوں کے ذریعہ ہوتی ہے، ہمیں اپنی جہالت اور بے روزگاری دور کرنے کے لئے مذہب سے انفرادی تعلق باقی رکھتے ہوئے اجتماعی زندگی میں ترقی یافتہ ممالک کی تقلید کرنا چاہئے، چنانچہ احمد السباعی (اصلاً مصری تھے دو پشتوں سے مکہ مکرمہ میں آباد تھے) انھوں نے ملک فیصل سے کہا تھا کہ حرم کی تعمیر میں جو پیسہ خرچ کیا جارہا ہے، اس سے کئی کارخانے بن سکتے تھے، مصری وطن پرستی کی جو لہر اٹھی اس کی گونج تمام عرب ممالک میں سنی گئی، یہی احمد السباعی تھے جنھوں نے دار قریش اور دارالندوہ قائم کرکے (مشرکین قریش) کے احیاء کی سعی کی تھی، ایک پریس "دارِ قریش" کے نام سے قائم کیا تھا، دارالندوۃ کی یادگار میں روزنامہ "الندوہ" نکالا، جس کو بعد میں احمد محمد جمال اوران کے بھائی صالح محمد جمال نے خریدلیا، اور آخر میں "مؤسسة الصحافة" کے حکومتی ادارہ نے خریدلیا، اور ابھی تک جاری ہے۔ اوراس کے مضامین علمی اجتماعی اور دینی ہوتے ہیں۔ احمد السباعی جو اپنے وقت کے صحافی ادیب بھی تھے، انھوں نے ایک تھیٹر کا منصوبہ بنایا تھا اوراس کے لئے ہال بھی تعمیر کرا چکے تھے، ان کا ارادہ تھا کہ حجاز کی قدیم تہذیب کو اجاگر کیا جائے، جاہلیت کے ہیروز کے کارنامے ڈراموں کی شکل میں پیش کیے جائیں، خدا بھلا کرے علامہ شیخ بن باز کا کہ انھوں نے حکومت کو اس فتنہ کی طرف متوجہ کیا اور منصوبہ پر عمل نہیں ہونے دیا۔

سب سے بڑھ کر عبرتناک اور حیرتناک بات یہ شروع ہوئی کہ بعثت نبوی ﷺ کو یہ لوگ ایک عبوری تحریک بتانے لگے، ایسی تحریک جس کا مقصد اس عہد میں عربوں کو

متحد کرنا تھا، ایک مصری رسالہ ''الاعتصام'' فروری ۱۹۵۲ء میں ایک مضمون ابراہیم احمد ابراہیم کا شائع ہوا۔ جس کی کٹنگ میرے پاس موجود ہے اس کا عنوان ہے ''ماذا فعل محمد ؐ'' (محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے کیا کیا؟)

ابراہیم احمد ابراہیم لکھتے ہیں کہ میں عمرہ کے لئے مکہ گیا وہاں ایک شخص (۱) ملا اور اس نے دوران گفتگو مجھ سے کہا کہ دنیا کے فلاں فلاں ہیروز نے اپنے ملک کو کہاں سے کہاں پہونچادیا۔ مگر اسلام نے ہمیں دیا ہی کیا؟ صرف چند مذہبی رسوم!!

ابراہیم لکھتے ہیں کہ واللہ میرے جوتے جو احرام میں استعمال میں تھے ان کی توہین ہوتی اگر میں اس سے اس شخص کو مارتا۔ اس کے لئے تو نجاست صاف کرنے والے برش کی ضرورت تھی۔ معاذ اللہ محسن انسانیت کے بارے میں یہ شخص کہتا ہے نے............ کیا کیا! مولانا نے خود اپنا واقعہ لکھا ہے کہ ایک ادبی ماہنامہ کے ایڈیٹر (اور جدہ کے مؤرخ اور جغرافیہ داں) سے جب دین کی باتیں شروع کیں تو انھوں نے کہا مولانا! دین کی باتیں تو حرم میں کیجئے، ہمیں یہ بتایئے کہ تقسیم ہند کا مسلمانوں کو کیا فائدہ ہوا؟ لیکن حق تلفی اور ناانصافی ہوگی اگر یہ اعتراف نہ کروں کہ ان شاذ قسم کے افراد کو چھوڑ کر عمومی طور پر دین کی عظمت لوگوں کے دلوں میں تھی، شاید ہی کوئی ایسا بدقسمت ہو جو نماز نہ پڑھتا ہو، رمضان شریف میں کوچہ و بازار کی رونقیں، حرم شریف کے انوار و برکات سے مستفید ہونے کی تمنا سب میں تھی، العواد اور السباعی اور وہ جن کا نام لینا مناسب نہیں ہے، (ادبی رسالہ کے اڈیٹر) شاذ قسم کے لوگوں میں تھے یہ اور بات ہے کہ ان کے صاحب قلم ہونے کی وجہ سے علماء و ادباء میں ان کا شمار ہوتا تھا۔ مدینہ منورہ ذرا مختلف تھا۔ یہاں کے باشندوں میں جن میں زیادہ تر بخاری اور ہندی نسل کے لوگ ہیں، دین اور حرم شریف سے تعلق رکھتے تھے، ان کے

---

(۱) وہ شخص محمد حسن عوّاد تھے، حجاز کے بڑے ادیبوں میں شمار کئے جاتے تھے اور ان کے ماننے والوں اور شاگردوں کی جماعت بھی ہے، ۱۹۸۰ء میں انتقال کیا۔ اجتماعیات اور فن تنقید پر ان کی کتابیں ہیں۔

اندر ادب واحترام کا جذبہ تھا، البتہ افلاس کی وجہ سے ایسے بھی لوگ تھے جو صدقات وصول کرنے کے لئے حجاج سے سخن سازی کرلیا کرتے تھے، مگر بے دینی کی لہر سے محفوظ تھے۔ مگر باوجود تمام کمزوریوں کے اہل حرمین میں عربی ثقافت باقی تھی، لباس بھی عربی رہا جواب تک ہے، خواتین بالعموم برقع استعمال کرتی تھیں، اور اب بھی کرتی ہیں، البتہ اس وقت چھوٹی بچیاں بلا برقع نہیں نکلا کرتی تھیں، مگر جب سے مدارس نسواں قائم ہوئے بچیوں کے لئے یونیفارم کا رواج ہوگیا، مگر آج بھی تمام خرابیوں کے باوجود خواتین بے پردہ نظر نہیں آتی ہیں۔ سرکاری بڑے گھرانوں (بروکریٹ) خواتین جب ملک سے باہر جاتی ہیں تو سنا ہے کہ بے پردہ ہوجاتی ہیں، مگر اس کے ساتھ ان خواتین کی تعداد بھی کم نہیں ہے جو آج لندن کے پیکڈلی اسٹریٹ اور آکسفورڈ اسٹریٹ میں برقع کے ساتھ دیکھی جاتی ہیں۔

لیکن مصر وشام، عراق کا اثر خلیج اور یمن پر بھی پڑ گیا ہے۔ اور دولت نے ان آنکھیں خیرہ کردی ہیں۔ سعودی حکومت کے کارنامے بہت ہیں، اُن میں یہ کارنامہ بھی قابل ذکر ہے کہ باوجود موڈرن عناصر کی کوششوں کے اب تک مخلوط تعلیم نہیں ہے، اور نہ دفتروں میں خواتین ایسے کام کرتی ہیں جس میں ان کا سابقہ مردوں سے پڑے۔

الغرض حجاز مقدس پر اس زمانہ میں مصر وشام کے تمدن کا رعب تھا، اور عقلی فکری اعتبار سے بھی مصری علماء، ادباء، آرٹسٹ کا دباؤ تھا، سوائے اس کے کہ مصریوں کی طرح لباس واطوار میں اہل حجاز نے نقل نہیں کی تھی، بلکہ اپنی ثقافت پر قائم تھے، یمن بھی ایک حد تک اپنی عرب وضع قطع اور اسلامی ثقافت کی حفاظت کرتا رہا، مگر قومیت عربیہ کی رو میں جب سے بہنے لگا اور شاہی نظام ختم ہوا تو وہ کمیونسٹوں کے قبضہ میں آگیا، اس طرح حضرموت، مکلا، اور عدن کے باشندے اپنی بدویانہ سادگی پر قائم تھے، بحرین میں بھی دینی روح مفقود نہیں ہوئی تھی، اگرچہ غیر ملکیوں کے ہاتھ

میں وہاں کی تجارت آگئی تھی، جیسے جیسے دولت آتی گئی اسلامی ثقافت مضمحل ہوتی گئی۔

مصر اور شام کا معاملہ دوسری عرب ریاستوں سے جداگانہ اور امتیازی ہے، یہ عرب ممالک کا دماغ ہے، شام پر فرانسیسی اور مصر پر انگریز قابض رہے، انگریز اور فرنچ حکمرانوں کو سب سے زیادہ فکر اس بات کی رہی کہ عرب اور اسلام دونوں جو لازم وملزوم ہوگئے ہیں اس کی وجہ سے ان کو خطرہ تھا کہ کہیں خلافت اسلامیہ عود نہ آئے، جس کو بڑی چالبازیوں اور مدتوں کی پلاننگ کر کر کے انھوں نے ختم کیا ہے، یہی وجہ ہے کہ فلسطین پر یہود کو قبضہ دلانے سے پہلے اور اس کے بعد ان کی یہی کوشش رہی کہ یہ مسئلہ امت اسلامیہ کا مسئلہ نہ بن جائے۔ چنانچہ انھوں نے عرب لیگ کی بنیاد ڈالی، بنیاد ہی نہیں ڈالی بلکہ اس کو سرگرم عمل رکھنے میں ان کا نمایاں کردار بھی رہا۔ یوپی کے مشہور سیاسی بزرگ چودھری خلیق الزماں مرحوم نے اپنی ضخیم روداد زندگی ''شاہراہ پاکستان'' میں لکھا ہے کہ ۱۹۳۸ء میں محمد علی علوبہ باشا نے مصر میں بین الاقوامی اسلامی کانفرنس فلسطین کے سلسلہ میں بلائی تھی، ہندوستانی وفد میں عبدالرحمٰن صدیقی چودھری صاحب بھی تھے، اور کانفرنس کی تجویز کے مطابق ایک وفد لندن گیا تاکہ برطانوی حکومت سے مفاہمت کی شکل نکالے، اس وفد میں چودھری صاحب بھی تھے، وہ لکھتے ہیں:

> ''ہم لوگ ۸؍نومبر ۱۹۳۸ء میں لندن پہونچنے کے بعد جارج لائیڈ سے جو بمبئی میں گورنر رہ چکے تھے اور بعد میں مصر میں ہائی کمشنر رہے تھے ملنے گئے۔ لندن میں ان کا ایک دفتر تھا جس کا نام انھوں نے ''عرب لیگ سینٹر'' رکھا تھا۔ اور ہم لوگ ان سے ان کے اسی دفتر میں ملے اور ان سے ان کے ہندوستان سے تعلق کی یاد دلاکر کہا کہ وہ فلسطین کے بے یارومددگار مسلمانوں کی مدد کریں،

انھوں نے اپنے دفتر کا نام بتا کر ہم سے کہا کہ ان کے نزدیک فلسطین
کا واحد حل ایک عرب لیگ ہے جس کے قیام کے لئے وہ برابر
کوشش کرتے رہتے ہیں، اس کے علاوہ ان کے نزدیک فلسطین کا
اور کوئی علاج نہیں ہے۔ عبدالرحمٰن (عبدالرحمٰن صدیقی) نے رخصت
ہونے کے بعد مجھ سے کہا کہ اس میں انگریزوں کی بڑی چال ہے۔"

عرب لیگ انگریزوں نے اس لئے قائم کی تھی کہ عربوں کو مسلمانان عالم سے کاٹ دیں، کیونکہ ان کو خطرہ تھا کہ اگر یہ مسئلہ عالم اسلام کا سمجھا جائے گا تو تمام مسلمان مل کر اس کا دفاع کریں گے۔ ۱۹۴۴ء میں مسٹر ایڈن نے عرب لیگ کے قیام کا استقبال کیا اور ہر ممکن معاونت کا وعدہ کیا یہ بھی اس کی ایک کڑی ہے۔

انگریزوں کو ہمیشہ مسلم اتحاد اور "عالم اسلام" کے نظریہ سے الرجی رہی، الغائے خلافت اور مدینہ منورہ سے استنبول تک جانے والی ریلوے کا تباہ کرنا جس کا ہیرو "لارنس آف عربیا" بتایا جاتا ہے اور الغائے خلافت کی سازش مرکز اسلام سے مسلمانوں کو کاٹنے کی اسکیم تھی، جو کارگر ہوئی، یہاں تک کہ خود عربوں نے بالآخر اس تحریک کو اپنایا اور اس کے پرجوش داعی بن گئے۔

ایک اور واقعہ اس سلسلے میں قابل ذکر ہے جس سے معلوم ہوگا کہ یورپین اقوام کو مسلمانان عالم کا اتحاد کس درجہ خطرناک اور ان کے مقاصد کیلئے کتنا خوفناک معلوم ہوتا ہے۔

۱۹۶۷ء کی مصر اور اسرائیل کی جنگ جو پانچ روزہ جنگ کے نام سے یاد کیا جاتی ہے۔ حالانکہ وہ پانچ روزہ نہیں بلکہ ۱۵ منٹ کے اندر مصر کے سارے جہازوں کو تباہ کرنے کا المیہ تھا۔ جیسا کہ مرحوم انور السادات نے اپنی آپ بیتی (۱) میں لکھا

---

(۱) مرحوم انور السادات کی خودنوشت سوانح کا نام "البحث عن الذات" (اپنی جستجو ہے)

ہے کہ وزیر دفاع عبدالحکیم عامر صورت حال کا معائنہ کرنے لئے ہوائی جہاز میں بیٹھ کر فضائے مصر میں گھوم رہے تھے اور اسی درمیان جنگ شروع بھی ہوئی اور ختم بھی ہوگئی۔

اس حادثہ کا مسلمانوں پر عموماً اور عربوں پر بہت برا اثر پڑا تھا۔ برٹش اخبارات نے شماتت آمیز الفاظ سے سرخیاں لگائی تھیں، مانچسٹر کے گارجین نے مستشرقین کا ردعمل بھی معلوم کیا تھا، اس وقت مانٹ گمری واٹ (محمد ایٹ مکہ اور محمد ایٹ مدینہ کے مصنف) زندہ تھے۔ انھوں نے لکھا کہ اس شکست کا یہ اثر بھی پڑسکتا ہے کہ عرب اس مسئلہ کا رخ اسلام کی طرف پھیر دیں، اور مذہبی جنون لوگوں میں پیدا ہوجائے۔ پھر اسرائیل اور اس کے دوستوں کے لئے ایک مشکل سامنے آجائے گی۔

علامہ اقبالؔ کی تخیلاتی نظم ''ابلیس کی مجلس شوریٰ'' کا یہ شعر ایک شاعرانہ تخیل سمجھا جاتا ہے مگر ان حقائق کی روشنی میں دیکھتا ہوں تو حرف بہ حرف سچ نظر آتا ہے کہ ابلیسی طاقت کو اگر کسی سے خطرہ ہے تو وہ اسلام سے ہے۔ ع

ہے اگر مجھ کو خطر کوئی تو اس امت سے ہے

بات طویل ہوگئی اور موضوع سے بھی دور جا پڑا، مگر عرب ممالک کے صحیح خدوخال کو سامنے رکھنا ضروری تھا، تاکہ معلوم ہو کہ وہاں کا ذہین طبقہ یا صاحب الرائے گروہ جس کو Intelligencia کہا جاتا ہے۔ کس نہج پر عالمی مسائل کو سوچ رہا تھا۔ اس کا ایک بین اثر یہ تھا کہ الازہر کی چہار دیواری کے باہر جو کالج اور یونیورسٹی کے مردان کار تھے، ان کا تعلق اسلام سے کمزور اور خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات گرامی سے کمزور پڑ گیا تھا۔ یوں عوامی سطح پر میلاد کی مجلسوں اور نعت خوانی کے جلسوں اور ۱۲ ربیع الاول کی تقریب مولد کے میلے کو دیکھ کر خیال ہوتا

ہے کہ یہی مزاج پورے ملک کا ہے۔ ۱۹۵۲ء کے انقلاب سے پہلے مصر کی عام زندگی پر رسومات وتقریبات کی حد تک اسلام کا اثر تھا، اور "قومیت عربیہ" کا سحر اور اس سحر کا زہر پھیلا نہیں تھا۔ حجاز اور مصر کے سفر میں مولانا نے جو کچھ کہا اور سنا، سب اسی روشنی میں دیکھا جا سکتا ہے کہ اس وقت ان ممالک کی فکری اور علمی سطح کیا تھی۔



حجاز مقدس کے دو سفر

مولانا نے ''کاروان زندگی'' میں اپنے دونوں سفروں کی تفصیل بیان فرمادی ہے، اس لئے یہاں یہ نقل کرنے کی ضرورت نہیں کہ یہ سفر کیوں کر ہوا۔ اور حج کے علاوہ کیا دواعی تھے (دعوت وتبلیغ کا کام کرنا) پہلے سفر میں مدینہ منورہ تشریف لے گئے، جہاں تین ماہ قیام کیا، اور حج کے بعد واپس تشریف لے آئے۔ اس وقت آپ کے پاس عربوں کے لئے جو ہدیہ تھا اس میں پہلا رسالہ ''الی ممثلی البلاد الاسلامیة'' تھا۔ یہ ایک مقالہ تھا جس میں ان عربوں کو مخاطب کیا گیا تھا جو ۱۹۴۷ء میں ایشیائی کانفرنس میں شرکت کے لئے دہلی آئے تھے۔ یہ خطاب بہت طاقتور اسلوب میں لکھا گیا تھا۔ تمہید میں مولانا نے اپنے دل آویز اسلوب میں کہا کہ میرا گذر آپ کی اس مجلس (ایشین کلچرل کانگریس) کی طرف سے ہوا، جہاں مختلف اقوام اور سوسائٹیوں کے نمائندے تشریف فرما ہیں، جو ایسا لگتا ہے کہ ایک نمائش گاہ ہے جہاں مختلف ممالک مختلف تہذیبوں اور مختلف تمدنوں کے نمائندے جمع ہیں، ان میں آپ مسلمان ممالک کے نمائندے بھی ہیں جو سب میں امتیازی شان رکھتے ہیں، امتیازی شان اس معنی میں نہیں کہ آپ کا لباس اور انداز نشست و برخاست دوسروں

سے مختلف ہے، بلکہ اس لحاظ سے کہ آپ حضرات اس امت کے نمائندے ہیں جو اقوام عالم میں ایک امتیازی خصوصیت کی حامل تھی اور اب بھی ہے۔

اس کے بعد مولانا نے براہ راست صاف اور صریح لہجے میں جس میں ذرا بھی معذرت خواہی پہلو نہیں تھا اور نہ کوئی جھجک تھی اور نہ طویل تمہید تھی، یہ فرمایا کہ:

''اسلام جب آیا ہے تو دنیا کا کوئی کام رکا ہوا نہیں تھا۔ زراعت، تجارت، حکومت، سیاست، ہر کام جو آج ہو رہا ہے وہ اس وقت بھی تھا۔ جو کام فطری طور پر بشر کرتا ہے اس وقت بھی کر رہا تھا۔ اس وقت بھی ان کاموں کے لئے کسی نئی امت کی ضرورت نہ تھی، اگر یہ امت اس لئے بھیجی جاتی کہ انسانوں کو فنون زراعت سے آگاہ کرے تو اس کے لئے سب سے اچھی جگہ طائف اور یثرب کے زرعی علاقے یا دریائے نیل اور وادی فرات یا یہ ملک جہاں گنگا جمنا بہتی ہے بہت مناسب جگہ تھی، اور اس امت کو عراق وشام اور مصر میں مبعوث کیا جاتا ہے، اگر مقصود یہ ہوتا کہ عالمِ بشریت کو تجارت کے طور طریقے سکھائے جائیں تو یثرب کے یہودی اور شام کے نبطی اور مصر کے قبطی بہت کافی تھے۔ جنھوں نے تجارتی کاروبار کو کافی پھیلا رکھا تھا۔ اگر مقصود صناعت کی ترقی اور اس کو فروغ دینا تھا تو روم بلجیم جہاں کے آلات وظروف مشہور ہیں اور جو پشتوں سے شیشہ گری کا کاروبار کرتے آئے ہیں وہ مناسب لوگ ہوتے جہاں پیغمبر بھیجے جاتے، حکومت وجہاں بانی اور سیاست کے لئے اگر امت اسلامیہ بھیجی گئی ہوتی تو رومن امپائر اور پرشین امپائر اور بزنطینی ریاست کیا کچھ کم تھی، (جس

نے چھ ہزار برس حکومت کی) اگر عیش وعشرت، طاؤس ورباب کی
زندگی اور پرشکوہ عمارتوں میں بنانا مقصود ہوتا تو اس کے چاہنے
والے دنیا میں کب کم تھے، کیا اس زمانہ میں یا کسی زمانہ میں
جہاں اسباب عیش مہیا ہیں وہاں کسی فرد کے لئے بھی جگہ خالی
ہے؟ چہ جائیکہ ایک قوم کے لئے؟''

اس کے بعد مولانا نے سامعین کا ذہن اس طرف موڑا کہ سردارانِ قریش نے اجتماعی طور پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں پیش کش کی تھی، کہ حکومت وسیادت، مال ودولت اور عیش وعشرت کے تمام سامان آپ کے قدموں پر ڈھیر کر دیتے ہیں بشرطیکہ آپ اس دعوت سے دست بردار ہوجائیں۔ آپؐ نے اس پیش کش کو پورے جوش اور صراحت کے ساتھ رد کر دیا۔ آپ کا رد کرنا صرف اپنی ذات کی طرف سے نہیں بلکہ پوری امت کی طرف سے تھا۔ قریش بھی مطمئن ہوگئے۔ پھر انھوں نے ایسی پیش کش کی ہمت نہیں کی۔ اس کے بعد کیا ہوا؟ آپ جانتے ہیں کہ طول طویل جنگ کا سامنا کرنا پڑا۔ ہزاروں منکرین رسالت مارے گئے، اگر وہ لوگ جو جنگوں میں مارے گئے تھے آکر آپ سے پوچھیں کہ آخر ہم کیوں مارے گئے اور کیوں مسلمان شہید کئے گئے، کیا اسی دنیا کے لئے؟ جس کو تمہارے رسول نے ٹھکرایا دیا تھا؟ تو ہمارا کیا جواب ہوگا؟

اس مضمون کو انتہائی بلاغت اور خوبصورت ایجاز سے بیان کرنے کے بعد غزوۂ بدر کے ایک لمحہ کی یاد دلائی، جس میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اللہ سے دعا کرتے ہوئے فرمایا تھا کہ اگر یہ امت ہلاک ہوگئی تو پھر دنیا میں تیری عبادت نہ ہوسکے گی، یہ نہیں فرمایا کہ تجارت نہ ہوسکے گی، زراعت نہ ہوسکے گی، حکومت وسیاست کا کاروبار ختم ہوجائے گا، لوگ زراعت سے منہ موڑ لیں گے، لوگ عمارتیں بنانا چھوڑ

دیں گے، آپ نے اس امت کی بقا جس حوالہ سے مانگی وہ صرف عبادت الٰہی تھی۔

اسی مضمون کو ذرا بسط کے ساتھ بیان کر کے جنگ قادسیہ کی مثال بھی پیش کی، جب کہ حضرت ربعی بن عامرؓ نے فارس کے کمانڈر ان چیف رستم کے سامنے اپنے آنے اور حملہ کا مدعا بیان کیا کہ ہم انسانوں کو انسانوں کی غلامی سے نکال کر اللہ کی غلامی کی طرف لانا چاہتے ہیں، دنیا کی تنگی سے نکال کر وسیع میدان میں داخل کرنا چاہتے ہیں، مذاہب کی سختیوں اور زیادتیوں سے نکال کر اسلام کے نظام عدل میں لانا چاہتے ہیں۔

یہ تقریر بہت جامع، بلیغ اور پراثر انداز کی تھی۔ آخر میں تبلیغی جماعت کا تعارف میوات میں کام کی نوعیت اور حضرت مولانا محمد الیاس رحمۃ اللہ علیہ کی مساعی، علمی رسوخ، تعلق باللہ اور اس کے ثمرات کا بیان تھا۔

"الی ممثلی البلاد الاسلامیۃ" مولانا کے پہلے سفر حج میں ساتھ تھی، غالباً کوئی اور مطبوعہ تحفہ اہل عرب کے لئے نہیں تھا، اور وہ سفر بڑی امنگوں کا تھا۔ دعوت و تبلیغ کے سلسلہ میں چند اہل علم سے ملے اور تبلیغی اجتماعات میں خطاب فرمایا، جن لوگوں سے ملاقاتیں رہیں ان میں شیخ محمد شویل، شیخ علوی عباس مالکی، شیخ حسن کتبی، شیخ حسن مشاط ہیں، جو وہاں کے کبار علماء اور سربرآوردہ دینی شخصیات میں تھے۔ منجانب اللہ مقبولیت نے ضرور اپنا کام کیا۔ مدینہ منورہ میں سید محمود احمد صاحب (برادر حضرت مدنیؒ) کی نوازشات کا ذکر مولانا نے تفصیل سے فرمایا ہے، مولانا کے ہم عمر اور بزرگ زادہ مولانا حبیب اللہ صاحب ابن حضرت مولانا احمد علی لاہوریؒ حرم شریف (مدینہ منورہ) میں درس قرآن دیا کرتے تھے، ان سے بہت حد تک مانوسیت اور بے تکلفی تھی، مولانا محمد ثانی مرحوم (مولانا کے بھانجے) گھریلو ضروریات کا نظم کیا کرتے تھے۔

ایک مختصر سفر نامہ حج مولانا محمد ثانی مرحوم نے مرتب کیا تھا جس میں سوز دروں کے ساتھ زبان بھی ادبی استعمال کی تھی، وہ مسودہ عرصہ دراز سے محفوظ تھا۔ الحمدللہ ان کے صاحبزادے مولانا سید محمد حمزہ حسنی سلمہٗ نے حال ہی میں "لبیك اللهم لبیك" کے نام سے شائع کیا ہے۔

خود حضرت مولاناؒ نے ایک مضمون "اپنے گھر سے بیت اللہ تک" تحریر فرمایا تھا جس میں اس وقت کے حالات جب کہ سعودی عرب فقر وافلاس کے دور میں تھا، اس عصر کی پوری تصویر اس مقالہ میں موجود ہے، نیز سرزمین عرب سے والہانہ تعلق، دل سوزی، اور جذبہ دروں کا عالم، زندگی بھر کی تمناؤں کا پورا ہونا اس حسین پیرایہ میں بیان کیا کہ پڑھنے والوں کو اپنی کوتاہیاں اور دعوت دین کے سلسلہ میں مسلمانوں کی بے التفاتیاں سامنے آگئیں، مولانا محمد منظور نعمانی صاحبؒ نے اس مضمون کو "الفرقان" کے ایک خاص نمبر میں شائع کیا، اس کے بعد جب مولانا موصوف نے اس کو مختصر کتابی شکل میں شائع کیا اس میں بھی یہ مضمون داخل تھا۔ اور ہزار ہا ہزار بندگان خدا نے اس کو پڑھا ہے اور اب تک پڑھتے آرہے ہیں، راقم اس سفر سعادت میں ہم رکاب نہیں تھا۔ اس لئے اس کی وہی تفصیل معلوم ہے جو کاروان زندگی میں مذکور ہے۔ مدینہ منورہ میں ایک غیبی مدد یہ ہوئی تھی کہ "ماذا خسر العالم بانحطاط المسلمین" کی تالیف میں چند اہم اعداد وشمار کی ضرورت تھی جس کا سراغ نہیں مل رہا تھا۔ مولانا کی عدم موجودگی میں کوئی "صاحب خدمت" آپ کی قیام گاہ پر لا کر ڈال گئے، جن کا نام مولانا کو نہیں معلوم تھا، اور نہ بعد میں معلوم ہو سکا۔ مگر ان کاغذات میں وہ سب کچھ تھا، جس کی مولانا کو جستجو تھی۔ اسی سفر میں مولانا کے استاذ علامہ شیخ خلیل بن محمد الیمانی سے مکہ مکرمہ میں ملاقات ہوئی، ان کو اس کا بڑا قلق تھا کہ مولانا کی خداداد صلاحیتیں تبلیغ و دعوت کے اس خاص نہج کو عام کرنے میں صرف

ہو رہی ہیں۔ ان کا خیال تھا کہ اس کام کو اور لوگ بھی کر سکتے ہیں، اس کے لئے ان صلاحیتوں کی ضرورت نہیں ہے، جو مولانا کو اللہ تعالیٰ نے عطا فرمائی ہیں۔ انھوں نے اصرار اور دردمندی کے ساتھ مولانا سے کہا کہ آپ اس سے زیادہ اہم اور بڑے پیمانے پر کام کر سکتے ہیں، اتنی بات تو مولانا سے ایک مجلس میں میں نے سنی ہے، جواب کیا دیا گیا اس کا ذکر نہیں سنا۔ ایک سراپا منت اور احسان شناس سعادت مند شاگرد نے اپنے ایسے استاذ کو جن کے احسان کا بار بار اور ہر موقع پر ذکر کرتا ہو کیا اور کس طرح جواب دیا ہوگا معلوم نہیں۔ لیکن معلوم کرنے کا اشتیاق رہا، بظاہر معذرت ہی کی ہوگی کیونکہ عملاً تبلیغ کے کام میں سرگرم رہے۔

دوسرا سفر حج جو ۱۳۵۱ھ میں ہوا، اس میں یہ خادم بھی گرد کارواں تھا دوسرے رفقاء سفر میں مولانا سید محمد رابع حسنی (موجودہ ناظم ندوۃ العلماء) ڈاکٹر سید رضوان علی ندوی (سابق استاذ لیبیا یونیورسٹی حال مقیم کراچی) مولانا محمد طاہر ندوی مظاہری (خویش حضرت ڈاکٹر سید عبدالعلی صاحبؒ اور ناظر عام دفتر نظامت) ہم چار نفر اسلامی جہاز پر شریک سفر تھے، حضرت رائے پوری اپنے متعدد خدام اور مریدین کے ساتھ تھے، حضرت رائے پوری کے خدام و رفقاء میں آزاد صاحب بھی تھے جو تھوڑا عرصہ پہلے حضرت رائے پوری کی شفقت و محبت کے اسیر ہوئے تھے(۱) مولوی عبد المنان

---

(۱) سید مسعود علی صاحب آزاد، اردو کے اچھے شاعر، فارسی کا ذوق بھی رکھتے تھے، مرحوم جگر مرادآبادی کے مقلد اور ان کے ہم نشینوں میں تھے، ندوہ میں جب تبلیغی اجتماعات ہوتے تھے، اس میں اپنے بھائی مقصود علی صاحب کے کہنے سے آگئے، مولانا کی تقریر ہو رہی تھی جسے سن کر ان کی دنیا بدل گئی اور اسی لباس میں جو بدن پر تھا پہنے ہوئے ایک جماعت کے ساتھ فساد زدہ علاقہ (بہار) روانہ ہوگئے۔ پھر حضرت رائے پوریؒ سے ربط ہوا تو جذب و انجذاب کی سنت تازہ ہوگئی اور مرتے دم تک حضرت سے وابستہ رہے، حضرت نے ان کو اپنا امام بھی بنا لیا تھا اور بے حد شفقت کا معاملہ فرماتے تھے، دوران حج جس نے بھی کوئی رقم پیش کی وہ آزاد صاحب کو دلوا دیا کرتے تھے اور ان کی عافیت کا خیال براہ راست رکھتے تھے، بڑی خوبیوں کے بزرگ تھے، اللہ تعالیٰ مغفرت فرمائے۔

صاحب مرحوم جو اصلاً پنجاب کے تھے مگر حضرت رائے پوری کی نسبت سے اپنے آپ کو رائے پوری لکھتے تھے، سب اسی جہاز پر سفر کر رہے تھے، اس کے عرشہ (یعنی بالائی منزل میں فرسٹ کلاس کے کمروں کے سامنے کا ہال) پر نمازیں ہوتی تھیں، ایک روز مسافرانِ حرم نے مجلس شعر و سخن بھی آراستہ کی تھی، اس میں پٹنہ کے ایک شاعر بھی تھے انھوں نے یہ شعر پڑھا۔

باب رحمت نہ کریں بند جلدی کیا ہے
ٹھہریئے ٹھہریئے سرکار غلام آتا ہے

مجلس ختم ہونے کے بعد مولانا نے بڑھ کر ان کو داد دی، آزاد صاحب مرحوم و مغفور سراپا درد و محبت تھے، ایک روز شب کے وقت حضرت رائے پوریؒ کے کیبن کی طرف سے گزر ہوا، محسوس کیا کہ اندر سے کوئی درد بھری آواز آ رہی ہے۔ بات تھی بے ادبی کی مگر یہ خادم اندر کیبن میں داخل ہو گیا، دیکھا آزاد صاحب حضرت کا ہاتھ پکڑ کر بڑے جذب و سوز سے یہ شعر پڑھ رہے ہیں۔

وہ سیاہیاں بھی سمٹ گئیں وہ ہوا کے رخ بھی بدل گئے
ترا ہاتھ ہاتھ میں آ گیا کہ چراغ راہ کے جل گئے

حضرت رائے پوری سر جھکائے بیٹھے تھے، بعد میں مولوی عبدالمنان صاحب رائے پوری نے مجھ سے کہا یہ تو ان کا روز کا قصہ ہے۔

اس سفر میں جب جہاز مکلّا کے ایئرپورٹ پر ٹھہرا تو بڑی تعداد میں حضرمی حجاج بھی سوار ہوئے یہ لوگ خالص عرب اور اپنی فطری سادگی پر قائم تھے، ان کو مولانا کے بعض رسائل دیئے جس کو انھوں نے دلچسپی سے پڑھا اور مولانا سے آ کر ملے، ان سے حضرت رائے پوری کا تعارف کرایا تو ایک نوجوان نے کہا کہ ذرا ہمیں ملا دو۔ مجھے شامت سوجھی کہ ان کو لے کر اوپر کیبن کے سامنے والے ہال (عرشہ)

پر لے آیا۔اشارہ سے ان کو بتایا کہ یہ حضرت سب کے شیخ ہیں،اس نے بے تکلفی سے سلام کرنے بعد کہا! شیخ آپ کا نام؟ آزاد صاحب نے کہا: حضرت مولانا شاہ عبدالقادر رائے پوری ۔اس نے کہا (حضرت مولانا شاہ)ان کا نام ہے؟ آزاد صاحب کیا جواب دیتے عربی میں بتانا ان کے لئے مشکل ہوا،اس لئے خود حضرت نے فرمایا میرا نام عبدالقادر ہے، بہت سادگی سے نوجوان نے کہا: كيف حالك يا عبدالگادر (حضرمی ''ق'' کو''گ'' سے تلفظ کرتے ہیں) حضرت نے الحمدللہ فرمایااور مجھے خوف تھا کہ حضرت کواس کی بے تکلفی ناگوار ہوگی ،زبان سے نہیں فرمائیں گے،مگر چہرہ پراثر آگیا ہوگا۔مگر جب حضرت رائے پوری کی طرف دیکھاتو چہرہ بشاشت اور مسرت سے دمک رہا تھا،آزاد صاحب سے اشارہ فرمایا۔وہ کیبن سے چند کیلے اور مٹھائی لے کر آئے ،اتنے میں مولوی عبدالمنان صاحب دہلوی مرحوم تشریف لے آئے انھوں نے حضرت کی ترجمانی فرماتے ہوئے کہا یہ معمولی (قلیل)ساضیافت کا سامان ہے اس نے فوراً یہ شعر پڑھا۔

قليل منك يكفيني ولكن
قليلك لا يقا ل له قليل

اس شعر میں اتفاق سے ''ق'' ہی ''ق'' ہیں،اور وہ ہر ق کوگ سے تلفظ کرر ہا تھا۔اس سے ہم سب محظوظ ہوئے ، چلتے وقت اس نے حضرت سے مصافحہ کیااور پیشانی کو بوسہ دیا۔

ان حجاجِ حضرموت کو الی ممثلی البلاد الاسلامیۃ کے چند نسخے دئے گئے کہ وہ باری باری پڑھ لیں ،اور الحمدللہ کہ انھوں نے واقعی پڑھا۔اور مولانا سے ملتے رہے۔حضرت رائے پوری کی فکرمندی کی یہ مثال ناقابل فراموش ہے کہ ان کو معلوم ہوا کہ حضرمی حجاج کے ٹکٹ میں کھانا داخل نہیں ہے، وہ سوکھی مچھلیاں

اور شہد اپنے ساتھ لائے ہیں اور اسی پر اکتفا کرتے ہیں۔ حضرت رائے پوری کے ایما سے آزاد صاحب علیہ الرحمہ اپنے ساتھیوں کے کھانوں میں سے وافر حصہ محفوظ کر لیتے اور نیچے (ڈک کلاس کے جس میں ہم بھی تھے) جا کر کھانا تقسیم کرتے۔

کامران جہاں کسی زمانہ میں قرنطینہ ہوا کرتا تھا، جس کی داستان مولانا عبدالماجد دریا آبادیؒ نے اپنے سفر نامہ میں بیان کی ہے، جس کو پڑھ کر رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں جہاں ہزاروں حجاج کی اب بھی قبریں ہیں۔ وہاں موٹر لانچ پر سوار ہو کر مولانا اور ان کے ہمراہی خدام کسی صاحب کے آفس میں گئے تھے۔ اور پہلی بار سرزمین عرب پر قدم رکھا تھا اور فنجانوں میں سادہ چائے پینے کا اتفاق ہوا۔ وہ جگہ جہاں مولانا تشریف لے گئے تھے معلوم نہیں کس کا آفس تھا (۱) حافظہ میں اس کمرہ کا نقشہ ہے اور کوئی گفتگو یاد نہیں ہے۔

حج سے فراغت کے بعد مولانا حضرت رائے پوری کے ساتھ مدینہ منورہ تشریف لے گئے تھے۔ اور ہم لوگ مدرسہ صولتیہ میں مقیم تھے۔ محرم سے مدرسہ میں تعلیم شروع ہو گئی تو چھوٹی رباط بھوپال میں مولانا معین اللہ صاحب کا کمرہ تھا اس میں ہم لوگ آ گئے۔ ادھر بھوپال کے کسی بڑے عہدیدار کی کوشش سے بڑی رباط بھوپال میں دو کمرے مولانا اور آپ کے رفقاء کو مل گئے۔ مولانا کا کمرہ دوسری منزل میں تھا۔ اور گراؤنڈ فلور میں ایک وسیع کمرہ ہم چار ساتھیوں کا تھا۔

رباط بھوپال میں قیام کے زمانہ میں جہاں ساڑھے چار ماہ کے قریب مولانا کا قیام رہا (ہم لوگ سال بھر رہے) اس زمانہ میں متعدد واقعات پیش آئے۔

۱- بستان بخاری کا اجتماع استاذ احمد عبدالغفور عطار مرحوم نے منعقد کیا تھا۔

---

(۱) بعد میں کاروان زندگی جلد اول میں اس سفر کی روداد بیان کرتے ہوئے مولانا نے کامران میں اترنے کا ذکر فرمایا ہے اور معلوم ہوا کہ وہ دفتر قاضی شہر کا تھا۔

انھوں نے اس وقت کے مکہ مکرمہ کے ممتاز ترین نوجوان ادباء اور اہل قلم کو جمع کرلیا تھا۔ ایک ہندوستانی عالم دین کے لئے پہلا موقع تھا کہ وہ خالص عرب ادباء اور اہل علم کے مجمع میں مہمان خصوصی کی حیثیت سے شرکت کرے اور یہ سب ان کی بات سنیں۔ اس سے پہلے اور بعد میں کسی عالم کو اگر موقع ملا تو صرف یہاں تک کہ وہ کسی ایک اہل علم سے مل لیں، یا حرم شریف کے اندر کسی ہندوستانی حلقہ یا تبلیغی حلقہ میں تقریر کرلیں، مگر یہ کہ وہاں کے ادباء مل کر کسی ہندی عالم کے اعزاز میں جمع ہوں، یہ نادر واقعہ تھا، اور اس واقعہ کے بعد بھی اب تک میں نے نہیں سنا ہے کہ کسی ہندی عالم کو وہاں کے چیدہ ادباء اور اہل قلم دعوت دیں۔ ہاں یہاں کے لوگ جو ملازمتوں یا تجارتوں کے سلسلہ میں مقیم ہیں اپنی زبان کے کسی شاعر (جگر صاحب مرحوم) یا کسی اعلیٰ مرتبت مشہور شخصیت جیسے ڈاکٹر ذاکر حسین صاحب کے لئے علی گڑھ کے طلبائے قدیم نے اعزازی دعوت کی تھی، مگر اس اجتماع میں جو لوگ شریک تھے سب حکومت کے کسی شعبے میں اعلیٰ عہدہ دار تھے۔ اور سب ہی اپنی تصنیفات یا عہدہ کی وجہ سے مشہور ہوئے (۱) خاص بات یہ کہ جو حضرت بھی اس جلسہ میں شریک تھے وہ مولانا سے عقیدت ومحبت کا زندگی بھر دم بھرتے رہے، ان میں ایک صاحب کچھ ضرورت سے زیادہ آزاد خیال تھے۔ الاستاذ سید علی حسن فدعق مرحوم سابق میئر جدہ (۲) وہ تو گویا نئے سرے سے اسلام لائے اور قرآن کریم پر ان کا ایمان پہلے موروثی تھا اب حقیقی بن گیا، ان کی محبت کا یہ عالم تھا کہ مشرق بعید کے ایک

---

(۱) اس میں استثناء علامہ عبدالعزیز راجکوٹی کا ہے، شام میں ان کی پذیرائی اس طرح ہوئی تھی کہ یونیورسٹی کے اساتذہ اور ادبی اکیڈمی کے ذمہ دار شاگردوں کی طرح آکر ملے تھے۔

(۲) سید علی حسن فدعق، ملک کے ایک سربرآوردہ ادیب اور صحافی تھے، عراق میں کلیۃ الھندسۃ سے گریجویشن کیا تھا، نئی تعلیم کے اثر سے کچھ آزاد خیال تھے، مگر بعد میں خصوصاً مولانا سے تعلق قائم ہونے کے بعد دینی رنگ غالب ہوگیا، جدہ کے میئر بھی تھے، ۱۹۹۷ء میں انتقال ہوا۔

سفر سے واپسی میں بمبئی پہونچے تو اپنے وطن (حجاز) جانے سے پہلے لکھنؤ (بذریعہ ٹرین) آئے۔ اور مرتے دم تک مولانا سے عقیدت کا دم بھرتے رہے۔ استاذ احمد عبدالغفور عطار(۱) الاستاذ محسن احمد باروم(۲) (جو دو مرتبہ لکھنؤ آچکے ہیں) الاستاذ عبدالقدوس انصاری (۳) استاذ حسین عرب (سابق وزیر حج) غرض کوئی ایسا نہیں ہے جو اس وقت محب ومعتقد نہ ہو گیا ہو اور آخر تک نہ رہا ہو۔ مولانا کو تو شبہ تھا کہ معلوم نہیں اس روز کی گفتگو کا انھوں نے کیا اثر لیا ہے مگر حقیقت یہ ہے کہ یہ انتظام خداوندی تھا کہ اس وقت کے نمایاں ابھرتے ہوئے جوانوں کو مولانا کی طرف مائل کر دیا۔ اور یہ حضرت جو اپنا ایک خاص اجتماعی ومعاشرتی معیار رکھتے تھے ان کو "تبلیغی دورے" پر نکالنا مولانا کی روحانی قوت تھی۔ یہ تمام حضرات خالص ہندوستانی مبلغوں کے طریقہ پر "وادی فاطمہ" ایک شب وروز کے لئے تبلیغ کے لئے نکلے۔ سب مصر کے پڑھے ہوئے تھے، صرف سید علی فدعق نے بغداد میں تعلیم حاصل کی تھی، علی فدعق صاحب نے اپنے سیاحت نامہ میں مولانا سے تعلق ومحبت کا ذکر

---

(۱) الاستاذ احمد عبدالغفور عطار، تاریخ، اجتماعیات اور ادب کی متعدد کتابوں کے مصنف تھے، عربی بہت سلجھی ہوئی اور ادیبانہ طرز بیان کی لکھتے تھے، عباس محمود العقاد کے حلقۂ فکر کے ادیب تھے، انہوں نے ملک عبدالعزیز بانی سعودی عرب کی سوانح میں سات جلدیں لکھیں ہیں۔ ایک روز نامہ 'عکاظ' سے نکالا تھا جو اب بھی نکلتا ہے اور اس کے بانی کی حیثیت سے ان کا نام اب بھی چھپتا ہے۔ حضرت کا سب سے پہلا تعارف ایک ریڈیو پر ایک تقریر کی شکل میں موصوف نے کرایا تھا یہ ریڈیائی تقریر میں نے ترجمہ کے ساتھ مولانا مشاد علی قاسمی کو پیش کردی تھی جس کو انھوں نے اپنی کتاب میں شائع کیا ہے۔ مولانا کے تعارف میں ریڈیو پر ان کی تقریر ایک یادگار مضمون ہے۔

(۲) المربی الکبیر استاذ محسن احمد باروم (پیدائش ۱۹۲۷ء) ماہر تعلیم ادیب ہیں، کنگ عبدالعزیز یونیورسٹی کے پہلے امین عام تھے اور تعلیم کے میدان میں ان کے بڑے کارنامے ہیں، اسکولوں کے انسپکٹر بھی رہ چکے ہیں۔ حضرموت میں آباد ہونے والے سادات میں ہیں۔

(۳) استاذ عبدالقدوس انصاری ایک قدیم صحافی اور ادیب ومؤرخ تھے، جدہ کی مکمل تاریخ انہوں نے لکھی ہے المنهل نامی رسالہ نکالا کرتے تھے جو اب بھی ان کے فرزند استاذ نبیہ انصاری نکالتے ہیں

بہت احترام کے ساتھ کیا ہے، سید محسن باروم بھی اپنی خودنوشت قسط وار مجلۃ ''العربی'' میں لکھ رہے ہیں، اس میں مولانا کا ذکر اس طرح کیا ہے ''اللہ نے میرے ساتھ لطف وکرم کا یہ معاملہ کیا کہ شیخ ابوالحسن تک میری رسائی ہوگئی''۔ سید محمود حافظ مرحوم اس درجہ متاثر ہوئے کہ اپنے بڑے لڑکے محمد الحافظ کو لے کر لکھنؤ آئے اور مولانا کی خدمت میں رکھ کر چلے گئے۔

مولانا نے مکہ مکرمہ کے عرصہ قیام میں ایک طویل مضمون لکھا کہ ''اسلامی ممالک میں تعلیم کا نظام کیا ہونا چاہئے؟'' عربی میں اس کا عنوان تھا (کیف توجه المعارف فی الاقطار الاسلامیة) اس زمانہ میں مکہ مکرمہ سے صرف ایک اخبار ''البلاد السعودیة'' ہفتہ میں دوروز نکلا کرتا تھا، (علاوہ سرکاری گزٹ ام القریٰ، جو ہر جمعہ کو نکلتا تھا اور اب بھی نکلتا ہے) اس کے اڈیٹر عبداللہ عریف تھے، جو بعد میں مکہ مکرمہ کے میئر ہوئے، اسی اخبار میں بالاقساط یہ مضمون پہلے صفحہ پر شائع ہوا۔ اس کو کتابی شکل میں اس وقت کے امام حرم شیخ عبدالمہیمن علیہ الرحمہ (مصری) نے اپنے خرچ پر شائع کیا۔ اس کی دوسری اشاعت بغداد میں الحاج طٰہٰ فیاض نے اپنے ادارہ کی طرف سے کی، تیسری اشاعت مصر سے جمعیۃ الشباب المسلم نے کی۔ پھر مجلس تحقیقات ونشریات اسلام لکھنؤ سے شائع ہوئی۔ مکہ مکرمہ، بغداد، قاہرہ سے اس کی اشاعت سے اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ مولانا کا تعلیم کے سلسلہ میں نظریہ اور پلاننگ کو عرب علماء اور دانشوروں نے کس نظر سے دیکھا۔

تیسری اہم بات یہ پیش آئی کہ مولانا کی شہرہ آفاق کتاب ''ماذا خسر العالم بانحطاط المسلمین'' (انسانی دنیا پر مسلمانوں کے عروج وزوال کا اثر) چھپ کر آگئی اور اس کا پارسل اسی رباط میں ملا، اور خاص خاص افراد کو مولانا نے ہدیۃً یہیں بیٹھ کر تقسیم کیا۔ پارسل آنے سے پہلے مولانا کو یہ کتاب جدہ میں استاذ جواد

مرابط (سفیر شام، جدہ) نے دکھائی تھی، اس کتاب کا مولانا کو بے چینی سے انتظار تھا۔ مولانا نے کاروان زندگی میں اس کا ذکر فرمایا ہے، ہم بھی اہم تصنیفات کے ضمن میں اس کا ذکر کریں گے۔

قیام مکہ مکرمہ کی اہم مشغولیات میں سعودی ریڈیوں کی تقاریر بھی ہیں۔ اس کی تقریب یہ ہوئی تھی کہ بستان بخاری کی تاریخی دعوت (جس کا اوپر ذکر ہو چکا ہے) کے بعد آپ کے مخلصین نے شیخ محمد سرور الصبانؒ سے ملایا جو اس وقت ہسپتال میں زیر علاج تھے، اور محکمہ اطلاعات کے سربراہ تھے (اس وقت تک سعودی عرب میں صرف ایک وزارت، وزارت المالیہ تھی دوسری منسٹری تعلیم کے محکمہ کو ترقی دے کر بنائی گئی جس کے پہلے وزیر موجودہ خادم الحرمین ملک فہد تھے) شیخ محمد سرور الصبان مملکت کے عین الاعیان میں تھے۔ بعد میں رابطہ عالم اسلامی کی تاسیس ہوئی تو اس کے سکریٹری جنرل بنائے گئے۔ شیخ محمد سرور الصبان نے آپ سے ریڈیو پر چند تقریریں براڈ کاسٹ کرانے کا مطالبہ کیا۔ استاذ سید محسن باروم جو آج مولانا کے مخلص ترین احباب اور قدر دانوں میں ہیں جن کو ہندوستانی اصطلاح میں معتقد کہا جاسکتا ہے۔ اس وقت سعودی ریڈیو سے وابستہ تھے۔

آپ کی پہلی تقریر کا عنوان تھا ''عالم کا پیام جزیرۂ عرب کے نام'' اس خطاب میں عام بشریت جزیرۂ عرب سے فریاد کر رہا ہے کہ تو نے اے جزیرے پٹرول دے کر ہماری مشینوں اور جہازوں اور کارخانوں کے چلانے کا سامان کر دیا تیرا بہت شکریہ۔ مگر دنیا کو تجھ سے زیادہ امیدیں وابستہ تھیں، ہمیں رحمت کا وہ جھونکا چاہئے جو کبھی تیرے دیار سے دنیا کو نصیب ہوا تھا۔ اس تقریر کا ایک بلیغ اور دردانگیز جملہ یہ تھا ''جودی علینا نفحة من نفحات سیدنا محمد ﷺ (اے جزیرہ! ہمیں بس ایک جھونکا بخش دے جو سیدنا محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی رسالت سے نکلا

ہے) دنیا کو اس عدل کی ضرورت ہے، اس وسعت کی ضرورت ہے جس سے اسلام نے دنیا کو روشناس کرایا تھا۔ آج کی دنیا نفس پرستی، جاہ پرستی، اور مال پرستی میں مبتلا ہے، بڑی مچھلیاں چھوٹی مچھلیوں کو نگل رہی ہیں۔ عدل اور مساوات وغیرہ صرف کھوکھلے الفاظ ہیں جن کے اندر کوئی معنی نہیں ہے۔ صرف اسلام نے دنیا کو بتایا تھا کہ مساوات کیا چیز ہے اور امانت کس کو کہتے ہیں، اور انسانوں کے حقوق کیا ہیں۔ اسی مضمون کو شرح وبسط سے بیان کیا گیا تھا۔

اس کا جواب جزیرۂ عرب نے دنیا کو کیا دیا ''من العالم الی جزیرة العرب'' جزیرہ عرب دنیا سے کہہ رہا ہے کہ اے دنیا! تو نے میرا کب لحاظ خیال کیا، مجھ کو تمدن سے دور ہونے کا طعنہ دیتے رہے اور کہتے رہے کہ اونٹوں کے چرواہے، ریگستانوں کے رہنے والے، بولنے میں ماہر، علوم وفلسفہ اور تہذیب وتمدن سے ناواقف۔

اور خطا معاف! پیغمبروں کی دعوت کو ہم نے سینے سے لگائے رکھا تم نے ضائع کیا، تمہارے دلوں کی انگیٹھیاں سرد پڑ گئیں، ایمان کا شعلہ بجھ گیا، اور تو نے میری طرف دین کے لئے نہیں دنیا کے لیے اب توجہ کی ہے، تم کو آج پٹرول کی مہک نے متوجہ کیا ہے، دین کی خاطر اور دین کی ثروت بڑھانے تم کب آئے؟

یہ ایک انوکھے انداز کی تقریر تھی۔ جس میں غیر اسلامی فکر پر بھرپور تنقید تھی اور اپنی بات بھی بے کم وکاست کہہ دی، اس ممتاز طریق بیان نے لوگوں کے اندر ایک حرکت اور حس پیدا کر دی۔

اس کے علاوہ جو کتابیں یا رسائل تھے جنھیں عام طور پر پسند کیا گیا اور ایک نے دوسرے کو پڑھ کر سنایا۔ اس کے بعض چبھتے ہوئے فقرے مزے لے لے کر عرب ادباء نے دہرائے۔ اس نے انداز فکر کو بدلنے میں اہم رول ادا کیا۔ مسلمانوں

کو جو اپنی ذات اور اپنے دین سے مایوسی ہو رہی تھی ان کے اندر امنگ اور حوصلہ کی لہر دوڑا دی۔ ان مقالات میں سے کچھ اردو میں لکھے گئے تھے اور کچھ عربی میں۔ اردو میں لکھے ہوئے مقالات میں مولانا کی تقریریں تھیں، جن کا متن اردو میں تھا اور ان کے ترجمے مولانا کی نگرانی میں ہوئے، اور آپ کی نظر ثانی، حذف و اضافہ کے بعد شائع کئے گئے۔ جیسے "آنکھوں کی سوئیاں" اس کا ترجمہ "بين الانسانية و اصدقائها" خطرناک تکبر" اس کا ترجمہ "الى شاطئى االنجاة" عربی میں شائع ہوا۔(۱) اور بعض مقالات وہ ہیں جو اصلاً عربی میں لکھے گئے تھے پھر ان کا ترجمہ اردو میں ہوا جیسے "ردة و لا أبابكرلها" اور "بين الجباية و الهداية"۔ یہ مقالات کتابی شکل میں شائع ہو کر مقبول ہوئے، اور بسا اوقات ضخیم کتابوں سے زیادہ مفید ہوئے۔ کیونکہ ضخیم کتابوں کے پڑھنے کے لئے جو وقت اور سکونِ دماغی کا ماحول چاہئے وہ ہر ایک کو حاصل نہیں ہوتا، ۵۰-۶۰ ورق کے رسائل ریل پر، بس پر، پارک میں، دفتر کے خارج اوقات میں پڑھ سکتا ہے۔ چنانچہ یہ رسائل سرکاری مدارس ثانویہ اور مدرسۃ البعثات کے طلبہ اور اساتذہ نے پڑھے او متاثر ہوئے اور ایسے بھی کم نہیں تھے جنھوں نے دل پر ایک چوٹ سی محسوس کی۔

یہی چند رسائل تھے جو حج کے دوسرے سفر میں مولانا کے ساتھ تھے اچھی خاصی تعداد میں تقسیم ہوئے اور مدرسہ البعثات (جو اس وقت سب سے بڑا ثانوی مدرسہ تھا اور جہاں فارغ ہو کر یونیورسٹی کی تعلیم کے لئے طلبہ قاہرہ چلے جاتے تھے) کے طلبہ اور مصری اساتذہ نیز ائمہ حرم اور مشائخ وعلماء نے بار بار پڑھا اور دل کھول کر اعتراف کیا، جیسا کہ تجربہ ہوا کہ عربوں میں اللہ تعالیٰ نے وسعت قلبی دوسرے مشرقی ممالک کی نسبت بہت زیادہ دی ہے۔ ان مقالات (جن پر مشتمل یہ رسائل

---

(۱) اردو سے عربی ترجمہ کی سعادت اس ناچیز کو ملی تھی۔

تھے) کا مرکزی مضمون یہ تھا کہ خالص علمی انداز میں تاریخ اسلام کے حوالہ سے وہ باتیں پیش کی جائیں جن سے لوگوں کے دلوں میں اسلام کی عظمت بڑھے اور خود ان کے اندر جو احساس پسپائی ہے وہ دور ہو، اور دین کی دعوت میں ہم لوگ قائدانہ کردار ادا کریں۔

اگر اجمالاً پوچھا جائے کہ مولانا نے عربوں کو کیا دعوت دی اور کیوں دعوت دی اور ان کا مرکزی نقطہ نظر کیا تھا؟ تو اس کی وضاحت کے لئے ہم یہاں پر ایک تحریر مع تمہید کے ''کاروان زندگی'' سے نقل کرتے ہیں۔

''حجاز سے ۱۹۴۸ء میں واپس ہوا تو عربوں کو ان کی زبان میں اسلام کی طرف بازگشت کی دعوت اور عالم اسلام ہی میں نہیں انسانی دنیا میں داعیانہ وقائدانہ کردار ادا کرنے اور اپنا قدیم منصب سنبھالنے کی دعوت دل ودماغ پر چھا گئی اور اعصاب پر اس طرح مستولی اور حاوی ہوگئی کہ اسی کو اپنی زندگی کا مقصد وموضوع بنا لینے کا خیال آنے لگا، میرے اس جوش وجذبہ کا کچھ اندازہ اس خط سے ہوسکتا ہے، جو میں نے اپنے عزیز ومحترم دوست مولانا مسعود عالم ندوی کو ۶ ؍شوال ۶۸ھ (۳؍اگست ۱۹۴۹ء) کو اس وقت لکھا جب وہ عراق میں تھے اس کا ایک اقتباس یہاں پیش کیا جاتا ہے:

> دین کی تخم ریزی کے لئے اس کشتِ ویراں میں کوئی دقیقہ نہ اٹھا رکھئے، حجت تمام کر دیجئے، دن رات ایک کر دیجئے، دل کو جلائیے، اور بدن کو گھلایئے، خون دیدہ اور خون جگر بہایئے کہ دجلہ وفرات اپنی تنگ ظرفی اور کم مائیگی پر ماتم کریں، ایک ایک کا گریبان تھام کر کہئے کہ اے صحرائے عرب کے بھٹکے ہوئے آہو! اے عالم کی آبرو، اے ابراہیم علیہ السلام ومحمد صلی اللہ علیہ وسلم کی آرزو تو کہاں گم

ہے؟ کیا سیدنا عمرؓ کی دعائے نیم شبی اور آہ سحر گاہی، مثنیٰ بن حارثہؓ کے خونِ شہادت، ابوعبیدہ الثقفیؓ کی پامالی اور استخوان شکنی، سعد بن وقاصؓ کی علم برداری، علی بن ابی طالبؓ کی جگر سوزی، اشک ریزی اور خطابت وتاثیر کی طوفان خیزی، آبروئے شہیداں جگر گوشۂ رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی تشنگی اور خاندان رسالت کے خون کی ارزانی، ابوحنیفہؒ کی دماغ سوزی، احمد بن حنبلؒ کی تعزیر جرم عشق، ابن جوزیؒ کی حمایت سنت، عبدالقادر جیلانیؒ کی دردمندی کا حاصل صرف یہ ہے کہ تو ائمہ ضلالت کا ادنیٰ غاشیہ بردار اور اس کی راہ کا غبار ہے، عراق کے اس مقبرہ میں صور پھونک دیجئے، اور شور قیامت برپا کیجئے کہ۔

گرفتہ چینیاں احرام مکی خفتہ در بطحا(۱)

آج سے نصف صدی پہلے کی بات ہے، مکہ مکرمہ کے ایک ذی علم، بڑے سرکاری عہدہ دار، جواں سال ادیب شیخ عبداللہ المزروع نے ایک رجسٹر تیار کیا تھا جس میں عالم اسلام کے مشاہیر سے نوجوانان مکہ کے نام پیامات لکھایا کرتے تھے۔ ۱۳۴۳ھ سے ۱۳۸۵ھ کے درمیان حج وعمرہ کے لئے جو اہم اشخاص آئے شیخ عبداللہ المزروع نے ان کی تحریریں حاصل کیں، اس طرح ستر شخصیات کی آراء کا یہ مجموعہ تیار ہوگیا ان کے انتقال کے بعد ان کے صاحبزادے ڈاکٹر احمد عبداللہ المزروع نے اس کو مرتب کرکے آب وتاب کے ساتھ شائع کردیا ہے، اس کا نام ہے ’’وصایا اساطین الدین والادب والسیاسة‘‘ اس میں مصر وشام کے وزرائے اعظم، تیونس کے میجر جنرل، ترکی کے ایک گورنر ہیں، ادباء اور مصنفین میں عباس محمود العقاد،

(۱) کاروان زندگی جلد اول طبع دوم صفحہ۔۳۵۲

احمد امین، مصطفیٰ الرافعی، اور بھی اسی قد و قامت کے لوگ ہیں، ہندوستان کے مشاہیر میں علامہ سید سلیمان ندویؒ، علامہ عبدالعزیز میمنؒ، مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ، مولانا سید ابوالحسن علی ندوی ہیں۔ آخر الذکر کی عمر اس وقت ۴۷ سال تھی اور ان مشاہیر میں سب سے کم عمر تھے، مگر نیا گان کہن کی مجلس کی زینت اس وقت بھی آپ ہی سے تھی، آراء ہر قسم کی ہیں ایک نے اہل مکہ کو مشورہ دیا کہ وہ اپنی محنت وقوتِ بازو سے وادی غیر ذی زرع کو ہرے بھرے باغوں، گلستانوں اور گلشنوں میں بدل ڈالیں، کسی نے رائے دی کہ سائنس اور ٹکنالوجی کی راہ میں آگے بڑھیں، کسی نے کارخانے لگانے اور پیداوار بڑھانے کا مشورہ دیا، علمی مشورہ دینے والوں نے مکہ مکرمہ کے قدیم کتب خانوں کو از سر نو مرتب کرنے اور قلمی نوادر کی طرف اعتناء کی توجہ مبذول کرائی۔

مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندوی مدظلہٗ نے وہ بات کہی جو آج بھی کہہ رہے ہیں۔ اور ہمیشہ کہتے آئے ہیں۔ مصر، شام، عراق، کویت ہر جگہ ایک ہی صدا تھی جو لگاتے رہے۔

ملال عالمیاں دم بدم دگر گوں است
منم کہ مدت عمرم بیک ملال گزشت

دنیا والوں کے غم کی نوعیت لحظہ بہ لحظہ بدلتی رہتی ہے مگر میں ہوں کہ میری ساری عمر ایک ہی غم میں بیت گئی۔

تحریر خود لکھنے والے کے قلم سے لکھی ہوئی ہے ایک صفحہ پر اس کا زیراکس ہے اور مقابل کے صفحہ پر خوبصورت ٹائپ میں اس عبارت کو نقل کیا گیا ہے، حضرت مولانا کی تحریر کا ترجمہ جو اصل عبارت کا بانکپن اور اس کی دل آویزی نہیں لاسکتا ہے:

''عرب جہاں بھی ہیں اور جتنے بھی ہیں اگر سب ایک میدان

میں جمع ہو جائیں اور مجھے ان سے خطاب کا موقع ملے، میری بات وہ سن سکیں اور ان کے دلوں میں اتر سکے تو عرض کروں گا۔"

بزرگو! اسلام جس کو سیدنا محمد صلی اللہ علیہ وسلم لائے ہیں آپ کی زندگی کا سرچشمہ ہے، یہی آپ کی قوت ہے اور اسی سے آپ کی رگوں میں خون کی گردش ہے، اسی اسلام سے آپ کے وجود کی صبح صادق نمودار ہوئی، آپ دنیا میں روشناس ہوئے، نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات گرامی سے آپ کی سرفرازی ہے، اسی نام نامی کے صدقے آپ کی نبض حیات میں گرمی اور قلب میں حرارت قائم ہے، اور صرف آپ ہی نہیں بلکہ سارے عالم میں اگر خیر کا کوئی ذرہ ہے تو وہ اس ذات گرامی کا عطیہ ہے اور آپ سن لیجئے کہ اسی نسبت سے آپ کی آج بھی عزت ہے اس رسول عربی کے دامن سے وابستگی آپ کا سب سے بڑا ہنر ہے۔ اگر خدانخواستہ اس ذات اقدس سے عرب کا رشتہ ٹوٹا یا کمزور ہوا تو اس کی حیثیت ایک ایسے دریا کی ہوگی جس میں پانی نہ ہو۔ عربوں کا سب سے بڑا عروج اس میں ہے کہ وہ سیدنا محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو اپنا امام وقائد، رہبر ورہنما مان کر اسلام کو لے کر اٹھیں جیسا کہ عہد اول میں ان کے اسلاف اٹھے تھے۔ (آج بھی ضرورت ہے کہ) اسلام کی دعوت کو اپنی سب سے بڑی دولت سمجھیں، اور مظلوم انسانیت کو یورپ کے چنگل سے آزاد کرائیں، جو اپنے جہل سے انانیت میں آکر ساری دنیا کو انارکی، ویرانی اور تباہ کاری کی طرف لے جا رہا ہے۔ عرب اٹھیں اور تہذیب واخلاق کی گرتی ہوئی دیوار کو سنبھالیں دنیا کو بے

چینی، اضطراب، خودرائی اور خود پسندی کے حصار سے نکال کر امن
وسلامتی، بھائی چارگی اور محبت کے راستے پر گامزن کریں۔
عالم عرب کا یہ فرض ہے۔جس میں اگر انھوں نے کوتاہی
کی تو ان سے پرسش ہوگی، وہ سوچ لیں کہ وہ کل اللہ کو کیا منھ
دکھائیں گے، اور کیا جواب دیں گے؟؟!

اس تاریخی تحریر کا ترجمہ خاکسار راقم نے تعمیر حیات، بتاریخ ۱۰راگست ۱۹۹۸ء
میں شائع کرایا۔ جس کو ملک کے دوسرے رسائل اور حیدر آباد کے روزنامہ "سیاست"
نے ۱۹را کتوبر ۱۹۹۸ء میں نقل کیا۔ روزنامہ سیاست میں یہ ترجمہ ایک دل آویز تمہید
کے ساتھ مولانا احمد عبد المجیب قاسمی ندوی کے قلم سے شائع ہوا ہے۔ اصل پیام کے
بعد مولانا موصوف نے حضرت مولانا کے عربوں سے تعلقات پر روشنی ڈالی ہے، وہ
اس لائق ہے کہ یہاں نقل کر دیا جائے۔

"اس میں شک کوئی نہیں کہ مفکر اسلام حضرت مولانا سید
ابوالحسن علی ندوی، ایک جہاں دیدہ اور باخبر عالم ربانی، باکمال
مصنف، ممتاز مؤرخ، مخلص مفکر اور دردمند داعی کی حیثیت سے
پوری اسلامی دنیا میں مقبول ومتعارف ہیں۔ انھوں نے اسلامی
فکر ودعوت کی اشاعت اور عالم اسلام، خصوصیت کے ساتھ عالم
عربی میں دینی وملی غیرت اور ایمانی حمیت پیدا کرنے کے لئے
اپنے قلم اور قدم کے ذریعہ جو سعی پیہم اور جہد مسلسل کی ہے، وہ اس
صدی کی تاریخ دعوت وعزیمت کا ایک روشن حصہ ہے، حقیقت
پسندی صاف گوئی، اور جرأت وبیباکی کے ساتھ وہ عربوں کو
اپنے مقصد حقیقی کو پہنچاننے اور اپنے مقام ومنصب اور عالم

(۱) اشارہ "عرب قومیت" کی طرف تھا جس کی تفصیل آگے آئے گی۔

انسانیت کے تئیں اپنی وسیع تر ذمہ داری محسوس کرنے کی مسلسل دعوت دیتے آرہے ہیں، انھوں نے ہمیشہ جہاں عربوں کی عالی ظرفی، طبعی شرافت، کریم النفسی، اخوت دینی اور حمیت اسلامی کو خراج تحسین پیش کیا، وہیں ان کی بنیادی کمزوریوں، رہنماؤں کی خامیوں او رکوتاہیوں پر آزادانہ اور تلخ تنقیدیں بھی کی ہیں، بے شمار مقالات ومضامین تحریر فرمائے۔اس سلسلہ کی ایک نہایت معرکۃ الآراء اور شہرہ آفاق کتاب ''ماذا خسر العالم'' (انسانی دنیا پر مسلمانوں کے عروج وزوال کا اثر) میں تو انھوں نے اپنے دل کا سوز اور اپنی فکر کا ساز بلکہ اپنا جگر نکال کر رکھ دیا ہے، خطابت وتحریر اور زبان وقلم کے ذریعہ انھوں نے عربوں کو للکارا، خطرات سے آگاہ کیا، بلکہ خون کے آنسو روئے، ایمانی قوت وطاقت کے حقیقی سرچشموں قرآن وحدیث کے گہرے مطالعہ اور اسلامی تاریخ کی وسیع معلومات کے تناظر مین عالم اسلامی وعربی میں زندگی کی نئی روح پھونکی، اور اس میں غیر متزلزل یقین واعتماد پیدا کرنے کی سعی بلیغ کی ہے۔''

چونکہ مولانا کی تعلیم وتربیت عرب اساتذہ کے ماتحت ہوئی اور دعوت دین کے سلسلہ میں مشرق وسطی اور پوری عرب دنیا کی سیاحت کے مواقع حاصل ہوئے، اس لحاظ سے وہاں کی تحریکات، رجحانات، مکاتب فکر، زعماء وقائدین اور اہم علمی وفکری شخصیات سے پورے طور پر واقف ہیں، بلکہ اگر یہ کہا جائے تو شاید مبالغہ نہ ہوگا کہ عالم عربی، اس کے مسائل اور خطرات اور عربوں کے فطری محاسن، خداداد کمالات اور قومی خصائص سے ان کی واقفیت، خود عربوں کے مقابلہ میں بڑھی ہوئی

ہے۔ اُسے حکمت الٰہی کی کرشمہ سازی کہئے یا مولانا کی باکرامت شخصیت کی سحرانگیزی کہ عالم عربی میں ان کے خطابات اور تحریروں کی غیر معمولی پذیرائی ہوئی، بلکہ اسلامی بیداری کی ایک لہر پیدا کردی۔ وہاں کے علماء اور اصحاب نظر نے ہمیشہ مولانا کی جلالت علمی، حکمت اسلامی، اور فراست ایمانی کا نہ صرف اعتراف کیا، بلکہ بھرپور خراج عقیدت و تحسین پیش کیا ہے، ایک موقع پر مولانا نے عالم عربی و اسلامی سے اپنے ایمانی رشتہ، دعوتی تعلق اور جذباتی وابستگی کا ان الفاظ میں اظہار کیا ہے:

"میں نہ عربی دنیا سے بیگانہ اور اجنبی ہوں، نہ میری معلومات سکینڈ ہینڈ ہیں، اور نہ میں نے عرب رہنماؤں پر تنقید کا کام اور عربوں کی زندگی کے احتساب کا فریضہ، ان کے مصائب اور ان کی ناکامیوں کے اسباب پر بحث کا سلسلہ صرف عرب واسرائیل کی اس جنگ کے موقع پر شروع کیا ہے، اور نہ میں اچانک دبے وقت اس میدان میں آگیا ہوں، میں اپنے کو ایک مسلمان کے رشتہ سے بھی اور عربی ثقافت کے ناطے سے بھی، اس وسیع و عظیم عرب خاندان کا جو مراکش سے بغداد تک پھیلا ہوا ہے، ایک فرد سمجھتا ہوں، میں ان کے دکھ سکھ میں شریک ہوں، میری قسمت ان کی قسمت سے وابستہ ہے، ان کی عزت سے میری عزت اور ان کی ذلت سے میری ذلت ہے، میرے تخیلات کی دنیا، میری تمناؤں کا مرکز، میرے طائر روح کا حقیقی نشیمن، عرب کی محبوب سرزمین، اس کی زبان وادب اور اس کی تہذیب وثقافت رہی ہے، عربی دنیا کے اس پورے اثاثے اور سرمایہ پر میرا حق کسی طٰہٰ حسین، کسی عقاد، کسی احمد امین یا کسی کرد علی سے کم نہیں، میرا

خمیر اور میرا آب وگل ہندوستان کی سرزمین سے ہے مجھے اس کا اعتراف بھی ہے، اس پر فخر بھی، لیکن میں نے اردو سے زیادہ عربی زبان کو اپنے اظہار خیال کا ذریعہ بنایا ہے، اور مجھے اقبالؔ کے الفاظ میں یہ دعویٰ کرنے کا حق ہے کہ

میرا ساز گرچہ ستم رسیدہ زخم ہائے عجم رہا
وہ شہید ذوق وفا ہوں میں کہ نوا مری عربی رہی"

مولانا ہمیشہ یہ صدا لگاتے رہے ہیں کہ عالم عرب کا مستقبل، اسلام کے مستقبل سے وابستہ ہے، عربوں کی ذلت وعزت، اسلام کی ذلت وعزت ہے، وہ اسلام کا راس المال ہے، اور اس کی اشاعت وترقی کا سرچشمہ ہیں، عرب اٹھیں اور قیادت وہدایت کے دیرینہ منصب ومقام کی طرف پلٹ آئیں، انسانیت کی سعادت وکامرانی کے لئے جو بے نظیر جدوجہد اور بے مثال قربانیوں کا نقش عربوں نے چھوڑا ہے، آج اسے تازہ اور زندہ کرنے کی ضرورت ہے، جون ۱۹۶۷ء کی عرب اسرائیل جنگ، پھر اس کے نتیجہ میں یہودیوں کا تسلط اور قبلہ اولیٰ پر ان کا غاصبانہ قبضہ، یقیناً انتہائی جاں گداز اور روح فرسا حادثہ تھا، اس موقع پر مولانا نے عالم عربی میں جو پر جوش اور ولولہ انگیز تقریریں کیں وہ آج بھی ایمانی جذبات کو ابھارتی ہیں، اسی زمانہ میں مکہ مکرمہ میں وہاں کے سربرآوردہ حضرات ادیبوں، صحافیوں اور تعلیم یافتہ نوجوانوں پر مشتمل ایک اجتماع میں تقریر کرتے ہوئے انھوں نے عربوں میں ایمان ویقین کا صور پھونک دیا، برجستہ اور فصاحت وبلاغت سے معمور تقریر کا ایک حصہ یہ تھا:

"اے اہل عرب اے اہل مکہ اور اے خادمان حرم! آپ نے اپنے ہاتھوں سے اس مقدس گھر کو بنایا تھا کہ ہر گھر سے اونچا ہو جائے، اور ہر صنم وہیکل سے بلند دکھائی دے، آپ کے لئے کیسے

جائز ہوسکتا ہے کہ پھر ان نا قابل ذکر بتوں کا سہارا لیں(۱) یہیں سے عالم انسانیت کی آواز اٹھی، جس نے امتیازات کے بتوں کو توڑ کر اور نسلی، وطنی، غلامی کے طوق وسلاسل کو کاٹ کر رکھ دیا، جس نے تاریخ کا رخ پھیر دیا، جس نے حوادث کا منھ موڑ دیا، یہیں سے روشنی کی وہ کرن پھوٹی جو دنیا میں پھیل گئی اور جس نے انسانیت کے تن مردہ میں روح زندگی دوڑا دی، میں آپ سے رحم کی اپیل کرتا ہوں کہ ہمیں اپنے ملکوں میں رسوا نہ کریں، آپ ہماری مدد نہیں کر سکتے تو ہمیں کمزور بھی مت بنایئے، ہمارے اسلام پر اعتماد، اپنی اسلامیت پر اطمینان اور تاریخ اسلامی پر فخر کے مواقع سے مت روکیے، ہمارے اس پرانے یقین کو دھچکا نہ لگایئے کہ آپ نے قوموں کو جہالت کی بوجھل زنجیروں سے چھڑایا تھا، اے اہل عرب اور اے مصری وشامی زعماء! ان مسلمانوں پر رحم کرو جو جاہلیت سے منھ موڑ کر اسلام وقرآن کو سب کچھ سمجھتے ہیں، آپ نے انھیں مومن قوم بنایا تھا، اور شجر وحجر کی پرستش سے بچایا تھا، اور ایشیاء وافریقہ کی قومیں آج بھی منتظر ہیں، بھوکی پیاسی، انسانیت زبان حال سے "افیضو علینا من الماء اومما رزقکم الله" کی صدا لگا رہی ہے، کہ محمدؐ کے خوان کرم سے ہمیں بھی کچھ دے دو۔ اہل عجم سے تو اس معاملہ میں آپ پیچھے نہ رہیں، آپ سے تو اس رسولؐ کا قومی، وطنی، لسانی، اور تہذیبی بلکہ خون کا رشتہ بھی ہے، آپ ہم ہندوستانیوں کو دیکھیں کہ محمدؐ کے نام نامی پر ہمارے جذبات بے اختیار ہو جاتے ہیں، روح

---

(۱) اشارہ "عرب قومیت" کی طرف تھا جس کی تفصیل آگے آئے گی۔

جھوم اٹھتی ہے، اور آتش شوق تیز تر ہو جاتی ہے، ترکوں کے لئے یہ نام ایک ایسا سحر انگیز کیف رکھتا ہے جو دوسرے کسی لیڈر کے لئے نہیں پایا جاتا، محمد صلی اللہ علیہ وسلم کا نام لے کر ترکوں کو تم خرید سکتے ہو، انھیں غلام بنا سکتے ہو، اسلام کا نام لے کر تو دیکھو کہ کس طرح ہم ہندوستانی بھی سر آنکھوں کے بل، ہر دور دراز مقام سے آج بھی آنے کو تیار ہیں۔ خدا کی قسم دنیا کی کسی تاریخ نے اس سے بڑھ کر قوت کا سرچشمہ نہیں دیکھا، کل تک یورپ اس قوت سے تھر تھر کانپتا تھا، لیکن آج وہ خراٹے کی نیند سو رہا ہے۔ حضرت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے الفاظ میں کہوں گا کہ ''المحيا محياكم والممات مماتكم'' اگر یہ خدائی رابطہ نہ ہوتا تو ہماری تاریخ آپ کی تاریخ سے مختلف ہوتی، اسلام ہی کے رشتہ میں ہم دونوں بندھے ہیں، وہی اسلام جہاں ہم دونوں عہد وفا نبھانا چاہتے ہیں، وہی اسلام جس کے لئے ہماری آرزو ہے کہ آپ از سر نو اس کی قیادت، اور اس کے سہارے دنیا کی امامت کا کارِ عظیم سنبھالیں، مجھے امید ہے کہ آپ اس تلخ گوئی کو معاف کریں گے، اس لئے کہ یہ صرف اخلاص کا نتیجہ ہے۔

چمن میں تلخ نوائی مری گوارا کر
کہ زہر بھی کبھی کرتا ہے کارِ تریاقی (۱)

اس ''پیام بنام نوجوانانِ مکہ'' کے علاوہ اوپر جن رسائل کا ذکر ہوا وہ بعد میں مصر سے کتابی شکل میں ایک مجموعہ مضامین (الى الاسلام من جديد) کے نام

---

(۱) عالم عربی کا المیہ صفحہ ۔۱۰۸

سے شائع ہوئے اور اب تک اس کے آٹھ ایڈیشن نکل چکے ہیں۔ جب مصر میں یہ رسائل شائع ہوئے تو علامہ ڈاکٹر احمد الشرباصی استاذ جامعہ ازہر نے ہر ایک مضمون کا خلاصہ بہت خوبصورتی سے لکھا اور ہر رسالہ کے شروع میں ان کا یہ خلاصہ مقدمہ کی شکل میں ہے اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ علماء مصر نے مولانا کے رسائل کو کس نظر سے دیکھا۔ ان مقدمات کا اردو ترجمہ یہاں پیش کیا جارہا ہے:

معقل الانسانية (انسانیت کی پناہ گاہ)

عہد رسالت سے پہلے دنیا ایک جنگل کے مانند تھی، جس میں لوگ شکار کھیلا کرتے تھے، یا ایک بازار تھا جہاں کی ہر چیز بکتی اور خریدی جاتی تھی، ہر چیز بکاؤ مال تھا، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جب اس دنیا میں تشریف لائے تو آپؐ نے زندگی کی نئی روح پھونک دی، زندگی کو اس کا مقام عطا کیا، عزت اور شرف انسانیت دیا، ایمان کے اندر معنویت پیدا کردی۔ روح اس کے تن مردہ میں ڈال دی، آسمانی ہدایت کے دروازے کھول دیئے۔ اسلام کے بغیر یہ زمین کیا تھی؟ ایک جسم تھا جس میں روح نہیں تھی، زندگی تھی مگر اس کا کوئی مقصد نہ تھا، ایک قوم تھی جس کے پاس کوئی پیغام نہ تھا، بغیر عقیدہ ویقین کے زندگی میں کیا رہ جاتا ہے، ایک لاشۂ بے گور وکفن!!

اسلام نے اپنے پیروؤں کو آگے بڑھنے کی قوت دی، جہاد کا جذبہ دیا، ایثار کا مادہ عطا کیا۔ شوق شہادت، اخلاص نیت بخشا اور ہر کام محض اللہ کی خوشنودی کے لئے کرنے کا حوصلہ دیا۔ ان خصوصیات نے ان کو سارے عالم کا نگہبان اور پہرہ دار بنادیا۔ یہ

بھیڑ اور بکریوں کو چرانے والے، اونٹوں کی رکھوالی کرنے والے، دنیا کی رکھوالی کرنے والے بن گئے۔

اگر آج بھی یہ سرپھری دنیا اور تباہ حال انسانیت چاہتی ہے کہ ان تاریکیوں سے نکل کر روشنی کی طرف آئے تو اس کو اسلام کی آواز پر کان دھرنا ہوگا۔ کیونکہ وہی اس کو تباہی کے غار سے نکال سکتا ہے۔ اسلام اس عالم میں خالق کائنات کی عطا کردہ روشنی ہے، ضرورت ہے کہ مسلمان دنیا کو تباہی کے غار سے نکالنے کے لئے کمربستہ ہو جائیں، کیونکہ وہی اور صرف وہی انسانیت کی پناہ گاہ ہے۔

المدّ والجزر فی تاریخ الاسلام (تاریخ اسلام میں اتار چڑھاؤ)

مسلمان مسلسل کیوں گرتے جارہے ہیں؟ یہ تاریخ سے پوچھئے دنیا سے دنیا کی کہانی پوچھئے۔ اہل عرب اسلام سے پہلے ذلیل وخوار تھے۔ اقوام عالم میں ان کا کوئی وزن نہیں تھا۔ اور جب اسلام آیا تو اس نے ان کو ایک باعزت فاتح قوم بنادیا۔ صاحب اقتدار، صاحب سطوت قائدین میں ان کا شمار ہونے لگا۔ مشرق مغرب میں انھوں نے اسلام کا علم لہرایا۔ دنیا حیرت زدہ ہوکر دیکھنے لگی کہ اتنی حقیر مقدار زادِ راہ کی، اتنے معمولی سے ہتھیار، اتنی معمولی تعداد کے نہتے لوگ نبرد آزما ہوگئے ان سے جن کی تعداد بے شمار اور جن کے اسلحے نئے اور تیز سے تیز تر، کم سے کم وقت اور بڑی سے بڑی طاقت سے مقابلہ، وہ فتح یاب ہوئے اس لئے کہ ان کے پاس ایمان کا وہ ہتھیار تھا، دوسرے جس سے

محروم تھے، دنیا کی ان کی نگاہ میں کوئی قیمت نہ تھی، جان کی انھیں پروانہ تھی، گھرانہ کی ان کو فکر نہ تھی کہ آخرت کی زندگی ان کی پیش نظر تھی۔ وہاں کی نعمتوں کے مقابلہ میں ساری دنیا ہیچ معلوم ہورہی تھی۔ شہادت کا شوق ان کے دل ودماغ پر حاوی تھا۔

مسلمانوں کی ساکھ اس دن سے گری ہے جب سے وہ ایمانی قوت سے محروم ہوگئے، جہاد اور شہادت کا شوق ان کے دلوں سے نکل گیا۔ طبیعت بجھ گئی، دماغ شل ہوگیا، سوائے ہوس کے ان کے پاس کچھ رہا نہیں تو پھر سنت الٰہی کا پورا ہونا بھی ضروری تھا۔

بين الصورة والحقيقة (صورت وحقیقت) (۱)

اگر روح نہیں ہے تو جسم ایک لاشۂ بے جان ہے۔ قلمی تصویر بغیر حقیقت کے وہم اور دھوکہ ہے، یا سایہ ہے جو کوئی فائدہ نہیں دے سکتا، زندگی کی بہت سی حقیقتیں آج نگاہوں سے اس لئے اوجھل ہیں کہ ان کی بڑی بڑی تصویروں نے اصل کو نگاہوں سے روپوش کردیا ہے۔ اسلام کے اصلی چہرہ اور اس کی ابدی حقیقت سے ہم اس لئے نابلد ہیں کہ ہم نے اس کے نقش ونگار دیکھے ہیں، اس کی حقیقت نہیں دیکھی ہے۔

آج ہمیں ضرورت ہے کہ اس کی اصل شکل دیکھیں، اس کی روح کو سمجھیں اور اس پر عمل پیرا ہوں۔ اے عصر حاضر کے مسلمانو! اسلام کی حقیقت کو اپنا کر، ظاہرداری اور شکل پرستی کے

---

(۱) اس مقالہ کا ترجمہ اردو سے عربی میں مولانا کے برادرزادہ مولانا محمد الحسنی مرحوم نے اس وقت کیا تھا جبکہ ان کی عمر صرف ۱۳ سال کی تھی، این خانہ ہمہ آفتاب است

حصار سے باہر نکل آؤ، دل کی خالص نیت، عمل سے اس کا اظہار کرو، عزم وارادہ سے آئندہ کا نقشہ عمل بناؤ، شکل اور تصویر کو حقیقت مت سمجھو، تاکہ اللہ تبارک وتعالیٰ کی مرضی کے مطابق زندگی گزار سکو۔

الی شاطئ النجاۃ (۱)

خدا غارت کرے اندھی عصبیت کو جہاں بھی ہو اور جس شکل میں ہو اور لعنت ہو جھوٹے گھمنڈ کو خواہ کوئی بھی کرے۔ مثال کے طور پر یونان کو لیجئے، جو اپنے شعر وفن میں مست، اپنے فلسفہ میں مگن، دعوت حق قبول کرنے سے روگرداں تھا، ہدایت کی راہ جو مشرق اور جنوب سے پیغمبروں نے دکھلائی اس سے اعراض کیا، نتیجہ یہ ہوا کہ یونان کو اس شعر وفلسفہ نے نجات کی راہ نہیں دکھلائی۔ اور وہ اپنے خودساختہ فلسفہ اور عیش وعشرت میں دفن ہو کر رہ گئے، یہی حال ہر متکبر کا ہوتا ہے جو ہدایت کی روشنی سے اس لئے آنکھیں بند کرلیتا ہے کہ ہدایت دینے والا دوسرے ملک کا ہے اور مال ودولت اپنے پاس نہیں رکھتا۔

اللہ نے صحرانشینوں سے یہ کام لیا کہ وہ رسول خدا کی اتباع کرکے دنیا میں سرفراز ہوں اور دنیا کو تباہی کے غار سے بچانے کی کوشش کریں، جس نے ان کی بات مانی اس نے نجات پائی اور جس نے تکبر وتمرد کی راہ اختیار کی ذلیل ہوا اور ہلاک ہوا۔ کشتیٔ نجات آج بھی موجود ہے کوئی نجات کا طالب ہو تو آگے بڑھے۔

(۱) اصل مضمون اُردو میں تھا اور رسالہ تعمیر شائع کردہ ادارۂ تعلیمات اسلام لکھنؤ میں چھپا تھا۔

من غار حرا (۱)

غارِ حرا جہاں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے تنہائی میں عبادتیں کیں، اور خالق کائنات سے اپنا رشتہ جوڑا۔ جہاں پہلی وحی نازل ہوئی، جہاں سے وہ روشنی نکلی جس کا اجالا چہار دانگ عالم میں پھیلا۔ جہاں سے انسان کے ہاتھ میں وہ کلید آ گئی، جس سے خرد کے تمام دروازے جو بند تھے کھل گئے۔ جہاں سے بشریت کو تاج قبولیت ملا، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جہاں سے انسانیت کو اللہ کا آخری پیغام دیا

آج جب کہ تمام راستے پھر بند ہو گئے ہیں، تاریکیاں تہہ بہ تہہ پھیل گئی ہیں، ان کو پھر اسی روشنی کی ضرورت ہے جو اس غار سے نکلی تھی۔ خیر وصداقت کے دروازوں کو پھر اسی کلید کی ضرورت ہے جس سے وہ دروازے کھل جائیں جن کو معصیت وانکار نے بند کر رکھا ہے۔ وہ کلید صرف اسی جگہ سے پہلے ملی تھی اور ہر زمانہ میں وہیں سے مل سکتی ہے۔

اسی در سے دکھی انسانیت کو دوا مل سکتی ہے۔ یہیں سے وہ یدِ بیضاء مل سکتا ہے جو اندھیروں میں روشنی پیدا کرے، صاحب غارِ حرا کے طریق عمل کے سوا آج دنیا کو وہ کلید نہیں مل سکتی جس سے امن وسلامتی کے بند دروازے کھل سکیں۔

بين الانسانية وأصدقائها

یہ اردو کی ایک تقریر تھی جس کو مقالہ کی شکل میں مصنف مدظلہٗ نے قلم بند

---

(۱) اصل مضمون عربی میں لکھا گیا تھا۔

فرمایا۔اوراس کا اردوعنوان تھا''آنکھوں کی سوئیاں''عربی ترجمہ سید محمد رابع الحسنی ندوی کے قلم سے ہے،اس کا لب لباب ڈاکٹر احمد شرباصی نے ان الفاظ میں پیش کیا ہے:

''بشریت کے سب سے بڑے اور خطرناک دشمن وہ ہیں جو دل سے اسلام کے دشمن ہیں اور ظاہر داری کے طور پر اسلام کی حمایت کرتے ہیں۔اسلام کے لئے اپنے دسترخوان کے ٹکڑے اور غریبوں کے لئے پھٹے چٹے کپڑے دیتے ہیں،اور اس سے اس کی بہترین کمائی اور اعلیٰ ترین ثروت چھین کر اپنے خزانے بھرتے ہیں۔ اور اکثر ایسا ہوتا ہے کہ شہد میں زہر ڈال کر دیتے ہیں۔خدا کی پناہ ان ظالم لٹیروں سے۔انسان دشمن عناصر سے جن کی بھوک کبھی ختم نہیں ہوتی ،اور ظلم وزیادتی کی ہوس پوری نہیں ہوتی ،جسم بشری کو ورم ہے جس سے روح کی لاغری نظر نہیں آتی ،سب بیماریوں کی جڑ بھی ہوس وحرص کی کثرت ہے۔

دعوتان متنافستان (دوقسم کی دعوت ،ایک دوسرے کی ضد)(۱)

''جاہلیت'' کسی ایک زمانہ کا نام نہیں ہے، جو ایک زمانہ میں نمودار ہوئی ۔اور وقت گذرنے سے ختم ہوگئی۔ جاہلیت کا یہ تصور بہت محدود ہے، حقیقت یہ ہے کہ جاہلیت اور اسلام دو نظام حیات ہیں جو آج بھی ایک دوسرے سے برسر پیکار ہیں۔ جب اسلام کی دعوت کچھ لوگوں نے قبول کی تو وہ جاہلیت پر غلبہ پاگئے ،اور فتح یاب ہوگئے ،اللہ کے تعلق کی بنیاد پر وہ اوران کے پیرو سربلند اور باعزت ہوگئے۔خداترسی کی صفت رکھنے والی قوم نے شریعت اسلامیہ کو اپنا

(۱)اصلاً عربی میں لکھی گئی

دستور بنالیا۔ پھر جب وہ پلٹے، پاؤں اس سے جدا ہوگئے، جہاد کے فریضہ سے غافل ہوکر دنیا کی لذت اندوزی میں مصروف ہوئے تو جاہلیت پھر لوٹ آئی۔ جاہلیت کے نظام نے ان پر قبضہ جمالیا۔ اور جاہلیت کے نظام میں بھی وہ اس کے چلانے والے سربراہ کا درجہ نہ پاسکے، بلکہ ان کی حقیقت پس خوردہ کھانے والے، حقیر قسم کے تابعداروں کی ہوگئی۔ ان کے لئے یہ مقدر ہوگیا ہے کہ جب تک وہ اس نظام جاہلیت سے دستبردار ہوکر اسلام کے نظام حیات کو قبول نہیں کرتے اسی طرح پسپا رہیں گے اور ہر در سے ٹھکرائے جائیں گے۔

مصرع الجاهلية ۔ (جاہلیت کی پسپائی)(۱)

جاہلیت کا خونخوار بھوت پھر سے انسانی سوسائٹی کو نوچ کھسوٹ رہا ہے۔ کیا عوام کیا خواص اور کیا اوسط درجے کے لوگ اپنی عقلیت میں سرشار اپنی دھن میں مست، بلکہ اپنی ذات میں گم رواں دواں ہیں، باتیں سنئے تو ایک سے ایک عاقلانہ اور عمل دیکھئے تو بچوں کی حرکت سے بھی زیادہ بچکانہ۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ الفاظ بے معنی و مطلب کے ہیں، اثر سے خالی درد سے عاری ۔ دین ان کے نزدیک ایک تاریخی داستان ہے۔ سنیں اور سن کر بے پرواہ ہوجائیں۔ پڑھیں اور پڑھ کر بے نیاز ہوجائیں۔

ایسا مرد درویش، خدا مست، جوانمرد اور ہمتور کوئی ہے جو میدان میں نکل کر آئے اور اس بھوت کو سرے سے نکالنے کا ذمہ لے۔

(۱) اصلاً عربی میں لکھی گئی

مسلمانو! مہیب و دیوہیکل دل و دماغ پر قبضہ جما لینے والے عفریت کو ہلاک کرو۔

بين الهداية والجباية (انسانیت کی رہنمائی نہ کہ خراج کی وصول یابی)

یہ مقالہ دراصل ایک خط تھا جو مملکت سعودی عرب کے بانی ملک عبدالعزیز بن عبدالرحمٰن کے نام لکھا گیا تھا۔ اور جس کو ان کے ولی عہد ملک سعود بن عبدالعزیز کو شیخ عمر بن حسنؒ نے پڑھ کر سنا دیا تھا۔ بعد میں اس عنوان سے ایک مستقل رسالہ ہو گیا، اس کے سرنامہ پر علامہ احمد الشرباصی تحریر فرماتے ہیں:

> ''حکومت کا لفظ ''حکمت'' نے نکلا ہے، حکومتوں کا مقصد یہی تھا کہ حکمت و عدل کے ساتھ اپنے ملک کے باشندوں کو صحیح راستے پر قائم رکھیں، لیکن مرور زمانہ سے حکومت نام رہ گیا ہے سطوت و جبروت کے ساتھ پبلک سے خراج وصول کرنے کا۔ اور حکومت کا مطلب یہی سمجھا جانے لگا کہ وہ ادارہ جو لوگوں سے زبردستی ٹیکس وصول کرے۔ رعایا کے حقوق پامال کرتا رہے۔ اور اپنا خزانہ بھرتا رہے۔ اللہ تعالیٰ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو ہدایت کے لئے مبعوث کیا تھا۔ جبایت (خراج کی وصول یابی) کے لئے نہیں۔ جب ہدایت کا کام بڑھے گا تو خراج کی وصول یابی کا کام کم ہو جائے گا۔ اسلام کی تاریخ میں اس درجہ روشن دلائل موجود ہیں کہ پیغمبر کے سچے پیروکار افراد نے اپنا مطمح نظر دولت کا ذخیرہ جمع کرنا نہیں بنایا تھا۔ ان کی نظریں لوگوں کے قلوب پر تھیں جیوب (خزانہ) پر نہیں تھیں۔ اور آج بھی نجات کا راستہ وہی ہے جس پر چل کر اگلے وقتوں کے لوگ کامیاب ہوئے تھے۔''

دعوت دین کے لئے متنوع انداز بیان

گزشتہ باب میں جن مکتوبات اور رسائل کا ذکر آیا ہے وہ سب دعوتی وفکری انداز کے تھے اور جو آپ کے دوسرے سفر حجاز کے وقت اہل علم میں تقسیم کئے گئے، اور ان کو اس درجہ پسند کیا گیا کہ ان کی بار بار اشاعت ہوئی ۔ جو خطابات عربی میں اصلاً لکھے گئے تھے ان کے اردو ترجمے کئے گئے، اور اسی طرح جو اصلاً اردو میں تھے ان کے عربی ترجمے کئے گئے ۔ اور ان تمام تقریروں (یا خطابات) کے ترکی میں بھی ترجمے ہوئے ۔ جنیوا کے اسلامک سینٹر نے متعدد خطابات کے ترجمے، فرنچ، جرمن، اٹالین، میں بھی کرائے ۔ انگریزی میں تو پہلے ہی ہو چکے تھے ۔ اس طرح کے بیسوں رسائل اب تک نکل چکے ہیں ۔ ان رسائل کا مطالعہ کرنے والے کو صاف طور پر معلوم ہوگا کہ موضوع سب کا ایک ہی ہے ۔ یعنی اسلام کو ہر درد کا مداوا، ہر مشکل کا علاج اور زندگی کے ہر موڑ پر رہنما یقین کرانا ۔ اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو انسانیت کا سب سے بڑا محسن اور اسوہ بتانا ۔ بات جس رخ سے شروع ہو، ختم اس پر ہوگی جو اسلامی عقیدہ کی کلید ہے ۔ انداز بیان اور اسلوب کلام ضرور مختلف ہے، ذہن کی تیزی اور طبیعت میں وہ اپج یا وہ صلاحیت جس کو نئے اہل قلم تخلیقی صلاحیت کہتے ہیں ہر جگہ جلوہ گر ہے ۔ بعض اردو میں لکھے ہوئے خطابات روایتی کہانی اور قصوں سے شروع

ہوتے ہیں، اوران کو بہ طور عبرت پیش کر کے اسلام کے محاسن کو ذہن نشین کرایا گیا ہے۔مثال کے طور پر ایک مقالہ ہے'' آنکھوں کی سوئیاں'' ایک کہانی سے شروع ہوتا ہے کہ ایک عورت کے جسم میں بہت سے سی سوئیاں چبھی ہوئی تھیں، اس کی سوکن اس کے جسم کی تمام سوئیاں نکالتی ہے مگر آنکھوں کی سوئیاں نہیں نکالتی ہے۔حالانکہ سب سے زیادہ تکلیف دہ یہی سوئیاں تھیں، اگر آنکھوں کی سوئیاں نکل جاتیں تو خود جسم کے اندر چبھی ہوئی دوسری سوئیاں نکال لیتی ۔یہ حال انسانیت کے نام نہاد ہمدردوں کا ہے۔وہ اقتصادی اصلاح، سماجی اصلاح، اور انسداد جرائم رشوت وغیرہ کے نام پر اصلاحی تحریکیں شروع کرتے ہیں، اور ناکام رہتے ہیں۔اصل بیماری کی جڑ اور تمام آزاروں میں سب سے بڑا آزار قلب کا بگاڑ ہے جو صحیح راہ ہدایت کا رخ موڑ دیتا ہے۔''اذا صلح القلب صلح الجسد کله'' اگر دل کی بیماری دور ہو جائے تو پورے جسم کو آرام مل جائے۔اس مضمون کا ترجمہ ''بين الانسانية وأصدقائها'' ''انسانیت اور اس کے غم خوار دوست'' ہے۔اسی طرح ایک مضمون کا عنوان ہے، خطرناک تکبر، قصہ یہ بیان کیا جاتا ہے کہ ایک برہمن زادہ پانی میں ڈوب رہا تھا، ایک اچھوت نے اپنے آپ کو خطرہ میں ڈال کر اس کو ڈوبنے سے بچالیا۔جب اونچی ذات کے صاحبزادے موت کے منہ سے نکل گئے تو انھوں نے پوچھا کہ ان کو کس نے پانی سے نکالا تھا؟ بتایا گیا کہ وہ فلاں شخص تھا۔اس پر برہمن زادے کو غصہ آگیا کہ اس نے میرے جسم کو چھوا کیونکر؟ یہ تو اچھوت ہے اس کی سزا قتل تجویز ہوئی۔یہی حال اس وقت صنعتی ترقی کرنے والے ممالک کا ہے کہ وہ ہدایت کی راہ قبول کرنے سے اس لئے اعراض کرتے ہیں کہ ان کو پیش کرنے والے وہ لوگ ہیں جو اہل مشرق ہیں اور مشرق کبھی بھی اہل مغرب کی ہمسری نہیں کرسکتے۔

مضامین کی آمد اور ذہن کا صحیح رخ پر کام کرنا اور معمولی واقعات سے بڑے

نتائج حاصل کرنا بتاتا ہے کہ ذہانت کس رخ پر کام کرتی ہے۔ ممکن ہے کسی کی سمجھ میں نہ آئے کہ دین کی دعوت کو اتنے متنوع انداز کلام میں پیش کرنے کی ضرورت کیا ہے؟ مگر غور کیجئے تو معلوم ہوگا کہ فطری طریق دعوت یہی ہے کہ مقصد کو بار بار مختلف زاویوں سے پیش کیا جائے۔ اور اس طریق بیان کے فطری ہونے کا ثبوت یہ ہے کہ قرآن کریم نے سب سے پہلے اس کی طرف متنبہ کیا ہے۔ ''وَلَقَدْ صَرَّفْنَا فِيْ هٰذَا الْقُرْاٰنِ لِيَذَّكَّرُوْا'' (۱) اور ہم نے اس قرآن میں طرح طرح سے بیان کیا ہے تا کہ (اس کو) اچھی طرح سمجھ سکیں۔

مولانا کا یہ ''تصریفی'' (دین کی دعوت مختلف اسالیب سے پیش کرنا) انداز بیان سمجھنے کے لئے اور ان مقالات کے اندر جو ایک بے چین روح اور دین کی سربلندی کی تڑپ ہے نیز جو معرفت و آگاہی کے خزانے ہیں، ان کی قدر اگر کی تو عرب علماء اور دانشوروں نے کی، وہ ہم سے کہیں زیادہ فراخ دل اور وسیع القلب ثابت ہوئے۔

مولانا کا ایک مقالہ جو اصلاً اردو میں لکھا گیا تھا اور اس کا ترجمہ ''بين الانسانية وأصدقائها'' یعنی انسانیت اور اس کے نام نہاد غم خوار اور دوست، بارہا مصر، شام اور کویت سے شائع ہوا اور ابھی تک موجودہ نسل کے لوگ پڑھ رہے ہیں، جبکہ اس کی اردو اصل بہت تلاش کے بعد دستیاب ہوئی۔ جناب انیس چشتی (پونہ) نے مولانا کے بعض مقالات کا انتخاب ''اصلاحیات'' کے نام سے شائع کیا تھا۔ اس میں یہ مضمون بھی دستیاب ہو گیا۔

دوسرا مضمون ''بين الجباية والهداية'' یہ بھی عربی کے ایک مجموعہ مضامین ''الى الاسلام من جديد'' (نواں ایڈیشن، کویت، آٹھواں ایڈیشن دمشق)

---

(۱) سورہ بنی اسرائیل۔۴۱

موجود ہے، یہ مضمون دراصل ایک خط تھا جو جلالۃ الملک سعود بن عبد العزیز کے نام لکھا گیا تھا۔ اس عنوان کا پس منظر یہ ہے کہ حضرت عمر بن عبد العزیزؒ کے وقت میں جو مصر کے گورنر تھے انھوں نے خلیفۂ وقت یعنی حضرت عمر بن عبد العزیزؒ سے شکایت کی کہ نئے مفتوح علاقہ کے لوگ جوق در جوق اسلام میں داخل ہو رہے ہیں اس لئے حکومت کے خزانہ میں جو جزیہ کی رقم آیا کرتی ہے وہ بہت کم ہوتی جارہی ہے اس پر حضرت عمر بن عبد العزیز نے اس گورنر کو لکھا:

"ویحك ان محمداً صلی الله علیه وسلم بعث هادیاً ولم یبعث جابیاً"

اللہ کے بندے! محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو ہادی بنا کر بھیجا گیا تھا۔ تحصیلدار بنا کر نہیں بھیجا گیا تھا۔

اس کتاب (نقوش سوانح) میں سب وہ تمام تقریریں اور خطابات مکمل نقل نہیں کئے جاسکتے۔ البتہ ان کی طرف اشارے کردئے گئے ہیں اور حوالے دیئے گئے ہیں۔ البتہ یہ مقالہ "بین الجبایة والهدایة" نقل کرنا اس لئے ضروری ہے کہ اس سے اسلام میں حاکمیت کا تصور اور تمکین فی الارض کی غایت واضح طور پر بیان کی گئی ہے۔ اور اس سے خود مولانا کا فہم دین کھل کر سامنے آتا ہے اور چونکہ اس مسئلے کی مختلف تعبیریں مختلف انداز میں دوسرے حضرات نے کی ہیں اس لئے اس تاریخی دستاویز کا پورا ترجمہ یہاں نقل کرنا ضروری ہے۔ اس مقالہ کے نقل کرنے کا سبب یہ ہے کہ سربراہانِ حکومت کو کس پیرایہ بیان میں متوجہ کیا اس کا ایک نمونہ ہے نیز یہ کہ "اسلام اور عرب" کا رشتہ کیا تھا۔ اور کیا ہونا چاہئے۔ اس کو تفصیل اور بسط کے ساتھ بیان کیا گیا ہے۔

انسانیت کی رہنمائی نہ کہ اقتصادی استحکام

''حکومتوں کی تاریخ کا مطالعہ ہمیں بتا تا ہے کہ دنیا میں دوقسم کی حکومتیں تھیں۔ایک حکومت تو وہ ہے جس کا مقصد ملک کے خزانے کو بھرنا اور ''اقتصادی'' ترقی ہے اور یہ معلوم ہے کہ حکومت کے خزانے ٹیکسوں سے بھرے جاتے ہیں۔ دوسری قسم کی وہ حکومت ہے جس کا مقصد خلق کو خدا کی بتائی ہوئی شاہراہ پر چلانا۔

جس حکومت کا جو مقصد ہوگا وہ اسی مقصد کی طرف گامزن ہوگی۔مگر جو مقصد ہوگا اس کے مطابق نتائج بھی سامنے آئیں گے۔

جس حکومت کا مطمح نظر تحصیلِ دولت ہوتا ہے یعنی رعایا سے ٹیکس وصول کر کے خزانے بھرنا، اس کا سارا انظام بس اسی فکر کے ماتحت گردش کرتا ہے کہ اس کی اقتصادی حالت زیادہ سے زیادہ مضبوط ہو، آمدنی بے حساب ہو، اہل حکومت کو عیش وآرام کے زیادہ سے زیادہ مواقع میسر آئیں۔ملک کی معیاری تہذیب تکلفات کا مرقع ہو، اور شہریت اور اس کے مظاہر میں اس کے اندر کشش اور اس معیار کی دل کشی ہو کہ دیکھنے والے کو جنت ارضی کا گمان ہو۔چاہے ان اغراض کے لئے اسے غریبوں کا خون چوسنا پڑے، مزدوروں اور کسانوں پر ستم توڑنے پڑیں۔بھاری ٹیکس اور محصولات عائد کرنے پڑیں۔اسے اس سے کوئی مطلب نہیں کہ غریب رعایا پر کیا

گزرے گی۔ نت نئے ٹیکسوں کے نیچے دب کر اس کی کیا گت بنے گی۔ یا جس شہریت کے ایک رخ کو وہ اتنا خوش منظر بنانا چاہتی ہے اس کا دوسرا رخ کتنا بھیانک ہوجائے گا۔ اس کی تمام تر دلچسپیاں صرف ان کاموں اور ان چیزوں سے تعلق رکھتی ہیں جن سے اس کی آمدنی اور آمدنی کے ذرائع میں اضافہ ہو، جن سے اس کی شان وشوکت بڑھتی ہو، جو بادشاہ یا رئیس مملکت اور اس کے وزراء کے لئے، ان کی آل واولاد کے لئے، ان کے خاندان اور اہل خاندان کے لئے، ان کے دوستوں اور دوستوں کے عزیزوں کے لئے، ان کے خدمت گزاروں، حاشیہ نشینوں اور جی حضوریوں کے لئے عیش وعشرت کے سامان مہیا کریں۔ اور جن چیزوں کی بدولت وہ شاندار محل اور عالی شان کوٹھیاں تعمیر کرا سکیں۔ اور بڑی بڑی جائدادوں، کارخانوں اور فیکٹریوں کے مالک بن سکیں۔ اس کی قسم کی حکومت کو اس کے علاوہ اور کسی چیز سے دلچسپی نہیں ہوتی۔

ایسی حکومت کا ایک خاصہ یہ بھی ہے کہ وہ جمہور کی اخلاقی اور روحانی تربیت سے غفلت برتتی ہے، ان کے اخلاق اور جذبات کی نگرانی کی قطعاً فکر نہیں کرتی، کیونکہ اس کے نزدیک کسی چیز کے قابل توجہ ہونے کا معیار یہ ہے کہ اس میں کوئی مالی یا سیاسی فائدہ نظر آئے۔ اسی لئے بسا اوقات ایسا بھی ہوتا ہے کہ اگر کسی معیوب یا ممنوع کام کے ارتکاب میں حکومت کو کوئی اس قسم کا فائدہ نظر آتا ہے تو وہ اس کام کو قانوناً جائز قرار دے دیتی ہے بلکہ اس میں لوگوں کی ہمت افزائی کرتی ہے اس کے برعکس اگر کسی جائز کام میں کسی مالی یا سیاسی نقصان کا اندیشہ ہوتا ہے تو اس کو قانوناً ممنوع قرار دے دیا جاتا ہے۔ اس کی مالی حرص بلکہ بھوک اس حد تک پہونچی ہوئی ہوتی ہے کہ ہر وہ کام اور ہر وہ اقدام جو آمدنی بڑھانے کا ذریعہ بن سکتا ہو فی نفسہٖ خواہ کتنا ہی معیوب کیوں نہ ہو اس کی نگاہ میں مستحسن ہو جاتا ہے حتیٰ کہ بعض اوقات

عبادات اور مرنے جینے تک پر (کسی بہانہ) سے ٹیکس لگا دیا جاتا ہے۔ اور اس طرح یہ حکومت اپنے اصل فرائض (یعنی عوام کے مفاد کی نگرانی، ان کی راحت اور خوشحالی کی فکر، اور ان کی اصلاح و تربیت کے انتظام) کو پسِ پشت ڈال کر ایک بڑی تجارتی کمپنی کا پارٹ ادا کرنے لگتی ہے جسے نفع اندوزی کے سوا نہ کوئی فکر ہے نہ کوئی کام۔

اس کے برعکس دوسری قسم کی حکومت یعنی جو "حکومت برائے ہدایت" کے نظریہ پر قائم ہوتی ہے اس کے سامنے ایسے پست اور ذلیل مقاصد نہیں ہوتے، وہ مالی منفعت اور سیاسی قوت کی بندگی نہیں کرتی۔ بلکہ اس کا ایک بالکل بے غرض اور بے لوث مشن ہوتا ہے۔ جس کی خدمت کو وہ اپنے اقتدار اور اختیار کا سب سے اہم اور اول مصرف سمجھتی ہے۔ وہ مشن کیا ہوتا ہے؟ لوگوں کو اللہ کی بندگی کی طرف بلانا، انھیں بھلائی اور سچائی کی راہ پر لگانا، اور برائی کی راہ سے ہٹانا۔ وہ اپنی کامیابی کا معیار زیادہ آمدنی اور زیادہ بچت کو نہیں قرار دیتی، بلکہ اس کے نزدیک کامیابی کا معیار یہ ہے کہ اس کی قلمرو میں عام طور سے لوگوں کا کیرکٹر بلند ہو، ان کے دل اور ان کی روحیں پاکیزہ ہوں، ان کی سیرتیں پسندیدہ اوصاف اور اچھی عادات کا آئینہ ہوں۔ مرنے کے بعد والی زندگی ان کی توجہات کا مرکز ہو، اس دنیا کے لذائذ اور منافع میں ان کا انہماک کم سے کم ہو، معیشت میں قناعت کے اصول پر عمل پیرا ہوں، معمولی گذر بسر کے لئے جتنا کافی ہو، اس سے زیادہ کی ہوس نہ رکھتے ہوں، بری باتوں سے نفرت رکھتے ہوں، خالق کی نافرمانی کے قریب جانے سے ڈرتے ہوں، اور اچھی باتوں اور بھلے کاموں میں ہر شخص دوسروں سے بڑھ جانے کی حرص رکھتا ہو۔ یہ ہے اس حکومت کی کامیابی کا معیار، اگر یہ باتیں اس کے جمہور میں پائی جاتی ہیں تو وہ اپنے آپ کو انتہائی کامیاب اور خوش نصیب سمجھتی ہے، اگرچہ اس کامیابی کی قیمت اسے اپنے پورے خزانہ سے ادا کرنی پڑے، اور بچت کے نام کی

ایک کوڑی بھی نہ رہے۔

اپنے پرخلوص مشن کی تکمیل کے لئے یہ حکومت طرح طرح کی کوششیں کرتی ہے، ملک کے ہر حصے میں واعظوں کا تقرر کرتی ہے، مبلغین بھیجتی ہے، امورِ خیر میں ہمت افزائی کرتی ہے، شراب سازی اور شراب نوشی بند کرتی ہے، ہر برے اور نازیبا کام پر دارو گیر کرتی ہے، ناچ رنگ کی محفلیں سرد کرتی ہے، اخلاق و جذبات کو بگاڑنے والے کھیل تماشوں کو ممنوع قرار دیتی ہے، عریانی اور فحاشی پھیلانے والے عناصر کو معاشرہ میں سے نکال کر پھینک دیتی ہے۔ غرض وہ نظام، عقائد، نظامِ اخلاق اور نظامِ معاشرت میں بگاڑ پیدا کرنے والے تمام عوامل اور محرکات کا انسداد کرتی ہے اور اس کو وہ اپنا اہم فرض سمجھتی ہے۔ اس حکومت کے دور میں مسجدیں آباد اور میکدے ویران نظر آتے ہیں۔ اچھے عناصر طاقت پاکر ابھرتے ہیں اور ملک پر اپنی اچھائیوں کے ساتھ چھا جاتے ہیں، اس کے برعکس برے عناصر دبنے اور روپوش ہو جانے پر مجبور ہو جاتے ہیں، ہر طرف نیک کرداری اور نیک عملی کا دور دورہ ہوتا ہے۔ اور

اَلَّذِيْنَ اِنْ مَّكَّنَاهُمْ فِي الْاَرْضِ اَقَامُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتَوُا الزَّكٰوةَ وَاَمَرُوْا بِالْمَعْرُوْفِ وَنَهَوْا عَنِ الْمُنْكَرِ وَلِلّٰهِ عَاقِبَةُ الْاُمُوْرِ ۝ (سورہ الحج۔۴۱)

وہ لوگ کہ اگر ہم ان کو زمین پر اقتدار بخشیں تو یہ نماز قائم کریں، زکوٰۃ دیں، معروف کا حکم کریں اور منکر سے منع کریں، اور بے شک اللہ ہی کے قبضہ میں ہے انجام کار۔

کا منظر آنکھوں کے سامنے آجاتا ہے۔

اس حکومت کی پوری مشینری میں اور اول الذکر قسم کی حکومت کی مشینری میں ہر لحاظ سے بڑا اختلاف ہوتا ہے۔ یہ اپنے طبعی میلانات اور جذبات میں اپنے

کردار اور معاملات میں اس سے بالکلیہ مختلف ہوتی ہے۔اس کے کاموں میں حب خیر اور احتساب کی شان، ایثار وخدمت اور دیانت داری کی اسپرٹ اور قربانی و وفاشعاری کے جذبات نظر آتے ہیں، اس کا ہر قدم اسی اسپرٹ اور انھیں جذبات کے ماتحت اٹھتا ہے۔اس کے برعکس دوسری قسم کی حکومت (جس کا اصل مقصد تحصیل دولت ہوتا ہے) کا حال یہ ہوتا ہے کہ اس کی مشینری میں خدمت، ایثار اور دیانتداری کی روح بالکل مفقود ہوتی ہے، اس لئے خود مملکت کے قانون اور اس کی مشینری کے درمیان سخت کشاکش دیکھنے میں آتی ہے۔خود حکومت کی مشینری ہی حکومت کے قانون کوناکام اور بے بس کرنے اور اس سے گلوخلاصی کے درپے رہتی ہے۔وہ عوام کے مقابلے میں خود کو برتر سمجھتی ہے، اسے اپنی حیثیت پر غرور اور گھمنڈ ہوتا ہے، اس کے کل پرزے جھوٹ، بددیانتی، منافقت اور رشوت ستانی کے اس درجہ خوگر ہوتے ہیں کہ بعض وقت ایک شریف انسان خانہ کعبہ تک میں یہ دعا کرنے پر مجبور ہو جاتا ہے، کہ خدایا! ان سے کبھی واسطہ نہ ڈالئے! ان لوگوں کی یہ خصلتیں یہ حال کر دیتی ہیں کہ جب تک آدمی ادھر اُدھر تھوڑا بہت خرچ نہ کر دے اپنے اُن حقوق کا فائدہ بھی نہیں اٹھا سکتا جو بحیثیت مملکت کے شہری ہونے کے مملکت کا قانون اس کے لئے تسلیم کرتا ہے، حتیٰ کہ انصاف جیسے بنیادی حق کے حاصل کرنے کے لئے بھی اسے کچھ قیمت چکانی پڑتی ہے غرض اس حکومت کے سایہ میں عام باشندوں کو بڑی سخت پریشانیوں اور تکلیفوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے، جیسے کہ ببول کے سایہ میں کانٹوں سے سابقہ پڑتا ہے۔اس لئے کہ اس حکومت کی مشینری کا کوئی فرد یہ عقیدہ تو رکھتا نہیں کہ مجھے جو کچھ اختیار اور قوت حاصل ہے وہ قوم اور اہل ملک کی امانت ہے جس کا مجھے غلط استعمال نہیں کرنا چاہئے، اور میں صرف ایک خادم ہوں۔ بلکہ وہ تو اپنے بارے میں یہ خیال رکھتا ہے کہ میں ایک محصل ہوں اور مجھے جو کچھ اختیار

حاصل ہے اس کا صحیح مصرف تحصیل وصول ہے۔ اور وہ بھی جہاں تک ہو سکے اپنے لئے ، نہ کہ سرکاری خزانے کے لئے ۔حکومت نے مجھے اس عہدے یا پوسٹ پر پہونچا کر کمائی کا ایک بہترین موقع دیا ہے۔ میں اسے کیوں ہاتھ سے جانے دوں۔ یہ تو بہتی گنگا ہے۔ جس میں ہر شخص ہاتھ دھو رہا ہے۔ میں ہی کیوں محروم رہوں، اور جب لٹیروں کے قافلے میں شرکت ہی کی ہے تو ان کے امتیازی پیسے سے پرہیز کیونکر کروں؟"

حکومت برائے ہدایت کا ایک مثالی نمونہ

تاریخ میں اس ننگِ انسانیت حکومت کی سیکڑوں مثالیں موجود ہیں، اور آج بھی ہم اپنے چاروں طرف اسی قسم کی حکومتیں پاتے ہیں، اس لئے نہ تو اس کی تمثیل کی چنداں ضرورت ہے اور نہ ان کی خصوصیات کی مزید وضاحت کی ، البتہ وہ حکومت جس کے پیش نظر بندگانِ خدا کی ہدایت اور بھلائی ہوتی ہے اس کی مثالیں تاریخ میں شاذ ونادر ہی نظر آتی ہیں، اور فی زماننا تو وہ بالکل ہی عنقا ہے۔ اس لئے اس کی وضاحت کے لئے ضرورت ہے کہ اس قسم کی حکومت کی کوئی مثال بیان کی جائے۔

چھٹی صدی عیسوی میں حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے جب عرب کے سامنے اسلام کی دعوت پیش کی تو مخاطبین کا وہ بہترین عنصر اس دعوتِ حق کی طرف کھنچ آیا جس نے اپنے زمانے میں اپنے کو قرآن کی ان آیات کا بہترین مصداق ثابت کیا:

نَحْنُ نَقُصُّ عَلَيْكَ نَبَأَهُمْ بِالْحَقِّ، إِنَّهُمْ فِتْيَةٌ آمَنُوا بِرَبِّهِمْ وَزِدْنَاهُمْ هُدًى ۔ وَرَبَطْنَا عَلَىٰ قُلُوبِهِمْ إِذْ قَامُوا فَقَالُوا رَبُّنَا رَبُّ السَّمٰوٰتِ وَالْأَرْضِ لَنْ نَدْعُوَا مِنْ دُونِهِ إِلٰهًا لَّقَدْ قُلْنَا إِذًا شَطَطًا ۔ هٰؤُلَاءِ قَوْمُنَا

اتَّخَذُوا مِنْ دُوْنِهٖٓ اٰلِهَةً ۭ لَوْلَا يَاْتُوْنَ عَلَيْهِمْ بِسُلْطٰنٍۢ بَيِّنٍ ۭ فَمَنْ اَظْلَمُ مِمَّنِ افْتَرٰى عَلَى اللّٰهِ كَذِبًا

(سورہ الکہف ۱۳۔۱۵)

وہ ایک جماعت تھی جو اپنے سچے رب پر ایمان لائی اور ہم نے ان کو اور زیادہ ہدایت دی اور مضبوط کر دیا ان کے دلوں کو جب کہ وہ اٹھ کھڑے ہوئے یہ کہتے ہوئے کہ ہمارا رب تو وہ ہے جو آسمان و زمین کا رب ہے، ہم ہرگز نہ پکاریں گے اس کے سوا کسی کو (اور بالفرض ایسا کیا گیا) تو ہماری یہ بات عقل سے دور ہوگی۔ یہ ہماری قوم والے ہیں جنھوں نے اس ایک کے سوا دوسرے معبود بنالیے ہیں، یہ ان کے معبود ہونے پر کوئی وزنی دلیل کیوں نہیں لاتے (اور اگر دلیل نہیں ہے) تو اس سے بڑھ کر نا انصاف کون ہے جو اللہ پر بہتان تراشے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اس دعوت پر لبیک کہنا سوسائٹی کی نظر میں ان کا بہت بڑا جرم تھا، جس کی پاداش میں یہ مردانِ باصفا، جور و جفا اور قہر و بلا کے تیروں پر رکھ لئے گئے، خوب خوب مشقِ ستم کی گئی۔ اور پوری سنگدلی کے ساتھ ستائے گئے، مگر ان سے تو پہلے ہی کہہ دیا گیا تھا۔

اَحَسِبَ النَّاسُ اَنْ يُّتْرَكُوْٓا اَنْ يَّقُوْلُوْٓا اٰمَنَّا وَهُمْ لَا يُفْتَنُوْنَ ۝ وَلَقَدْ فَتَنَّا الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ فَلَيَعْلَمَنَّ اللّٰهُ الَّذِيْنَ صَدَقُوْا وَلَيَعْلَمَنَّ الْكٰذِبِيْنَ ۝ (سورہ العنکبوت ۔۲)

کیا لوگوں نے یہ سمجھ رکھا ہے کہ انھیں صرف ''آمنا'' کہنے پر چھوڑ دیا جائے گا، اور ان کے اس دعوے کی آزمائش نہیں کی جائے گی، حالانکہ ہم نے ان کے اگلوں کو آزمایا ہے، اللہ تعالیٰ ضرور جان لے گا ان کو جو سچے ہیں اور ان کو جو جھوٹے ہیں۔

اس لئے آزمائش کے کسی مرحلہ میں ان کے قدم ذرا نہ ڈگمگائے اور پہاڑوں کی شانِ استقامت کے ساتھ اپنے موقف پر ڈٹے رہے، انھوں نے سمجھ لیا کہ یہ مصائب تو وہی ہیں جن کے آنے کی خبر اللہ اور اللہ کے رسول نے ہمیں پہلے ہی دیدی تھی۔ "ھذا ما وعدنا اللہ ورسولہ وصدق اللہ ورسولہ" وہ آزمائش وابتلا کے ان کٹھن مراحل کو پورے صبر و ثبات کے ساتھ طے کرتے رہے، یہاں تک کہ ان کا کھرا پن اور سچائی ظاہر ہوگئی، اور اللہ نے ہجرت کی اجازت مرحمت فرمادی، اب ان کی دعوت کو نسبتاً کم دشوار گزار راستہ مل گیا پہلی سی مزاحمتوں کا سامنا نہ رہا اس لئے کامیابی کی رفتار تیز ہوگئی اور رفتہ رفتہ یہ جماعت اس پوزیشن میں آگئی کہ خلافتِ ارضی کی ذمہ داریاں سنبھال سکے۔ پس مشیتِ الٰہی کا تقاضہ ہوا کہ انھیں اقتدار حکومت بخش دیا جائے، تاکہ یہ دنیا میں اعتدال قائم کریں، ظلم اور بے انصافی کا استیصال کریں، انسانوں کو ظنون واوہام کی اندھیریوں سے نکال کر نورِ حقیقت سے آشنا کریں، جن غلط اصولوں کی پابندی اور رسوم ورواج کی بندشوں نے ان پر زندگی تنگ کر رکھی ہے ان سے نجات دلا کر ان پر جینا آسان کریں اور ان کو انھیں جیسے انسانوں کی غلامی سے آزاد کرا کر صرف خدائے وحدہ لاشریک کی غلامی اور بندگی کا سبق پڑھائیں۔ یہ ذمہ داریاں تھیں جو حکومت کے ساتھ ان پر عائد کی گئی۔ تاریخ گواہ ہے کہ انھوں نے ان ذمہ داریوں کا حق ادا کر دکھایا، اور وہی کام کئے جو حکومت برائے ہدایت کا طرۂ امتیاز ہیں، نماز اور زکوٰۃ کا اہتمام کیا۔ ہر برائی کی بندش کی، اور ہر بھلائی کی پرورش۔

بہر حال دعوت اسلامی کا یہ شجر حکومت کا پھل لایا اور جن لوگوں نے اس پودے کے نشو ونما اور اس کی حفاظت وبقا کی خاطر اپنی جانوں کی بازیاں کھیلی تھیں، انھوں نے اپنی قربانیوں کا پہلا صلہ عزت وشوکت اور اقتدار کی صورت میں پالیا۔

لیکن سچ یہ ہے کہ یہ انعام بجائے خود ایک بڑا امتحان تھا، بلکہ اب تک کے تمام امتحانوں اور تمام آزمائشوں سے زیادہ سخت اور نازک امتحان تھا، مشیت کے اس تازہ فیصلہ نے انھیں ایک دوراہے پر لا کھڑا کیا تھا..... حکومت کے دوراہے پر ! جہاں ان کے سامنے دو راستے تھے، ایک راستہ ''حکومت برائے خدمت و ہدایت'' کا تھا دوسرا راستہ ''حکومت برائے دولت و راحت'' کا تھا، اس منزل تک یہ قافلہ بغیر حکومت کے ہدایت و خدمت ہی کی راہ پر گامزن تھا۔ مگر یہاں پہونچ کر ایک دوسری راہ بھی سامنے آ گئی تھی۔ جس کا ہر ذرہ مجسم کشش تھا، اس میں قدم قدم پر مال و دولت کے انبار تھے، سیم و زر کی چمک و دمک تھی، عیش و عشرت کے مواقع تھے، اور سب سے بڑھ کر حکومت کے نام سے خدائی تھی، بس شرط اتنی تھی کہ یہ اس راستہ پر قدم بڑھا دیں اور اس راہ کے پیشرووں کی طرح رعایا کو ٹیکس محاصل اور رشوت وخراج کے بھاری بوجھوں تلے دبا دیں.... ان دونوں میں سے کسی ایک راہ کا انتخاب کرنا تھا، اس لئے یہ قافلہ ذرا ٹھٹکا، مگر فوراً ہی ہاتف غیبی نے پکار کر کہا:

''خبردار! تم جناب محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے جانشین ہو، جو دنیا کو سیدھی راہ پر لگانے آئے تھے۔ ٹیکس وصول کرنے نہیں آئے تھے۔ وہ صرف ہادی تھے نہ کہ جابی (محصّل)''

انھیں ذرا بھی تردد نہ ہوا، اور ایک لمحہ کی پس و پیش کے بغیر ''حکومت برائے ہدایت'' کی راہ اختیار کر لی، اور فیصلہ کر لیا گیا کہ اللہ کے بخشے ہوئے اس اقتدار کو شخصی اور ذاتی منفعت و جاہ طلبی کے بجائے عالمِ انسان کی ہدایت اور ہر پہلو سے اس کی زندگی کی اصلاح و تربیت کے لئے استعمال کیا جائے گا۔ اور یہی کام ہماری اس نوزائدہ مملکت کا امتیازی نشان ہوگا اس طرح وہ اس سخت ترین آزمائش میں بھی پورے اترے۔ رضی اللہ عنہم وارضاہم۔

بالفرض اگر وہ اس کے برعکس فیصلہ کر لیتے اور فرائض کو نظر انداز کر کے منافع کا راستہ اختیار کر لیتے تو واقعہ یہ ہے کہ انھیں کوئی روکنے والا نہ تھا، دنیا نفع پرست اور فرض ناشناس حکومتوں کی عادی تھی، اس کے جسم پر اس قسم کے سیکڑوں جونکیں چمٹی ہوئی تھیں، اگر اس نئی حکومت کے قیام سے بھی اس کی جونکوں میں ایک اور جونک کا اضافہ ہو جاتا، تو یہ کوئی ایسا حادثہ نہ ہوتا جس پر یہ چیخ اٹھتی، لیکن ایک خیال یہ تھا جو اس وقت آڑے آیا، اور اس نے ان کا دامن پکڑ کر کہنا شروع کیا، آپ کو اختیار ہے کہ جس راستے کو چاہیں اپنے لئے پسند کر لیں۔ مگر یہ سمجھ لیجئے کہ اگر آپ نے دعوت وہدایت کی راہ چھوڑ کر ذاتی عیش وآرام اور نفع پرستی کی راہ کو اختیار کیا تو یہ اپنے ان ساتھیوں کے ساتھ غداری ہوگی جو اپنی قربانیوں اور جاں نثاریوں کا پھل چکھے بغیر رخصت ہو چکے ہیں، یہ ان مخلصین کے ساتھ بے وفائی ہوگی جن کے حصے میں جہاد کی سختیوں اور بھوک پیاس کی شدتوں کے سوا کچھ نہیں آیا، آپ کا یہ فعل ان اصحاب باصفا کی مقدس روحوں پر ظلم ہوگا جن کی زندگی مسلسل فاقوں میں گذری، اور آج کی زبردست فتوحات اور بے شمار مال غنیمت میں ان کا کچھ بھی حصہ نہیں ہے۔ جیسے عثمان بن مظعونؓ، حمزہ بن عبدالمطلبؓ، مصعب بن عمیرؓ، انس بن نضرؓ اور سعد بن معاذؓ وغیرہ جن کی قربانیوں، جاں نثاریوں اور فاقہ مستیوں کی بدولت آپ کو یہ حکومت واقتدار نصیب ہوا ہے۔ دراصل یہ اقتدار ایک حیثیت سے ان کی امانت ہے اس لئے یہ کیسے جائز ہو سکتا ہے کہ آپ اس کو اپنے مصالح، اپنے منافع اپنی خواہشات اور اپنی اغراض کی تکمیل میں استعمال کریں، اقرباء پروری اور احبا نوازی کے کام میں لائیں، شکم پروری اور عیش کوشی کا ذریعہ بنائیں۔ اسلام کے ان جاں نثاروں نے اس لئے وطن نہیں چھوڑا تھا، اس لئے فاقے نہیں کئے تھے اس لئے جہاد نہیں کیا تھا، اور اس لئے مصیبتیں مول نہیں لی تھیں، کہ وہ اور ان کے ساتھی

طاقت حاصل کر کے قیصر وکسریٰ کی جانشینی کریں اور اونچے اونچے محلوں میں دادِ عیش دیں، یہ پاپڑ انھوں نے اس لئے نہیں بیلے تھے کہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے مقصد بعثت کی تکمیل کریں، اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت کا مقصد عالمِ انسانی کی ہدایت تھا ہدایت! اس کے سوا کچھ نہیں۔

بس یہ خیال تھا جس نے ان کو اقتدار کے غلط استعمال سے باز رکھا، اور صحیح راہ کے انتخاب میں امداد دی۔ چنانچہ انھوں نے اپنے شایانِ شان راستے کا انتخاب کرلیا۔ اور فیصلہ کرلیا کہ وہ بھی اسی طرح سے زندگی گزار کر اپنے رفقاء کے پاس پہونچیں گے جیسے انھوں نے گذاری تھی۔

پھر ان کے عمل نے اس فیصلے کا کتنا احترام کیا؟ اس کا اندازہ اس بات سے کیا جاسکتا ہے کہ مملکت کے قیام کے بعد چند ہی سال کے عرصے میں اس کے مجاہدین نے شام وایران کو فتح کرلیا۔ اور قیصر وکسریٰ کے ہاتھوں سے اقتدار کی باگیں چھین لیں۔ اور ان دونوں مفتوح شہنشاہیتوں کے سارے خزانے اس نئی مملکت کے پائے تخت مدینہ منورہ میں لاکر ڈھیر کردیئے گئے، بلکہ کہنا چاہئے کہ چاندی سونے کے دو دریا ان دو عظیم ترین سلطنتوں سے نکل کر مدینہ کی سمت میں بہنے لگے اور دونوں سلطنتوں کے وہ بہترین اموال اور ٹھاٹھ باٹھ کے وہ لاجواب اسباب اس نئی مملکت کے سربراہ کارواں کے قدموں میں آپڑے، جنھیں انھوں نے اپنی پوری عمر میں بیداری میں تو کیا شاید خواب میں بھی نہ دیکھا تھا تو اس وقت اس کا پورا پورا موقع تھا کہ ان میں سے کوئی اگر چاہتا کہ کسریٰ کا تاج زرنگار اس کے سر پر رکھ دیا جائے یا قیصر کا بستر خاص اس کے نیچے بچھا دیا جائے تو بلا تکلف ایسا ہو جاتا۔ مگر...... ہمیں حیرت ہو جاتی ہے کہ جب ہم یہ سنتے ہیں کہ اس ارادہ سے تو انھوں نے ان چیزوں کو ہاتھ بھی نہ لگایا، پھر ہماری حیرت میں مزید اضافہ ہو جاتا ہے جب

ہم اس پہلو پر بھی نظر کرتے ہیں کہ یہ موقع انھیں اس وقت حاصل ہوا تھا جبکہ انھیں زندگی کی تلخیاں برداشت کرتے، کھانے پینے اور پہننے میں تنگی اور تکلیف اٹھاتے ہوئے تقریباً ایک چوتھائی صدی گزر چکی ہے۔اس مدت میں انھیں مشکل ہی سے اتنا کھانا اور کپڑا میسر ہوتا تھا جس سے پیٹ بھرا جاسکے، اور تن ڈھکا جاسکے...ایسے وقت میں دنیا کی دو عظیم ترین سلطنتیں مع اپنے ہر قسم کے مال و دولت کے ان کے قبضے میں آتی ہیں، اور یہ ان کے مال و دولت کو نظر بھر کر بھی نہیں دیکھتے.....بڑی بات تھی!استغناء واستقامت کا حیرت انگیز مظاہرہ !!.....بخدا ایسی استقامت جس کی توقع پہاڑوں سے بھی نہیں کی جاسکتی، استغناء کے ایسے امتحان میں بڑے بڑے ضرب المثل کرداروں کو فیل ہوتے دیکھا ہے...مگر یہ کامیاب ہوئے...کیوں...؟اس لئے کہ انھوں نے اس مسئلہ کو سرسری نظر سے نہیں دیکھا، ان کے نزدیک یہاں سوال صرف یہ نہیں تھا کہ وہ تنگ دستی اور فاقہ مستی سے نجات پا کر خوش حالی اور کشائش اختیار کرنا چاہتے ہیں کہ نہیں؟ بلکہ اصل سوال ان کے خیال میں یہ تھا کہ کیا وہ آج اس مال و دولت ،اس تاج وتخت ، اور ''زینت دنیا'' پر ریجھ کر ہمیشہ کے لئے اپنے اصول، اپنے مقصد، اپنی دعوت ، راہِ حق کی رہبری اور اس کے تقاضوں کو خیر باد کہہ دینے کا فیصلہ کرتے ہیں، یا یہ فیصلہ کرتے ہیں کہ وہ سیم وزر کے اس سیلاب اور سکوں کی جھنکار میں بھی دعوتِ نبویؐ کی اصل روح کو مضبوطی سے تھامے رہیں گے، اور جانشینانِ انبیاء وحاملانِ دعوت حق کے مثالی کردار پر حرصِ دنیا کا کوئی ہلکے سے ہلکا دھبہ بھی نہ لگنے دیں گے۔

ان کے لئے بہترین موقع تھا کہ رومی وایرانی شہنشاہیوں کے سقوط کے بعد وہ ایک عظیم عربی شہنشاہیت کی بنیاد ڈال دیتے اور انہی کے اربابِ اقتدار کی طرح عیش وعشرت میں ڈوب جاتے، اس لئے کہ یہ دونوں شہنشاہیاں بیک وقت

ان کی مٹھی میں تھیں، کسریٰ اگر تنہا مملکتِ ایران کی دولت اور وسائل کے بل پر عیش وعشرت کے ریکارڈ قائم کرسکتا تھا.....! قیصر اگر تنہا رومی شہنشاہیت کی دولت اور وسائل پر ناز کر کے شان وشوکت کے متکبرانہ مظاہرے کرسکتا تھا.....! تو خطاب کے بیٹے عمر فاروقؓ کے لئے بھی یہ سب کچھ کرنے، بلکہ اس سے بہت زیادہ کرنے کا موقع حاصل تھا، کیونکہ ان کا اقتدار بیک وقت روم وایران دونوں پر تھا۔

بیشک عمرؓ اور ان کے رفقاء کرنے کو ایسا کر سکتے تھے .....! مگر وہ اس کو کیا کرتے کہ کانوں میں تو قرآن کی یہ تنبیہ ہر وقت گونج رہی تھی:

تِلْكَ الدَّارُ الْاٰخِرَةُ نَجْعَلُهَا لِلَّذِيْنَ لَا يُرِيْدُوْنَ عُلُوًّا فِي الْاَرْضِ وَلَا فَسَادًا وَالْعَاقِبَةُ لِلْمُتَّقِيْنَ (سورہ القصص۔۸۳)

اس دارِ آخرت میں ہم ان لوگوں کو عیش کا حق دیں گے، جو دنیا میں نہ اپنی بڑائی کے خواہشمند ہیں، نہ (اس غرض کے لئے) فساد برپا کرتے ہیں، اچھا انجام تو متقیوں ہی کا ہے۔

اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد حافظہ کی تختیوں پر ابھر ابھر کر سامنے آرہا تھا کہ:

لاالفقر اخشیٰ علیکم ولکن اخاف ان تبسط علیکم الدنیا کمابسطت علی من کان قبلکم فتھلککم کما اھلکتھم۔ (صحیح بخاری کتاب الجزیہ ۳۱۵۸)

مجھے تمہارے فقر وفاقے سے خطرہ نہیں ہے، بلکہ مجھے خطرہ اس سے ہے کہ دنیا تم پر کشادہ ہو جائے، جیسے تم سے اگلوں پر ہوئی تھی، اور اس نے جیسے انھیں برباد کیا تھا تمہیں کر دے۔

اس لئے وہ سب کے سب بیک آواز بول اٹھے:

اللهم لاعيش الاعيش الآخرة فاغفر الانصار
والمهاجرة

بے شک زندگی آخرت ہی کی زندگی ہے، خدایا تو ہم سب انصار
ومہاجرین کو بخش دے۔

الغرض انھوں نے ہر قیمت پر اپنی دعوتی روح اور اپنے کردار کی حفاظت کی، حکومت کی مگر حاکمانہ انداز کے بجائے داعیانہ انداز سے، دنیا میں رہے، مگر اہل دنیا کی طرح نہیں بلکہ طالبِ آخرت بن کر، انھوں نے اس سیل تند و تیز میں بھی اپنے اوپر قابو رکھا جس میں ہزاروں حکومتیں، سیکڑوں قومیں، ان کا تہذیب وتمدن، ان کے اصول واخلاق اور علوم وفنون خس وخاشاک کی طرح بہہ گئے۔ یہ قوت واقتدار کا سیلاب تھا جس کے متعلق علامہ اقبالؔ نے کہا ہے۔

تاریخِ امم کا یہ پیام ازلی ہے
صاحب نظراں! نشۂ قوت ہے خطرناک
اس سیل سبک سیر وز میں گیر کے آگے
عقل وخرد وعلم وہنر ہے خس وخاشاک

لوگ تاریخ اسلام کے اس واقعہ کو انتہائی حیرت اور تعجب کی نگاہ سے دیکھتے ہیں کہ مجاہدین اسلام حضرت سعد بن ابی وقاصؓ کی قیادت میں اپنے گھوڑوں سمیت دریائے دجلہ میں پھاند پڑے اور بغیر کسی جانی اور مالی نقصان کے اس کے پاٹ کو پار کر کے دوسرے کنارے پر جا اترے۔ بیشک واقعہ اپنی جگہ پر تعجب خیز ضرور ہے اور اس پر زیادہ سے زیادہ تعجب کرنا بجا ہے، لیکن اس سے کہیں زیادہ قابل تعجب بات یہ ہے کہ خلافتِ راشدہ کے دور میں روم وایران کو فتح کرنے والے مسلمان رومی وایرانی تہذیب وتمدن کے تلاطم خیز سمندر میں گھسے اور اس کنارے سے اس کنارے تک

جا نکلے، مگر اس ہوشیاری اور احتیاط کے ساتھ کہ ان کے اخلاق واطوار کا دامن ذرا بھی تر نہ ہونے پایا۔

عین فتوحات کے شباب کے زمانہ میں ان کے بڑے سے لے کر چھوٹے تک ہر ایک نے اپنے تمدن کی زہد، سادگی اور جفاکشی جیسی خصوصیات کو پوری طرح برقرار رکھا اور اپنی روح اور اپنے مزاج کو ان مفتوح اقوام کے عیش پرستانہ تمدن کی آلودگیوں سے بالکل پاک رکھا، حالانکہ "قعر دریا" میں پہنچ کر تر دامنی سے بچے رہنے کو عقل آج تک محال سمجھتی رہی ہے۔

عزت واقتدار کی دن دوگنی رات چوگنی ترقی کے باوجود ان کی سادگی اور متاعِ دنیا سے بے رغبتی کا جو عالم تھا اس کا اندازہ اس ایک واقعہ سے کیا جا سکتا ہے کہ شاہ اہواز ہرمزان نے جب خلیفۂ دوم حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کی خدمت میں حاضری کا ارادہ کیا تو:۔

> خدام نے اس کی خاص شاہانہ وضع بنائی، دیباج کی ایک زرنگار کی پوشاک زیب تن کی گئی، اس پر سامانِ زینت آراستہ کیا گیا، سر پر آزین نامی تاج رکھا گیا جس میں یاقوت جڑے ہوئے تھے، تاکہ خلیفۂ اسلام اور مسلمان اس کو ہیئت شاہی میں دیکھیں۔ چنانچہ اس کو اس شان کے ساتھ لئے ہوئے حضرت عمر فاروقؓ کے مکان پر پہونچے، وہاں آپ کو نہ پایا، تو لوگوں سے دریافت کیا کہ کہاں ملیں گے؟ معلوم ہوا کہ کوفہ کے ایک وفد سے مسجد نبویؐ میں ملاقات کر رہے ہیں، لہٰذا مسجد کا رخ کیا، مگر آپ وہاں بھی نظر نہ آئے۔ پھر واپس ہوئے، راستے میں مدینہ کے کچھ لڑکے کھیلتے ہوئے ملے، انھوں نے دریافت کیا کیا معاملہ ہے؟ کیا امیر المؤمنین کی تلاش میں ہو وہ دیکھو مسجد کے داہنے حصے میں اپنی برنس سر کے نیچے رکھے ہوئے

سورر ہے ہیں (ہوا یہ تھا کہ حضرت عمر فاروقؓ کوئی وفد سے ملاقات
کے وقت اپنی برنس پہنے ہوئے تھے، جب ان سے فارغ ہوگئے اور
وہ وفد اٹھ کر چلا گیا اور آپ تنہا رہ گئے تو برنس جسم سے اتار کر تکیہ کی جگہ
سر کے نیچے رکھ کر سو گئے تھے) خیر وہ پھر پلٹے، اور اب ان کے ساتھ
کچھ تماشہ بیں بھی ہوگئے تھے، مسجد میں داخل ہوئے، حضرت عمرؓ پر
نظر پڑی تو آپ کے قریب بیٹھ گئے، آپ بالکل تنہا تھے، ہاتھ میں
درہ لٹکا ہوا تھا، ان کے بیٹھنے پر ہرمزان (شاہ اھواز) نے دریافت
کیا کہ عمرؓ کہاں ہیں؟ بتلایا کہ یہ جو سو رہے ہیں (اور یہ خیال کر کے
باتوں سے امیر المومنین کی نیند خراب نہ ہو جائے) وفد نے باقی تمام
لوگوں کی طرف خاموشی کا اشارہ کیا (ہرمزان نے بھی اس کو محسوس کیا)
اور اپنے ساتھ والوں سے کان میں پوچھا، ان کے دربان اور محافظ
کہاں ہیں؟ انھوں نے کہا ان کا نہ کوئی دربان ہے نہ محافظ، نہ دفتر نہ
محرر، اور نہ دربار و ایوان۔ اس پر ہرمزان بولا! پھر تو انھیں نبی ہونا
چاہئے تھا کہا گیا کہ نبی تو نہیں ہیں مگر یہ کام نبیوں ہی کا کرتے ہیں، اسی
اثنا میں حضرت عمرؓ کی آنکھ کھل گئی اور سیدھے ہو کر بیٹھ گئے، ہرمزان پر
نظر پڑی تو فرمایا کون؟ ہرمزان! وفد نے کہا جی ہاں! حضرت عمرؓ نے
پھر اس کی ہیئت اور لباس کو غور سے دیکھا تو فرمایا: ﴿اعوذ بالله
من النار، واستعين بالله﴾ (میں جہنم کی آگ سے اللہ کی
پناہ چاہتا ہوں اور اس کی اعانت کا طالب ہوں، پھر فرمایا:
﴿الحمد لله الذى اذل بالاسلام هذا واشياعه﴾
(تعریف اس خدا کی جس نے اسلام کی قوت سے اس کو اور اس کے
اعوان وانصار کو ذلیل وخوار کرایا) پھر مسلمانوں سے مخاطب ہو کر

فرمایا۔ برادران اسلام! اپنے دین پر مضبوطی سے قائم رہو، اپنے نبی
کے طریق زندگی کو اختیار کیے رہو، خبردار! یہ دنیا تمہیں اپنے دامِ
فریب میں نہ لے لے، یہ بڑی ہی دھوکہ باز ہے۔ اس کے بعد وفد
اہواز نے ہرمزان کی طرف اشارہ کر کے عرض کیا: یہ اہواز کے بادشاہ
ہیں، ان سے گفتگو فرمایئے۔ آپ نے فرمایا: ''نہیں! میں اس سے
اس وقت تک خطاب نہیں کروں گا جب تک کہ اس کے جسم سے
زینت و آرائش کی ایک ایک چیز نہ الگ کردی جائے۔'' یہ سن کر اس
نے صرف بقدر ستر کپڑے کے علاوہ اپنے بدن کی ہر چیز اتار ڈالی
اور ایک موٹے کھردرے قسم کا لباس اس کو پہنا دیا گیا، تب آپ
نے اس سے گفتگو فرمائی۔(۱)

یہ حال تو مملکت اسلامی کے دوسرے خلیفہ کا تھا، اسی مملکت کے چوتھے
خلیفہ کا بھی حال سن لیجئے، جن کا دور آنے تک حدود مملکت کچھ اور وسیع ہو چکی تھیں۔
ضرار بن ضمرہؓ حضرت علیؓ کی وفات کے بعد ان کے دورِ خلافت کا حال
حضرت معاویہؓ سے بیان کرتے ہیں کہ:

آپ دنیا کی رنگینیوں سے متنفر تھے، رات کی تاریکیوں اور تنہائیوں
سے آپ کو انس تھا، قلب مضطر اور چشم اشکبار پائی تھی، آخرت کے
سوچ میں ڈوبے رہتے، اور اسی سوچ میں کبھی کبھی خود اپنی ذات سے
مخاطب ہوجاتے، روکھا پھیکا کھانا اور موٹا جھوٹا پہننا پسند فرماتے،
خدا گواہ ہے کہ ہم میں سے ہر شخص کو اپنے برابر سمجھتے، ہم اگر کوئی
درخواست کرتے تو آپ منظور فرماتے، ہم اگر آپ کے پاس جاتے
تو خود بڑھ کر خندہ پیشانی سے ملتے، ہم اگر آپ کو دعوت دیتے تو

---

(۱) تاریخ طبری جلد۲ص:۵۰۱/۵۰۲

تشریف لاتے، اہل دین کی توقیر فرماتے، ناداروں سے محبت رکھتے، کوئی طاقتور یا ذی اثر فریق (طاقت اور اثر کے بل پر) آپ سے نامنصفانہ فیصلہ کرالینے کی توقع نہیں رکھ سکتا تھا، اور کوئی کمزور اپنی کمزوری پر نظر کرکے آپ کے انصاف اور اپنے حق سے مایوس نہیں ہوتا تھا، خدا گواہ ہے کہ بعض مواقع پر ان آنکھوں نے یہ منظر دیکھا ہے کہ شب تاریک اپنے پردے چھوڑ چکی ہے، ستاروں تک کو نیند آچکی ہے، مگر وہ اپنی خلوت گاہ میں اپنی داڑھی پکڑے ہوئے کھڑے ہیں، تڑپ رہے ہیں، بلبلا رہے ہیں، جیسے کسی کو سانپ نے ڈس لیا ہو، اس طرح پھوٹ کر رو رہے ہیں جیسے کبھی کسی غم نصیب کو روتے دیکھا ہو، آپ کے اس وقت کے یہ الفاظ اب بھی میرے کانوں میں گونج رہے ہیں۔ ''یا دنیا! أبی تعرضت أم لی تشوفت؟ هيهات هيهات غرى غيرى، قد بتتك ثلاثاً لا رجعة لى فيك فعمرك قصير وعيشك حقير وخطرك كبير، آه من قلة الزاد وبعد السفر ووحشة الطريق" (اے دنیا! کیا تو میرے آگے اپنا جال بچھا رہی ہے؟ کیا تو مجھ پر اپنا بناؤ سنگار کا جادو چلانا چاہتی ہے؟ جا دور ہو جا! کسی اور کو بہلا، کسی اور کو پھسلا! میں تو تجھ کو تین طلاقیں دے چکا ہوں، اب تو مجھ سے مایوس ہو جا، اب میں تیری طرف رخ نہیں کر سکتا، تیری عمر بہت تھوڑی ہے، تیرا عیش بہت حقیر ہے، لیکن تجھ سے خطرات بہت بڑے ہیں،.... آہ! توشہ کتنا کم! منزل کتنی دور!! اور راستہ کتنا وحشت ناک!۔(۱)

---

(۱) تاریخ طبری جلد۴ص:۲۲۷

بہرحال خلفائے راشدین کے دور میں اسلامی حکومت کا شعار انسانی برادری کی خدمت اور دعوت وہدایت کی جدوجہد تھا، حکومت دین واخلاق کے لئے بڑے بڑے مالی خسارے برداشت کرتی تھی، اگر کسی موقع پر اس کے سامنے لوگوں کے روحانی واخروی منافع اور اپنے مادی ومالی فوائد میں ترجیح کا سوال آجاتا تو وہ بڑی خوشی سے لوگوں کی روحی اور اخروی منفعت کی خاطر اپنی مالی منفعت قربان کردیتی، اور اگر کبھی کوئی ایسی صورت ہوجاتی جس سے اس کو تو کچھ مالی فائدہ حاصل ہوجاتا مگر دوسرے لوگوں کو روحانی اعتبار سے نقصان پہونچ جاتا تو اس پر خود حکومت کو اور عام مسلمانوں کو اتنا رنج وافسوس ہوتا جیسے کہ ان کے ہاتھ سے حکومت جاتی رہی۔ پہلے چار خلفاء اور پانچویں خلیفۂ راشد حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ نے ہمیشہ غیر مسلم مفتوحین سے جزیہ وصول کرنے پر ان کے اسلام لانے اور ہدایت یاب ہونے کو ترجیح دی، باوجود کہ اُن کے اسلام قبول کرنے کی صورت میں اسلامی بیت المال کو مالی اعتبار سے زبردست نقصان پہنچتا تھا، مگر چونکہ اس نقصان کے مقابلے میں بندگانِ خدا کو نجات اور دخول جنت کا عظیم الشان اخروی فائدہ پہونچتا تھا جس کے لئے خود دعوت دینا اور لوگوں کو راغب کرنا ان کی حکومت کا اولین مقصد اور ان کا منصبی فرض تھا، اس لئے اس پر وہ دل سے خوش ہوتے تھے، اور اگر اس کے برعکس غیر مسلم اسلام لانے سے انکار کردیتے تو باوجود یہ کہ جزیہ کی رقم ملتی، بیت المال کو فائدہ پہونچتا، مگر انھیں سخت دکھ ہوتا، اس لئے کہ ان لوگوں کا ہدایت پاجانا انھیں اپنے اس مالی فائدہ سے کہیں زیادہ محبوب تھا۔ اس سلسلہ کا ایک واقعہ مؤرخ طبری نے بروایت زیاد بن جزء الزبیدی بیان کیا ہے:

> زیاد کہتے ہیں کہ: ایک مرتبہ مصر میں ہم نے عیسائی قیدیوں کو ایک جگہ جمع کیا، کچھ شہری عیسائی بھی اکٹھے ہوگئے، پھر ہم نے یہ کرنا شروع

کیا کہ ایک قیدی کو سامنے لاتے اور اس سے سوال کرتے کہ نصرانیت ہی پر قائم رہنا چاہتے ہو یا اسلام کو پسند کرتے ہو؟ اگر وہ اسلام کو اختیار کر لیتا تو ہم جوش مسرت سے اتنا زوردار نعرۂ تکبیر بلند کرتے کہ کسی شہر کے فتح کرنے کی خوشی میں بھی اتنے زوردار نعرے نہیں لگاتے تھے، پھر ہم اس کو اپنی جماعت میں شامل کر لیتے، اور اگر وہ نصرانیت ہی کو پسند کرتا تو عیسائیوں کی طرف سے خوشی کی آواز بلند ہوتی، اور وہ اس کو اپنی طرف لے لیتے، تب ہم اس پر جزیہ مقرر کر دیتے، مگر بادل ناخواستہ، اس لئے کہ اس صورت میں ہمیں اتنا رنج ہوتا تھا کہ جتنا کسی مسلمان کے نصرانی ہو جانے کی صورت میں ہوسکتا تھا۔'' (۱)

خلفائے راشدین کے یہی بہی خواہانہ جذبات اور ان کا یہی داعیانہ طرز عمل تھا کہ جس کے نتیجے میں اسلام گنتی کے چند سال میں مدینہ سے نکل کر مشرق و مغرب کی وسعتوں میں پھیل گیا۔ اور انسانی دنیا اخلاقِ فاضلہ کی دولت سے مالا مال ہوگئی۔

خلفائے اربعہؓ کے گذر جانے کے بعد حکومت کی نوعیت بدل گئی، اس لئے رفتہ رفتہ آثار و نتائج بھی دوسرے رنگ کے ظاہر ہونے لگے، جاہلی طور طریق زندہ ہونے لگے، اسلام کے سادہ تمدن میں تزئین و تفاخر کا رنگ بھرا جانے لگا، اور جامع الفاظ میں اقتدار کا نشہ رنگ لانے لگا، اسی اثنا میں حکومت کی باگ عمر بن عبدالعزیزؒ کے ہاتھ میں آئی، یہ اس دوسرے دور کے خلفاء کے راستے چھوڑ کر خلفائے اربعہ کے راستے پر چلے، انھوں نے پھر سے حکومت کو دعوت دین کا خادم بنایا، ہدایت و خدمت کو شعار حکومت قرار دیا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ گو انھیں کام کرنے کے لئے

---

(۱) صفة الصفوة لابن الجوزی۔ ج ۱۔ ۱۲

دو سال چند مہینے ہی کا وقت ملا، مگر انھوں نے عالم اسلامی کا رنگ بدل کر رکھ دیا۔ عیش پرستی کے سیلاب کو روکا، تمدن کا نقشہ بدلا، کارپردازان حکومت کے دماغ سے "نشۂ قوت" دور کیا، غیر اسلامی رسوم اور جاہلی تخیلات کا قلع قمع کیا، اور دین حق کو سر بلند اور کفر کو سرنگوں کرنے کے وہ کارہائے نمایاں انجام دیئے جن سے بڑی بڑی طویل المدت اسلامی حکومتیں قاصر رہیں.... کیونکہ وہ مخلوق کی ہدایت وبھلائی کو اپنا واحد نصب العین بنانے کا فیصلہ کرنے پر قادر نہ ہو سکیں، بلکہ تحصیل مال ومنفعت کو بھی اس کے ساتھ لے کر چلنا چاہا، اور جہاں ان دونوں چیزوں میں ٹکراؤ ہو، وہاں حکومت اکثر اپنی مالی منفعت کی طرف جھک گئی۔

حکومت راشدہ کے دور میں اسلامی ریاست کے مرکزی مقامات، دعوت وہدایت کا بھی مرکز تھے، بایں معنی کہ جب کوئی مسلمان ان مقامات میں پہونچتا تو وہ صاف طور پر محسوس کرتا کہ وہ اسلام کے مرکز میں چل پھر رہا ہے، اسلامی فضا میں سانس لے رہا ہے۔ کیونکہ وہ کھلی آنکھوں سے دیکھتا، کہ اسلامی حدود قائم ہیں، شرعی قوانین نافذ ہیں، اور ہر مسئلہ میں شریعت کا فیصلہ آخری فیصلہ ہے، وہاں اسے کوئی متنفس ایسا نظر نہیں آتا جو دینی امور میں سست ہو، دین کی وقعت کو کم کرتا ہو، یا کھلے بندوں احکام اسلامی کی خلاف ورزی کرتا ہو، وہاں سے اسے بدعت ومعصیت کا وجود نہ ملتا، وہاں کے تمدن میں اسے عریانی وفحاشی اور بے حیائی کا نام ونشان نظر نہ آتا وہاں وہ حکومت کی مشینری کے متعلق رشوت کے چرچے اور بدیانتی کے قصے نہ سنتا، غرض اسے وہاں کوئی چیز بھی ایسی نظر نہ آتی جو روح اسلام کے منافی ہو، بلکہ ہر طرف تعلق باللہ اور فکرِ آخرت کی دعوت، حسنِ اخلاق اور خدا ترسی کی دعوت، اتباع کتاب وسنت کی دعوت، شرک وبدعت سے بچنے کی دعوت، اور دین سے مکمل وابستگی کی دعوت وتاکید کے چرچے ہی سننے میں آتے، وہ ان مقامات کے باشندوں کو اسی

ذکر وفکر میں ڈوبا ہوا، اور اسی کے مقتضیٰ پر عمل پیرا دیکھتا، خواہ وہ جلوت میں ہوں یا خلوت میں، بازار میں ہوں یا رہگذر میں، اپنے گھر میں ہوں یا حکومت کے دفتر میں اس کا نتیجہ یہ تھا کہ ان مقامات کے قیام سے اس شخص کی رگ رگ میں دین کی روح سرایت کرجاتی، وہ دین کی لذت شناس ہوجاتا، اس کا ایمان تازہ ہوتا، دل ایمانی قوت، اور اہل ایمان کی محبت سے لبریز ہوجاتا، دین کے احکام ومسائل معلو م ہوتے، اور دماغ حکمت وبصیرت سے بہرور ہوجاتا، اور وہ وہاں سے علم وحکمت ایمان واستقامت، اہل دین کی محبت اور اس کے نمائندوں پر اعتماد کی بیش بہا دولتیں لے کر اپنے گھر لوٹتا یا اگر کوئی غیر مسلم یا بالکل نومسلم ان مقامات میں پہونچ جاتا تو اس پر غیر اسلامی نظام حیات کے مقابلے میں اسلامی نظام حیات کی اور غیر اسلامی حکومت کے مقابلے میں اسلامی حکومت کی بہتری اور برتری عیاں ہوجاتی، اس کا جی چاہتا کہ یہیں رہ پڑے اور یہاں سے لوٹ کر غیر اسلامی حکومت میں جانے کا تصور تو اس کے لئے ایسا روح فرسا ہوتا جیسے اسے جنت سے نکال کر جہنم میں ڈھکیلا جارہا ہے۔

مکہ معظمہ اور مدینہ منورہ جنھیں اس ہدایت شعار حکومت میں سب سے زیادہ مرکزیت حاصل تھی یہ صرف حکومت کے صدر مقامات ہی نہیں تھے، بلکہ دین کی مثالی درسگاہ اور اسلامی تہذیب کا گہوارہ بھی تھے، یہاں اسلامی زندگی پوری آب وتاب کے ساتھ جلوہ گر تھی، عالم اسلامی کے گوشہ گوشہ سے مسلمان یہاں کھنچ کر آتے تھے، تاکہ دین کی حقیقت کو سمجھیں اور اس کے عملی نمونے اپنی آنکھوں سے دیکھیں، پھر وہ یہاں سے دینی علم وعمل اور دعوتی روح کی سوغات لے کر اپنے وطن واپس ہوتے۔ اور ہر معاملے میں اہل حرمین کے طرز عمل کو بطور حجت کے پیش کرتے، اور اس کو حجت مانا بھی جاتا، کیونکہ اس وقت حجاز کتاب وسنت کا علماً وعملاً امین ومحافظ تھا،

اور وہاں کی حکوت کو ہر دم اس بات کی لگن تھی کہ مرکز اسلام میں زندگی کا نقشہ پوری طرح کتاب وسنت کے مطابق ہو۔

اس حکومت کے مثالی دور کا خاتمہ

لیکن ایک وقت آیا کہ جب مسلمانوں نے اس حقیقت کو بھلا دیا کہ یہ اقتدار اصل میں ایک انعام تھا، جو ان کے اسلاف کو داعیانہ اور مجاہدانہ خدمات کے صلہ میں دربار خداوندی سے عطا ہوا تھا، اور اب انھیں کے صدقے میں ان کو حاصل ہوا تھا۔ وہ اس بات کو بھول گئے کہ اگر حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم مبعوث نہ ہوتے، اگر انھوں نے دنیا کو اللہ کا پیغام اور اس کے دین کی دعوت نہ دی ہوتی، اگر آپ نے اس کے لئے قریش مکہ اور عرب کے ہاتھوں دل دہلا دینے والے مظالم نہ سہے ہوتے، اگر آپ نے اس دعوت کے لئے مکہ جیسا وطن نہ چھوڑا ہوتا، اگر آپ نے اس کے لئے کئی دن ثور کے بھیانک غار میں چھپنے کی زحمت گوارا نہ فرمائی ہوتی، اگر معرکۂ احد میں دندان مبارک نہ شہید ہوئے ہوتے، اور اگر اسی احد کے دن آپ کے پیارے چچا اس دعوتِ حق کے لئے شہید نہ ہوئے ہوتے، ہندہ نے ان کا مثلہ کر کے ان کا جگر مبارک نہ چبایا ہوتا، اگر بئر معونہ پر مقدس صحابہؓ کا دردناک قتل نہ ہوا ہوتا، اور اگر خبیبؓ (۱) پھانسی کے تختے پر نہ چڑھے ہوتے.. تو یہ دینا آج یوں عربوں کی قدم بوس نظر نہ آتی، اور نہ یہ دمشق وبغداد (۲) شہرت کے ہفت آسماں پر پہنچتے، نہ بنی مروان روم وایران سے باج وخراج وصول کر سکتے تھے، اور نہ ہارون الرشید

---

(۱) یہ انصاری صحابی ہیں جن کے جسم مبارک کو کفار نے پہلے بھالوں سے چھیدا، اور پھر پھانسی دے دی، مگر اس استقامت وفداکاری کے پتلے نے یہ شعر پڑھتے ہوئے جان دے دی:

ولست ابالی حین اقتل مسلماً علی ای جنب کان فی اللہ مصرعی

(اگر میرا قتل راہِ خدا میں ہے تو پھر مجھے پرواہ نہیں کیسے ہی قتل کیا جاؤں)

(۲) بنوامیہ اور بنوعباس کے زمانے کے دارالسلطنت۔۱۲

کا یہ منہ ہوتا کہ گذرتے بادلوں سے کہہ سکے ''امطری حیث شئت فسیأتینی خراجک '' (جہاں جی چاہے برس، تیری پیداوار کا خراج بہرحال میرے پاس آئے گا)

بہرحال ایک زمانہ آیا کہ مسلمان اس حکومت اور دعوت کے تعلق کو بھول گئے، خلافتِ راشدہ کے بعد ان کے حکمرانوں نے ''حکومت برائے ہدایت'' کے اساسی نظریہ کو بدل کر ''حکومت برائے دولت وقوت'' کی بنیاد ڈالی، اور اس خداداد اقتدار کو دعوتِ نبوی کی خدمت کے بجائے مالی منافع اور سیاسی مصالح کا آلہ کار بنادیا، دنیا کو اللہ کی بندگی کی طرف بلانے اور جنت کی راہ پر لگانے کا کام چھوڑ دیا، شریعت کی مقرر کردہ حدود عملاً معطل کردی گئیں، جمہور کے دین واخلاق پر سے احتساب اٹھالیا گیا۔ اور امر بالمعروف، نہی عن المنکر کا سسٹم گویا اڑادیا گیا، غرض یہ کہ قرآن پاک نے انبیاء سابقین کے گمراہ ہوجانے والے اخلاف کے متعلق جو فرمایا تھا:

''فَخَلَفَ مِنْ بَعْدِهِمْ خَلْفٌ اَضَاعُوا الصَّلٰوةَ وَاتَّبَعُوا الشَّهَوَاتِ''۔ (سورہ مریم۔۵۹)

ان اسلاف کی جگہ ایسے اخلاف نے لی، جنھوں نے نمازوں کو لاپرواہی کی نذر کیا، اور خواہشات کی پیروی کی۔

ان مسلمان حکمرانوں نے اپنے آپ کو اس کا صحیح مصداق بنالیا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اسلام کے مرکز اب باہر سے آنے والے مسلمانوں کو نہ دینی زندگی کا درس دیتے، اور نہ ان کے سامنے اسلامی تہذیب وتمدن کی صحیح تصویر پیش کرتے، اب یہاں آنے والے ایمان ویقین کی روح پرور کیفیات، عقائد کے استحکام و دین اور اہلِ دین پر اعتماد کے بجائے شک ونفاق اور بے اعتمادی کے امراض میں مبتلا ہوکر لوٹتے۔ پہلے جن مقامات سے اطراف عالم کے مسلمان شعائر اسلامی کی توقیر، دین پر استقامت کا جوش، اس کے احکام کی تعمیل میں چستی اور اس کے

نمائندوں کے ساتھ حسن ظن کی سوغات لے کر لوٹا کرتے تھے، اب وہ وہاں سے تعظیم وتوقیر کی جگہ استخفاف و بے وقعتی، جوش استقامت کی جگہ ضعف، چستی کی جگہ سُستی، اور حُسن ظن کی جگہ سوء ظن کی پوٹ لے کر اپنے گھر واپس آتے، اور پہلے جس طرح وہاں کے طرز عمل اور طرز زندگی کو ہر معاملہ میں بطور حجت پیش کیا جاتا تھا، اب بھی اسی طرح پیش کیا جاتا حالانکہ اب وہ اس قابل نہ رہا تھا۔ اور ناواقف لوگ اب بھی اس کی اس حیثیت کو تسلیم کرتے، اور یہ چیز اُن لوگوں کے لئے بڑی مصیبت اور ان کی راہ میں زبردست رکاوٹ بنی، اور آج بھی بن رہی ہے جو عالمِ اسلامی کے مختلف حصوں میں پھر سے اسلام کے نظام حیات کو زندہ کرنے کے لئے کوشاں تھے، یا کوشاں ہیں۔

اسلامی دنیا بلکہ کل انسانی دنیا کی سب سے بڑی ضرورت

آج عالمِ اسلام کی بیسیوں مختلف ضروریات ہیں، مگر اس کی سب سے بڑی، سب سے اہم، اور سب سے مقدم ضرورت ایک ایسی حکومت ہے جو دعوت وہدایت، اور خدمت وخیر خواہی کے نظریہ پر قائم ہو اور عالم اسلامی کی اصل حیثیت دنیا کے سامنے پیش کرے، اس لئے کہ اسلام اس وقت نہ لوگوں کے دلوں کو اپیل کر سکتا ہے اور نہ مفکرین عالم کے دماغوں کو مطمئن کر سکتا ہے جب تک کہ روئے زمین پر اُسے ایک ایسا ٹکڑا نہ مل جائے جہاں نظام زندگی کی تشکیل اس کی مرضی کے مطابق ہو، جہاں صرف اس کی تہذیب اور اس کا تمدن رائج ہو، جہاں انفرادی اور اجتماعی زندگی کا سارا کاروبار اُس کے نقشہ کے مطابق چلے۔ اور پھر دنیا اس تجربے کے نتائج دیکھے!...... یہ تجربہ اگرچہ چھوٹے سے چھوٹے خطۂ زمین پر بھی ہو مگر اس کے نتائج دنیا کو مجبور کر دیں گے کہ وہ سنجیدگی سے اسلام پر غور کرے، اور پھر اگر خدا نے چاہا تو ''يَدْخُلُوْنَ فِيْ دِيْنِ اللّٰهِ اَفْوَاجًا'' کا وہ منظر

جسے دیکھنے کے لئے آنکھیں مدت سے ترسی ہوئی ہیں ایک بار پھر دیکھا جا سکے گا۔

یاد رہے کہ یہ ضرورت تنہا عالم اسلام ہی کی نہیں ہے بلکہ پوری انسانی دنیا اس قسم کی حکومت کی حاجت مند ہے جتنی حاجت مند اسلامی دنیا ہے، اس لئے کہ آج کی مریض و مجروح انسانیت کے دکھ درد اور دلدر دور ہونے کی کوئی صورت اس کے سوا اور نہیں ہے کہ زمین کے کسی خطہ پر ایک ایسی حکومت کا قیام عمل میں آوے جس کی بنیاد اللہ کی اطاعت و عبدیت نوع انسانی کے احترام و عظمت، مادی منافع کے مقابلہ میں روح کی اہمیت، خواہشات پر اخلاقی احساس کے غلبہ اور دولت بنانے پر آدمی بنانے کو ترجیح دینے کے بلند نظریات پر رکھی گئی ہو، یہ حکومت چاہے کتنی ہی چھوٹی اور کتنی ہی قلیل الوسائل ہو، مگر جس وقت بھی اور جہاں کہیں بھی قائم ہو گئی تو دنیا کے لئے ایک نادر واقعہ ہی نہیں جانفزا مژدہ بھی ہوگی، جس کے نتائج منظر عام پر آتے ہی ہر طرف سے بے اختیار مرحبا مرحبا کی آوازیں بلند ہوں گی، دنیا کے بڑے بڑے سیاسین اور مدبرین اور ائمہ فکر جو انسانیت کا حال زار دیکھ دیکھ کر روز بروز اس کے مستقبل سے مایوس ہوتے جا رہے ہیں، ایک نئی امید کے ساتھ اس کی طرف نظریں اٹھائیں گے۔ انسانیت کے الجھے ہوئے مسائل کو حل کرنے میں اس کی کامیابی ضرب المثل بنے گی، آج جو مفکرین عالم اس پر سنجیدگی سے غور کرنے کے لئے بھی تیار نہیں ہیں، وہی دنیا کو اس کی دعوت دیں گے، اور اس پر بڑی بڑی ضخیم تالیفات و تصانیف کا ڈھیر لگا دیں گے، دنیا کے عوام کے لئے اس کا قیام ایک ایسی نعمت غیر مترقبہ ہوگا جیسے ڈوبتے کو کہیں کنارہ مل جائے، انسانیت کی مظلوم اولاد، تہذیب جدید کی خوشنما ناگن کے ڈسے ہوئے اور ناہموار سماج کے ستائے ہوئے انسان، حکومتوں کے جور و ستم اور لوٹ کھسوٹ کے مارے ہوئے عوام ہر طرف سے اس نئی حکومت، نئی تہذیب اور نئے سماج کے سایۂ عافیت میں

پناہ لینے کے لئے دوڑیں گے اور بلاشبہ یہ حکومت جبین دہر کا نور، اور رخِ انسانیت کا خالِ دلکش قرار پائے گی۔

انسانیت سکھ اور چین کی تلاش میں بہت سی حکومتوں کا تجربہ کر چکی ہے، اس نے شخصی حکومت کو بھی آزما لیا، جمہوری راج کو بھی آزما لیا، سرمایہ داری اور اشتراکیت کو بھی آزما کے دیکھ لیا، مگر کہیں اس غریب کی اُمیدیں بر نہ آئیں، کسی دُکان پر اس کے درد کی دوا نہ ملی، اسے رکھوالوں کے بھیس میں رہزن ملے جنھوں نے اس کا سہاگ لوٹ لیا، اس کی رگ جان کا خون چوس لیا، ہر نیا تجربہ کچھ نئی تلخیوں اور نئی الجھنوں کا باعث بنا، اور اب بالآخر وہ اس نتیجہ پر پہونچ گئی ہے کہ ان حکومتوں کے نام ایک دوسرے نے کتنے ہی مختلف سہی مگر اصل سب کی ایک ہی ہے صورتوں میں کتنا ہی فرق سہی مگر حقیقت سب کی ایک ہی ہے، فطرت ایک ہی ہے، مزاج ایک ہی ہے، اور مطمحِ نظر سب کا ایک ہی ہے، اور وہ ہے......اس کا خون چوسنا اور موٹا ہونا، اس کو تباہ کر کے خود کو بنانا......!

اب اگر ایسے وقت میں ایک نئی مملکت وجود میں آتی ہے۔ جس کا صدر مسلمان، وزراء مسلمان اور ارکان و حکام مسلمان! مگر اپنی حقیقت، اپنی فطرت، اپنے مزاج اور اپنے مقاصد و نظریات کے اعتبار سے وہ دنیا کی دوسری حکومتوں سے مختلف و ممتاز نہیں ہے۔ تو یہ دنیا کا کوئی نرالا واقعہ نہ ہوگا، نہ یہ مظلوم انسانی دنیا اس کو کوئی خاص اہمیت دے گی۔ اور نہ کوئی بڑی امیدیں اس سے وابستہ کرے گی، اس لئے کہ اس قسم کی تو ہزاروں حکومتیں پہلے ہی سے موجود ہیں جو اپنی حدود کے لحاظ سے اس نئی حکومت سے کہیں زیادہ وسیع ہیں، ان کا میزانیہ بھی اس کے میزانیہ سے بہت زیادہ مضبوط ہے، ان کی پیداوار اور برآمد بھی زیادہ ہے فوجی طاقت میں بھی ان کا پلہ بھاری ہے، بڑی فوج ان کی زیادہ مضبوط، بحری بیڑہ ان کا زیادہ طاقتور،

اور فضائی طاقت میں بھی وہ اس سے فائق تر، کارخانے اور فیکٹریاں ان کے پاس زیادہ، صنعت وتجارت کے میدان میں بھی وہ زیادہ ترقی یافتہ، آرائش ونمائش کے لحاظ سے ان کی تہذیب وتمدن کا معیار بھی زیادہ بلند، ملکی نظم ونسق کے لحاظ سے بھی ان کی حالت بہتر، ان کے عوام میں تعلیم بھی نسبتاً عام، غرض دوسری موجودہ حکومتیں خصوصاً مغربی دنیا کی حکومتیں جب اس قسم کی چیزوں میں اس نوازائیدہ مسلم حکومت سے بدرجہا زیادہ آگے ہوں گی تو کیونکر اس کا قیام دنیا کی نظر میں کوئی خاص اہمیت حاصل کرسکے گا، جبکہ اس کے پاس نہ کوئی نیا مقصد ہو نہ کوئی نیا نظریہ، اور نہ وہ اپنی خوبیوں میں ان سے مختلف!۔

دینی واصلاحی دعوتوں کی تاریخ پر عبور رکھنے والے اور عادات الٰہیہ کے جاننے والے جانتے ہیں کہ دنیا کے کسی حصے میں مسلمانوں کی کسی سلطنت کا وجود میں آنا ایک ایسے نادر موقع کے ہاتھ آنے کے مرادف ہے جو صدیوں میں کبھی ہاتھ آتا ہے، یہ گردشِ لیل ونہار کا ایک سنہرا لمحہ ہوتا ہے، اس کی مثال ایسی ہے جیسے رات کی گھٹاٹوپ اندھیریوں کے بیچ بیچ میں کبھی بجلی چمک جائے، لیکن جس قدر یہ موقع قیمتی ہے ارباب حکومت کے لئے اتنا ہی بڑا امتحان بھی ہے، اگر انہوں نے اس موقع کو اپنے ذاتی مفادات اور مصالح کے لئے استعمال کرنے کے بجائے اپنے دین کی دعوت کو طاقتور اور مؤثر بنانے اور اس کے نظریات کو بروئے کار لانے کے لئے استعمال کیا تو بیشک انہوں نے اس کی قیمت پہچانی اور اس کا حقیقی فائدہ حاصل کیا۔ بیشک انہوں نے اپنے دین کی صحیح نمائندگی اور لوگوں کے حسن ظن کو حق بجانب ثابت کردکھایا، اور حقیقت یہ ہے کہ ایسا کرنے والوں نے اپنے دین ہی کا نام اونچا نہیں کیا، بلکہ خود اپنی ذات کو بھی لافانی فائدہ پہونچادیا، جو انھیں مرنے کے بعد ضرور معلوم ہوجائے گا۔ اور اگر انہوں نے اُس کا الٹا کیا، یعنی

دین، اس کی دعوت، اس کے مصالح، اس کے پھیلانے اور اس کا علم تھامے رہنے کے لئے لوگوں کی قربانیاں، نیز قیام حکومت کے سلسلہ میں ان کی مساعی وغیرہ ان تمام چیزوں کو نظر انداز کر کے اس نادر موقع سے صرف اپنی ذات اور متعلقین کے لئے فائدہ اٹھانے کی کوشش کی، اور بنو امیہ اور بنو عباس کے نقش قدم پر چلے، تو بیشک انہوں نے بہت براراستہ اختیار کیا، انہوں نے اس بہترین موقع کو ضائع کر دیا، انہوں نے اپنا بھی نقصان کیا اور اپنے ساتھ دینی دعوت کا بھی نقصان کیا، اب کسے پتہ ہے کہ یہ موقع دوبارہ کب آئے گا، یا کبھی آئے گا بھی یا نہیں؟ اس کے متعلق کوئی کیا کہہ سکتا ہے...... تاریخ ایسی بہت سی امتوں اور جماعتوں کے متعلق بتاتی ہے کہ جنہوں نے اپنی حکومت واقتدار کے موقع کو ضائع کر دیا اور اس کا اصل فائدہ نہ اٹھایا ...... کہ جب ان کا دور ختم ہو گیا اور یہ موقع ہاتھ سے نکل گیا تو وہ زندگی کے میدان سے ہٹ گئیں، اور بصد حسرت وندامت پچھڑی ہوئی قوموں کی صف میں کھڑے ہو کر عہد رفتہ کی واپسی کا انتظار کرنے لگیں...... مگر کسے پتہ ہے کہ یہ موقع لوٹ کر آئے گا یا نہیں یا اگر آئے گا تو کب آئے گا؟۔

اسلامی حکومتوں سے

آج روئے زمین پر جتنی مسلمان حکومتیں قائم ہیں ان کے اربابِ حل وعقد کو گویا یہ زرّیں موقع حاصل ہے۔ کاش! وہ اس سے فائدہ اٹھائیں اور ایک بڑے کارنامے کا سہرا اپنے سر باندھیں، ان کے لئے موقع ہے کہ ہمت اور توجہ سے کام لے کر وہ مرتبہ حاصل کر لیں جس پر بڑے بڑے اتقیاء وصلحاء اور عبّاد وزہاد بھی نہیں پہونچ پاتے، اس لئے کہ انھیں قوت واقتدار اور وہ مواقع کار حاصل ہیں جو دوسروں کو حاصل نہیں، ان کے لئے موقع ہے کہ اگر عزم واخلاص کے ساتھ کھڑے

ہو جائیں تو صرف ایک دن میں دین کی خدمت اور اس کے احیاء، سوسائٹی کی اصلاح، اور جاہلیت سے اسلام کی طرف اس کے رخ کی تبدیلی کا اتنا کام ہو جائے جتنا مصلحین واہل قلم برسوں میں نہیں کر سکتے، اور پھر دین و دنیا میں اللہ کی اتنی خوشنودی حاصل ہو جس پر بڑے بڑے زاہدوں اور متقیوں کو بھی رشک آجائے۔

حضرت عمر بن عبد العزیزؒ کو ایک عظیم المرتبت مجدّد اور خلیفۂ راشد کے لقب کا اعزاز آکر اسی بنا پر تو حاصل ہوا کہ اسلامی حکومت خلافتِ راشدہ کے بعد جس غلط سمت میں سرگرم ہو گئی تھی، ان کے ہاتھ میں جوں ہی باگ ڈور آئی انہوں نے فوراً ہی اُسے اس سمت سے ہٹا کر صحیح سمت پر ڈال دیا، سیاست، تمدن اور معاشرت میں زبردست اصلاحات کا بیڑا اٹھایا، اور جاہلیت کی ایک ایک آلائش کو چھان ڈالا، اور اس سلسلہ میں ہر وقت ہر ناراضگی اور ہر چیں بہ جبینی کا انتہائی ثابت قدمی اور جوانمردی سے مقابلہ کیا، اور پھر اس کارِ عظیم کی انجام دہی میں انہوں نے کیا کھویا اور کیا پایا؟ اگر کوئی یہ معلوم کرنا چاہے تو واقعہ یہ ہے کہ انھوں نے جو کچھ جان بوجھ کر کھو دیا، وہ اس شے کے مقابلہ میں بالکل ہیچ ہے، جس کو انھوں نے پالیا، اور اس پہلو سے ان کا یہ کارنامہ ان کی انتہائی دانشمندی کا بھی ثبوت ہے جو چیزیں انھوں نے کھوئیں وہ تھیں ہی ایسی کہ ایک نہ ایک دن کھونی ضرور تھیں یعنی دنیا کا عیش، مال ومتاع، لذیذ کھانے، عمدہ پوشاکیں، اور خدم وحشم...... جنھیں نذرِ فنا ہو جانا ہی تھا، لیکن اتنا کچھ کھو کر جو کچھ انھوں نے پالیا تھا وہ ایسا تھا کہ دنیا ومافیہا کے عوض میں بھی مل جائے تو سستا رہے، یعنی ایک دائمی راحت، لازوال عیش، پائیدار مسرت، سرکارِ دوعالم (صلی اللہ علیہ وسلم) کی ایک نظرِ کرم، اور آپ کے حلقۂ رُفاقت کی شرکت کی امید، اور بعد والوں کے دلوں میں وقعت، اور زبانوں پر ذکرِ خیر!۔

آج اسلام کو پھر ایک عمر بن عبد العزیزؒ کی ضرورت ہے...... دیکھیں یہ

سعادت کس نصیب ور کے لئے مقدر ہے۔

یہ ایک پیغام تھا، جو خط کی شکل میں دراصل سعودی عرب کے مؤسس اور فرماں رواں ''فاتح جزیرہ'' ملک عبدالعزیز بن عبدالرحمٰن آل سعود کے نام لکھا گیا تھا مرحوم اس وقت حیات تھے، مگر عملاً کاروبار سلطنت ان کے ولی عہد شاہ سعود بن عبدالعزیز اوران کے وائسرائے مکہ وجدہ شاہ فیصل کے ہاتھ میں تھا، یہ پورا مکتوب (یا مقالہ) ولی عہد کے مقرب ترین بزرگ خاندان اوراپنے وقت کے ایک بڑے ''شیخ'' علامہ عمر بن حسنؒ نے ولی عہد کو پڑھ کرسنایا ولی عہد نے اس کا کیا اثر لیا، یہ تو نہیں معلوم ہوسکا، مگراس خط کے باوقار ذی علم فرستادہ شیخ عمر بہت متاثر ہوئے اور بہت تحسین ودعاء کے ساتھ مولانا کو شکریہ کا خط لکھااورایک سے زیادہ بار اپنی مجلسوں میں پڑھ کرسنایا،اوران سے مولانا کی خط وکتابت ہوتی رہی، یہ خطوط مجھے دستیاب نہ ہوسکے۔مگر چونکہ اس زمانے میں میرا قیام وہاں تھا اوراکثر تبییض کی خدمت بھی انجام دیتا رہا، (اس وقت کمپیوٹر تو کجا عام طور پرٹائپ کرانے کی بھی سہولت نہ تھی) ان بزرگوں کی آپس میں خط وکتابت جو ہوتی اس کا سرنامہ نام والقاب کے بعد اس طرح شروع ہوتا: انی أحمدالیکم الله الذی لااله اِلاھو، واصلی واسلم علی رسول اللهِ وبعد:اور کبھی لااله الا ھو کے بعدالذی قال چندآیتیں اوررسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد حدیث نبوی کے بعض فقرے ہوتے جس میں خط کا مضمون اصلی آجاتا، پھر مطلب شروع کرتے جس کا شروع سے آخرتک مضمون امت کی اصلاح اوردین کی فکر سے ہوتا۔

بہرحال یہ تاریخی مکتوب ایک نمونہ ہے کہ وقت کی عظیم شخصیت کو کس طرح مخاطب کیا جائے، عظیم شخصیت صرف حکمراں اورفرماں رواہونے کے لحاظ سے نہیں بلکہ ایک مجاہد اوردینی فاتح ہونے کے لحاظ سے بھی جس نے اپنے ملک کا

دستور کتاب اللہ اور سنت رسول قرار دیا اور جس نے کبھی کسی موقع پر دین و شریعت کو فراموش نہیں کیا، ان کے جانشینوں (ملک سعود، ملک فیصل ملک خالد اور موجودہ خادم الحرمین) ہر ایک نے ہر موقع پر عام خطابات میں اپنی عزت و سرفرازی کا عنوان اسلام اور شریعت اسلامی کو قرار دیا، اور جس کو مصر کے مشہور شیخ حامد فقی قرة عیون أهل التوحید (موحدوں کی آنکھ کی ٹھنڈک) لکھتے تھے ایک لبنانی شاعر نے ان کو مخاطب کر کے کہا "خامس الخلفاء الراشدین" ایسی دین دار اور بزرگ شخصیت کو غلام ہندوستان کا ایک نوجوان داعی کیا پیغام دے سکتا تھا؟ اور کیا کمی تھی جس کی اصلاح کی طرف توجہ دلاتا؟ مگر جیسا کہ عاجز نے اس کتاب کے شروع میں عرض کیا تھا کہ اللہ تعالیٰ نے مولانا کو دین کے معاملہ میں جو اعلیٰ ترین ذہانت بخشی ہے وہ طوفان سے پہلے طوفان کو دیکھ لیتی ہے، انھوں نے اس وقت جب پٹرول کی کی دولت کھل کر سامنے نہیں آئی تھی، مگر اندازہ کر لیا کہ دولت اور "ترقی یافتہ" ملکوں کی تقلید ملک کو کس رخ پر بہا لے جائے گی، عربوں کی اصل دولت پٹرول نہیں بلکہ ان کا دین سے والہانہ تعلق ہے، جفاکشی اور محنت ہے، دین کے لئے سب کچھ قربان کر دینے کا جذبہ ہے، عدل و مساوات کا وہ جوہر ہے جس کی نظیر تاریخ میں نہیں ملتی، لہٰذا ایک حق آگاہ، دین کے تقاضوں سے واقف والیٔ سلطنت کو یاد دلانے کی ضرورت ہے، معیشت کے استحکام اور دولت کی ریل پیل سے کیونکر مزاج بدل جاتے ہیں، اور جو سیلاب بلاخیز غیر ملکی تمدن کی نقالی کا آرہا ہے وہ کس درجہ دینی مزاج اور دعوتی روح کے لئے تباہ کن ثابت ہوگا، اس پر بند کہاں سے اور کس طرح باندھا جا سکتا ہے۔

اس تحریر میں قارئین آسانی سے یہ دیکھ سکتے ہیں کہ:-

۱- داعی الی اللہ اپنے آپ کو خدانخواستہ کسی اونچے مقام پر کھڑا نہیں محسوس کر رہا ہے اور نہ "پیغمبرانہ لہجے" میں بات کر رہا ہے بلکہ ایک معترف قدرداں اور تاریخی

مدوجزر سے واقف دردمند مسلمان کی حیثیت سے اپنے اندیشوں کا اظہار اور آئندہ کے لئے اعلیٰ سے اعلیٰ توقعات کے لہجہ میں بات کررہا ہے۔

۲- علماء نجد و حجاز کے بارے میں ان کے معاندین خواہ کچھ کہیں مگر یہ حقیقت اعتراف کے لائق ہے کہ ان کا اخلاقی معیار بہت سے مشرقی ممالک کے علماء سے بلند ہے، بادشاہ کے نام دعوتی خط پیش کرنے کی جرأت ایک ہندی عالم کرے اس کو نہ صرف برداشت کرنا بلکہ اس کو سراہنا اور اس کی عزت کرنا، لوگوں کو پڑھ کر سنانا، اس کی جرأت خواب میں بھی ان لوگوں کو نہیں ہوسکتی جن کا ''دینی مزاج'' یہ ہے کہ ''ہر کہ از حلقۂ ما نیست کافر است'' (جو ہمارے حلقہ کا نہیں وہ کافر ہے) ان کی ''انا'' کو مجروح کرنے کے لئے یہی کافی ہوتا کہ کوئی ''بیرون حلقہ ما'' کا کوئی فرد دین کی بات کرے۔

۳- پورے مکتوب میں کہیں اشارۃً کنایۃً پیش بندی یا تمہید کے اسلوب میں کوئی اپنی، یا اپنے لوگوں، اپنے ادارے، اپنے ملک کے لئے کسی نظر کرم ''یا توجہ شاہانہ'' کا سراغ نہیں ملتا۔

مولانا نے حجاز سے واپسی کے بعد دوسرے مواقع پر جب شاہان وقت سے تنہائیوں میں ملاقاتیں کرتے رہے اور خط و کتابت بھی رہی جس کا مجموعہ شائع بھی ہوچکا ہے، ان میں بہت کچھ ہے، مگر جو کچھ ہے اس کا تعلق ارض حرمین کے معنوی تقدس سے ہے اور دین کے لئے جس جوش دروں کی ضرورت ہے، اس کا اظہار ہے، علامہ اقبال کے الفاظ میں سارا مکتوب آواز دے رہا ہے

حرف شوق آوارہ ام از من پذیر
از فقیرے رمز سلطانی بگیر

بادشاہوں اور سربراہان حکومت کی خدمت میں دعوتی عرضداشت کس طرح

پیش کی گئی اس کا ایک نمونہ ابھی آپ کے سامنے گزرا اسی ضمن میں وہ گفتگو بھی یاد رکھنے کے لائق ہے کہ سلطنت اردنیہ ہاشمیہ کے پہلے فرماں رواں ملک عبداللہ بن حسین (شریف مکہ حسین بن علی کے فرزند) سے مولانا نے فرمایا تھا کہ جلالۃ الملک! اگر دنیا کا چھوٹا سا چھوٹا ملک بھی اگر شریعت اسلام کو نافذ کر دے تو سارے عالم کے لئے نمونہ بن سکتا ہے۔

اسی تسلسل میں مولانا کی ایک اور اہم تقریر کا مختصر ترجمہ نقل کرنا مناسب ہوگا جو دانشوروں، ادیبوں اور دنیا سے باخبر اور وقت کے مشاکل و مسائل سے آگاہ افراد کے لئے کی گئی تھی اور اس کا اصل عنوان یہی تھا کہ دنیا کی اہم مشکلات کا اسلامی حل (القضایا الانسانیة و حلولها الاسلامیة) یہ موضوع سعودی ریڈیو کے ڈائرکٹر (شیخ محمد شطا مرحوم) نے دیا تھا، مولانا نے اسی موضوع پر ایک ریڈیائی تقریر لکھی، مگر ادبی اور جدت پسند ذوق نے (جس کو معاصر ادباء تخلیقی صلاحیت کہتے ہیں) اس کا عنوان "من غار حرا" کر دیا۔ گویا

اتر کر حرا سے سوئے قوم آیا
اور اک نسخۂ کیمیا ساتھ لایا

کو اپنے خاص اسلوب میں پیش کیا، یہ مقالہ جب دوسرے دعوتی مقالات کے مجموعہ کے ساتھ شائع ہوا، تو اس پر جامعہ ازہر کے استاذ ڈاکٹر احمد الشرباصی مرحوم نے مختصر سا نوٹ لکھا تھا، اس ریڈیائی تقریر کا ترجمہ یہ ہے:-

"جبل نور" نامی وہ پہاڑ جس کے اندر یہ غار ہے، یہاں پہنچ کر میرے دل میں یہ بات آئی کہ یہی وہ غار ہے جہاں جبرئیل امین خالق کائنات کا پیام لے کر آئے تھے، یہیں رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو خلعتِ نبوت سے نوازا گیا تھا، اور پہلی وحی "اقرأ"

نازل ہوئی تھی، حق یہ ہے کہ یہی وہ مقام ہے جہاں سے آفتاب ہدایت طلوع ہوا، یا یوں کہئے یہیں وہ صبح نمودار ہوئی، سچی صبح، دنیا کو روشن کرنے والی صبح، یوں تو رات اور دن کے آنے جانے اور صبح وشام کے بدلنے کا سلسلہ ازل سے قائم ہے اور ابد تک باقی رہے گا، مگر وہ ''صبح'' جس سے شبستان وجود روشن ہوئی، اس صبح کی کرنیں یہیں سے پھوٹی تھیں، اس صبح کی روشنی سے ہر شے چمک اٹھی، انسان تو ہر جگہ رات گزارنے کے بعد صبح نمودار ہوتے جاگ اٹھتا ہے، مگر جس صبح سے صرف انسان نہیں بلکہ انسانیت جاگ اٹھی صرف تن ہی نہیں من بھی بیدار ہو گیا، جسم کے ساتھ روح نے بھی تازگی محسوس کی وہ صبح درخشاں یہیں سے طلوع ہوئی تھی۔

آفتاب رسالت کے طلوع ہونے سے پہلے ہر گوشۂ حیات تاریک تھا، یوں سمجھئے تاریکیوں کا سلسلہ قائم تھا، مشکلات اور پیچیدہ مسائل کا ایک انبار تھا، خیر کے دروازے بند اور فتنوں کے دروازے کھلے تھے، ہر مسئلہ اپنی جگہ پر پیچیدہ مسئلہ بنا ہوا تھا، جس کے کھولنے سے انسان کے ناخن تدبیر عاجز ودرماندہ تھے، گویا ہر دروازہ بند اور اس پر ایسے بھاری قفل لگے تھے جس کو کھولنے کے لئے کوئی کلید (چابی) دریافت نہیں ہوئی تھی۔

عقل انسانی پر بھاری بھر کم قفل لگا تھا، جن کو کھولنے کی صلاحیت کسی ''حکیم وقت'' اور ''دانائے روزگار'' میں نہیں تھی، ضمیر انسانیت بھی خودغرضی اور نفس پرستی کے خانے میں بند تھا، اس پر جو قفل لگا تھا اس کو کھولنے کی قوت کسی مصلح قوم کے پاس تھی نہ

کسی ''واعظ شیریں بیان'' کے پاس۔

انسان کے دل پتھر کے سِل بن گئے تھے، اس کو توڑنا بڑی بڑی تعلیم گاہوں اور تربیتی اداروں کے بس سے باہر تھا، قدرت کی کھلی نشانیاں اور عبرت کے واقعات جو آئے دنوں سامنے سے گزرتے تھے، انسان کے ضمیر اور اس کے قلب میں کوئی حرکت پیدا نہیں کر سکے تھے، کہنے کو عدالتیں بھی تھیں اور انصاف دلانے کے نام پر ادارے، پنچایتیں تھیں، علاقائی حکام کے دربار بھی تھے، مگر وہاں مظلوم کی دادرسی کا کوئی سامان نہ تھا، گھریلو مسائل، آپس کے اختلافات، خاندانی غرور، قبائلی عصبیت سب کا کام قوت وشدت کے ساتھ جاری تھا، مگر ان مشاکل ومسائل کو سلجھانے والے مصلحین ومفکرین کم تھے۔

راجاؤں اور حکمرانوں کے عالی شان محلوں کی اونچی دیواروں سے غریب جفاکش مزدور سر ٹکرا سکتے تھے مگر اپنا حق، اپنا پیدائشی اور انسانی حق نہیں حاصل کر سکتے تھے، اہل ثروت اپنی عیش کوشیوں میں مست تھے، وہاں شیر خوار بچوں کے رونے اور بھوک سے بلبلانے کی آواز نہیں پہنچ سکتی تھی، وہاں مظلوم پھٹے چیتھڑوں میں لپٹی ہوئی نیم برہنہ عورت اپنی جان کو محفوظ رکھنے کے لئے معمولی سی چادر عصمت نہیں حاصل کر سکتی تھی۔ یہاں ناداروں کو انسانی زمروں میں شمار نہیں کیا جاتا تھا، ان کے گوشت پوست کے جسم کو انسانی جسم سمجھا ہی نہیں جایا کرتا تھا۔ دراصل وہ مفتاح (چابی) ہی گم تھی جس سے انسانی مشکلات کے بھاری قفل کھل

سکتے، لوگوں نے کوششیں ضرور کیں، مگر وہ ان قفلوں کو غلط قسم کے خود ساختہ چابیوں سے کھولنا چاہتے تھے لیکن وہ چابیاں سب بیکار ثابت ہوئیں اور ایک تالا (قفل) بھی نہ کھول سکیں، یہ بھی کوشش کی گئی کہ اگر کوئی چابی نہیں لگ رہی ہے تو تالا ہی توڑ دیا جائے، مگر اس کوشش کا انجام بھی سوائے پشیمانی کے کچھ نہیں نکلا، تالے تو نہ کھل سکے اور نہ ٹوٹ سکے ہاں وہ اوزار جن سے ان قفلوں کو توڑنے کی کوشش کی گئی وہ خود ٹوٹ گئے۔

یہی وہ زمانہ تھا کہ آبادی سے ذرا دور، ایک سنسان و بیابان علاقہ میں ایک پہاڑ کے اوپر یہی وہ غار تھا جہاں قدرت حق نے حضرت محمد بن عبد اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو رسالت کی دولت عطا فرمائی، اور یہی وہ جگہ ہے جہاں سے وہ انسانی مشکلات حل ہوئیں جواب تک لاینحل تسلیم کی جا چکی تھیں، جن کو حل کرنے میں دنیا کے اعلیٰ ترین ذہین وذی علم افراد ناکام رہ چکے تھے۔ رسالت محمدی کی شکل میں وہ مفتاح (چابی) مل گئی، جس سے تمام مشکلات کا حل نکل آیا، ہر قسم کے پیچیدہ مسائل کو حل کرنے کا راستہ نکل آیا، انسانیت کو وہ چابی مل گئی جو صدیوں سے گم تھی، وہ چابی کیا تھی؟ اللہ کی وحدانیت کا اقرار، محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی رسالت کو قطعی اور یقینی باور کرنا اور اس حقیقت کو ماننا کہ اس زندگی کے بعد آخرت ہے جس میں اپنے تمام اعمال کا حساب دینا ہوگا، یہی وہ مفتاح سعادت ہے جو انسان کو راہ نجات دکھا سکتی ہے اور اسی سے دنیا کے تمام پیچیدہ مسائل کا حل نکل سکتا ہے اس چابی سے آپ نے وہ تمام

قفل کھول دیئے جو صدیوں سے بند تھے، یا یوں کہئے آپؐ نے وہ تمام گتھیاں سلجھادیں جو صدیوں سے الجھی پڑی تھیں، انسانی زندگی کے ہر شعبہ میں نئی جان آگئی، آپ صلی اللہ علیہ وسلم اسی مفتاح ایمانی کے ذریعہ عقل انسانی کو سوچنے، سمجھنے، عبرت حاصل کرنے، اپنے نفع نقصان کو سمجھنے کی صلاحیت دے دی، عقل درماندہ اس لائق ہوگئی کہ وہ دنیا کی حقیقت سمجھ سکے، اپنی حقیقت کو سمجھے اور کائنات کے سربستہ راز کو سمجھے، زمین وآسمان میں پھیلی ہوئی نشانیوں کو دیکھ سکے، اس کائنات کے بنانے والے کی ذات وصفات سے تعلق قائم کر سکے، اور اپنے خالق کو پہچان سکے۔ ''کثرت'' کے اندر ''وحدت'' کا جلوہ دیکھ سکے۔ خدا ناشناسی کی وجہ سے اس کی عقل پر جو پردے پڑے تھے اسے چاک کر سکے، شرک وبت پرستی اور رسومات واوہام کے بند دروازوں کو توڑ کر فکر ایمانی کی کھلی فضا میں سانس لے سکے، یہ اسی ایمان کا کرشمہ تھا کہ نفس انسانی جو ہمیشہ بدی اور بے حیائی پر ابھارا کرتا تھا، (نفس امارہ بالسوء) وہ نفس لوامہ بن گیا (محاسبہ کرنے والا، اپنے عیوب جس پر منکشف ہوگئے ہوں) اور محاسبہ نفس نے انسان کی جان کو ''نفس مطمئنہ'' بنادیا، یعنی وہ نفس جس کے اندر شک وشبہات اور عدم یقین کی وجہ سے کشاکش تھی اب ایک سمجھے ہوئے اور یقینی مقصد کو جان لینے کی وجہ سے مطمئن ہوگیا، یعنی الجھنیں ناپید ہوگئیں۔

آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اسی ایمانی (کلید) کے ذریعہ ضمیر انسانی کو بیدار فرمادیا، اس کا شعور جو صدیوں سے مردہ تھا اس

نے زندگی کی نئی کروٹ لی، اب اس کے اندر کسی باطل کے بسنے کی گنجائش نہیں رہی، ضمیر انسانی کی بیداری کی ایک جھلک دیکھی گئی کہ گناہ گار خود آ کر اپنی معصیت کا اقرار کرتا ہے، اقرار ہی نہیں کرتا بلکہ اس کی التجا کرتا ہے کہ اس پر قانون کو نافذ کر کے آخرت کے عذاب سے نجات کا سامان کر دیا جائے ،ایک عورت اپنی معصیت کے داغ اسی دنیا میں دھلانے کی درخواست لے کر بارگاہ رسالت میں حاضر ہوگئی، اپنے آپ کو سنگسار کئے جانے کی درخواست کرتی ہے۔آپ صلی اللہ علیہ وسلم عذر شرعی کی وجہ سے اس کی سزا کو ملتوی کر دیتے ہیں ،وہ اپنے قبیلہ واپس جاتی ہے جہاں کوئی پہرہ دار نہ تھا صرف اس کا ضمیر جو جاگ اٹھا تھا، اس کا پہرہ دار تھا، اور عذر شرعی کے دور ہونے کے بعد پھر دربار رسالت میں حاضر ہوتی ہے اور اس سزا کی طالب ہوتی ہے جو تلوار کی کاٹ سے قتل ہونے کے مقابلہ میں زیادہ اذیت ناک زیادہ رسوا کن، اور زیادہ دردناک تھی، یعنی پتھروں سے مار مار کر ہلاک کیا جانا (سنگسار کیا جانا)۔

جب ایران فتح ہوا، ایک معمولی سے سپاہی کے ہاتھ کسریٰ کا تاج زریں ہاتھ آ گیا وہ اس کو کپڑوں میں چھپا لیتا ہے اور اپنے امیر کی خدمت میں لے جا کر پیش کر دیتا ہے، یہ امانت کی ادائیگی کا جذبۂ ایمانی تھا، نمائش اور شہرت کی نہ خواہش تھی اور نہ تمنا۔

قلوب مقفل تھے، خوف خدا سے محروم، نرمی اور رقت سے بے گانہ، عبرت پذیری کی صلاحیت سے دور، ان کی بند کوٹھریوں

پر تالے پڑے تھے، مفتاح رسالت سے ان کے سارے دریچے
یکایک کھل گئے، وہی دل خوف خدا سے کانپنے لگے، حوادث وواقعات
سے درس عبرت لینے لگے، کائنات میں پھیلی ہوئی اللہ کی نشانیاں
ایک ایک کر کے ان کو خالق کائنات کی طرف متوجہ کرنے لگیں،
وہ لوگ جو انسانی خون کی کبھی پرواہ نہیں کرتے تھے اب یہ عالم
ہوگیا کہ آنسو نکل آئے جو کسی کو دم توڑتے دیکھا، دوسروں کا
بھوک کا احساس اتنا بڑھ گیا گویا وہ خود بھوک سے بے تاب
ہیں، کسی کو پیاسا دیکھ کر ان کے اپنے حلق خشک ہونے لگے، کسی
مجبور و مظلوم کو حقیر نہیں سمجھتے بلکہ اس کے ساتھ محبت اور دلجوئی
کا معاملہ کرتے، انسانوں کی فطری صلاحیتیں، ذوق جستجو اور
آرزوئے کمال پر پردہ پڑے ہوئے تھے، گویا یہ بھی ایک طرح
سے مقفل تھے۔ ان کو بھی مفتاح رسالت نے ہاتھ لگایا تو مس
خام کو کندن بنا دیا، انسانی صلاحیتیں بجائے تعمیر کے تخریب پر
مائل تھیں۔ ان کو انسان کو ہلاک کرنے، ایذا پہونچانے، ان کو زیادہ
سے زیادہ اذیت پہونچانے میں مزہ ملتا تھا۔ مگر یہ عالم تھا کہ وہ رحم
دل، آپس میں ایک دوسرے کا احترام کرنے والے، کمزوروں اور
ناتوانوں کی نگہبانی کرنے والے بن گئے، اور ان کی قوت ایجاد
تعمیری کاموں میں صرف ہونے لگی، شتربانوں کے گہوارے علم
وتحقیق کے رکھوالے بن گئے، ان کے کھردرے ہاتھوں میں اونٹوں
کی لگام کی جگہ جہاں بانی کی زمام آگئی، اور وہ دنیا کے نقشے
پر طرح نو کے آئین ساز بن گئے، علم کی قدر آگئی، علماء کی عزت

بڑھ گئی، مکتب ومدرسہ کی عظمت دلوں میں قائم ہوگئی، مسجدیں تعلیم گاہ بن گئیں، ہر مسلمان اپنے حق میں متعلم اور دوسروں کے لئے معلم بن گیا۔ کلکم راع و کلکم مسئول تم میں سے ہر شخص دوسرے کا نگراں بھی ہے اور کسی کے سامنے جواب دہ بھی، اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ بدمعاملگی کا خاتمہ ہوا، آپس کے تعلقات استوار ہوئے، دشمن دوست بن گئے اور دوست عزیزوں سے بڑھ کر عزیز اور رشتہ داروں سے بڑھ کر رشتہ دار بن گئے، ان کی باتیں سچی باتیں تھیں، ان کی شہادتیں (گواہیاں) حق پر مبنی ہوتی تھیں، خواہ اس کی زد ان کے گھر والوں پر پڑتی ہو، باپ، فرزند، اور عیال کو اس سے ضرر پہنچتا ہو مگر جب گواہی دیں گے تو سچی اور واقعہ کے مطابق گواہی دیں گے۔

قبائلی عصبیت ختم ہوئی، خاندانی رقابتیں کافور ہوئیں، حسب ونسب کا غرور تہ خاک ہوا، اب کاروبار کرنے والے ایسے نہ رہے جن کے بارے میں فرمایا گیا: اِذَا اکْتَالُوْا عَلَی النَّاسِ یَسْتَوْفُوْنَ ۝ وَاِذَا کَالُوْھُمْ اَوْوَّزَنُوْھُمْ یُخْسِرُوْنَ ۝ بلکہ ان کے اندر امانت کا شعور پیدا ہوگیا، اب ایک ایک دانہ کا خدا کے سامنے حساب دینے کا خوف ان کی طبیعت کا خاصہ بن گیا، ان کو معلوم ہوگیا کہ وہ مال ودولت کے مالک نہیں بلکہ اس کے رکھوالے اور امین ہیں، ان کو قرآن نے تعلیم دی کہ وَاَنْفِقُوْا مِمَّا جَعَلَکُمْ مُّسْتَخْلَفِیْنَ فِیْہِ ۔ اور خرچ کرو اس (مال میں سے) جس میں اللہ نے تم کو اپنا نائب بنایا ہے۔

اور پوری وضاحت کے ساتھ اس نکتہ کو ذہن نشیں کرایا گیا۔

وَاٰتُوْهُمْ مِّنْ مَّالِ اللّٰهِ الَّذِیْٓ اٰتٰىكُمْ ؕ

جو مال تم کو اللہ نے دیا ہے اس میں سے حاجت مندوں کو دو۔

ان کے اندر قبائلی عصبیت اور خاندانی غرور کو مٹا کر کافور کر دیا، ان کو جتلا دیا گیا کہ تم ایک آدم وحواء کی اولاد ہو۔

یٰٓاَیُّهَا النَّاسُ اتَّقُوْا رَبَّكُمُ الَّذِیْ خَلَقَكُمْ مِّنْ نَّفْسٍ وَّاحِدَةٍ وَّخَلَقَ مِنْهَا زَوْجَهَا وَبَثَّ مِنْهُمَا رِجَالًا كَثِیْرًا وَّنِسَآءً ۚ وَاتَّقُوا اللّٰهَ الَّذِیْ تَسَآءَلُوْنَ بِهٖ وَالْاَرْحَامَ ؕ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ عَلَیْكُمْ رَقِیْبًا ○ (سورہ نساء۔۱)

اے لوگو! اپنے رب سے ڈرو جس نے تم سب کو ایک جان سے پیدا کیا (اس طرح) کہ اس کا ایک جوڑا پیدا کیا اور ان دونوں (کی نسل) سے پھیلا دیئے بہت سے مرد اور بہت سی عورتیں اور اس اللہ سے ڈرو جس کے واسطے سے تم مانگتے ہو، اور قرابتوں کا خیال رکھو، بے شک اللہ تم پر نگراں ہے۔

غار حرا کے دہانے پر کھڑا تھا اور اپنے دل میں سوچ رہا تھا، عہد رفتہ کی یاد نے مجھے گرد وپیش سے تھوڑی دیر کے لئے اپنے ماحول اور خود اپنے وجود سے بے خبر کر دیا، مجھے ایسا لگا جیسے میں اسی ماحول میں سانس لے رہا ہوں، اس وقت کی باتیں ایک ایک کر کے یاد آنے لگیں گویا وہ میرے سامنے کے واقعات اور آنکھوں دیکھی حقیقتیں ہیں، ماضی کے آئینے میں عہد سعادت کے خط وخال نمایاں نظر آنے لگے، اسی عالم تصور میں مجھے اپنے زمانہ کا خیال آیا، جس فضا میں سانس لے رہا اور جی رہا ہوں،

میں نے دیکھا کہ آج زندگی کے پیروں میں بھاری بیڑیاں پڑی ہیں، آج پھر وہ قفل سارے کے سارے زندگی کے ہر دروازے پر لگے ہیں، وقت بدل گیا ہے اس لئے مسائل مشکلات بھی بدل گئے ہیں، کیا آج بھی ان تالوں کو اسی پرانی کنجی سے کھولا جاسکتا ہے۔؟ قفل نئے، دروازے بھی آہنی ہیں، دست و بازو بھی شل ہو چکے ہیں، یہ بات میرے دل میں آئی مگر میں نے کہا پہلے ''ان نئے تالوں'' یا دوسرے الفاظ میں ان نئی مشکلات کا جائزہ لینا چاہئے میں نے جب اس ارادہ سے ان قفلوں کو ٹٹولا الٹ پلٹ کر دیکھا تو یہ حقیقت واضح ہوگئی کہ یہ تالے نئے نہیں ہیں، تالے وہی پرانے قسم کے ہیں، صرف ان کی پالش بدل گئی ہے، انسانی زندگی میں پیش آنے والی الجھنیں جن کو نئے زمانے کے مشکلات ومسائل کے نام دیئے گئے ہیں سب وہی پرانے اور ہر زمانے میں پیش آنے والے مشکلات ومسائل ہیں اوران سب کی پیچیدگی ایک ہی ہے (مرض کی شکلیں اوران کے نام بدل گئے ہیں، مگر اصل مرض ایک ہی ہے) اصل مسئلہ فرد کی تعمیر سیرت، تعمیر کردار اور تعمیر اخلاق کا ہے، فرد اپنی جگہ پر ایک اینٹ کی حیثیت رکھتا ہے، اگر اینٹیں اپنی جگہ پر ٹھوس اور پختہ ہیں تو عمارت بھی ٹھوس اور پختہ ہوگی، آج کا انسان بھی اسی طرح کے گوشت و پوست کا انسان ہے جیسے ہزاروں برس پہلے تھا، اس کی خواہشات، اس کی تمنائیں، اس کی حوصلہ مندی اور مہم جوئی میں کوئی فرق نہیں آتا ہے، وہ مادہ اور قوت کے علاوہ کسی چیز کو ماننے کے لئے

تیار نہیں ہے، اس کی خواہشات اس کے ہر فعل وعمل پر حکمراں ہے،
خیر وشر کا معیار، اچھے برے کے درمیان امتیاز کا پیمانہ صرف اس
کی اپنی ''اَنا'' اور اپنی خواہش ہے جس کا وہ غلام ہے، اس کا رشتہ
اپنے پیدا کرنے والے سے ٹوٹ چکا ہے، وہ رسالت اور تعلیم
رسالت سے منھ موڑ چکا ہے، اس کے نزدیک آخرت کا تصور
ایک واہمہ ہے، اس کے مرض کی جڑ یا جراثیم جن کا زہر اس کے
رگ وپے میں سرایت کر گیا ہے، وہ یہی ہے کہ اپنے آپ کو وہ
کسی کے سامنے جواب دہ نہیں سمجھتا آخرت کا عقیدہ باقی نہیں
رہا کہ اس کو اپنے اعمال کا حساب دینے کی فکر ولحاظ ہو، اس کی
ساری بدبختیوں کا سبب یہی ہے کہ وہ اس زندگی کو اپنی اول آخر
کائنات سمجھتا ہے، آپس کی لڑائیاں، خون خرابیاں، آئے دن کی
جنگیں اور آپس میں تناؤ اسی وجہ سے ہے ایک شخص تجارت کرتا
ہے تو اس کو ایک لمحہ کے لئے بھی یہ غم نہیں ہوتا کہ اس کی ذخیرہ
اندوزی کی وجہ سے ہزاروں انسان کا رزق ضائع ہو جائے گا،
اور لاکھوں کو فاقہ کرنا پڑے گا، بھوکوں اور ننگوں کی تعداد بڑھ
جائے گی، یہ فرد اگر نادار ہوتا ہے تو چاہتا ہے کہ دوسروں کی محنت
سے پیدا کردہ روزی کر اپنا لے، اگر مزدوری کرتا ہے تو اپنے فرض
کی ادائیگی میں کام چوری کرتا ہے اور مزدوری اپنے حق سے کہیں
زیادہ طلب کرتا ہے، اگر جائز وناجائز طریقہ پر دولت اکٹھا کر لیتا ہے
تو انتہائی سنگدلی، بخیل، دین واخلاق سے بے بہرہ ہو جاتا ہے
اور دنیا کے ہر آرام اور لذت کو اپنی میراث سمجھتا ہے، دوسروں کو

انسان بھی مشکل سے سمجھتا ہے۔ اگر اس کے ہاتھ اقتدار کی کنجی آجاتی تو فرعون وقت بن کر نمودار ہوتا ہے، اپنی ذات اور اپنی اولاد کے علاوہ کسی کو خاطر میں نہیں لاتا، اگر کسی ادارے کا سربراہ، یا کسی منفعت عامہ کے کام کا ذمہ دار ہوتا ہے تو اس کی کوشش یہی ہوتی ہے کہ اس کے اقتدار کو صدمہ نہ پہونچے، اور اس کی پارٹی اور اولاد کے علاوہ کوئی اس کا شریک نہ بن سکے، اگر لیڈر ہوتا ہے تو اس کے سامنے اپنی پارٹی کے علاوہ کہیں خیر کا پہلو نظر نہیں آتا، اگر کسی ملک کا صدر جمہوریہ یا وزیر بن جاتا ہے تو اس کو اپنے عوام اور اپنے ووٹ دینے والوں کے علاوہ کسی کی بہبود مدنظر نہیں ہوتی، ایجاد کی صلاحیت ہوتی ہے تو ایسے آلات ایجاد کرتا ہے جس سے انسانی برداری کی ہلاکت کا سامان تیار ہو، زہریلی گیس ایجاد کرتا ہے، اگر اس کو قانون سازی کا اختیار مل جاتا ہے تو ظالمانہ قوانین بناتا ہے اور ملک کے بھوکے غریب عوام پر بھاری ٹیکس عائد کرتا ہے، غرض وہ جہاں بھی ہے اور جس حال میں بھی ہے اس کے سامنے سوائے اپنی ذات، اپنی آل اولاد، اپنی پارٹی، اپنے گروہ کے علاوہ کسی کا نفع، نقصان نظر نہیں آتا، ان میں سے ایک شخص اپنی من مانی اور اپنی شہوت رانی کے لئے ہزارہا انسانوں کو درندوں سے زیادہ بے دردی اور بے رحمی سے چیر پھاڑ کر رکھ دیتا ہے۔ ایسے افراد سے جو معاشرہ وجود میں آئے گا وہ معاشرہ انسانوں کا نہیں درندوں کا معاشرہ ثابت ہوگا، معاشرہ یا حکومت دونوں کے کل پرزے یہی افراد ہیں اور جب افراد اپنی جگہ پر

انسان دشمن ہوں گے تو پورا معاشرہ انسان کُش بن جائے گا، اور مشکلات ومسائل حل ہونے کے بجائے پیچیدہ ہوتے چلے جائیں گے، ایک گرہ کھلے گی تو دوسری گرہیں پڑ جائیں گی، ایک مرض دور ہوگا تو دوسرے بیسوں مرض سامنے آجائیں گے، زہر سے زہر کا علاج تلاش کیا جائے گا تو نتیجہ موت ہی ہوگا۔ یہ ہے مادہ پرستی یا خواہش پرستی کا فساد جس کے بطن سے ہر قسم کی الجھنیں، برائیاں بیماریاں پیدا ہوتی ہیں اور ہورہی ہیں جن کو ہم انسانی زندگی کے مشکلات کا نام دیتے ہیں۔

ان سب کا علاج ان تمام مشکلات کا اسلامی حل فرد کی تعمیر سیرت ہے، یہ تعمیر بغیر اللہ، اللہ کے رسولؐ اور یوم آخرت پر ایمان لائے مکمل نہیں ہوسکتی۔

(تلخیص وترجمہ ع ع ن)



حجاز مقدس سے مصر کا سفر

۱۳۶۹ھ ۔ ۱۹۵۰ء کے حج سے فارغ ہونے کے بعد ۱۱ ربیع الثانی ۱۳۷۰ھ ۱۹ جنوری ۱۹۵۱ء تک مولانا کا قیام حجاز مقدس میں رہا، اس عرصہ میں دعوت وتبلیغ کا کام پوری سرگرمی سے قائم رہا، آپ کی تقریروں اور تحریروں کا تذکرہ گذشتہ صفحات میں آچکا ہے، یہ سفر اور قیام حجاز اللہ تعالیٰ کی کارسازی کا بہترین مظہر تھا، تبلیغی کام اب تک صرف ہندوستانی (قبل تقسیم کے ہندوستانی مسلمان) حلقوں میں محدود تھا، حرمین شریفین کے اندر جماعت کے حلقے ہوتے تھے اور عربوں میں جو کام ہوئے اس کی نوعیت بھی ایک خاص سطح کے (غیر متمدن علاقوں، بدوؤں کی بستیوں میں) افراد تک محدود تھی، اہل عرب فطری طور پر مہمان نواز ہیں، ان کی بستیوں میں جب تبلیغی وفود پہنچتے تو وہ لوگ ان کے مواعظ سنتے، جو لوگ مبلغوں کی زبان نہیں سمجھتے وہ بھی حصول برکت کے لئے مسجدوں میں کلمہ خیر سن لیا کرتے تھے۔ لیکن عرب علماء دانش وروں، مصنفین، اساتذہ، اہل قلم وفکر تک دعوت کے اس خاص طرز کو پہنچانے کا واسطہ اللہ تعالیٰ نے مولانا کو بنایا، مولانا پہلے ہندی عالم تھے جن کے اعزاز میں خالص عرب نژاد علماء ادباء نے "حفلۃ تکریم" منعقد کیا۔ توجہ سے بات سنی، اور پہلی بار "تبلیغی دورہ" پر نکلے۔

عاجز راقم الحروف کو اپنے مشاہدات کی بنا پر یقین ہے کہ اللہ تعالیٰ نے مولانا کے ساتھ حضرت شاہ ولی اللہ دہلویؒ کی طرح مرحمت خاص کا معاملہ فرمایا ہے ورنہ ظاہری اسباب میں اس درجہ پذیرائی عرب علماء اور دانشوروں میں ناممکن تھی۔

اگر ایسا نہ ہوتا تو ظاہری اسباب ووسائل بالکل اس لائق نہیں تھے کہ ایوان شاہی کے قریب ترین علماء سے لے کر اخبار نویس حضرات تک شاگردوں اور نیازمندوں کی طرح حلقہ بہ گوش نظر آتے۔

وَاللّٰهُ غَالِبٌ عَلٰیٓ اَمْرِهٖ وَلٰکِنَّ اَکْثَرَ النَّاسِ لَا یَعْلَمُوْنَ۔

اور اللہ تعالیٰ اپنے کام پر غالب ہے لیکن اکثر لوگ نہیں جانتے۔

(سورۂ یوسف۔۲۱)

یہ کام (یعنی دین کی طرف متوجہ کرنے اور اسلام سے حقیقی تعلق قائم رکھنے اور مضبوط کرنے کی دعوت) مصر میں اور دشوار تھا، حجاز اور یمن تو خیر اس زمانہ میں علمی لحاظ سے بہت پیچھے تھے، مگر مصر تو پورے عالم عربی کا دماغ تھا، تمام عرب ممالک کے مدارس کے لئے اساتذہ (ابتدائی درجات سے لے کر یونیورسٹیز کے سطح تک پڑھانے کے لئے) ازہر اور قاہرہ یونیورسٹی سے ٹریننگ حاصل کر کے جاتے، درسیات سے لے کر مختلف علوم وفنون کی کتابیں، ناول، رسائل، مجلات، سب مصر ہی سے تمام عرب ممالک سپلائی ہوتے، مصر میں اس وقت شاہی پارلیمانی نظام تھا، یہ نظام حکومت نیم جمہوری اور نیم شاہی تھا، برطانوی شہنشاہیت سے مختلف قسم کا نظام تھا، برطانیہ میں بادشاہ مالک ہوتا ہے، مگر حکومت نہیں کرتا۔(یَمْلِكُ وَلَا یَحْکُمُ) مصر میں ملکیت موروثی اور حکومت عوام اور شاہ کے درمیان مشترک تھی، آخری فیصلہ بادشاہ کا ہوتا تھا۔ پارلیمنٹ کو شاہی حکم ادا کرنے کا اختیار نہیں تھا، مگر الیکشن بڑے دھوم دھام اور جوش وخروش سے ہوتے تھے، سیاسی پارٹیاں

بہت سرگرم تھیں، اس طرز حکومت کو Dmocratic Monarchy کہا جاتا ہے، عوام میں خوش حالی تھی، تاجر اور سرمایہ دار بھی تھے، عوام کو تعلیم اور علاج کی سہولت تھی، مرد وزن حدود قیود سے بہت حد تک آزاد تھے مگر یورپ کی جیسی مکمل بے حیائی بھی نہیں تھی، اہل ریف (دیہات وقصبات والے) اپنی زندگی میں مست تھے، اس دور کی اجتماعی اور معاشی حالت کی صحیح تصویر مرحوم انور السادات نے اپنی خود نوشت سوانح میں اچھے پیرایہ بیان میں لکھی ہے۔ بادشاہ کے خوشامدی سب تھے "دوشاہ کو دُعا" پر سب کا عمل تھا اور خود شاہِ وقت کی حیثیت برطانیہ کے سامنے شاہ شطرنج کی تھی، ان کو عیش وعشرت کی پوری چھوٹ تھی، مگر لگام بہرحال برطانیہ اور بعد میں امریکا کے ہاتھ تھی، جمہوری دور میں قدریں کس درجہ تبدیل ہوگئیں وہ ہم بعد میں عرض کریں گے، اس دور میں جب کہ حضرت مولانا سید ابوالحسن علیؒ قاہرہ تشریف لے گئے ہیں، اس وقت ترکوں کا فکری ورثہ (Legacy) باقی تھا، سرکاری خطابات میں "سر" کی جگہ "باشا" اور "خان بہادر" یا "پدم بھوشن" کے مقابلہ میں Beg جو مخفف ہو کر Bay "بے" بولا اور لکھا جاتا تھا۔ بروکریٹ طبقہ کا رعب داب قائم تھا، عوام دودھ، دہی، سبزی، پھل اور روٹی میں مست تھے، حجاز کے دونوں مقدس شہروں میں "تکیہ مصریہ" قائم تھا۔ جہاں سے اہل حرمین کو مالی، غذائی اور معالجاتی مدد ملا کرتی تھی۔ غلاف کعبہ مصر سے آیا کرتا تھا، اس کے وقف کی آمدنی سے اہل حرم کو فائدہ پہونچتا تھا۔

سیاسی پارٹیوں میں الحزب الوطنی (نیشنل کانگریس) حزب الوحدہ (یونائیٹڈ فرنٹ) اور اسی طرح کی پارٹیاں تھیں۔

مسلمانوں کی اصلاحی جماعتیں اور متعدد تنظیمات تھیں، الاخوان المسلمون سب سے بڑی اسلامی انقلاب لانے والی پارٹی تھی، جو اگرچہ حکومت پر قبضہ نہ کر سکی

اوراس کے صدر (جس کو ان کی اصطلاح میں مرشد عام کہا جاتا تھا) شیخ حسن البنا کو امریکہ کے اشارہ پر حکومت نے قتل کرایا تھا، مگر پارٹی زندہ تھی، اگر چہ مرشد عام کی شہادت کے بعد کمزور بلکہ گویا یتیم ہوگئی تھی، مگر اس کی سرگرمیاں قائم تھیں، ایک شعبہ عسکری تربیت کا تھا، جس سے امریکہ اور روس خوف زدہ تھے، دوسری غیر سیاسی خالص تنظیمات میں جمعیۃ شباب سیدنا محمد (نوجوانان محمد صلی اللہ علیہ وسلم) جمعیة العشیرة المحمدیه جمعیۃ مکارم الاخلاق سرگرم عمل تھیں، الأزہر (جو ایک بڑی مسجد کا نام ہے) اور وہ دینی درس گاہ ایک ہزار برس سے قائم ہے اور اب مسجد ازہر سے علاحدہ اس کی مستقل عالیشان عمارت ہے مگر اس کو بھی جامع (مسجد) ازہر ہی کہتے ہیں، اور جو یونیورسٹی ہے اس کو "جامعۃ الأزہر" کہا جاتا ہے، درس وتدریس، علوم قرآن وحدیث، نحو وبلاغت پر تحقیق کرنے والے اور نت نئی کتابیں لکھنے والے اپنے کام میں مشغول تھے، اس زمانہ میں اس وقت اہل علم وادب میں استاذ احمد الزیات کا "الرسالہ" بہت مقبول تھا، خود ان کے قلم سے نکلے ہوئے اداریئے اتنے خوبصورت اور ڈھلے ڈھلائے جملوں اور خالص نحوی عربیت کے اعتبار سے ایسے مکمل تھے جس میں لبنانی یہودیوں اور مصری قبطیوں کی جدت پسندی کا شائبہ بھی نہیں ہوتا تھا، دوسرا ہفتہ وار رسالہ ڈاکٹر احمد امین کی ادارت میں "الثقافة" نکلا کرتا تھا، اس میں ادبی وتحقیقی مضامین شائع ہوا کرتے تھے، اس رسالہ کی زبان بھی ادبی اور پابند نحو ہوا کرتی تھی، دینی دعوتی انداز کا ہفتہ وار اخبار "المنبر" نکلا کرتا تھا، محب الدین الخطیب کا رسالہ "الفتح" بھی اس زمانہ میں باقی تھا، جو بہت قدیم ہفت روزہ پرچہ تھا۔

اخباروں میں الاہرام، المصری، الوحدہ، الشعب روزنامے نکلا کرتے تھے، الاہرام اور المصری اب بھی باقی ہیں، یہ سیاسی پارٹیوں کے اخبارات تھے، مگر اس کا اثر ونفوذ مصر سے باہر دوسرے عرب ممالک پر بھی تھا، مشہور مشہور کالم نویس

اپنے اپنے کالم بہت سلیقے سے ترتیب دیا کرتے تھے جن میں محمد حسین ہیکل اور انورالسادات کے نام بہت نمایاں تھے، عوام اچھے برے، امیر وغریب، تعلیم یافتہ اور دیہاتی ہر قسم کے تھے، سب کا عمل ''کھاؤ اور دوشاہ کو دعا'' پر تھا، ربیع الاول اور رمضان کی رونقیں نرالی شان رکھتی تھیں، ۱۲/ربیع الاول کو مولد النبی کی تقریب ایسی ہوتی تھی جس کا انتظار لوگ سال بھر کیا کرتے تھے، ایک میلہ لگا کرتا ہے اور بالکل کرسمس کی روح کے ساتھ بدعات ہی نہیں بلکہ خرافات تک عام تھیں، جواب تک ہیں اور اب بھی رمضان میں الازہر اور سیدہ زینب کی مسجد کے باہر لان میں میلے لگا کرتے ہیں، اس میں مشائخ طریقت اپنے اپنے لبادوں، لباسوں اور رنگ برنگی پگڑیوں اور شانوں پر مختلف رنگوں کی چادریں ڈال کر حلقہ ہائے ذکر کی قیادت کرتے تھے، اور اب بھی کرتے ہیں۔

عوام حکومت کی طرف سے مطمئن تھے۔ خفیہ پولیس کا دائرہ کار صرف جرائم پیشہ لوگوں پر نگاہ رکھتا تھا، عام طور پر ہر شخص آزاد تھا، کوئی تنظیم قائم کرنا چاہتا تو اس کو قاعدہ کے مطابق رجسٹرڈ کرالیتا، اندرون ملک اور بیرون ممالک کے سفر پر کسی کے لئے پابندی نہیں تھی، باہر سے آنے والے جہاں چاہتے بغیر روک ٹوک کے جاتے آتے، جلسے کرتے، دعوتیں کرتے، جس کو چاہتے مدعو کرتے حکومت اس میں دخل نہیں دیتی تھی، اور نہ خفیہ پولیس (انٹلی جنس) اس کا تعاقب کرتی۔

مولانا جب وہاں تشریف لے گئے ہیں اس وقت مصر کے بہت سے مشہور اہل قلم اور ادباء زندہ تھے جن کا طوطی بولتا تھا، جن میں ڈاکٹر احمد امین ڈائرکٹر جنرل لجنة الترجمة والتاليف و النشر، ڈاکٹر طٰہٰ حسین باشا (جو وزیر تعلیم تھے مگر اکثر ملک سے باہر رہتے تھے) عباس محمود العقاد جن کو اس عصر میں عقلیت عربیہ کا رمز سمجھا جاتا تھا، ان کے حلقہ بگوش، ادبی حلقے کے ایک ہونہار فرد سید قطب شہید بھی

تھے، جو اس وقت علمی و دینی تالیفات میں مصروف تھے، ڈاکٹر محمد حسین ہیکل (سیرت نبوی پر جن کی انگریزی میں کتاب ہے) توفیق الحکیم (مشہور صاحب قلم، صحافی اور شاعر) احمد حسن زیات جن کی مشہور کتاب تاریخ الادب العربی ہمارے درس میں بھی تھی، جن کا اوپر ذکر ہوا۔

علماء کرام میں شیخ الازہر جن کو ''الامام الاکبر'' کے لقب سے یاد کیا جاتا ہے، اس وقت شیخ عبدالمجید سلیم تھے، دوسرے علماء ازہر میں شیخ محمد شلتوت بھی موجود تھے، مسند احمد بن حنبل کے شارح محدث محمود احمد شاکر تھے، اور عبدالسلام ہارون (محقق معجم الصغانی) شیخ حسین مخلوف (مفتی اعظم مصر) شیخ احمد بن عبدالرحمٰن (سنن ابوداؤد کے شارح۔ امام حسن البناء شہید کے والد ماجد) ایک خاص نوعیت کے موحد شیخ حامد فقی بھی تھے۔ مشہور حنفی مفسر زاہد الکوثری تھے، اعجاز القرآن پر وسیع کام کرنے والے علامہ الخضر حسین جو بعد میں شیخ الازہر بھی ہوگئے تھے۔

غرض مصر اس وقت اہل علم وکمال سے جگمگا رہا تھا، یوں وہ یورپ، افریقہ اور ایشیا تین براعظموں کی تہذیب کا سنگم تھا، اور جہاں علوم اسلامیہ وعربیہ میں ایک سے ایک باکمال تھے وہاں آزادی نسواں کا بھی زور تھا، قاسم امین (آزادی نسواں کے مبلغ وداعی) کے فکری ونظریاتی عقیدہ کے لوگ بھی تھے۔

علماء ازہر کا لباس ایک جبہ ہوتا ہے جس کو ''کولا'' کہا جاتا ہے، آستیں اتنی چوڑی ہوتی ہیں کہ اس میں ایک بچہ سما سکتا ہے، گردن پر سادہ کالر جیسے شیروانیوں کا ہے اور ٹخنے تک لانبا ہوتا ہے اس کے اندر وہ عربی ثوب پہنتے ہیں اس پر کلاہ ترکی جس پر سفید پگڑی منڈھی ہوتی ہے۔ لبنانی اور شامی علماء اس کولا کے نیچے فل شرٹ، ٹائی، اور پتلون پہنے ہوتے ہیں، اگر کولا اتار دیں تو سراپا موڈرن انگریزی سوٹ میں ظاہر ہو جائیں، کولا اور کلاہ چڑھا لیں تو ''رجال الدین'' بن جائیں، قد وقامت

عام طور پر بلند، جسم عمومی طور پر فربہ، ریش وفش سے آزاد، مگر آواز بہت بلند اور سینہ و حلق میں قوت کافی ہوتی ہے، تقریر کا انداز پرکشش، اگر بارہا سنی سنائی بات بھی دہرائیں تو معلوم ہو کہ بہت اہم اور نئی بات کررہے ہیں۔ قرآنی آیات اور احادیث، واقعات کے متن ان کو اکثر ازبر ہوتے ہیں، طریق خطابت بہت دل آویز ہوتا ہے باتیں پُر مغز اور مدلل کرتے ہیں، عربی ان کی مادری زبان ہے، قرآن کریم سے استدلال اس طرح کرتے ہیں جیسے ان کے الفاظ کا تتمہ قرآن ہے، سمجھنے والے ان سے متاثر تو ہوتے ہی ہیں، نہ سمجھنے والوں کے بھی اعصاب پر الفاظ کے زیر و بم کا براہ راست اثر پڑتا ہے، عراق کے مشہور مسلم اخوانی قائد شیخ محمود صواف مرحوم کراچی میں ایک بار تقریر کررہے تھے تو عربی سے نابلد سننے والے بھی جوش سے نعرۂ تکبیر لگانے لگے تھے، ڈاکٹر سعید رمضان، عبدالحکیم عابدین اور شام کے استاذ مصطفےٰ السباعی بہت اعلیٰ درجہ کے مقررین میں شمار ہوتے تھے۔

ان تفصیلات سے دکھانا یہ ہے کہ مولانا جب مصر گئے ہیں آپ کی عمر ۳۷ سال کی تھی، لباس، ہندوستانی شیروانی اور وہ ٹوپی جس کو کوئی رام پوری کہتا ہے، کوئی کشتی نما، سفید پائجامہ، بقول الاستاذ احمد عطار کے وہ لباس جس کا وزن بھی ہلکا اور قیمت بھی معمولی (خفيف الوزن والثمن) مولانا عربی بے شک جانتے تھے اور اس زبان کے ادیب بھی تھے مگر اہل زبان کے اندر جو طاقت ہوتی ہے، بے ساختگی اور روانی ہوتی ہے وہ اس شخص میں کہاں سے آسکتی ہے جس نے ایک غیر عرب ملک میں پرورش پائی ہے، غیر ملکی عربی دانوں کے لئے ان کے سامنے زبان دانی کا دعویٰ کجا، زبان کھولنا بھی دشوار ہو، اگر کوئی زبان دانی کا ہنر لے کر جاتا اور اس کا سرمایہ علم صرف عربی زبان میں مہارت ہوتی تو اہل زبان حضرات کو حق تھا کہ کہیں ؎

دعویٰ زباں کا لکھنؤ والوں کے سامنے؟!
اظہار بوئے مشک غزالوں کے سامنے؟!

لہٰذا یہ تصور کہ مولانا کی پذیرائی مصر میں اس لئے ہوئی کہ آپ عربی زبان صحت اور روانی کے ساتھ بول لیتے تھے، غلط ہے، مولانا سے پہلے بھی ایسے لوگ وہاں گئے ہیں جو عربی زبان پر قدرت رکھتے تھے، اور بعد میں بھی جاتے رہے ہیں جن کو نہ صرف زبان عربی آتی تھی بلکہ مصریوں کے لہجے میں بات کرنے کی مشق بھی تھی، اس سلسلہ میں ایک خاص بات عرض کردوں تو بے محل نہ ہوگی کہ ایسے لوگوں کی کمی نہیں جو اپنی مادری زبان کے علاوہ دوسری زبان مثلاً عربی یا انگریزی پر مہارت حاصل کرنے کے بعد اہل زبان کے لہجے کی بھی نقل کرتے ہیں، اپنے حلق کی ساخت کو موڑنا چاہتے ہیں وہ اکثر مضحکہ خیز قسم کی حرکت کر جاتے ہیں، نقل، نقل ہی ہے، حضرت مولانا بے تکلف اور مسلسل اسی طرح عربی بولتے ہیں جیسے اردو، مگر کبھی آپ نے حجازی یا مصری لہجے کی نقل نہیں کی۔ قدرت نے جس قدر سینے میں طاقت دی ہے آلات صوت ocal instrument میں جس قدر فطری لچک ہے، اس کو موڑنے کی کوشش کبھی نہیں کی، ہاں مخارج صحیح ہوتے ہیں، اور کیوں نہ ہوں جب کہ قرآن کریم کی قرأت و تلاوت کی وجہ سے زبان عربی مخارج کی عادی ہے اور اہل زبان سے زبان سیکھی ہے، مولانا کے اسلوب تحریر عربی و اردو پر ہم آئندہ صفحات میں گفتگو کریں گے، اس وقت مزید اس کی وضاحت ہو جائے گی، یہاں ذکر اس بات کا ہے کہ مولانا جب مصر گئے ہیں، مصر کی طرف آپ کی زندگی کا پہلا سفر تھا، یوں علمی طور پر اور عرب ثقافت سے واقفیت کی بناء پر وہاں کے کوچہ و بازار کا مولانا کے ذہن میں ایک تصور ہوگا، مگر شنید و دید میں کافی فرق ہوتا ہے، مولانا کے لئے وہ ملک اجنبی تھا، وہاں کے لوگ اجنبی تھے، اور آپ ان کے درمیان سراپا اجنبی تھے، رفتار

وگفتار، لباس ومعاشرت ہر چیز آپ کی جدا تھی، وہ جو دعوت لے کر گئے اس دعوت کے امامانِ فن وہاں موجود تھے۔ الازہر کے علماء، الاخوان کے خطباء کا وہاں مجمع تھا، قرآن کے مفسروں اور حدیث کے شارحوں کا جمگھٹا تھا، ایک سے ایک محقق، ایک سے بڑھ کر ایک لکھنے والے، کون سا فن تھا جس پر وہاں ریسرچ اور تحقیق کرنے والوں کی کمی ہو، لکھنے والے ایسے ایسے جن کی ایک ایک سطر کو پڑھ کر عربی زبان کا ذوق رکھنے والے جھوم اٹھیں، جس گلی کے لوگ احمد حسن زیات، طہٰ حسین، محمود العقاد، اور سید قطب ہوں وہاں ایک ہندی عالم کس گلی میں شمار ہوسکتا ہے؟! پھر بھی اللہ تعالیٰ نے آپ کو جو مقبولیت عطا فرمائی کہ اصحاب علم اور ارباب فن نے آپ کو عظمت کے ساتھ اپنے اونچے سے اونچے منبر پر بیٹھایا، اور آپ کی باتیں احترام اور اعتراف کے کانوں سے سنیں، آٹھ مہینوں کی مدت میں آپ کے اعزاز میں جو دعوتیں اور جلسے ہوئے ان کی صحیح تعداد تو معلوم نہیں البتہ جب آپ مصر، سوڈان اور شام سے واپس مکہ مکرمہ آئے ہیں تو میں نے آپ کے اعزاز میں ہونے والے جلسوں اور دعوتوں کے کارڈ دیکھے ان کی تعداد ۲۸ تھی، ان کے داعی صالح حرب باشا سے لے کر الاخوان، شباب سیدنا محمد اور دوسری جمعیتیں تھی، آپ کی تقریروں پر تبصرے اور اس کا چرچہ المنبر میں شائع ہوتا رہا، الثقافة، اور "الرسالہ" میں آپ کا مقالہ "اسمعي يامصر" (مصر سے خطاب) شائع ہوا۔

یہ جو کچھ پذیرائی اور تکریم واعزاز کا معاملہ ہوا وہ راقم کے نزدیک کوئی معمہ نہیں تھا، اور نہ خرق عادت یہ سب اخلاص اور للٰہیت کی قوت تھی اور داعیانہ جذبہ اور پیغام کی الہامی قوت کا عمل تھا۔ ضرورت ہے کہ اس کی تشریح کردی جائے کیونکہ یہ بہت اہم موضوع ہے۔

"محمد عربی سے ہے عالم عربی"

مولانا نے علماء ازہر، ادباء مصر، یونیورسٹیوں کے پروفیسروں، ممتاز

اہل قلم اور اہل فکر سے جو کچھ کہا اور جس کے کہنے میں دل و دماغ کی پوری توانائی لگادی، زبان و بیان کی جو بھی صلاحیت اللہ تعالیٰ نے ودیعت فرمائی تھی وہ سب صرف کردی، وہ بات بقول جگر مرحوم ''سمٹے تو دل عاشق، پھیلے تو زمانہ ہے'' ایک ہی بات تھی، پیرایۂ بیان مختلف، انداز گفتگو جدا، موضوعات متنوع، مگر دل کی لگی بات ایک ہی تھی کہ عربوں کو یہ باور کرایا جائے کہ عرب ممالک جن کی فکری قیادت مصر کے ہاتھ ہے اس کو ضرورت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات اور آپ کی رسالت پر اپنے یقین کو پختہ کرے۔

کوئی اگر پوچھے اور صرف پوچھے ہی نہیں بلکہ تعجب کا اظہار کرے تو بے جا نہ ہوگا کہ آخر اس بات کو اس درجہ بڑھا کر خطیبانہ جوش اور ادیبانہ تنوع بیان کے ساتھ کہنے کی کیا ضرورت تھی؟ کیا اہل مصر خدانخواستہ رسالتِ محمدؐ کے منکر تھے؟ کیا ان کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پیغام و رسالت پر یقین نہیں تھا؟ کیا علماء ازہر نے احادیث نبویؐ کی خدمت نہیں کی ہے؟ احادیث نبویہ کی شرح و تفسیر پر عمریں نہیں صرف کی ہیں؟ کیا سیرت نبویؐ کے بڑے بڑے جلسے وہاں نہیں ہوتے؟ کیا مصر کے قاری دنیا بھر میں فن قرأت میں معیار اور نمونہ نہیں ہیں؟ کیا گاؤں گاؤں اور شہر شہر میلاد کی محفلیں نہیں ہوتیں؟ کیا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے ان کی عقیدت میں کسی طرح کی کمی دیکھی گئی؟ عوام تو عوام ٹھہرے خواص کا بھی تکیہ کلام واللہ کے بعد والنبی ہے (اللہ کی قسم اور نبی کی قسم) کسی سے کوئی کام لینا ہوتا اور جب یہ کہنا چاہے کہ ''خدا کے لئے یہ کام کردو'' تو کہتے ''باللہ'' و ''بالنبی'' (اللہ کے لئے اور اس کے رسول کے لئے)۔

لہٰذا ایسے ملک میں جہاں میلاد کی محفلوں میں جب میلاد خواں کوئی معجزہ بیان کرتا تو حاضرین تحسین کے نعرے لگاتے۔ ''الله يفتح عليك'' اللہ تجھ پر مضامین

کی آمد کو اور بڑھائے" "بارك الله فيك" "الله يرضىٰ عليك" کی آوازیں گونجنے لگتیں، بعض سامعین پر ایسا وجد طاری ہوتا کہ بڑھ کر میلاد خواں کی پیشانی اور اس کے رخسار چومنے لگتے، اس والہانہ تعلق رکھنے والوں کو یہ بتانے کی کیا ضرورت تھی کہ "محمد عربی سے ہے عالم عربی"؟؟

اس کا جواب "برائے جواب" اور سخن سازی کا حاجت مند نہیں ہے بلکہ ایک واقعاتی تجزیہ اور حقیقت پسندانہ علمی تحلیل کا متقاضی ہے، صورت حال یہ تھی، جواب تک چلی آرہی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی شخصیت عوام میں ایک افسانوی ہیرو کی تھی آپؐ کے معجزات قبل پیدائش کی موضوع روایات کو مروجہ میلاد کی منظوم ومنثور کتابوں میں شدومد سے بیان کیا جاتا ہے، مثلاً آپؐ ناف بریدہ اور مختون پیدا ہوئے تھے، پیدائش سے پہلے جنت کی حوریں آپؐ کی والدہ ماجدہ کی خدمت میں حاضر رہتیں، آپ کی پیدائش کے وقت کسریٰ کے قصر میں زلزلہ آگیا، اور چودہ کنگرے گر پڑے، دریائے سادہ خشک ہوگیا، آپؐ جدھر جاتے بادل کا ایک ٹکڑا سایہ فگن رہتا، گویا آپ کی شخصیت ایک مافوق البشر اور مافوق الطبیعاتی شخصیت تھی، جن کی سیرت کے آداب حدود بشریت سے ماوراء ہیں، جن کا اتباع انسانی قوت سے بالاتر ہے، عوام اس عقیدہ پر قائم ہیں اور علماء کی طرف سے ان کے اصلاح عقیدہ کی کوئی کوشش نہیں کی گئی، اس کا اثر خواص کی زبان پر تھا، جس کا اوپر ذکر کیا گیا، جیسے بات بات پر "والنبی" کی قسم کھانا اور "بالنبی" کہہ کر کچھ طلب کرنا۔

یہ عوام کا حال تھا اور خواص اسلام کے احسانات کو فراموش کر چکے تھے، دانشور اور صحافی اپنی سات ہزارہ تاریخ فراعنہ پر فخر کرتے، کوئی حضرت عمرو بن العاصؓ فاتحِ مصر کا ذکر نہیں کرتا، فراعنۂ مصر اور اہرام کی تقدیس ایک قومی وفاداری کی علامت سمجھا جاتا۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے وقت میں جو فرعون تھا، رمسیس

ثانی (۱) اس کا مجسمہ نمایاں کیا گیا ہے، قاہرہ کے مرکزی اسٹیشن پر اس کا مجسمہ آج بھی موجود ہے جس کی دوبارہ مرمت اور تزئین جمال عبدالناصر کے عہد میں ہوئی، مصر کے سب سے بڑے شاعر ''شوقی'' نے ڈھائی سو شعروں کا قصیدہ ''توت عنخ آمون'' کے عنوان سے لکھا جس میں فراعنہ کے امجاد کا والہانہ انداز بیان میں ہے اور جو تین نعتیہ قصیدے لکھے ہیں وہ سب معجزات، خیال آفرینی، اور لفظی صنعت گری پر مبنی ہیں، کہیں یہ ذکر نہیں ہے کہ آپؐ نے انسانیت کو کیا پیغام دیا اور انسانی زندگی کے لئے آپؐ کے اسوہ کے بغیر نجات وہدایت ممکن نہیں، انگریزوں اور فرنچ نے اپنے اپنے دور میں مغرب کی معاشرت کو جزءِ زندگی بنادیا، صحافت کا رخ یکسر اس طرح ہو گیا کہ اگر کہیں ادیان و مذاہب کا ذکر آیا تو اس میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا نام ''والنبی'' محمد (بغیر صلی اللہ علیہ وسلم کے) کہہ کر سرسری لیا گیا، علمائے ازہر اور وہ لوگ جو مذہبی خدمت انجام دیتے ان کو ''رجال الدین'' کہا جاتا یعنی مذہبی لوگ، مغرب کی تمام رسومات مثلاً شادی کے بعد ہنی مون منانا، ماں کی تقدیس اس طرح کہ سال میں ایک بار مدرڈے (یوم الام) کی تقریب ہو، محرمات کو محرمات سمجھا ہی نہیں جاتا، یہ سب باتیں یورپ اور غیر اسلامی ملکوں کی طرح عام تھیں۔

اس کے مقابلہ میں علماء ازہر کے مواعظ، تفسیری دروس کا سلسلہ بھی جاری ہے، مصری علماء کی علمی خدمات سے انکار نا ممکن اور جہل کی علامت ہے، انھوں نے تفسیر، سیرت، ادب و بلاغت پر جو شاندار حاشیئے اور شرحیں لکھیں ہیں اور ان کی طباعت کا جو دیدہ زیب معیار قائم کیا ہے وہ نہ صرف عرب ممالک بلکہ پوری اسلامی دنیا پر احسان ہے، لیکن ان کا حلقۂ نفوذ بہت محدود اور ان کے مواعظ وخطبات میں یہ دعوت نہیں ملتی کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت وسنت ایک ابدی پیغام

(۱) قبطیوں کے سلاطین کا خاندانی لقب ''فرعون'' ہوتا تھا جیسے مسلمانوں کے سربراہ کا لقب امیر المؤمنین ہے

ہے اور زندگی کے ہر موڑ پر اور تمام بدلتے ہوئے حالات میں اور روئے زمین
کے ہر حصہ میں قابل عمل ہے، صرف یہی نہیں کہ قابل عمل ہے بلکہ اس کے بغیر
آخرت تو آخرت ٹھہری دنیا میں بھی عدل وانصاف قائم نہیں ہوسکتا، اور انسان
کشی کا سلسلہ ختم نہیں ہوسکتا، انسانیت کی موجودہ عہد میں جو رسوائی دیکھی جارہی
ہے کہ ایک فرد ایک قوم اپنی لذت اندوزی کے لئے لاکھوں کا خون کرتا ہے اور ملکوں
کو تباہ کرتا ہے، انسان کو انسان جانور کی طرح غلام بناتا ہے جیسا کہ افریقی ممالک
کے باشندوں کے ساتھ گوری رنگت والے یورپین نے سلوک کیا ہے اس کو صرف
اسلام ہی کی تعلیمات ختم کرسکتی ہے، یہ دعوت نہیں دی گئی کہ عرب مسلمانوں کے لئے
آئیڈیل رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے پیروکار صحابہ کرامؓ ہیں بلکہ کوئی
نیوپلین کا نام لیتا ہے کوئی فرائڈ کا کوئی ڈی گال کو نمونہ سمجھتا ہے، عرب اسلام کی
وجہ سے دنیا میں روشناس ہوئے، اسلام کے صدقہ میں ان کو عزت ملی، اسلام ہی
کے نام پر وہ سارے عالم میں عزت واعتبار کی نظر سے دیکھے گئے، اس حقیقت کا
اعتراف کجا اس کے برعکس عیسائیوں کی طرح مذہب کو عبادت گاہوں تک محدود
کرنے کی سازش کامیاب ہوچکی ہے، اسلامی آداب معاشرت کو بدویانہ تہذیب
سمجھنا ایک روش عام بن چکا تھا۔ انور السادات مرحوم (جن کو کاتب الحروف ان کے
پیش رو عبد الناصر سے بہتر سمجھتا ہے) جیسا صحافی دانش ور جو موتمر اسلامی کا سکریٹری
جنرل رہ چکا ہے اور اسلامی تعلیمات میں اپنے کو کسی ازہری شیخ سے کمتر نہیں سمجھتا
تھا، وہ برملا کہتا ہے کہ ''اخوان چاہتے ہیں کہ ہم آگے بڑھنے کے بجائے پیچھے کی
طرف لوٹ جائیں، جنگل کا قانون رائج کریں چور کے ہاتھ کاٹیں اور زانی کو پتھروں
سے مار کر ہلاک کریں''۔ یہ لفظ ''پیچھے کی طرف لوٹ جائیں'' رجعت'' اہل دین
کے لئے اصطلاح بن گئی، رجعی ہر وہ شخص ہے جو اسلامی قوانین کی بالادستی چاہتا

ہو، مسلمانوں کے لئے یہ لفظ اس وقت بھی بولا جاتا تھا مگر اس کی کثرت اور اس کو ایک مذموم جاہلانہ غیر عاقلانہ غیر تمدنی علامت کے طور پر اس وقت رائج کیا گیا جب کہ ''قومیت عربیہ'' کی تحریک شباب پر تھی جس کا ذکر بعد میں کروں گا۔ لیکن دوسری طرف ''مولد النبی'' دھوم دھام سے منایا جاتا، بوصیری کی نعت جس اچھے دُھن میں مصری پڑھتے ہیں اس کی نظیر نہیں مل سکتی، لیکن جس نے ان ''المولد'' منانے والوں کو یہ کہنا چاہا کہ صاحب المولد صلی اللہ علیہ وسلم کی لائی ہوئی شریعت کو رائج کرو، زندگی سے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو خارج نہ کرو، اس پر قیامت ٹوٹ پڑی، واقف کار حضرات جانتے ہیں کہ الاخوان المسلمون نے جب اس بنیاد پر اپنی تحریک شروع کی تو ان کو ملک کا باغی قرار دیا گیا، انگریزوں کے اشارہ پر نہیں بلکہ حکم پر فاروق شاہِ مصر نے شیخ حسن البنا کو قتل کرایا، اور روس (سویت یونین) کی فرمائش پر جمال عبد الناصر نے سید قطب، عبد القادر عودہ، محمد الفرغلی رحمہم اللہ کو شہید کرایا۔

فرعون اور فرعونیت ہم غیر عرب مسلمانوں کے درمیان ظلم و جہل کی علامت ہے۔ کیونکہ قرآن کریم میں حضرت موسیٰ علیہ السلام کے قصوں سے جو اس کا تصور ملتا ہے وہی ہمارا ایمان ہے، مگر مصر میں یہ بات نہیں ہے، فاروق شاہ مصر کو وریث الفراعنہ (فرعونوں کا جانشیں) کہا جاتا تھا۔ جیسا کہ ایران کے شاہ محمد رضا پہلوی کو ''آریا مہر'' کہا جاتا تھا۔

اس ماحول میں جو پیغام اہل مصر کو دیا جانا چاہئے تھا اور جس کی وہاں ضرورت تھی تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے الفاظ میں ان کو یاد دلایا جائے، کہ ''اے عربو! تم دنیا کی ذلیل ترین قوم تھے، دنیا کی سب سے زیادہ نظر انداز کی ہوئی قوم تھے، تم کو اسلام نے سر بلند کیا اور عزت دی اور جب تم اسلام کو چھوڑ کر عزت طلب کرو گے تم کو ذلت و نامرادی کا سامنا کرنا پڑے گا''۔

یہی تنبیہ فاروقی کا ترجمہ سمجھئے کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم سے عرب کی آبرو وابستہ ہے، اگر آپ نہیں تو کچھ بھی نہیں، یہ جذباتی نعرہ نہیں تھا، کوئی تخیلاتی افسانہ نہیں تھا، وقت کی سب سے بڑی ضرورت اور دین کا تقاضا تھا۔

اللہ تعالیٰ نے یہ بات مولانا سید ابوالحسن علی میاںؒ سے کہلائی، پہلا خطاب جو بہت عام "اے مصر سن" اسمعی یامصر! تھا، دوسرا خطاب الاخوان المسلمون کے باقی ماندہ افراد سے تھا، اريد أن أتحدث الى الاخوان' میں اخوان سے کچھ کہنا چاہتا ہوں'' پھر بعد میں اسی طرح کا خطاب تمام عربوں سے کیا گیا، اسمعو ها صريحة منى أيها العرب! اے عربو! مجھ سے صاف صاف سن لو! صرف ان تینوں خطابات کا ترجمہ یا خلاصہ آپ سنیں گے تو حسب ذیل تین باتیں واضح طور پر نظر آئیں گی۔

پہلی بات یہ ہے کہ ان خطابات میں صاحب خطاب کے درد دل اور بے پناہ تڑپ کا اندازہ ہوگا، وہ یہ بات جس بے چینی اور کرب کے ساتھ کر رہے ہیں اور جس شدت کے ساتھ ان کے اندر طلب ہے کہ ان کی بات لوگ سمجھ لیں اس شدت کو واضح کرنے کے لئے ایک ہی لفظ ملتا ہے جو قرآن کریم سے مستعار ہے۔ وہ لفظ ہے "حرص"، جس طرح کوئی مال کی طلب میں دیوانہ ہو جاتا ہے خواہ خوشامدوں سے حاصل کرے یا کما کر حاصل کرے، خواہ بھیک مانگ کر حاصل کرے، جائز ناجائز وسائل اختیار کرتا ہے کہ کس طرح اس کو دولت مل جائے، اسی دھن کو "حرص" کہتے ہیں، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو اپنی امت کا غم اور اس کی اصلاح کی فکر اسی درجہ تھی کہ قرآن کریم نے آپؐ کے بارے میں فرمایا "حَرِيصٌ عَلَيْكُمْ"، یعنی دل ودماغ زبان کی تمام طاقتیں یکجا ہو گئی تھیں کہ کسی طرح اللہ کا پیغام لوگوں کے دلوں میں اتار دیں۔ ایک اندرونی تڑپ اور بے چینی تھی، اصلاح امت کی یہ حرص رسول اللہ

صلی اللہ علیہ وسلم کی امت میں باقی ہے اور ہر دور میں ایسے افراد پیدا ہوتے رہے ہیں جن پر وہ فکر طاری رہی جس کو حرص کہا جائے۔

دوسری بات "اُدْعُ اِلٰی سَبِیْلِ رَبِّکَ بِالْحِکْمَةِ وَالْمَوْعِظَةِ الْحَسَنَةِ" اپنے رب کی طرف عقل مندی اور بہتر اسلوب نصیحت سے بلایئے اور بحث (کی اگر ضرورت پیش آئے تو) ان سے بہتر سے بہتر طریقے سے نمٹئے۔

داعی موقع ومقام کے لحاظ سے بات کرتا ہے اس کا مقصد "مناظرہ جیتنا" نہیں بلکہ کلمہ حق کی سربلندی ہوتا ہے، وہ اس کی کوشش نہیں کرتا کہ اس کا مخاطب بے بس ہو کر چپ ہو جائے، اس کی کوشش یہ ہوتی ہے کہ مخاطب بات کو دل سے مان لے، اور اس پر حق آشکارا ہو جائے، اللہ تعالیٰ کی مشیت نے جب مولانا سید ابوالحسن علیؒ سے یہ خدمت لی کہ وہ اسوۂ نبویہ کو زندگی کا شعار بنانے کی دعوت اہل فکر وقلم کو دیں تو آپ کی ذہانت اور ابتکار کی صلاحیت (۱) اپنے پورے عروج پر ابھر آئی، خود مولانا کی تعبیر ہے کہ موتیوں میں سوراخ کرنا سنگ تراشی سے کہیں زیادہ مشکل کام ہے۔

تیسری بات یہ نظر آتی ہے کہ اللہ تعالیٰ کے کلام اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت میں من موہنی، یا مقناطیسی کشش آج بھی موجود ہے، بات اگر سلیقہ سے کہی جائے، دردمندی کے لہجے میں کہی جائے، محبت واحترام کے پیرایہ میں ذکر کی جائے تو اس کو قبول کرنے والے جس طرح پہلے دور میں تھے آج کے دور میں بھی ملیں گے، شرط اخلاص وصداقت کی ہے جس سے خداداد صلاحیتوں کے تمام سوتے پھوٹ نکلتے ہیں اور صلاحیتوں میں اگر نقص ہو تو اللہ تعالیٰ صلاحیتیں بھی پیدا فرما دے گا۔ کہ

---

(۱) عام مروجہ لفظ "تخلیقی صلاحیت" ہے مگر اس لفظ "تخلیق" کو ہماری دینی حس نے قبول نہیں کیا ہے اور اس کی جگہ ابتکار بولنا صحیح سمجھتے ہیں اگر چہ یہ لفظ اردو میں عام نہیں ہوا ہے۔

ورنہ گلشن میں علاج تنگیٔ داماں بھی ہے

مولانا نے اہل مصر کو جو پیغام دیا اور جو وہاں کے سب سے بڑے مؤقر ومشہور مجلّہ ''الرسالہ'' میں پہلی بار شائع ہوا، جس کے ایڈیٹر زیات بک تھے، جن کی تحریر کو لوگ ادبی شہ پاروں کی طرح پڑھتے تھے، اس کو پڑھ کر قطب شہید علیہ الرحمہ نے مولانا سے کہا تھا ''کاش مصر سن لے'' اس کا خلاصہ یہ ہے:

''اے مصر! میرا اسلام قبول کر، عرب دنیا کی فکری قیادت تجھے مبارک ہو، وہ قیادت جس کا تجھے پورا استحقاق ہے، یہ قیادت تو نے کسی سے چھین کر یا غصب کر کے نہیں حاصل کی ہے، بلکہ اپنی صلاحیت اپنی محنت وسرگرمی عمل سے حاصل کی ہے، تو عرب ممالک کا دماغ ہے، اس کی دیکھنے والی آنکھ اور سننے والا کان ہے، اس کی عقل وفکر ہے یہ واقعہ اور حقیقت ہے، کوئی تسلیم کرے یا نہ کرے، حقائق کو جھٹلایا نہیں جا سکتا، علم کی گرم بازاری، گلستان ادب کی آبیاری، علماء وادباء کی قدر دانی میں آج تیرا کوئی ہمسر نہیں ہے، اہل علم وفن تیری آغوش میں پل کر جوان ہوئے، تیرے دامن نے ان کو پناہ دی، سرد وگرم سے بچایا، وہ سب تیری اولاد اور تو ان کی مادر مشفق ہے، جامعہ ازہر تیری عظمت کا نشان، علم کا چشمہ رواں اور عالم اسلامی کی جان ہے، ایک قدیم ترین شجر سایہ دار ہے، جو ہمیشہ پھل دیتا رہا ہے، اور اس کثرت سے دنیا کو مستفید کرتا رہا ہے جس کی نظیر دنیا کی کوئی دانش گاہ یا درس گاہ نہیں پیش کر سکتی۔''

عربی زبان کی لسانی حرمت کو محفوظ رکھنے میں تیری کاوش اور حمیت، اس کو پائیدار رکھنے اور پھیلانے میں تیری جدوجہد

اور محنت قابل صد تحسین ہے، تو نے اس کی اہمیت بڑھانے اور دنیا کی دوسری عالمی زبانوں کی طرح اس کو بلند مقام تک پہنچانے میں تیرے ادباء اور اہل قلم کی حوصلہ مندی اور جرأت، سیاست اور صحافت میں تیرے اخبار نویسوں کی خدمت، لسانیاتی اکیڈمی کی پیش روی اور تصنیف و تالیف، ترجمہ و اشاعت میں سرگرمی نے عربی زبان کو فلسفہ و سائنس، ریاضیات و طبعیات کے ہر میدان میں کسی مغربی زبان سے پیچھے نہیں ہونے دیا۔

قابل مبارکباد ہیں یہ تیرے ہونہار و نونہالانِ چمن، ادباء اور مصنفین، ان میں ایک سے بڑھ کر ایک صاحب اسلوب، انشاء پرداز، بڑی ماہرانہ قدرت رکھنے والے، سلیس اور رواں لکھنے والے پیدا ہوئے، فن کار و پرکار سامنے آئے، محقق و نقاد، وسیع النظر اور دقیقہ سنج علماء اور مؤرخین، اعلیٰ درجہ کے مقرر و خطیب اور ایسی مہارت رکھنے والے افسانہ نویس اور قصہ گو پیدا ہوئے کہ اگر کسی بزم کا نقشہ کھینچیں تو:

شمع تصویر پہ گرنے لگیں آ آ کے پتنگ

اور اگر کسی معرکہ کا ذکر کریں تو:

خوں برستا نظر آئے جو دکھا دیں صفِ جنگ

طنز و مزاح پر لکھیں تو دکھتی رگوں پر انگلی رکھ دیں، ہنسانے، رلانے والے لطیفہ گو، تعمیری و تخریبی دونوں قسم کی تنقید کرنے والے تیری ہی سرزمین سے عرب دنیا کو ملے، طبع زاد شاعر، اعلیٰ درجہ کے سیاسی اور صحافی اس درجہ کے بلند قامت کہ اگر کسی پر رائے

دیں تو ساری دنیا میں اس کی گونج سنائی دے، جن کی تحریر سے اس راہ کے نئے راہ رو قلم پکڑنا سیکھیں اور ان کی نقالی کی کوشش کریں، اور ان کی تحریر کو اس طرح بطور سند پیش کریں جیسے قدماء کے اشعار سے سند پیش کی جاتی ہے۔

سرزمین مصر! میں دل سے ان تمام خصوصیات کو تسلیم کرتا ہوں اور اعتراف کرتا ہوں، اس کے ساتھ کچھ دل کی بات زبان پر لانا چاہتا ہوں، تجھ سے گفتگو کا موقع ملا ہے تو چاہتا ہوں کہ تجھے درد دل سنا ہی دوں۔

سرزمین مصر! علم وادب کی خدمت سے بڑھ کر اور ان تمدنی سوغاتوں سے ماسوا جو تو مغرب کے خوان نعمت سے لے کر عرب ممالک میں تقسیم کرتا ہے، تیری ایک ذمہ داری اور بھی ہے اور وہ بڑی ذمہ داری ہے، تو مشرق و مغرب کا سنگم ہے۔ مشرقی و مغربی دونوں کلچروں کی سرحد تیری زمین پر آ کر ملتی ہے، تو واقعی ''مجمع البحرین'' ہے، لہٰذا تیری ذمہ داری صرف مصر تک محدود نہیں بلکہ دونوں براعظم کے دہانے پر ہونے کی وجہ سے دونوں کے حقوق تیرے ذمہ ہیں، تیرا ایک سرا اس زمین پر ہے جہاں سے اسلام کا اجالا پھیلا اور جہاں سے دین کی کرن پھوٹی اور دوسرا سرا مغربی تمدن اور علوم عصریہ کے مراکز پر ہے، تجھ پر دونوں کے حقوق ہیں اور دوہری ذمہ داری ہے۔

مصر! تو اپنی ذمہ داریوں سے اس وقت تک عہدہ برآ نہیں ہوسکتا جب تک تو ایک پل کی حیثیت نہ اختیار کرے جس سے ایک

طرف یورپ کے سائنسی تجربات وعلوم، محنت اور سرگرمی اور زندہ رہنے کے لئے جدوجہد کا اصول عرب ممالک کی طرف منتقل ہو، اگر تو یہ حیثیت اختیار کرلے گا تو ان عرب ممالک کا حق ادا کرے گا جس سے تیرا روحانی، دینی، ثقافتی اور سیاسی تعلق ہے۔

یورپ کی طرف سے تیری ذمہ داری یہ ہے کہ جزیرہ عرب کا پیغام اس کو پہنچادے، جزیرہ عرب کا پیغام اسلام ہے، وہ دولت اسلام جو ایک زمانہ سے تیرے خزانے میں محفوظ ہے، وہ اسلام جس کے ذریعہ یورپ اپنی وہ گتھیاں سلجھا سکے گا جس کے سلجھانے میں اس کے ناخن تدبیر ناکارہ ثابت ہوچکے ہیں، اور قانون سازوں کی صلاحتیں ناکام ہوچکی ہیں، اگر تو ایسا کرے تو یورپ کے حق میں تیرا احسان بھی ہوگا اور جو کچھ تو نے اس سے لیا ہے کارخانہ کی تنظیم، پیداوار اور بڑھانے کی تدبیریں تجارتی سلیقہ، ان سب کا بہترین بدلہ ہوجائے گا بلکہ تیری عطاء و بخشش کا وزن کہیں زیادہ بڑھ جائے گا۔

اے مصر! تو نے بہت سے کارآمد پل تعمیر کئے ہیں جن سے آبِ رسانی کا کام منظّم ہوگیا ہے اور زراعت میں ترقی ہوئی ہے اور پورا ملک سرسبز ہوگیا ہے، میں چاہتا ہوں کہ تو ایک اور پل تعمیر کرے، ایسا پل جس کی دنیا میں مثال نہ ہو، جو ایسے دو دریاؤں کو جوڑے جو اب تک ایک دوسرے سے جدا جدا ہیں، جس سے دو تہذیبیں مربوط ہوجائیں جو اب تک ایک دوسرے کی مخالف ہیں، اور ان دونوں تہذیبوں کی جدائی عصر حاضر کا بڑا المیہ ہے،

اگر تو ایسا پل بنالے جن سے دونوں براعظم ایک دوسرے کو اپنی اپنی پیداوار دیں تو انسانیت کو ضائع ہونے سے بچالے گا اور دونوں بے جا وقت ضائع کرنے سے بچ جائیں گے، جس طرح تیرے بنائے ہوئے پلوں نے زراعتی نظام کو استوار کر دیا ہے اور ضرورت مندوں کا وقت بچایا ہے۔

نہر سویس کا نکالنا بلاشبہ ایک عظیم کارنامہ ہے، تاریخی واقعہ ہے جس کی وجہ سے تجارتی اور سیاسی دنیا میں انقلاب آگیا، لیکن کون انکار کر سکتا ہے کہ مشرقی ممالک کے لئے یہی نہر ایک مصیبت بھی لائی۔ فائدہ سے کہیں زیادہ نقصانات ہوئے، نہر سویس سے مغربی تہذیب مشرق پر ٹوٹ پڑی، عالم عرب کو دوسری نہر کی ضرورت ہے جو صحیح طور پر مفاہمت باہمی اور عادلانہ تبادلہ کی صورت نکال دے اور یہ کار خیر اے مصر تو ہی کر سکتا ہے، تیرا محل وقوع، تیری سیاسی اہمیت، تیری ثقافتی ثروت، تیرا روحانی مرکز نا قابل انکار ہے، تجھے خوب معلوم ہے کہ کسی سلطنت کا بجٹ اس وقت تک برابر نہیں ہوسکتا اور اس کی اقتصادی حالت متوازن نہیں ہو سکتی جب تک کہ اس کی برآمد، درآمد سے بڑھی ہوئی نہ ہو، لیکن ہم اہل مشرق جتنا برآمد کرتے ہیں اس سے کہیں زیادہ درآمد کرتے ہیں، قناۃ سویس کے ذریعہ ہماری درآمد بہت بڑھ گئی ہے اور برآمد گھٹ گئی ہے، لہٰذا ہمیں ضرورت ایسی نہر کی نہیں ہے جو غیر ملکی افکار وثقافت، فلسفہ واخلاق کو مشرق کے رگ وریشہ میں پیوست کر دے، ہمیں حاجت ایسی نہر یا پل کی ہے جو امپورٹ،

اکسپورٹ (درآمد و برآمد) کے نظام کو مساوی درجہ میں لے آئے۔
بلکہ حق یہ ہے کہ جو ثروت مشرق دے سکتا ہے اس کا وزن ہزار گنا
اس سے زیادہ ہے جو مغرب سے درآمد کیا جاتا ہے، مصر مغربی
ممالک کو اسلام کا ابدی پیغام دے سکتا ہے، عقیدۂ توحید کی
دولت دے سکتا ہے۔

یہ خلاصہ ہے ''پیغام بنام مصر'' کا پورے رسالہ کا ترجمہ دینا مقصود نہیں ہے اور نہ پیش نظر کتاب کا حجم اس کا متحمل ہو سکتا ہے جو اقتباس اوپر دیا ہے اس پیغام کا اسلوب سمجھنے کے لئے کافی ہے، اس کے اندر دعوت وحکمت کی روح جھلکتی ہے جو انبیائے کرام کا ورثہ ہے، ایک دردمند دل سے نکلی ہوئی آواز خالی نہیں جا سکتی تھی، اس کا اثر ہوا، اور مصر کے علماء اور ادباء وہاں کے دانش ور، اور مفکر ایسے گئے گزرے نہ تھے کہ اس پیغام کا مقصد نہ سمجھ سکیں، انہوں نے سمجھا اور اچھی طرح سمجھا، اس پر وہاں کے اہل علم وقلم نے تبصرے کئے اور تاکیدی بیانات دیئے، جس کو اس زمانہ کا ہفتہ وار ''منبر الشرق'' پابندی سے شائع کرتا رہا اور یہ راقم اس وقت مکہ مکرمہ میں تھا، جہاں المنبر کے ذریعہ ان بیانات، خطابات اور خطابات پر تبصرے پابندی سے پڑھتا رہا، حجاز سے ایک نوجوان، ادیب استاذ ماجد الحسینی نے ایک مضمون لکھا کہ اگر میں مصری ہوتا تو عرض کرتا کہ یہ پیغام حق صرف مصر کے لئے نہیں بلکہ تمام عرب ممالک کے فکر و فہم کے لئے ایک نیا باب ہے۔

یہ پیغام..........

''حکمت وموعظت'' کا وہ نمونہ ہے جس کی مثال ہمارے اسلامی لٹریچر میں نہیں مل سکتی، اور اگر کوئی مثال ہے تو خود مولانا ہی کی وہ ریڈیائی تقریر جو حجاز میں کی تھی۔ ''عالم انسانیت کا جزیرۂ عرب کو پیغام'' اعلیٰ ترین ذہانت، نکتہ رسی

اور نکتہ آفرینی کی صلاحیت اور اس کے ساتھ اخلاص وللّٰہیت اور دین کا درد، سوچنے کی بات ہے کہ پسِ دیوار کعبہ جو لوگ بیٹھے ہیں ان کو کیسے کہا جائے کہ دین کی طرف توجہ کرو، جو قرآن وحدیث کی شرحیں لکھنے والے ہوں ان سے یہ کیوں کر کہا جا سکتا ہے کہ آپ اس کتاب کا حق ادا کریں، مگر کہا گیا اور برملا کہا گیا اور اس حسن کے ساتھ کہا گیا کہ ان کو بجائے بُرا لگنے کے وہ اپنی تقصیر کے معترف ہوئے اور ان پر وہ اثر ہوا جیسے کسی نے دل ودماغ کے تار ہلا دیئے ہوں۔

یہی سبب ہے کہ راقم نے مولانا کے قیام مصر کے درمیان کی ہوئی تقریروں میں سے اس کو پہلے ذکر کیا۔ حالانکہ یہ مصر جانے کے ایک ماہ بعد چھپی تھی اور اس سے پہلے ایک دو نہیں متعدد تقریریں طلبائے ازہر کے سامنے ہو چکی تھیں جن میں تمام عرب وعجم ممالک کے طلبہ تھے۔

ازہر کے طلبہ سے خطاب میں آپ نے کہا کہ اسلام ایک سدابہار درخت ہے اس کی دعوت میں کوئی قدیم وجدید نہیں ہے، اس کی راتیں اس طرح روشن ہیں جس طرح اس کے دن، قدیم وجدید، تمدن، ادب، طرز معاشرت میں ہوتا ہے۔

مولانا نے اپنے قیام مصر میں بیسیوں تقریریں کیں اور ہر ایک کا مرکزی مضمون اسلام کی بنیادی دعوت تھا، اور یہ کہ صرف اسلام اور اس کی تعلیمات سے انسانیت کا زخم خوردہ جسم باقی رہ سکتا ہے اور ہر زخم کا صرف ایک ہی مرہم ہے، یہ بات اس قدر حکمت کے ساتھ کہی گئی کہ علماء وخواص بھی اعتراف پر مجبور ہوئے۔

مولانا کی ایک تقریر جو ''الاخوان المسلمون'' کے مجمع میں ہوئی وہ داعیان دین کے لئے کلیدی خطبہ کی حیثیت رکھتی ہے، اس کا عنوان تھا ''اريد أن أتحدث الى الاخوان'' میں اخوان سے کچھ کہنا چاہتا ہوں'' قبل اس کے کہ اس خطاب کے اہم اجزاء کا اردو ترجمہ آپ پڑھیں، وہ حضرات جو عربی زبان وادب اور

آداب گفتگو سے واقف ہیں وہ اس عنوان کی سادگی اور خالص عربی انداز خطاب پر غور کریں۔ وہ بے چارے مقفّیٰ جملوں اور غریب الفاظ کے استعمال کو ادب سمجھتے ہیں ان کے لئے یہ تقریریں ادب آموز بھی ہیں۔

مولانا نے اپنی گفتگو کا آغاز اس طرح فرمایا کہ:

''مجھے اس کا صدمہ رہے گا کہ شیخ حسن البنا سے ملاقات نہ ہوسکی البتہ اس محرومی کی تلافی اور تسکین قلب کا ذریعہ صرف یہی رہ گیا ہے کہ آپ حضرات سے گفتگو کریں اور اپنے دل کو کھول کر رکھ دیں''۔

مولانا نے گفتگو کے آغاز میں اسلامی دنیا کی عموماً اور عالم عربی کی صورت حال کا خاص طور سے جائزہ لیتے ہوئے ان اسباب وعوامل اور متضاد کارفرما عناصر کا تذکرہ کیا جن کی وجہ سے اسلامی دنیا مسلسل کشمکش کے دور سے گذر رہی ہے، اس سلسلہ میں آپ نے فرمایا:

''آج کی دنیا جس عالم اسلام کا سامنا کر رہی ہے وہ ذہنی افلاس کی کگار پر کھڑی ہے اور اپنی تباہی دیکھ رہی ہے اچکوں اور رہزنوں کا منظم گروہ ہے جو پوری انسانیت پر شب خوں مار رہا ہے، کوئی اس کی فریاد رسی کرنے والا نہیں ہے، مولانا نے اس جدید جاہلی دور کی تہ بہ تہہ تاریکیوں کا جائزہ لینے کے بعد بتایا کہ ایسے نازک ترین حالات اور گھٹاٹوپ اندھیرے میں انبیاء علیہم السلام کی بعثت ہوا کرتی ہے، لیکن سید الانبیاء خاتم النبیین کی آمد کے بعد اب کوئی نیا دین آنے والا نہیں البتہ مجددین اور اصحاب دعوت وعزیمت تجدید دین کا فریضہ انجام دیتے رہیں گے۔

اسلامی تاریخ کے ہر دور میں ایسے افراد پیدا ہوتے رہے ہیں،
آج کے دور میں اخوان کی دعوت وتحریک کی جو امتیازی خوبیاں
اور اوصاف ہیں ان کو دیکھ کر ہماری خوشی ومسرت کی کوئی انتہا
نہیں رہی کہ اس دعوت نے وسیع پیمانے پر اسلامی دنیا کو متاثر
کیا ہے اور الحاد واباحیت کا جو سیلاب بلاخیز آرہا تھا اخوان نے
اس کے خلاف ایک زبردست پشتہ باندھ دیا ہے، اس دعوت
نے زندگی کے ہر شعبہ کو متاثر کیا ہے، اگر اللہ تعالیٰ کو منظور ہوتا
کچھ دن یہ تحریک اور اس کے بانی باقی رہ گئے ہوتے تو قریب
تھا کہ اسلامی دنیا کا رخ بھی تبدیل ہو جاتا۔

مولانا نے اخوان کی دعوت وتحریک اور اس کے کارکنوں کی امتیازی خوبیوں اور کمالات کا پورا اعتراف کیا، انھوں نے فرمایا کہ اس دعوت وتحریک میں وہ بہت ساری خصوصیات پائی جاتی ہیں جو عرصہ سے ہمارے علم میں کسی اور دین واصلاحی تحریک میں اس ملک میں نہیں پائی جاتیں، مولانا نے سب سے پہلے شیخ حسن البناؒ کی جامع شخصیت کا تذکرہ کرتے ہوئے فرمایا کہ:

(۱) شیخ حسن البناء شہید ایک منفرد اور یگانہ روزگار شخصیت
کے مالک تھے، جس ماحول اور جس طرز پر ان کی نشو ونما اور تربیت
ہوئی تھی اس کے جائزہ سے انداہ ہوتا ہے کہ شیخ کو اس عظیم مقصد
کے لئے خاص طور سے تیار کیا گیا تھا، ان کے اندر متنوع
صلاحیتیں تھیں، اسلام کا وسیع اور گہرا علم، دین کا عمیق فہم، دینی
غیرت وحمیت، دل دردمند فکرِ ارجمند، اسلام کی سربلندی کے لئے
جہد مسلسل اور عمل پیہم، ساحرانہ خطابت، دل آویزی ودل کشی اپنے

رفقاء واحباب کے دلوں کے اندر اتر جانے کی غیر معمولی صلاحیت، اقبال کے الفاظ میں ۔

نگہ بلند ، سخن دلنواز، جاں پرسوز
یہی ہے رخت سفر میر کارواں کے لئے

۲ اس دعوت وتحریک کی دوسری امتیازی خوبی یہ ہے کہ اس میں مختلف بلکہ متضاد صفات جمع ہوگئی ہیں جو کسی دعوت وتحریک میں کم جمع ہوتی ہیں ۔ پختہ ایمان ،قوت عمل ،عصری علوم میں کمال، تنظیم کی اعلیٰ درجہ کی صلاحیت ادب وصحافت اور صنعت وتجارت میں مہارت ، یہ ایسی خوبیاں اور خصوصیات تھیں جنہوں نے اس دعوت وتحریک کو عصری تقاضوں سے ہم آہنگ ایک عوامی تحریک بلکہ ایسی عالمگیر برادری میں تبدیل کردیا تھا جس میں ہر قوم کے لوگ گروہی اور طبقاتی عصبیت کو فراموش کر کے پورے خلوص و محبت اور احساس اخوت کے جذبے سے ایک دوسرے سے مل بیٹھے تھے ، اس تحریک میں علوم دینیہ کے متبحر عالم بھی تھے اور جدید علوم کے شناسا بھی بڑے صنعتکار وتجار بھی ، صاحب قلم ادیب ، باکمال صحافی ،نوجوان طالب علم ، باوقار معلم ، تجربہ کار طبیب ، کامیاب وکیل اور آزمودہ کار سیاستداں بھی ۔ ان سب کو دین کی محبت اور اسلامی اخوت نے ایک لڑی میں منسلک کردیا تھا اور یہ سب ایک خاندان کے فرد اور تسبیح کے دانے تھے جن کو امام شہید نے ایک لڑی میں پرودیا تھا۔

۳ تیسری امتیازی خوبی اس دعوت وتحریک کی یہ ہے کہ

امام شہید کی غیر معمولی تربیت وتاثیر، دعوت میں زبردست انہماک اور مشغولیت اور اخلاقی انحطاط کے خلاف ردعمل نے اخوانیوں کے اندر غیر معمولی جوش وجذبہ اور حیرت انگیز اتحاد واتفاق اور ہم آہنگی پیدا کردیا تھا، اس کے ساتھ ایک نرم ونازک، تن آسانی کی عادی قوم کے اندر ایک نئی لہر اور اقبالؔ کے الفاظ میں ''کبوتر کے تن نازک میں شاہین کا جگر'' پیدا کردیا تھا، انہوں نے فلسطین کی جنگ میں بہادری کے ایسے جوہر دکھائے کہ اسلامی جہاد کی یاد تازہ ہوگئی۔

۴ اس دعوت وتحریک کا سب سے کامیاب اور نمایاں پہلو یہ ہے کہ اس کے بانی اور اس کے پیروکار اسلامی عقائد وتعلیمات اور دینی شعائر کا برملا اعلان کرنے لگے، جو لوگ احساس کمتری کا شکار تھے وہ بھی اور جدید تعلیم یافتہ طبقے بھی اسلامی نظام اور اسلامی حکومت کے قیام کا مطالبہ کرنے لگے، شاہراہوں، پارکوں اور پارٹیوں کے موقع پر نمازیں پڑھنے لگے، اگر امام شہید کی زندگی وفا کرتی تو عالم عربی کی زندگی کا رخ ہی تبدیل ہوجاتا، الحادوا باحیت کا بازار سرد پڑ جاتا، فحش لٹریچر کی اشاعت ختم اور مردوزن کے اختلاط کے مناظر ہمیشہ کے لئے نگاہوں سے اوجھل ہوجاتے، لیکن افسوس ہے کہ وقت اس بیداری کی قدر نہ کرسکا، جیسے کمزور و بیمار معدہ کبھی صالح طاقتور غذا ہضم نہیں کرپاتا اور تخمہ ہوجاتا ہے، یہ ایسی ٹریجڈی اور زبردست المیہ ہے کہ صرف اخوانیوں کا خسارہ نہیں بلکہ اسلامی دنیا کا ایسا سانحہ ہے جس نے سب کو رنجور وملول

بنادیا ہے، لیکن میرا خیال ہے کہ اس میں بھی اللہ تعالیٰ کی حکمت
ومصلحت پوشیدہ ہے کہ اللہ تعالیٰ اس آزمائش کے ذریعہ اس
دعوت وتحریک کے کارکنوں کو مزید پختہ دیکھنا چاہتا ہے، تاکہ از سرنو
ہم اپنے لائحہ عمل اور منصوبے پر غور کریں اور دعوت کے اسلوب
اور طریقہ کار میں مزید استحکام لائیں۔

مولانا نے دعوت دین کی غیر معمولی اہمیت اور عظمت کا تذکرہ کرتے ہوئے فرمایا کہ دینی دعوت وتبلیغ اور اسلامی تجدید کا کام اتنا آسان نہیں ہے جتنا کہ سمجھ لیا گیا ہے، اس کا کام اور پیغام صرف اتنا نہیں ہے کہ ایک نظام کی جگہ دوسرا نظام اور ایک سیاسی واقتصادی نظام کی جگہ دوسرا سیاسی واقتصادی نظام لایا جائے، نہ علم وثقافت کو عام کرنا، جہالت کو مٹانا، بے کاری وبے روزگاری کے خلاف جنگ چھیڑنا ہے اور نہ ہی معاشرتی واخلاقی خرابیوں کا علاج اس ڈھنگ سے کرنا ہے جس طرح یورپ کے مصلحین اور مغرب کے رفارمر کیا کرتے ہیں، اس دعوت کا کام تو اس ''اسلام'' کی طرف بلانا ہے جو عقیدہ عمل، اخلاق وکردار، عبادت وسیاست، انفرادی واجتماعی سلوک سب پر حاوی ہے، اس میں قلب، ذہن ودماغ اور جسم وروح شامل ہیں، کوئی چیز اس کے دائرہ بحث سے خارج نہیں، اس دعوت میں دل، دماغ، انداز فکر، انسانی نفسیاتی، عقائد، ذہنیت سب کے اندر گہری تبدیلی لائی جاتی ہے اس دعوت کا سرچشمہ قلب ہوتا ہے نہ کہ قرطاس وقلم اور تقریر کا اسٹیج، وہ دعوت جوامت پر نافذ ہونے سے پہلے داعی کے جسم پر نافذ اور اس کی پوری زندگی پر اثر انداز ہوتی ہے۔

مولانا نے فرمایا کہ اصلاً یہ دعوت انبیاء کرام کے شایانِ شان ہے کہ اس کے اندر غیر معمولی قوتِ ارادی، اولوالعزمی، غیر متزلزل ایمان، راہ حق میں مسلسل جہاد اور ثبات واستقامت اور ان کی دعوت حکمت واخلاص پر مبنی ہوتی ہے اور یہ ساری

صفات ایسی ہیں جوانبیاء میں بدرجہ اتم پائی جاتی ہیں، لیکن ان کے جانشین اور متبعین کے اندر بھی یہ صفات پائی جاتی ہیں، اسلامی تاریخ کے طویل دور میں ہر جگہ ایسے علمائے دین اور اصحاب دعوت وعزیمت برابر پیدا ہوئے اور تجدید دین کے فرائض انجام دیتے رہے۔

مولانا نے بڑی حکمت عملی اور بصیرت ودانائی اور مخاطب داعیوں کے سیاسی حالات ونفسیات کی رعایت کرتے ہوئے انھیں قرآن، سیرت نبوی اور اسلامی تجدید کی تاریخ کی روشنی میں جو مشورہ دیا وہ مندرجہ ذیل نکات پر مبنی تھا:۔

مولانا نے انبیاء علیہم السلام کی دعوت کے اصل سرچشمہ اور ان کے طریقہ کار کا گہرائی سے جائزہ لیتے ہوئے ان کی دعوت کی امتیازی خوبیوں کا تذکرہ کیا اور فرمایا کہ:

(۱) انبیاء کی دعوت کی امتیازی خصوصیت یہ ہے کہ وہ دعوت وجہاد ہی نہیں زندگی کے تمام مراحل میں اللہ تعالیٰ کی طرف رجوع کرتے اور اسی سے فریاد کرتے اور مدد مانگتے ہیں، اس کے در پر اس طرح پڑ جاتے ہیں جیسے کوئی بھکاری اور محتاج ومسکین اور کمزور وناتواں چوکھٹ پر پڑ جاتا ہے یا جس طرح ایک بچہ ماں کی گود میں پناہ لیتا ہے، مولانا نے سید الانبیاء اور قیامت تک سرخیل حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی ان دعاؤں کی طرف اشارہ کیا جو طائف اور منیٰ میں اپ نے کی تھیں یا بدر کے موقع پر فوجوں کی صفیں درست کرنے کے بعد اللہ تعالیٰ سے فتح ونصرت کی دعا مانگی تھی، مولانا نے ان دعاؤں کا تذکرہ کرتے ہوئے فرمایا کہ یہ انبیاء کا ہتھیار ان کی قوت کا سرچشمہ اور دعوت کی شاہ کلید

ہے، اس سے سارے قفل کھلتے ہیں، کوئی انسان محض جسمانی قوت، مادی تیاری، تنظیمی قوت اور علمی و عقلی صلاحیتوں کے بل بوتے پر دعوت کے فرائض سے سبکدوش نہیں ہوسکتا، اللہ تعالیٰ کی مدد اور غیر معمولی روحانی طاقت کی بدولت اس بوجھ کو اٹھایا جا سکتا ہے، یہ عظیم چٹانیں بلکہ بلند و بالا پہاڑ جو دعوت کی راہ میں حائل ہوتے اور داعیوں کے سروں سے ٹکراتے اور ان کی محنتوں اور کوششوں کو پاش پاش کرتے ہیں صرف خدا کی مدد ہی سے پگھل سکتے ہیں۔

۲ انبیاء کی دعوت اور کوششوں کا دوسرا امتیازی پہلو یہ ہے کہ وہ مادی منافع اور دنیاوی وسائل سے بالکل بے پروا ہوکر دعوت میں مشغول ہوتے ہیں، قوت و جہاد سے ان کا مقصد صرف رضائے الٰہی کا حصول، اس کی اطاعت و فرمانبرداری اور پیغام رسانی ہوتا ہے، ان کے دل و دماغ، فکر و خیال، دنیاوی بہبود اور جاہ و منصب کی رغبت، اپنے کنبہ اور رشتہ داروں کے لئے سہولت اور حکومت کی خواہش سے یکسر خالی ہوتے ہیں، یہاں تک کہ ان کے متبعین اور قریب ترین رفقاء کے دلوں میں بھی اس کا گزر نہیں ہوتا، تاہم جو حکومت قائم ہوئی اور جو شان و شوکت اور قوت و سطوت حاصل ہوئی وہ محض خدا کی طرف سے انعام و صلہ اور دین کے مقاصد کی تکمیل، اس کے احکام کے نفاذ، معاشرہ کی اصلاح اور زندگی کو صحیح رخ پر لگانے کا ایک وسیلہ تھی۔

اَلَّذِيْنَ اِنْ مَّكَّنَاهُمْ فِي الْاَرْضِ اَقَامُوا الصَّلٰوةَ

وَاٰتَوُا الزَّكٰوةَ وَاَمَرُوْا بِالْمَعْرُوْفِ وَنَهَوْا عَنِ الْمُنْكَرِ (سورۃ الحج۔۴۱)

یہ لوگ ایسے ہیں کہ اہم اگر ان کو دنیا میں حکومت دیدیں تو یہ لوگ (خود بھی) نماز کی پابندی کریں اور زکوٰۃ دیں اور (دوسروں کو بھی) نیک کاموں کے کرنے کو کہیں اور برے کاموں سے منع کریں۔

زمین اور حکومت پر قبضہ ان حضرات کے خواب وخیال میں بھی نہیں تھا، حکومت تو دعوت و جہاد کا ایک طبعی اور فطری نتیجہ تھا جیسے پھل درختوں کی افزائش بالیدگی اور قوت وتبدیلی کا نتیجہ ہوتے ہیں۔ مولانا نے انبیاء کی سیرتوں سے اس کی مثالیں دینے کے بعد فرمایا کہ داعیوں کو جن آزمائشوں سے گزرنا پڑتا ہے اس میں بھی اللہ تعالیٰ کی حکمت اور مصلحت ہوتی ہے تاکہ ہر طرح ان داعیوں کو جانچ لیا جائے اور انھیں ٹھونک بجا کر دیکھ لیا جائے۔

مولانا نے اغراض ومقاصد اور نتائج کے درمیان واضح فرق کی طرف اشارہ کرتے ہوئے دینی ودعوتی کارکنوں کی نفسیاتی کمزوری اور مادی ذہنیت کا تذکرہ کیا اور فرمایا کہ دو چیزیں ہوتی ہیں، ایک ہے غرض وغایت جس کے لئے جدوجہد کی جاتی ہے اور ایک ہے نتیجہ وانجام جو بعد میں ظاہر ہوتا ہے، دونوں میں بڑا بنیادی فرق ہے، جس شخص کا مقصد جاہ ومنصب اور حکومت کا حصول ہوتا ہے، حکومت حاصل نہ ہونے کی صورت میں وہ سست پڑ جاتا ہے اور وہ جدوجہد سے کنارہ کش ہو جاتا ہے، حکومت کی فکر میں دعوت کی طرف سے اس کی توجہ ہٹ جاتی ہے، ہر وہ جماعت جو حکومت کی طلب میں تگ ودو کرتی ہے اس کی نفسیاتی کمزوری اور ذہنیت یہ ہو جاتی ہے کہ وہ دعوت کی راہ میں جہاد وقربانی سے گریز

کرنے لگتی ہے یا اس راہ سے منحرف ہو جاتی ہے، اور اگر حکومت حاصل ہو جاتی ہے تو پھر وہ طاقت کے نشہ میں بدمست ہو جاتی ہے اور مال حاصل کر کے سرکش۔

اس لئے ہمارے لئے یہ ضروری ہے کہ ہم اس معاملہ میں اپنے ذہن کو یکسو کر لیں، ہمارے پیش نظر دعوت اور صرف دعوت ہو، ایثار و قربانی کا جذبہ، اطاعت الٰہی اور حصول اجر و ثواب کی فکر، آخرت میں کامیابی کی فکر دامن گیر ہو، انسانیت کے زخموں پر مرہم رکھنا، مخلوق خدا کے ساتھ شفقت و محبت اور پوری انسانیت کی نجات کا جذبہ ہمارے اعصاب پر سوار ہو، پھر اگر تاریخ کے کسی اور دعوت کے کسی مرحلہ میں بجز حکومت کے کسی اور ذریعہ سے دعوت کا کام ممکن نہ ہو تو داعیوں کے دل و دماغ میں دعوتی اصول و مبادی اور اس کے عقائد روح میں سرایت کر جانے کے بعد دین اور دعوت کی مصلحت کی خاطر حکومت کے لئے بھی تگ و دو کر سکتے ہیں، لیکن اس ذہنیت، مخلصانہ جذبے پاکیزہ سیرت و کردار، امانت، دیانت داری اور سچائی سے، جیسے ہم دین کے فرائض اور عبادات کے دوسرے ارکان ادا کرتے ہیں اور نیت درست رکھتے ہیں، ایسی صورت میں حکومت و عبادت میں کوئی فرق نہیں رہ جائے گا اس لئے کہ وہ رضائے الٰہی کے حصول اور اجر و ثواب اور تقرب الٰہی کے لئے سب کچھ انجام دیتا ہے۔

۳ مولانا نے انبیاء علیہم السلام کی دعوت کی تیسری امتیازی خوبی کا تذکرہ کرتے ہوئے بتایا کہ وہ مستقل مزاجی سے اپنی دعوت پر ہر حال میں قائم رہتے تھے، سالہا سال اس دعوت میں وہ منہمک رہتے ہیں، ان کو اس وقت تک اس بات میں اطمینان قلب نہیں ہوتا جب تک کہ ہر طرح ٹھونک بجا کر اپنے متبعین کو دیکھ نہیں لیتے، پھر وہ نہ اپنی ذات سے دھوکہ کھاتے ہیں

اور نہ ہی پر شکوہ الفاظ اور چاپلوسی کی باتیں ان کو دھوکہ وفریب
میں مبتلا کر سکتی ہیں، اس ٹھوس اور مستحکم تربیت اور طویل دعوتی
جدوجہد کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ یہ دعوت پوری طرح برگ وبارلاتی
اور کثرت سے اچھے نتائج سامنے لاتی ہے، پھر جب حکومت قائم
ہوجاتی ہے تو اخلاص کی ٹھوس بنیادوں پر قائم ہوتی ہے، اس کے
حامل وکارکن وہ لوگ ہوتے ہیں جو عقائد اسلامی سیرت وکردار،
اخلاق ومعاملات، عبادت وریاضت اور سیاست واستحکام میں
طاقتور اور پختہ تر ہوتے ہیں، وہ تمدن کے تیز دھارے میں بہہ
نہیں جاتے اور جاہ ومنصب اور نہ مال ودولت سے ان کے اندر
بدمستی اور سرکشی پیدا ہوتی ہے، اور نہ ہی قرابت داروں کی قرابت
ان کو راہ راست سے سرمومنحرف کرتی ہے، خلافت راشدہ کا یہی
حال اور خلفائے راشدین کا یہی کردار تھا۔

مولانا نے خلفائے راشدین کی زندگی سے مثالیں دیتے ہوئے فرمایا کہ
صحابہ کرامؓ کا کمال یہ نہیں تھا کہ وہ دجلہ وفرات سے گذر گئے اور پانی سے ان کا دامن
تر نہیں ہوا، بلکہ اصل کمال یہ تھا کہ وہ عیش وتنعم اور جاہ ومال کے طوفانی سمندر سے
گذر گئے اور ان کا دامن تر نہیں ہوا، اگر رومیوں نے اپنی دولت کے بل بوتے
پر عیش کیا تو کیا کمال کیا، حضرت عمر فاروقؓ کے پاس دو بڑی سلطنتوں کی دولت اور
عیش کا سامان جمع ہوگیا وہ چاہتے تو دونوں حکومتوں کی دولت پر عیش کر سکتے تھے۔

❹ انبیاء علیہم السلام کی دعوت کی چوتھی امتیازی خصوصیت
کا تذکرہ کرتے ہوئے مولانا نے کہا کہ وہ شخصی تقاضوں سے
اپنے کو فارغ کر کے دل وجان سے دعوت میں لگے رہتے ہیں،

جان و مال کی قربانی دیتے ہیں، اپنا پورا وقت اور پوری طاقت
اس پر صرف کرتے ہیں اور اپنی ساری کوششوں اور توانائیوں اور
صلاحیتوں کو اس کام کے لئے وقف کر دیتے ہیں، نہ کسی چیز کو دینے
میں بخل سے کام لیتے ہیں نہ کسی چیز کو بچا کر رکھتے ہیں نہ کسی
دوسری چیز کو اس پر ترجیح دیتے ہیں، نہ وطن و ملک خویش و اقارب
نہ رغبت و خواہش اور مال و جائداد کو، پھر ان کی کوششیں بارآور
ہوتی ہیں، کبھی دنیا ہی میں اس کا پھل ظاہر جاتا ہے، کبھی ان کی
زندگی میں اور کبھی اس دنیا سے جانے کے بعد، سب کو چھوڑیئے،
خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو خطاب کر کے کہا جارہا ہے۔

وَاِمَّا نُرِيَنَّكَ بَعْضَ الَّذِىْ نَعِدُهُمْ اَوْنَتَوَفَّيَنَّكَ فَاِلَيْنَا مَرْجِعُهُمْ ثُمَّ اللّٰهُ شَهِيْدٌ عَلٰى مَايَفْعَلُوْنَ ۔

(سورہ یونس۔۴۶)

اور جس عذاب کا ان سے ہم وعدہ کر رہے ہیں اس میں سے کچھ
تھوڑا سا (عذاب) اگر ہم آپ کو دکھلا دیں یا اس کے نزول کے قبل ہی
ہم آپ کو وفات دیدیں، سو ہمارے پاس ان کو آنا (ہی) ہے پھر
(اس کو معلوم ہے کہ) اللہ ان کے سب افعال کی اطلاع رکھتا ہی ہے۔

جب انبیاء علیہم السلام کے سب کچھ دینے کے بعد بھی ان کی دعوت کے
نتائج کے بارے میں یہ کہا گیا تو ہمہ شما کا کیا سوال۔

۵ مولانا نے انبیاء علیہم السلام کی سیرت کا جائزہ لیتے
ہوئے ان کی دعوت کی پانچویں خوبی کا ذکر کیا اور فرمایا کہ اللہ تعالیٰ
اور آخرت کی دعوت ان کی زندگی پر اس طرح حاوی اور غالب
بلکہ ان کے اندر سرایت کر جاتی ہے جیسے پانی درخت کی جڑوں

میں اور کرنٹ بجلی کے تاروں میں، ان کے اخلاق، کردار، معاملات، طرز عمل اور عبادات میں بھی اس کا اظہار ہوتا ہے، ان کے دلوں پہ خشیت الٰہی اور فکر آخرت کا اتنا غلبہ ہوتا ہے کہ عبادات کا بڑا اہتمام کرتے ہیں اور ان ہی میں حقیقی لذت ملتی ہے، صحابہ کرامؓ بھی مشغول ترین اوقات میں عبادات کا اہتمام کرتے تھے، یہ بات دشمنوں کو بھی معلوم تھی۔

❻ مولانا نے انبیاء اور ان کے جانشینوں کی چھٹی خوبی کا تذکرہ کرتے ہوئے فرمایا کہ وہ دین میں عزیمت پر عمل کرتے ہیں، اور اگر وہ رخصت کو اختیار بھی کرتے ہیں تو خدا کی نعمت کے شکریہ کے طور پہ اور حکم شرعی بیان کرنے کے لئے اور امت سے بے بسی دور کرنے کے لئے خود کو مستثنیٰ کرتے ہیں اور نہ کسی عبادت میں تساہلی سے کام لیتے ہیں، اس لئے کہ لوگوں کا دین پر عمل ان قابل قدر ہستیوں کی دین میں سختی سے عمل اور تعصب ان کے فکر و راحت کے مطابق ہوتا ہے۔ جب یہ حضرات نوافل کا اہتمام کریں گے تو عام لوگ فرائض کی فکر کریں گے، لیکن اگر قائدین اور مقتدا حضرات صرف فرائض ادا کرنے پر اکتفا کریں گے تو عام لوگ ان فرائض کو بھی چھوڑ دیں گے۔

❼ مولانا نے انبیاء علیہم السلام اور دوسرے مصلحین کے درمیان فرق بیان کرتے ہوئے فرمایا کہ انبیاء علیہم السلام ایسے افراد کی تربیت کا پورا اہتمام کرتے ہیں جن کو ان کے بعد دعوت کا بار اٹھانا اور علمی و عملی طور سے ان تعلیمات و پیغامات کو نافذ کرنا

ہے، اور یہ نا قابل انکار حقیقت ہے کہ ان کی یہ عظیم دعوت دل میں ان لوگوں کے بل بوتے پر قائم ہوتی ہے جو صحیح العقیدہ ،قوی الایمان، کامل الاخلاق، ایمان میں کھرے، فکر وعمل میں سچے اور نیتوں میں پورے مخلص ہوتے ہیں، ان کا ذہن و دماغ اوران کا دل جاہلیت کی آلودگی سے بالکل پاک ہوتا ہے، وہ اسلام کو پوری طرح سمجھ چکے ہوتے اوراس کے پیغام وروح کو اپنے اندر اتار چکے ہوتے ہیں اور ہر طرح کی جاہلیت سے ان کا رشتہ منقطع ہو چکا ہوتا ہے، ان کی زندگی جاہلیت کے شائبوں سے پاک ہوتی ہے اور وہ اسلام کے سانچے میں پوری طرح ڈھالے جا چکے ہوتے ہیں، یہی لوگ اس دعوت کے حامل ہوتے ہیں، مولانا نے اس سلسلہ میں صحابہ کرامؓ کی ایمانی تربیت کا تذکرہ کرتے ہوئے ہجرت نبوی کی حکمتوں اور مصلحتوں پر روشنی ڈالی اور فرمایا کہ نئی نسل کا تیار کرنا، یا موجودہ نسل جن کے اندر اچھی اٹھان کی صلاحیت ہے، ان کو صحیح رخ پر لگانا بچوں کا کھیل نہیں، یہ ایک ایسی مہم ہے جس کو بڑے بڑے طاقتور اور زورآور بھی بڑی مشکل سے سر کر پاتے ہیں۔

مولانا نے اس تربیتی میدان میں درکار بنیادی وسائل وذرائع اور نئے نئے چیلنجوں کا جواب دینے اوراس کے لئے مردان کار کی تیاری کی طرف اشارہ کرتے ہوئے مادی اور معنوی اسلحوں سے لیس ہونے کا مشورہ دیا، انہوں نے فرمایا کہ:

میرے بزرگو اور دوستو! آپ ایک نسل نئی تیار کرنا چاہتے ہیں

، ایک نیا گھر تعمیر کرنے کا آپ عزم رکھتے ہیں اور ایک ایسی کشتی بنانا چاہتے ہیں جو حوادث وموانع اور طوفانی لہروں کو چیرتے ہوئے آگے نکل جائے، آپ ایک نیا کام شروع کرنا اور نئے جہاد کا عزم رکھتے ہیں جس کے لئے طویل وقت اور زبردست جدوجہد درکار ہے، یہ ایسا کام ہے جو طویل اور تھکا دینے والی اور اکتا دینے والی ہے، اس کے لئے ساری صلاحیتوں اور طاقتوں کو دعوت وتربیت پر مرکوز کرنے کی ضرورت ہے، گہرائی وگیرائی کے ساتھ غور وفکر کرنے، ایک دوسرے کے ساتھ تعاون، نئی حکمت عملی اور عزم مصمم کی ضرورت ہے، تربیت کے حکیمانہ طریقوں اور دعوت واصلاح کے بعدان میں علمی اور عملی کوششوں کی ضرورت ہے وسیع پیمانے پر اصلاحی لٹریچر، نئی بنیادوں پر عصر حاضر کے تقاضوں کے مطابق نصاب تعلیم ڈھالنے، مقامی مدارس اور دانش گاہیں قائم کرنے کی ضرورت ہے، دین اسلام کی شرح، اور فکر اسلامی کے بعدان میں نئی کتابوں، سیرت نبوی کے موضوع پر طاقتور اسلوب میں نئی کتابوں کی ضرورت ہے، اسلامی تاریخ کی از سر نو تدوین، علوم اسلامیہ کی از سر نو ترتیب، انسانی علوم کی نئی تفسیر وتوضیح اور جدید علمی پیوندکاری، ادب وصحافت اور شاعری وناول نگاری کو نیا طرز دینے کی ضرورت ہے، آپ نے جس نئی نسل کی تیاری کا بیڑہ اٹھایا ہے اس کے لئے ضروری ہے کہ آپ ان تمام وسائل سے مالا مال ہوں۔

مولانا نے آخر میں فرمایا کہ:

بزرگو! آپ کے پاس صدق واخلاص اور ایمان ویقین کی عظیم دولت ہے جو بڑی بڑی حکومتوں اور بڑی بڑی فوجوں کے پاس بھی نہیں ہے، آپ کے پاس بہت ہی مبارک اور مقدس امانت ہے ایسے لوگوں کی امانت جن کے دل ایک دوسرے سے جڑے ہوئے ہیں، جو آپ سے محبت کرتے ہیں، آپ کی وفاداری پر جن کا ایمان ہے اور آپ کی قیادت پر پورا اعتماد اور بھروسہ ہے، یہ وہ امانت ہے جو شیخ حسن البنا شہیدؒ آپ کے پاس چھوڑ گئے ہیں، اچھی طرح اس کا خیال رکھیں اور ان کی جانشینی کا حق ادا کریں۔

حاضرین نے مولانا کے پیش کردہ نکات کا گرم جوشی سے خیر مقدم کیا اور کہا کہ شیخ ندوی نے جو نکات ہمارے سامنے پیش کئے ہیں وہ دراصل ایسا صاف وشفاف آئینہ ہے جس میں ہم مرشد عام حسن البنا شہیدؒ کے افکار کی سچی اور صحیح تصویر دیکھ سکتے ہیں، ہم اور ہمارے رفقاء برادرانہ محبت اور رہنمائی کی پوری قدر کرتے ہیں اور اپنی بے پایاں خوشی کا اظہار کرتے ہیں۔

یہ وہ تقریر ہے جو مولانا نے ۱۹۵۱ء (۱۳۷۰ھ) میں اپنے پہلے سفر کے موقع پر ''الاخوان المسلمون'' کے منتخب ومخصوص مجمع میں کی تھی اس مجمع میں اخوان کی مجلس انتظامی کے ارکان اور اس کے اہل رائے شریک تھے، اخوان نے اس کی بڑی پذیرائی کی اور اپنے صدق واخلاص کا ثبوت دیا اس کو علیحدہ رسالہ کی شکل میں شائع کیا، اس کی اہمیت کا اندازہ اسی سے لگایا جاسکتا ہے کہ اس کے پہلے ایڈیشن کے لئے شیخ محمد الغزالی (جو اخوان کے مشہور داعی اور اخوانی لٹریچر کے سب سے بڑے مصنف ہیں) نے مقدمہ لکھا اور دوسرے ایڈیشن میں اخوان نے اسی پر اکتفاء

نہیں کی بلکہ ان کے شیخ حسن البناؒ کے پہلے جانشین شیخ حسن الہضیبی نے مقدمہ تحریر فرمایا پھر متعدد ایڈیشن نکلے، شیخ محمد الغزالی نے جن کلمات کے ساتھ نذرانہ عقیدت پیش کیا ہے اور قدر افزائی فرمائی ہے اس کا خلاصہ یہ ہے۔ فرماتے ہیں:

مفکر اسلام داعی جلیل حضرت العلامہ شیخ ابوالحسن علی حسنی ندوی کے بعض رسائل ان سے پہلے مصر پہنچ چکے تھے، ان کو پڑھ کر بھی ان کی زیارت اور صحبت سے اور ان کا خطاب سن کر یہ حقیقت روز روشن کی طرح آشکارا ہوگئی اور یہ یقین پختہ ہوگیا کہ اسلام جہاں کہیں ہو اور جس زمانہ میں ہو ایک ہی نقطہ اور ایک ہی طرز پر اپنے متبعین کی پرورش کرتا ہے، سب کا شعور و احساس سب کی فکر وتخیل، سب کا نقطہ نظر اور سب کا طرز عمل ایک ہی ہوتا ہے ایک ہی جذبہ سب کے اندر مشترک طور پر کارفرما ہوتا ہے۔ دوسری بات یہ واضح ہوگئی کہ مصر وشام ہند و مغرب ہر جگہ جہاں بھی اسلامی بیداری کے اثرات رونما ہو رہے ہیں یہ سب انھیں افراد کا مرہون منت ہے جنہوں نے اسلام کو اچھی طرح سمجھ کر اس پر پورا عمل کیا ہے۔

الاخوان المسلمون سے شیخ کو جو محبت اور تعلق ہے اس سے ہم اچھی طرح واقف ہیں ہندوستان میں بھی وہ اس کی اہمیت اور ضرورت سے خوب واقف ہوں گے وہ اخوان کے بڑے قدرداں اور ان کی آزمائشوں سے اچھی طرح باخبر ہیں، وہ ہر تحریک کی تہہ تک پہنچنے کی کوشش کرتے ہیں، اور اس کے اندرونی اسباب کا جائزہ لیتے ہیں، ظاہری شکل سے دھوکہ نہیں کھاتے، قریب سے جاننے کی کوشش کرتے ہیں، مشورے دیتے ہیں اور اپنے تجربات

ان کے سامنے رکھتے ہیں وہ زمانہ کے چیلنجوں سے پورے واقف اوراس کے مخالف دھاروں سے پورے باخبر ہیں، بڑے عمیق الفکر وسیع النظر اوراعلیٰ اخلاق وکردار کے حامل ہیں، طبعاً نرم خو ہیں، مگر باطل کے ساتھ بالکل نرمی نہیں برتتے بلکہ بڑا سخت رویہ اختیار کرتے ہیں۔

انھوں نے ہمیں نصائح عالیہ سے نواز کراپنا اسلامی حق ادا کردیا، ہرکام میں اخلاص اور بے نفسی اور رضائے الٰہی کے حصول کی تائید کی، مقامات مقدسہ کی حفاظت کی اہمیت بتائی، اور مغربی حملوں سے ہوشیار رہنے اور سامراجیت اور عیسائی مشنری کے سامنے سینہ سپر رہنے کی تلقین کی، اوراس بات کی طرف توجہ دلائی کہ اسلام کے غلبہ کے لئے اسلامی طریقوں ہی کواختیار کریں، خیر کوخیر ہی کے ذریعہ حاصل کیا جاسکتا ہے، باطل کے ذریعہ حق تک نہیں پہنچا جاسکتا۔

اخیر میں فرماتے ہیں کہ اللہ کا شکرادا کرتے ہیں کہ اس نے شیخ کو ہمارے پاس پہنچا کرہمیں قیمتی موقع عطافرمایا اور شیخ سے استفادہ کا موقع دیا اور شیخ سے عہد کرتے ہیں کہ ہم جب تک ہماری جان میں جان ہے اسلام کے اوپر عمل پیرا اور قرآنی تعلیمات پر کاربند رہیں گے اسلامی دعوت کے ساتھ وابستہ رہیں گے، اسلامی احکام کی تبلیغ اوراس کے قانون کے نفاذ کے لئے ہر ممکن کوشش کریں گے۔(۱)

---

(۱) اس خطاب کا مکمل ترجمہ اردو میں مولانا فیصل ندوی بھٹکلی نے کیا ہے۔ یہاں جو خلاصہ پیش کیا گیا وہ مولانا نذرالحفیظ ندوی کے قلم سے ہے اور آخری تعارف مولانا فیصل ندوی کے قلم سے ہے۔

مصر میں مولانا کا قیام ۱۵ / ربیع الثانی ۱۳۷۰ھ (۲۳/ جنوری ۱۹۵۰ء) سے شروع ہوا اور ۲۰/ رمضان ۱۳۷۰ھ (۲۵/ جون ۱۹۵۱ء) کو ختم ہوا، اسی میں دو ہفتہ سوڈان کے بھی شامل ہیں گویا پانچ ماہ عمومی طور پر آپ وہاں رہے، اس عرصہ میں وہاں کے مشاہیر علماء اور بین الاقوامی شہرت رکھنے والے اہل فکر و قلم سے بھی ملاقاتیں رہیں، وہاں کی انجمنوں، دینی جماعتوں اور اسلامی انقلاب کے لئے جدوجہد کرنے والی جماعت ''الاخوان المسلمون'' کے رہنماؤں اور مختلف ممالک سے آئے ہوئے مسلم طلبہ سے آپ نے ملاقاتیں کیں، مختلف تنظیموں اور انجمنوں نے آپ کے اعزاز میں استقبالیہ دیا، دعوتیں کیں، خصوصی اجتماعات ہوئے، ان میں آپ کی تقریریں ہوئیں، قاہرہ یونیورسٹی میں بھی آپ کا خطاب ہوا اور الازہر شریف کے منبر سے بھی آپ نے خطبہ دیا، جیسا کہ پہلے عرض کیا جا چکا ہے کہ وہاں کی مسلم علمی صحافت میں جو مجلّے چوٹی کے دانشوروں اور ادیبوں کے رسالے شمار ہوتے تھے۔ اس میں تقریروں پر تبصرے ہوئے اور وقیع ادبی مجلّہ ''الرسالہ'' نے آپ کی وہ تاریخی تحریر ''اے مصر سن'' شائع کیا۔

مصر جانے سے پہلے آپ کے پاس علمی تحائف میں آپ کی وہ عظیم تالیف تھی جو اہل علم میں پھیل چکی تھی اور جس کو مصر کے سب سے بڑے علمی اور تحقیقی ادارہ لجنة التأليف والترجمة والنشر نے شائع کیا تھا، جس کے سربراہ ڈاکٹر احمد امین (فجر الاسلام اور ضحیٰ الاسلام کے مصنف) تھے یہ کتاب بقول مولانا کے ان کے لئے وزیٹنگ کارڈ بن گئی تھی، اس عرصہ میں عوام میں تبلیغی جماعت کے طرز پر دعوت کا کام آپ نے کیا، اور مصر کے قصبات اور چھوٹے چھوٹے شہروں مثلاً قناطر خیریہ، حلوان (سید قطب شہید کا وطن) طنطا (جہاں کے علی طنطاوی مشہور اہل قلم ہیں) نکلا، بنہا محلّہ کبری، نبروہ، عزیزۃ، حامون، سنترلس، قدیسنا اور اس طرح کے چند

قصبات میں جا کر خالص تبلیغی انداز میں وہاں کے مقامی مسلمانوں کو ''اُٹھایا'' اور ان کو ''دین پر محنت'' پر ابھارا اور مسجدوں میں قیام کرایا اور ''گشت'' پر مائل کیا، ان سفروں میں حضرت مولانا عبیداللہ بلیاوی علیہ الرحمہ ساتھ تھے، جب حضرت مولانا کی مصر میں آمد کے بعد مولانا بلیاوی سوڈان کی جماعت کے ساتھ گئے ہوئے تھے اور حضرت مولانا کی مصر میں آمد معلوم کر کے شریک سفر ہو گئے۔

حضرت مولانا کی جو تقریریں یہاں ہوئیں سر فہرست تو ''اے مصر'' اور ''اخوان سے کچھ کہنا چاہتا ہوں'' ہیں۔ اس کے علاوہ علامہ اقبال کے افکار اور ان کے ذہنی تشکیل کے عناصر پر دو وقیع مقالے تحریر فرمائے جو قاہرہ یونیورسٹی کے لئے تیار کئے گئے تھے اور اسلامی تاریخ میں (اتار چڑھاؤ) (المدو الجزر فی التاریخ الاسلامی) بھی یہیں تالیف ہوا اور ادبی موقر علمی رسالوں میں شائع ہو کر مقبول ہوئے۔

اس سفر کی ایک خاص بات جس کو علامہ ڈاکٹر احمد الشرباصی استاذ ازہر اور اس وقت کے طالب علم اور آج مشہور زمانہ مفکر و محقق علامہ یوسف قرضاوی نے خاص طور پر نوٹ کیا اور اس کو کئی جگہ مختلف مناسبتوں سے بیان کیا ہے، وہ یہ کہ آپ کا قیام بہت ہی معمولی سے کمرہ میں رہا، جو شاہ راہ سے ہٹ کر گلیوں میں تھا، اور یہ اس وقت تھا جب کہ مصر کے بڑے مشہور اور کامیاب تاجر جلال حسین بگ آپ کو ایک بڑے ہوٹل میں قیام کی دعوت دے رہے تھے اس کے علاوہ بھی متعدد سر برآوردہ شخصیات آپ کی میزبانی کرنا چاہتے تھے، انتہائی سادہ زندگی، مشقت اور تکلیف کی زندگی آپ نے قبول کی اور عیش و آرام کی قیام گاہ منظور نہیں کی۔

مولانا کے اس سفر میں دو معاون شریک سفر تھے۔ ایک مولانا معین اللہ صاحب ندوی (نائب ناظم ندوۃ العلماء) جو اس تحریر کے وقت ذی فراش اور مرض

و مجبوری کی تکلیف دہ آزمائشوں سے گذر رہے ہیں۔ (لطف اللہ بہ) تھے اور ایک رفیق اعظم گڑھ کے مولوی عبد الرشید ندوی تھے، جناب مولانا عبید اللہ صاحب بلیاوی علیہ الرحمہ جماعت تبلیغ کے اساطین میں تھے اور حضرت مولانا محمد یوسفؒ اور حضرت مولانا محمد الیاسؒ کے معتمد خاص عابد وزاہد اور مجاہد بزرگ تھے وہ تبلیغی جماعت کے انداز کے سفروں میں پوری طرح شریک ومعاون رہے۔

اس عنوان کے شروع میں راقم نے ایک عنوان قائم کیا ہے ''مال وجاہ طلبی'' سے بے نیازی، اس گوشہ پر مزید روشنی قیام مصر میں زاہدانہ اور مشقت پسندانہ قیام سے بھی پڑتی ہے، یعنی عیش وآرام کی سہولتیں جب حاصل تھیں اور دوسروں کی طرف سے پیش کش بھی تھی مگر اس کو اپنے لئے پسند نہیں کیا۔

سوڈان کا سفر رمضان میں ہوا، جون کی تپتی ہوئی رات اور ۱۸ گھنٹوں کا روزہ، لُو، اور سخت تپش کا زمانہ تھا، وہاں ملاقات سوڈان کے روحانی پیشوا شیخ میرغنی سے ہوئی اور ان کے ایک با اختصاص مرید اور قریبی رشتہ دار شیخ طیب ابراہیم عبد المقصود کے یہاں قیام کیا۔

چند مساجد میں بھی خطبات ہوئے اور اس وقت جو اہم شخصیات تھیں اسماعیل مرحوم بیگ جو بعد میں وزیر اعظم ہو گئے تھے اور متعدد علماء کی مجالس میں شرکت کی۔

تفصیل کاروان زندگی کی پہلی جلد میں ہے، مولانا عبید اللہ صاحب بلیاوی علیہ الرحمہ شریک سفر تھے، البتہ چند مفید ملاقاتوں کا ذکر ''شرق اوسط کی ڈائری'' میں ہے وہاں سے مولانا پھر قاہرہ واپس تشریف لائے، علمائے ازہر میں ڈاکٹر احمد شرباصی، احمد العال، عبد اللہ العقیل سے ملاقاتیں رہیں اور خاص طور پر وزارت تعلیم کے ایک بڑے ذمہ دار عالم شیخ امین زویدار نے مولانا کی ''قصص النبیین للاطفال'' کی دل کھول کر تعریف کی، مصنف کی تکریم اب تک ''ماذا خسر العالم

بانحطاط المسلمین" کی وجہ سے لوگ کرتے رہے تھے۔اس مرتبہ قصص النبیین کو اہل علم اور اہل زبان اور تعلیم کے محکمہ کے ذمہ داروں نے اس کی معیاری زبان اور حسین اسلوب کو خراج تحسین پیش کیا،اس کا مولانا کی طبیعت پر اچھا اثر پڑا۔سوڈان سے واپسی کے بعد رواق الہنود میں ہندی اور ترکی طلبہ کثرت سے جمع ہوئے اور ان سے مولانا نے خطاب فرمایا،مصر میں مولانا کو کیا پسند آیا اور کیا پسند نہیں آیا،دونوں باتیں بلاکم وکاست آپ نے ذکر فرمادی ہیں اور ''شرق اوسط کی ڈائری'' (مذکرات السائح فی الشرق العربی) میں موجود ہے جس کے کئی ایڈیشن نکل چکے ہیں۔

پسندیدہ باتوں میں آپ نے اہل مصر کی سرگرمی،نشاط،جوش عمل زندگی اور زندہ دلی،ہمت ووسعت قلبی،مہمان نوازی کا ذکر فرمایا ہے،ناپسندیدہ باتوں میں مغربی تہذیب کی ہر ہر قدم پر تقلید،تفریحات میں غلو،مردوزن کا مغربی تہذیب کے مطابق اختلاط،نیز سیاسی پارٹیوں کی کثرت،دینی انجمنوں کے درمیان تنافس بے جا کو تعریف کے لائق نہیں سمجھا۔حکومت کی باگ ڈور جن لوگوں کے ہاتھوں میں اس وقت تھی وہ سب مغرب پرست اور مغربی انداز فکر کے حامل تھے۔

اقتصادی ناہمواری،طبقات کا زیادہ ہونا،امیر ہیں تو بہت امیر ہیں اور غریب ہیں تو بہت غریب۔یہ باتیں خطرہ کی نشاندہی کرتی تھیں لیکن مجموعی طور پر مصر کو ایک معیاری ملک پاکر مسرت کا اظہار کیا ہے اور مصر کا ذکر ختم کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

> امابعد! فسلام علی "مصر" وأهلها وتحية من زائر لقی فی هذا البلد الاسلامی کل مایتوقعه مسلم من عطف و کرم وحسن وفادة۔

''سلام مصر پر اور مصر میں رہنے والوں پر،سلام ایک مسافر کی طرف

سے جس نے اسلامی ملک میں وہ سب پایا جس کی ایک مسلم سے توقع کر سکتا ہے۔"

مولانا نے اپنے سفر کی ڈائری میں جس کا نام مذکرات السائح فی الشرق العربی ہے اور جس کا اردو ترجمہ مولانا شمس الحق ندوی (ایڈیٹر تعمیر حیات) کے قلم سے شائع ہو چکا ہے، اس سفر نامہ میں صرف وہی باتیں ذکر نہیں فرمائی ہیں جس میں ان کی تکریم، عزت افزائی کے واقعات ہیں، البتہ وہ باتیں بلا کم وکاست نقل فرمادی ہیں جس کو عام طور پر ہوشیار اہل قلم نظر انداز کر جاتے ہیں۔

شیخ حامد الفقی سے ملاقات اور ان کے اعتراضات کو مکمل نقل کر دیا ہے، کوئی چابک دست مصنف ہوتا تو ان کا ذکر نہ کرتا، جس طرح بعض رسائل کے ایڈیٹر صاحبان صرف انہی مراسلات کو "اپنی ڈاک" میں نقل کرتے ہیں جن میں ان کی ستائش ہوتی ہے اور جن خطوط میں ان کو بلند القاب سے یاد کیا جاتا ہے، ایسے خطوط کی رسید بھی نہیں دیتے ہیں جن میں ان کے خلاف کوئی جملہ یا جن میں ان کو کسی عادی لفظ سے مخاطب کیا گیا ہو، اس کا ذکر تک نہیں کرتے، لیکن مولانا کا معاملہ ہمیشہ امانت داری کا جو تقاضا تھا وہ آپ نے پورا کیا، آپ کی اس ڈائری (جو دراصل سفر نامہ ہے) میں محمد حامد الفقی صدر انصار السنہ سے ملاقات کا ذکر بھی ہے جو مولانا کے افکار وخیالات کے سخت مخالف تھے۔ یہ صفحہ ڈائری سے نقل کرتا ہوں۔

شرق اوسط کی ڈائری کا ایک اقتباس

جمعیہ انصار السنہ کے صدر شیخ حامد الفقی سے آج ملاقات کی اور ان کو اپنی کتاب "الدعوۃ الاسلامیہ فی الھند و تطوراتھا" (ہندوستان میں اسلامی دعوت اور اس کے مراحل) کا ایک نسخہ پیش کیا، یہ کتاب موصوف کو پسند نہیں آئی کیونکہ اس میں صوفیائے

کرام کی خدمات کا ذکر ہے اور ہندوستان میں دین پھیلانے کا جو انھوں نے کام کیا ہے اس کو نمایاں کیا گیا ہے، موصوف نے کہا کہ میں آپ کو اپنا رسالہ ''رسالة العبودية'' دیتا ہوں اس پہ میرے حاشیے میں صوفیہ سے متعلق میری رائے ہے، مزید فرمایا: صوفیہ کے بارے میں میری رائے شیخ ابن تیمیہؒ سے بھی مختلف ہے کیونکہ انھوں نے جنید جیسے صوفیہ کو مستثنیٰ قرار دیا ہے، مگر میں کسی کو الزام سے بری نہیں سمجھتا، اپنی بات جاری رکھتے ہوئے انھوں نے کہا آپ کی آراء و خیالات کو پسند نہیں کرتا اس لئے میں آپ سے ملنے کے لئے آپ کی قیام گاہ پر نہیں گیا، مجھے آپ کے خیالات میں ''اشتراکیت'' کی بو آتی ہے۔ کیونکہ آپ ہمیشہ مادہ اور مادہ پرستی پر تنقید کرتے ہیں اور زاہدانہ، متوکلانہ اخلاق کی بڑائی کرتے ہیں اور یہی اشتراکی رجحان ہے۔ میرا عقیدہ ہے کہ مادہ کی بڑی اہمیت ہے، اسلام نے اس کا انکار نہیں کیا ہے اور مادہ پسندی کی مخالفت کرنے کی ترغیب نہیں دی ہے، میرے خیال میں مادہ (مال و دولت) کا حصول ضروری ہے اور اس کی زیادہ کی طلب برمحل ہے، اور عیش و عشرت کی زندگی میں کوئی حرج نہیں ہے۔ اموی سلطنت اور حکام پر لوگ بیجا اعتراض کرتے ہیں، عیش و عشرت کی زندگی اور مال کی فراہمی کوئی معیوب بات نہیں ہے کسی داعی کو مال و دولت جمع کرنے والے پر اعتراض نہیں کرنا چاہئے، دعوت کا مفہوم فرد کی اصلاح ہے، قوت کا حصول ممنوع نہیں ہے اور خدا نے دنیا میں جو لذت و آرام کی چیزیں

بنائی ہیں ان سے فائدہ اٹھانا غلط نہیں ہے، ہاں صحیح جگہ استعمال ہونا چاہئے، قرآن کی یہی تعلیم ہے اور اس کے مخالف بات کو ظلم قرار دیتا ہے۔ اس کے علاوہ جو باتیں ہیں وہ فروعی مسائل ہیں، یہاں تک کہ زنا کی بھی مذمت قرآن نے صرف چند مقامات پر کی ہے کیونکہ یہ فروعی مسئلہ ہے، اصل یہ ہے کہ شہوت کا استعمال غیر مناسب جگہ پر نہ کیا جائے، لیکن قوت کے استعمال سے منع نہیں کیا ہے، اس کے بیجا استعمال کو ناپسند کیا ہے، موصوف نے اپنے خاص آراء کا اظہار کرتے ہوئے کہا کہ ''رسولؐ'' ان سے صرف وحی کے معاملہ میں ممتاز ہیں۔

میں نے کہا شیخ صاحب! مادیت پر میری تنقید اس کے اسراف اور ہوس پرستی پر ہے اور چونکہ مادہ پرستی نے وبائی شکل اختیار کرلی ہے اس کا ردعمل وہ ہے جو میری تحریروں میں ملتا ہے اور میں توحید کو دعوت اسلامی کی بنیاد سمجھتا ہوں، میری وہ تقریر ''جاہلیت سے اسلام کی طرف کوچ'' جس کو جمعیۃ انصار السنہ کے ایک بھائی نے شائع کیا ہے وہ آپ ملاحظہ فرمالیں، کہنے لگے یہ بھی غیر واضح ہے، میں نے کہا الحمدللہ میں ہر طرح کے ''ازم'' سے بری ہوں اور صحیح اسلام کا داعی ہوں، شیخ نے کہا میں مانتا ہوں آپ اچھے آدمی ہیں اور آپ کی نیت پاک ہے اور مصر میں آپ کی تقریروں اور تحریروں کا جائزہ لیتا رہا ہوں جس سے اندازہ ہوا کہ آپ کی نیت اچھی ہے۔(۱)

(۱) شیخ محمد حامد الفقی سلاطین بنی امیہ کے زبردست حامی اور وکیل تھے، عیش پرستی کو طبیعت کا مقتضی بتلاتے تھے اور تصوف کو بت پرستی (وثنیت) سمجھتے تھے، ان سے مولانا کا ملاقات کرنا (باقی اگلے صفحہ پر)

حامد الفقی جس جمعیت ''انصار السنہ'' کے صدر تھے اسی جماعت کے روشن ضمیر علماء نے مولانا کے رسائل شائع بھی کئے اور تقریباً ہر تقریر میں شریک رہے تھے بہر حال مجھے حامد الفقی کے حق میں کوئی انتقامی لفظ نہ توہین آمیز بات کرنے کی ضرورت ہے اور نہ ہماری تہذیب اس کی اجازت دیتی ہے خاص طور پر جب کہ مصر وسوڈان اور شام کے علماء و دانشور، صوفیہ اہل اللہ، صاحب بصیرت اور عالم اسلام کے ماضی اور حال کے واقف بہت سے اللہ کے بندے ایسے ہیں جنھوں نے مولانا کے ہر ہر لفظ کی تائید کی اور دل سے آپ کی عظمت کا اعتراف کیا ہے، مولانا ممشاد علی قاسمی کی تالیف ''حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی - اکابر ومشاہیر کی نظر میں'' کا سرسری مطالعہ اس کے لئے کافی ہے لیکن اتنی بات ضرور واضح ہوتی ہے کہ انبیاء کرام کی سنت کے مطابق جب بھی دعوت حق دی جائے گی تو کچھ ایسے بھی لوگ ہوں گے جو برملا کہہ اٹھیں گے ''مَا نَفْقَهُ كَثِيرًا مِّمَّا تَقُولُ ''(۱) بہت سی باتیں جو تم کہتے ہو ہماری سمجھ میں نہیں آتی ہیں۔

اور تلخ باتوں کا سننا اور تحمل وحلم سے جواب دینا دعوت دین کی کڑی ہے، ایک شخص جو صاف کہہ رہا ہے کہ میں آپ کے خیالات وآراء کو غلط سمجھتا ہوں، اس کی بات کو نقل کرنا امانت وصداقت کا ایک نمونہ اور انبیاء کرام کا ورثہ ہے، ''رسول ہم سے صرف اس بات میں ممتاز ہیں کہ ان کے پاس وحی آتی ہے اور میرے پاس وحی نہیں آتی۔'' قرآن کریم نے جس سیاق میں ''اِنَّمَا اَنَا بَشَرٌ مِّثْلُكُمْ يُوحىٰ اِلَيَّ'' فرمایا ہے وہاں 'مثلیت' بشریت میں ہے نہ کہ رتبہ اور درجات میں۔

(۱) (سورۂ ہود-۹۱)

شام کا سفر اور قیام

سوڈان سے مصر واپس آئے، اور چند روز مزید قیام کر کے مولانا سوریہ تشریف لے گئے۔

مولانا تاریخ اسلام کے اسکالر ہیں، دمشق دیکھا نہیں تھا مگر دمشق کے کوچہ و بازار کے نام سنے ہوئے تھے، یہ وہ سرزمین ہے جہاں صحابہ کرام میں مؤذن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم حضرت بلالؓ، امین الامۃ حضرت ابوعبیدہؓ، حضرت معاذ بن جبلؓ، حضرت ابودرداءؓ، حضرت سعد بن عبادہؓ، حضرت ابی بن کعبؓ، حضرت دحیہ کلبیؓ مدفون ہیں علماء ومحدثین میں سے ابن الصلاح ذہبی، مؤرخین میں ابن خلکان، ابن عساکر، ابن کثیر، ائمہ اسلام میں امام نووی، ابن قیم ہیں اور انہی میں علامہ ابن تیمیہؒ بھی ہیں جنھوں نے اس شہر کے جیل میں جان جانِ آفریں کے سپرد کی تھی، صوفیائے کبار میں ابراہیم بن ادھم، بایزید بسطامی، شیخ محی الدین ابن عربی، مجاہدین میں سے نورالدین زنگی اور صلاح الدین ایوبی (رحمہم اللہ اجمعین) آسودہ خاک ہیں، یہ بھی معلوم تھا کہ سلاطین بنی امیہ کا یہ مضبوط پایۂ تخت تھا، عیسائیوں کے تمام فرقے یہاں موجود ہیں، بردیٰ (نہر) اور غوطہ (ایک طول طویل باغ وچمنستان) پر شعراء کے کلام پڑھ چکے تھے، اس لئے دمشق کی سرزمین پر قدم رکھتے ہوئے دل ودماغ پر

ایک شوق کا عالم طاری ہے، اس کے ساتھ آپ کو یہ بھی معلوم تھا کہ یہ سرزمین اب اسلام دشمن تحریکات کا مرکز بن گئی ہے یہاں فرنچ حکومت نے اپنی تہذیب اور زبان کا گہرا اثر چھوڑا ہے، جس طرح ہندوستان میں آزادی کے بعد بھی انگریزی کو علمی زبان اور اونچی سوسائٹیوں میں تہذیب کی علامت سمجھا جاتا ہے، اس طرح یہاں فرنچ کا اثر ہے، مولانا نے حسب معمول پہلے خواص علماء وادباء سے روابط قائم کئے، جن علماء کے نام اپنی یادداشت سے کاروان زندگی میں ذکر کئے ہیں ان میں شیخ مکی کتانی، شیخ احمد کتانی، علامۃ الشام شیخ بہجۃ البیطار، شیخ ابوالخیر میدانی (میدان ایک محلّہ کا نام ہے جس میں رہنے والے علماء اپنے آپ کو ''میدانی'' لکھتے ہیں، جس طرح بغداد کے اس محلّہ کے لوگ جہاں امام اعظم ابوحنیفہ رحمۃ اللہ مدفون ہیں اپنے آپ کو اعظمی لکھتے ہیں) شیخ حسن حبنکہ میدانی، ڈاکٹر مصطفیٰ السباعی، استاذ محمد المبارک، استاذ احمد الزرقائی، شیخ محمد احمد دہمان (رئیس قسم الدراسات الاسلامیۃ دمشق یونیورسٹی) ڈاکٹر ابوالیسیر عابدین (علامہ شامی کے پوتے اور مفتی جمہوریہ) شیخ احمد کفتارو (موجودہ مفتی شام جنھوں نے مولانا کی سوانح مصنفہ عبدالماجد غوری ندوی کی کتاب پر مقدمہ لکھا ہے) شیخ محمد سعید برہانی، ادباء میں مشہور شاعر محمد علی الحمدانی، استاذ تیسیر ظبیانی، محمد کمال الخطیب، مصنفین، ومحققین میں علامہ محمد کرد علی استاذ محمد عزہ دروزہ، استاذ خلیل مردم بک اور علامہ شیخ عبدالقادر (۱) مغربی سے ملاقاتیں رہیں اور

(۱) الجزائر کے مشہور مجاہد شیخ عبدالقادر مغربی دمشق میں آکر پہلے پناہ گزیں ہوئے پھر بس گئے تھے، ان کے پوتے عبدالسلام لیڈز میں میرے ساتھی تھے، ان کے والدین بھی وہیں ایک مکان لے کر اپنی اولاد کی تربیت کے خیال سے رہا کرتے تھے، اس خاندان کے افراد سے میرا ملنا جلنا تھا، ان کے والد شیخ عبدالرزاق میرے نام کے ساتھ ''ندوی'' سن کر چونک پڑے اور پوچھا کہ شیخ ابوالحسن ندوی سے تمہارا کیا رشتہ ہے؟ میں نے کہا ندوی خاندان نہیں ہے بلکہ درس گاہ سے نسبت ہے اور شیخ ندوی جن کا نام ہے آپ نے لیا میں ان کا رشتہ دار نہیں بلکہ تلمیذ وخادم ہوں۔ و کفی لی شرفاً (میرے شرف کے لئے یہی کافی ہے)۔

مولانا نے اپنے طرز پر جو گفتگو کی اس کا محور اسلام سے نسلی وجغرافیائی تعلق اور علمی وابستگی کی قدر کرتے ہوئے اس کو ایک زندہ قابل عمل اور تمام تحریکات پر غالب، عقلی اور علمی میدان میں قیادت کا مستحق دین سمجھنے اور سمجھانے کی تمنا کا اظہار کیا، اور دراصل مولانا کو یہی ایک صدا ہر جگہ لگانی تھی، یہی فکر آپ کا راس المال اور قلب ودماغ کا عطر تھا، اسی ایک لگن نے دلوں کو موم کیا اور زبان میں روانی اور مضامین میں آمد پیدا کی، ورنہ کہاں ایک ۳۷-۳۸ سال کا نوجوان اور کہاں پیرانِ دیر وحرم، کہاں ہندوستان کے ایک اوسط درجے کے شہر کا رہنے والا عالم دین اور کہاں مصر وشام کے جہاں دیدہ اور عمالقہ فکر وقلم، اگر کوئی اس کی منطقی توجیہ کرنا چاہے اور ظاہری اسباب سے ان عزت افزائیوں اور اعلیٰ سطح کے علماء کی قدردانیوں کا ربط تلاش کرنا چاہے تو ناکام رہے گا، شام کے چوٹی کے ادباء، علماء اور صوفیاء جو عام جلسوں میں شرکت بھی نہیں کرتے تھے اور جوش وولولہ سے بھری ہوئی تقریریں سنتے سنتے اکتا چکے تھے، ان کا اشتیاق وانتظار کے ساتھ تقریر شروع ہونے سے پہلے آکر بیٹھنا، علامہ شیخ محمد بہجۃ البیطار، پروفیسر احمد زرقاء، استاذ محمد المبارک جیسے محققین، جہاندیدہ، وسیع النظر علماء کا محبت وعقیدت سے اونچے سے اونچے منبر پر بیٹھانا ایک خدائی انتظام تھا، ڈاکٹر محمد المبارک جن کی تفسیری بحثوں اور فقہ اللغۃ سے یہ عاجز مستفید ہوا ہے اور مکہ مکرمہ میں ان سے بارہا استفادہ کرتا رہا، ان کا بیان ہے کہ شیخ ابوالحسن کی جو قدر ومنزلت شام کے علماء میں دیکھی وہ نہ کسی عرب خطیب وصاحب قلم کی دیکھی اور نہ کسی یورپین اسکالر کی دیکھی جن کا رعب وہاں کے عوام وخواص پر تھا، استاذ محمد المبارک رحمۃ اللہ علیہ کی زبان سے یہ سن کر حافظ شیرازی کا یہ شعر یاد آتا ہے۔

غلام نرگس مست تو تاجدارانند
خراب بادۂ لعل تو ہوشیارانند

(تیری نگاہ مست کے غلام تاج دار لوگ ہیں، تیری شراب دید سے
مست ہونے والے ہوشیار قسم کے لوگ ہیں)۔

دمشق کے قیام میں مولانا نے وہاں کی یونیورسٹی کی مسجد میں خطبہ دیا، مشہور درس گاہوں کو دیکھا، ایسے صوفیاء سے بھی ملنا ہوا جو کہیں باہر نہیں نکلتے تھے۔ مگر مولانا سے ملنے کے بعد ان کی قیام گاہ پر آکر ملے، پارلیمنٹ کا ایک اجلاس بھی مشاہدہ کیا، اخوان المسلمین کے مرکز میں بھی گئے، اور قدیم و مشہور علماء تحقیق و بحث جیسے علامہ کرد علی، استاذ محمد دروزہ، خلیل محمد مردم بک، اور علامہ شیخ عبدالقادر مغربی سے ملاقاتیں کیں۔

شام (سوریہ) کے ریڈیو اسٹیشن سے آپ کی دو تقریریں براڈ کاسٹ ہوئیں، جن میں ایک کا عنوان تھا ''اسمعي یاسوریه'' ''اے سوریہ سن'' جس طرح مصر سے خطاب فرمایا تھا ''اے مصر سن'' اس کے بعد مولانا نے عراق، کویت پھر پورے عالم عرب کو اسی طرح اور اسی لہجہ میں خطاب کیا، ان تقریروں کا مجموعہ ''اسمعیات'' مولانا کے مجموعہ مضامین '' الی الاسلام من جدید'' میں موجود ہے، اور اس کے ترجمے بھی ہو چکے ہیں، وحدت موضوع اور تنوع بیان اور اچھوتا طرز نگارش، دل کو موہ لینے والا بلکہ سخت سے سخت دل کو موم کرنے والا انداز بیان دعوتی لٹریچر میں اضافہ ہے۔

شرق اردن کے بادشاہ ملک عبداللہ بن حسین (۱) سے ملاقاتیں

شام کے دوران قیام مولانا نے بیت المقدس کی زیارت بھی کی، رمضان کے آخری ایام گذار کر عید کی نماز بیت المقدس کی مسجد اقصیٰ میں ادا کی، وہاں کی متعدد انجمنوں کو جا کر دیکھا، اس زمانہ میں افغانستان کے سفیر شیخ محمد صادق مجددی تھے، یہ ایک صاحب سلسلہ و طریقت بزرگ تھے، افغانستان سے ریٹائرڈ ہونے بعد

(۱) موجودہ ملک اردن عبداللہ بن حسین کے پردادا، بانی سلطنت ہاشمیہ شرق اردن

مدینہ منورہ میں آکر بس گئے تھے اور وہیں ان کا انتقال ہوا، رابطہ عالم اسلامی کے ممبر تھے، بہرحال شیخ مجددی کی وساطت سے مولانا کی ملاقات شاہ اردن عبداللہ بن حسین (شریف مکہ) سے ہوئی، وہ مولانا کی کتاب "ماذا خسر العالم بانحطاط المسلمین" پڑھ چکے تھے۔ اور علمی کتابوں اور انساب پر ان کی نظر تھی، مولانا کو دیکھتے ہی انھوں نے کہا کہ آپ کا حلیہ سادات یمن سے ملتا ہے، شاہ مرحوم نے مولانا کی ضیافت کی اور کھل کر بات کی۔

مولانا عبیداللہ صاحب بلیاوی رحمۃ اللہ علیہ نے اس سفر کی داستان اور شاہ سے ملاقات کا تذکرہ ان الفاظ میں کیا ہے:

> "مولانا علی میاں نے شاہ عبداللہ بن حسین سے کہا: جلالۃ الملک! اگر چھوٹا سے چھوٹا ملک بھی ہو اور خواہ اس کی پیداوار کم ہو، اس کی فوج ناقابل ذکر ہو، لیکن اسلام کو اپنا لے اور دین کے احکام اپنی مملکت میں رائج کرلے تو وہ دنیا کے لئے رحمت کا سبب بن سکتا ہے، اور ساری دنیا کے لئے نمونہ بن سکتا ہے" جب مولانا یہ بات کر رہے تھے میں نے شاہ کو دیکھا کہ وہ کنکھیوں سے اپنے ایک وزیر کو دیکھ رہے تھے، جیسے کہہ رہے ہوں سنو ایک ہندی داعی دین کیا کہہ رہا ہے؟ مولانا نے کاروان زندگی میں اس کا ذکر نہیں فرمایا ہے (۱)

تقدیری بات کہ اس ملاقات کے ایک ہفتہ بعد جب کہ مولانا دمشق میں تھے شاہ کو ایک فلسطینی باشندے نے جمعہ کے روز مسجد اقصیٰ میں شہید کردیا۔ رحمۃ اللہ علیہ

---

(۱) شاہ عبداللہ بن حسین (شریف مکہ) نے ایک ہدیہ پیش کیا تھا جس کو مولانا نے فلسطین فنڈ میں دیدیا، کیونکہ شاہ کا ہدیہ واپس کرنا آداب شاہی کی توہین شمار ہوتا ہے، مگر جس فنڈ میں چندہ دیا اس کے صدر خود بادشاہ تھے۔

شام کے متعدد حلقوں میں مولانا کے خطابات ہوئے اوران تقریروں کو لوگوں نے یادرکھا،عربی کے مشہور شامی ادیب وشاعر استاذ بہاء الدین الامیری جو شام کے سعودی عرب میں سفیر (۱) تھے ان سے راقم کی ملاقات استاذ زہیر شاویش مالک المکتب الاسلامی بیروت کے ساتھ ہوئی،مولانا کا ذکر آیا تو کہنے لگے کہ فلسطین کے قضیہ پر شیخ ابوالحسن کی تقریر اس درجہ اثر میں ڈوبی ہوئی تھی کہ ہم نے بہت سے سامعین کو زار وقطار روتے ہوئے دیکھا،ان تقریروں کا سرسری ذکر کاروان زندگی کی پہلی جلد صفحہ ۳۸۸-۳۸۹ میں موجود ہے اور تقریر "العوامل الأساسية في كارثة فلسطين " کے نام سے کتابی شکل میں چھپ چکی ہے۔

دمشق کے علاوہ شام کے دوسرے شہروں میں حمص اور حماۃ میں بھی مولانا تشریف لے گئے تھے،حمص کی تقریر آج بھی ان بوڑھوں کو یاد ہے جو اس وقت جوان تھے،مثلاً ڈاکٹر راتب النفاخ (۲) کو یہ تقریر گویا ازبر تھی،میں نے انہی سے سنا کہ مولانا نے فرمایا تھا (اردو ترجمہ)

> میں نے بچپن میں واقدی کی کتاب فتوح الشام کا ترجمہ اپنے گھر کی بڑی بوڑھیوں سے سنا تھا اس کا اردو نام سیف الاسلام تھا۔(صمصام الاسلام کے بجائے ان کو سیف الاسلام یادرہا) اس نے ہمارے اندر ایمان وغیرتِ دینی کی روح پھونک دی،اے اہلِ شام اور اے اہلِ حمص یہ تاریخ تمہارے ملک میں تیار ہوئی ہے،اس

---

(۱) بہت مقبول ومشہور ادیب تھے،بعد میں الجزائر میں جاکر مقیم ہوگئے اور وہیں انتقال کیا،دارالعلوم ندوۃ العلماء میں رابطۃ الادب الاسلامی کے ایک جلسہ میں صدارت کے لئے آئے تھے۔

(۲)۔استاذ راتب النفاخ ایک پرجوش اخوانی ذہن کے ادیب اور جامعہ سوریہ میں استاذ ادب عربی تھے ۱۳۹۸ھ میں انتقال ہوگیا رحمہ اللہ علیہ جنہوں نے مولانا مسعود عالم ندویؒ کے انتقال کے بعد مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ کی کتابوں کے عربی تراجم پر نظر ثانی وتصحیح کر کے اشاعت کے قابل بنایا۔

کتاب نے ہم ہندوستانیوں کو ہندو تہذیب اور فلسفہ میں تحلیل ہونے
سے بچایا تھا، آج پھر اس ملک کو ایک سیف اللہ کی ضرورت ہے۔

اسی طرح حماۃ میں بھی ایک تقریر میں مولانا نے عہد ماضی میں عربوں کے غلبہ اور ان کے رعب ودبدبہ کا ذکر کیا یہ دونوں تقریریں افسوس کہ قلم بند نہ ہوسکیں ورنہ داعیان دین کے لئے ایک نمونہ کا کام دیتیں۔ شام میں مولانا کا قیام ۴۸ دن رہا، جس میں دمشق کی مدت قیام ۲۵ روز ہے، اور اس عرصہ میں کوئی دن بھی ایسا نہیں گزرا جس میں کوئی اہم ملاقات یا علمی مجلس یا محاضرہ نہ رہا ہو۔

شام کے بعد مولانا دوبارہ حجاز تشریف لے گئے تھے، دمشق سے مدینہ منورہ ہوائی جہاز سے آئے پھر تیسرا حج کیا اور حج کے بعد مزید دو ماہ قیام کیا۔ حجاز واپسی اس طرح ہوئی جیسے سفر سے اپنے وطن آگئے ہوں، پھر وہ تمام احباب مل گئے جن سے بستان بخاری کے تاریخی اجتماع میں ملاقات ہوئی تھی، اس عرصہ میں مولانا سے ملنے کے لئے رباط بھوپال میں جو حضرات آتے رہے ان میں اہم شخصیت علامہ عمر بن حسنؒ کی تھی جو ملک فیصل کے ماموں ہوتے تھے اور سب سے بڑے دینی منصب پر فائز تھے جن کا ذکر پہلے آچکا ہے، شیخ علوی عباس مرحوم مدرس حرم شریف بھی جو حدیث اور نحو کے سب سے بڑے مدرس تھے اور ان کا بڑا حلقہ تھا بار بار آتے رہے دعوتیں کرتے رہے اور ہر دعوت میں مولانا کے پانچ چھ رفقاء (خدام) کو بھی بلاتے جن میں یہ ناچیز بھی حاضر باش رہا۔



اندرون ملک دینی خدمات کا سلسلہ

پیام انسانیت کی تحریک

حجاز، مصر، شام، مسجد اقصیٰ اور سوڈان کا دعوتی دورہ کرنے کے بعد مولانا اکتوبر ۱۹۵۲ء میں اپنے وطن تشریف لائے، یہ آپ کی زندگی کا طویل سفر تھا، اس سے پہلے اتنے طویل عرصہ کے لئے اپنے وطن سے آپ باہر نہیں رہے تھے، الحمدللہ کہ یہ سفر ہر طرح سے کامیاب رہا، ہر جگہ توقعات سے کہیں زیادہ پذیرائی ہوئی، علماء و مشائخ سے لے کر ادباء و مفکرین، یورنیورسٹیوں کے اساتذہ و طلبہ سبھوں نے عزت واحترام کے ساتھ آپ کی باتیں سنیں، اللہ تعالیٰ کے نزدیک مقبولیت کا اندازہ بندگان خدا کے دلوں میں آپ کی محبوبیت سے کیا جاسکتا ہے، لکھنؤ تو آپ کا ایک طرح سے وطن ہی ہے، شہر کے اعیان وعلماء سے لے کر تجار اور سرکاری ملازمین سب پہلے ہی سے آپ کے گرویدہ تھے، اس سفر کے بعد ان کی گرویدگی اور بڑھ گئی، تبلیغ ودعوت کا کام اہلِ شہر جس نہج پر کر رہے تھے وہ ہمیشہ جاری رہا، اور آپ کی واپسی کے بعد اس میں نئی جان آگئی، اور یہاں آکر ایک دن کے لئے بھی ایسا محسوس نہیں ہوا کہ آپ کی سرگرمی اور جوش عمل میں کوئی فرق آیا ہو۔

اس زمانے میں مولانا کو یہ خیال آیا کہ ہندوستان میں رہ کر یہاں کی غیر مسلم

اکثریت کو نظر انداز نہیں کیا جاسکتا ہے، جو بہر حال اس ملک پر حاوی اور اثر انداز ہے، نیز ان کا حق ہے کہ حق کی بات ان کو بتائی جائے، مگر کیسے بتائی جائے، مسلمانوں اور غیر مسلموں کے درمیان انگریزوں نے اپنے دور حکومت میں بہت وسیع اور گہری خلیج قائم کردی ہے، تاریخ ہند میں مسلمانوں کے کردار کو مسخ کر کے پیش کیا ہے، موجودہ نسل انہی تاریخی مستندات پر ایمان رکھتی ہے جو انگریزوں سے اس کو ورثہ میں ملی ہے، پھر برطانوی سامراجیت اس فارمولے پر قائم تھی کہ آپس میں ان کو لڑا کر حکومت کرو، منافرت اور اختلاف کی آگ کو قیام پاکستان نے اور بھی ہوا دی، اس کے علاوہ راقم کا احساس یہ ہے کہ اسلامی تعلیمات اور اسلامی زندگی کا کوئی نمونہ ہمارا مسلم معاشرہ نہیں پیش کر سکا، جہاں ہم ان کو بتا سکیں کہ اگر اسلامی تعلیمات، عقیدہ توحید ورسالت اور یوم آخرت پر ایمان لائیں تو اس طرح کا صاف ستھرا پاکیزہ معاشرہ وجود میں آجائے گا جہاں حکام اپنے آپ کو خدا کے آگے جوابدہ اور خلق خدا کا خادم سمجھیں، جہاں تاجر ذخیرہ اندوزی نہ کرتے ہوں، جہاں کاریگر بے ایمانی نہ کرتے ہوں، جہاں مزدور کام چوری نہ کرتے ہوں، جہاں غریبوں، بیماروں اور جفاکش طبقہ پر رحم دلی سے پیش آیا جاتا ہو، اگر کوئی چھوٹے سے چھوٹا معاشرہ بھی ہم ایسا دکھا سکتے جہاں اسلامی تعلیمات کے مطابق عمل بھی ہو تو ہم برملا نہ صرف اس ملک کے غیر مسلموں کو بلکہ دنیا بھر کے یہود و نصاریٰ، آتش پرست، مجوس، بت پرستوں کو سر اُٹھا کر دعوت دیتے کہ یہ ہے عقیدۂ توحید و عقیدۂ یوم آخرت کا اثر مگر جو صورتحال ہے وہ کسی سے مخفی نہیں ہے، مادہ پرستی، خواہش پرستی اور کسی قسم کی بھی پرستش میں ہم کسی ناخدا ترس غیر مسلم سے پیچھے نہیں ہیں، اور یہ فطری بات ہے کہ درخت اپنے پھل سے پہنچانا جاتا ہے، جہاں تک عقیدہ اور اصول کا تعلق ہے، یہ حقیقت ہے کہ صرف آخرت کی نجات نہیں بلکہ دنیا کی زندگی کو بھی آلودگیوں سے پاک کرنے اور امن وسلامتی قائم

کرنے میں اسلامی تعلیمات کی ہمسری کوئی مذہب نہیں کرسکتا۔

بہر حال، مولانا نے اپنے ہم وطن غیر مسلموں کا حق سمجھا کہ ان کو یکسر نظرانداز کرنا مناسب نہیں ہے، چنانچہ تبلیغی جماعت کی ''حرکت ومحنت'' کے ساتھ ایک مزید کام کا آغاز کیا گیا کہ ایسے اجتماعات منعقد کئے جائیں جن میں مسلمانوں کے ساتھ غیر مسلم بھی شریک ہوں، اس تحریک کی ابتداء اور مقبولیت پھر اس کام کے آگے نہ بڑھنے کے اسباب، خود حضرت مولانا کی زبان سے سنئے:۔

''لیکن غیر مسلم اکثریت کے ان افراد کو متوجہ کرنے اور ان کے ذہن وضمیر تک پہنچنے کا کوئی راستہ اس وقت زندگی کے مشترک مسائل، انسانیت اور اخلاق، اور ملک کے مفاد کے تذکرہ اور تمام مسائل ومصائب کے حل کی نشان دہی کے سوا نہیں اور یہی طریقہ ان کو اسلام کے مطالعہ اور مسلمانوں کے سمجھنے اور ان کو ان کا صحیح مقام دینے پر اور اس خداداد دولت (مسلمانوں کی موجودگی) سے فائدہ اُٹھانے پر جو اس ملک کی تاریخ نہیں بلکہ تقدیر بن گئی ہے، آمادہ کرسکتا ہے۔''

لیکن یہ کام بہت نازک تھا اس کے لئے بڑے سلیقہ، احتیاط، اظہار خیال پر قدرت اور مخاطبین کی نفسیات سمجھنے کی ضرورت تھی، ذرا سی بے احتیاطی سے یہ دعوت ''وحدت ادیان'' کے لئے راستہ ہموار کرسکتی ہے، دوسری طرف مخاطبین کے اس شوق کو ختم کرسکتی ہے جو ایک مرتبہ جلسہ میں آچکے ہیں، اس لئے یہ نازک کام زیادہ تر مولانا بذاتِ خود انجام دیتے رہے، اور الحمدللہ یہ تجربہ بہت کامیاب ہوا، اور مولانا آپ بیتی کاروانِ زندگی میں لکھتے ہیں:۔

> مصر اور شام سے واپسی پر لکھنؤ کی تبلیغی جماعت کے زیر اہتمام امین الدولہ پارک میں، جس کو جھنڈے والا پارک بھی کہتے ہیں، اور جہاں تحریک خلافت سے لے کر اس وقت تک

اہم سیاسی جلسے ہوتے رہے گاندھی جی اور موتی لال نہرو سے
لے کر مولانا محمد علی اور جواہر لال نہرو نے ہمیشہ تقریریں کی
ہیں، ایک عمومی اور مخلوط جلسہ ہوا، جس میں مسلم اور غیر مسلم سبھی
شریک تھے، میں نے وہاں خداپرستی اور نفس پرستی کے عنوان
سے ان دو متوازی فلسفہ حیات اور عالمگیر مذہبوں پر تقریر کی،
جنھوں نے دنیا کو منقسم کر رکھا ہے اور دونوں کے نتائج اور زندگی
پر اثرات کی وضاحت کی، بعض لوگوں کا اندازہ ہے کہ اس جلسہ
میں حاضرین کی اتنی تعداد تھی جو بڑے سے بڑے سیاسی رہنما
حتیٰ کہ جواہر لال صاحب کے خطاب میں بھی دیکھنے میں نہیں
آئی، من جانب اللہ بات تھی کہ مضامین کی ایسی آمد اور تقریر میں
ایسی روانی اور جوش تھا کہ سامعین ایک سکتہ کے عالم میں تھے اور
ایسی خاموشی تھی جس کو (in Drop Silence) سے تعبیر کیا جاتا
ہے، بہت سے رکشے والوں نے جن کا اڈہ قریب تھا سواری لینے
سے انکار کر دیا اور کھڑے سنتے رہے، اس جلسہ کی ایک خصوصیت
یہ تھی جو میرے لئے بڑی اہمیت رکھتی ہے، کہ بھائی صاحب مرحوم
(حضرت مولانا ڈاکٹر حکیم عبدالعلی صاحبؒ) بھی پاس کی ایک عمارت
میں بیٹھے ہوئے تقریر سن رہے تھے اور اس میں کوئی شبہ نہیں کہ وہ
اپنی محنت و تربیت ذہنی پر مسرور و مطمئن ہوئے ہوں گے۔

اس کے بعد باقاعدہ یہ سلسلہ شروع ہو گیا، ایک تقریر ۹ ؍جنوری ۱۹۵۴ء کو
گنگا پرشاد میموریل ہال لکھنؤ میں کی گئی جس میں شہر کے سر برآوردہ حضرات اور غیر مسلم
تعلیم یافتہ افراد کی خاصی تعداد شریک تھی، اس سلسلہ کی دوسری چار تقریریں تبلیغی

دورے میں جو یو. پی. کے مشرقی اضلاع میں ہو رہا تھا، جون پور، غازی پور، مئو، (اعظم گڑھ) اور گورکھپور میں کی گئیں، ان تقریروں کے عنوانات سے (جن سے زیادہ تفصیل اس بات میں پیش نہیں کی جاسکتی) ان تقریروں کے مزاج، مقصد، اور کچھ مشکلات کا اندازہ ہو سکتا ہے۔

یہ عنوان بترتیب لکھے جاتے ہیں:

۱۔ خرابی کی جڑ یہ ہے کہ برائی اور پاپ کی خواہش پیدا ہو گئی ہے۔
۲۔ آج دنیا پر خود غرضی اور بداخلاقی کا مانسون چھایا ہوا ہے، اسے چادروں سے روکا نہیں جا سکتا۔
۳۔ انسان خود پرست بھی ہے اور خود فراموش بھی۔
۴۔ دنیا کی موجودہ کشمکش یہ نہیں کہ برائی دور ہو بلکہ یہ برائی ہماری نگرانی اور انتظام میں ہو۔
۵۔ اعلیٰ اخلاقی قدریں دل کے اندر کھوئی ہیں۔ ان کی باہر تلاش ہے۔
۶۔ ہر تقریر کا اختتام ایسے مضمون پر ہوتا تھا جس سے آسمانی ہدایت کی ضرورت، نبوت کی قدر و منزلت اور اس کی آخری شکل اسلام کی جستجو اور تلاش پیدا ہو۔

اگلے سال ۱۹۵۵ء میں پھر دوسرے تبلیغی دورہ میں مخلوط اجتماعات کا اہتمام کیا گیا، ان میں جو مختلف مقامات پر تقریریں کی گئیں، ان کے عنوانات اور مقامات لکھے جاتے ہیں۔

۱۔ زندگی میں فرد کی اہمیت، ہمارے اصلاحی کاموں کا ایک بڑا خلا (ٹاؤن ہال جونپور)

۲۔ ایک مقدس وقف اور اس کا متولی (بلتھرا روڈ)
۳۔ موجودہ تہذیب کی ناکامی، ذرائع و مقاصد کا عدم توازن (وکٹوریہ پارک بنارس)
۴۔ ملک کی آزادی (امین الدولہ پارک لکھنؤ)

ان تقریروں کے دوران اثر پذیری کے بعض عجیب واقعات پیش آئے جن کا ذکر کرنا بے محل نہ ہوگا۔ اور جس سے اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ اگر یہ سلسلہ ان ضروری احتیاطوں کے ساتھ جاری رہتا، جن کا ذکر اوپر آیا ہے اور تائید الٰہی شامل حال ہوتی ہے تو نہ صرف اسلام اور مسلمانوں کی ایک بڑی خدمت انجام پاتی بلکہ اس ملک کے بھی سب سے پیچیدہ مسئلہ کے حل ہونے کے امکانات پیدا ہو جاتے، لیکن جیسا کہ آئندہ صفحات سے معلوم ہوگا، بعض اندیشوں و زیادہ تر اس موضوع پر محتاط و مؤثر تقریر کرنے والوں کی کمیابی یا نایابی نے اور واقعہ یہ ہے کہ میرے بیرونی سفروں اور علمی مشاغل نے اس سلسلہ کو جاری نہیں رہنے دیا اور بقول شاعر

زمانہ بڑے شوق سے سن رہا تھا
ہمیں سو گئے داستاں کہتے کہتے

ایک مرتبہ تو یہ پیش آیا کہ سیوان میں شب کے مخلوط اجتماع میں میں حسب معمول تقریر کر کے بیٹھنا چاہتا تھا کہ جلسہ سے آوازیں آئیں کہ ابھی اور فرمایئے ہم ابھی سننا چاہتے ہیں، ہم نے کہا کہ ہم لوگوں کا یہ معمول نہیں کہ جب بات پوری ہو جائے، تو بلا ضرورت تقریر جاری رکھیں، میں یہ کہہ کر بیٹھ ہی رہا تھا کہ ایک

سن رسیدہ ہندو اسٹیج پر (WONDERFUL WONDERFUL) کے الفاظ کہتے ہوئے آگے بڑھے اور کہا کہ میں کچھ کہنا چاہتا ہوں، ہم لوگوں نے اس اندیشہ کے پیش نظر کہ کہیں اس جلسہ میں کوئی انتشار یا خیالات کا تضاد سامنے نہ آئے، ان کو مہذب طریقہ پر بٹھانے کی کوشش کی لیکن وہ اسٹیج تک پہنچ گئے، معززین شہر نے بتایا کہ یہ یہاں کے بہت کامیاب وکیل اور یہاں کی پرجا سوشلسٹ پارٹی کے سکریٹری یا صدر ہیں، انہوں نے مائک پر کہا میں نے اپنے زندگی میں دو تقریریں سنی ہیں جن سے سب سے زیادہ متاثر ہوا ہوں، ایک مسٹر C.R.DASS کی تقریر، اور ایک آج مولانا صاحب کی، اور میں صاف کہتا ہوں کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم صاحب (انھوں نے صلی اللہ علیہ وسلم کا جملہ ادا کرنے کی کوشش کی تھی جو انہوں نے بار بار سنا تھا، لیکن وہ ادا نہ کر سکے) خدا کے سچے پیغمبر ہیں، مولانا صاحب آپ صرف مسلمانوں ہی کے نہیں ہیں، ہم بھی آپ پر اپنا حق سمجھتے ہیں، ہم آپ کو آئندہ بھی یہاں آنے کی زحمت دیں گے۔

اس تجربہ اور اقدام نے ۱۹۷۴ء میں ''پیام انسانیت'' کی تحریک کی شکل اختیار کر لی جس کا تجربہ پچھلے تجربوں کی طرح کامیاب رہا، اور اس نے اکثریت کے طبقہ، انصاف پسند غیر مسلموں اور دانشوروں میں اسلام اور سیرت کے مطالعہ کا کسی درجہ میں شوق اور جذبہ بھی پیدا کیا، ہندوستان جو انسانی بحران، اخلاقی انتشار، انسانی جان و مال کے عدم احترام وتحفظ، خود غرضی اور دولت پرستی کے جنون کی وجہ سے جس خطرہ سے دوچار ہے اس کا مہیب نقشہ پیش

کرنے اور ملک کو بچانے کی جدوجہد کی دعوت دینے پر بعض ممتاز
ہندوؤں نے یہاں تک کہا کہ آج معلوم ہوا کہ مسلمانوں کو اس ملک
کے بچانے کی فکر ہم سے زیادہ ہے۔(۱)

پیام انسانیت ایک تحریک بن گئی، مگر اس تحریک کو تنظیم کی شکل نہیں دی گئی، یہ بات مولانا کے مزاج اور طریقہ کار سے دور کی چیز ہے، یہی کام اگر کوئی سیاسی ذہن کا شخص لے کر اُٹھتا تو پہلے اس کا ایک مرکز ہوتا، صدر، سکریٹری، نائب صدر، خازن بنایا جاتا پھر ہر صوبہ میں اس کی شاخیں یا علاقائی دفاتر ہوتے، اور ایک آل انڈیا قسم کی تنظیم بن جاتی، مولانا چاہتے تو ایسا کر سکتے تھے، الحمدللہ ہر صوبہ میں اچھی خاصی تعداد میں ایسے لوگ تھے اور اب بھی ہیں جو اس میں داخل ہوتے اور ذمہ داریاں سنبھالتے مگر ایسا نہیں ہوا، نہ ہونے کا سبب اسباب وافراد کی کمی نہیں ہے بلکہ صاحب تحریک کا غیر تحریکی مزاج ہے، ورنہ جس شخص کے نام پر اور جس کی تائید حاصل کر کے مختلف تنظیموں نے مال واعتبار حاصل کیا، وہ خود اگر اس انداز پر کام کرتا تو مسلم تنظیموں کے درمیان ایک زیادہ مستحکم طاقتور تنظیم ہو جاتی۔ شروع میں مولانا کے اس تصور کے ساتھ کام کرنے والوں میں محمد میاںؒ (مولانا محمد الحسنی ایڈیٹر البعث الاسلامی) اور مولوی اسحاق جلیس مرحوم تھے، دونوں نے جوانی میں وفات پائی، مزید تائید کرنے والوں میں مولانا عبدالکریم پاریکھ، محترم قاضی عبدالحمید صاحب اندوری، اور جناب انیس چشتی ہیں جو اس کے لٹریچر پھیلانے میں کوشاں رہے اور اس کے جلسوں میں خواص کو دعوت دیتے رہے، اور اب بھی اپنی سی کوشش کر رہے ہیں، لیکن اگر پوچھئے اس کا صدر دفتر کہاں ہے، صدر کون ہے تو وہ سب مولانا کی تنہا ذات ہے، اور نہ اس کام کے لئے ایک پیسہ کا چندہ کیا گیا، اور نہ اس کے وفود ''تماشائے اہل کرم'' دیکھنے کے لئے

---

(۱) کاروان زندگی جلد اول صفحہ ۳۹۶ تا ۴۰۰

کہیں گئے، ورنہ آج اس کی اپنی بلڈنگ ہوتی، کام کرنے والوں کا عملہ ہوتا، سالانہ اجلاس ہوتے، حلقہ واری مجلسیں ہوتیں، مولانا کے نفوذ واثرات اور مقبولیت کو دیکھتے ہوئے یہ کہنا بے جانہ ہوگا کہ یہ تنظیم ایک کامیاب ومقبول تحریک ہوتی، بہرحال ایثار و خدمت کے جونقوش مولانا نے قائم کئے ہیں وہ آئندہ حوصلہ مند افراد کے لئے دلیل راہ کا کام دیں گے۔

دینی تعلیمی کونسل

آزادی اور تقسیم ملک کے بعد ہندو احیائیت کا کام حکومت کی سرپرستی میں زور وشور سے شروع ہو گیا، ہندو دیو مالا اور ہندو میتھالوجی کو پھلنے پھولنے اور پھیلنے کا موقع ملا، اگر یہ بات ایجابی طور پر اور سیکولر ڈھانچے کے اندر ہوتی تو مسلمانوں کو کوئی کد یا ضد نہ ہوتی، مگر یہاں صورت حالت مختلف تھی، پاکستان کے حصول کے لئے جو نعرے مسلمانوں کو دئے گئے تھے وہ اسلامی تشخص کا بقاء اور اردو زبان کی حفاظت کا تھا، اس لئے ہندو احیائیت کی تحریک نے صرف اپنے مذہبی دیوتاؤں کی تقدیس ہی پر اکتفا نہیں کیا، بلکہ مسلم ثقافت کے باقی ماندہ اثرات کو کالعدم کرنا بھی اپنے نصب العین میں داخل کرلیا، اردو زبان کے عناد کا مظاہرہ بھی شروع کر دیا، ریلوے اسٹیشنوں پر، پبلک پارک میں، سڑکوں کے نام جہاں جہاں اردو میں لکھے ہوئے تھے ان کو کھرچ کھرچ کر مٹانا اور صرف ہندی کو باقی رکھنا اور کہیں کہیں انگریزی کو قائم رکھنا جو انگریزوں کا ورثہ تھا، ایک عام قاعدہ بن گیا، مسلمان بچوں کے سامنے صرف دو راستے رہ گئے تھے، یا وہ تعلیم سے محروم رہیں، اور آگے چل کر انجینرنگ، سائنس، طب (ڈاکٹری) وغیرہ سے نابلد رہیں، یا پھر ان علوم کو حاصل کرنے کے لئے ہندو دیو مالا پر ایمان لائیں، اُردو جو مسلم ثقافت کی اس ملک میں امین ومحافظ ہے

اس کو بھول جائیں، سنسکرت آمیز ہندی کو اپنی زبان سمجھیں، اور بہت عجلت کے ساتھ اس منصوبہ پر عمل ہونے لگا، اس بات کا قلق سب کو تھا، اور اس اندیشے سے کوئی مسلمان ناواقف نہیں تھا، مگر اس دیوناگری ثقافت کے طوفان میں کوئی جائے پناہ Shlter تلاش کرنے اور مشکل کا حل نکالنے کی توفیق اللہ تعالیٰ نے مرحوم قاضی عدیل عباسی صاحب کو عطا کی، اور انہوں نے ضلع بستی میں ایک کام شروع کیا، اس طرح کہ اسکول جانے والے بچوں کے والدین اور سرپرستوں کو ان خطرات سے آگاہ کرتے ہوئے یہ تجویز رکھی کہ بچے سرکاری اسکولوں میں جانے سے پہلے یا شام کو واپسی کے بعد مسجد کے صحن و دالان میں قرآن، اردو، اور اسلامی عقیدوں کی ابتدائی کتابیں پڑھیں، ایک مدرس رکھا جائے جو مسجد میں امام کے حجرہ میں رہے اور اس کی تنخواہ چٹکی فنڈ سے دی جائے، چٹکی فنڈ خلافت کے زمانہ میں مولانا محمد علی جوہر یا کسی دوسرے ہمدرد ملت نے ایجاد کیا تھا، کہ ہر گھر میں خاتون خانہ جب روٹی پکانے کے لئے آٹا نکالیں تو ایک مٹھی آٹا علاحدہ کسی گھڑے میں رکھدیں، ہر ہفتہ ایک رضا کار گاؤں کے گھروں سے یہ آٹا اکٹھا کر کے فروخت کردے اس سے جو آمدنی ہو اس کو ''چٹکی فنڈ'' کہا جاتا ہے، قاضی عدیل عباسی مرحوم نے یہی طریقہ دینی تعلیم کے لئے نکالا، اللہ تعالیٰ ان کی مغفرت کرے، ان کا بروقت یہ تدبیر اختیار کرنا کام آگیا، اور انھوں نے ضلع بستی میں اس کا تجربہ شروع کردیا، جو کامیاب جارہا تھا، جب اس کی اطلاع حضرت مولانا کو ملی تو آپ نے گویا اپنے دل کی مراد پائی، اور جس فکر و غم میں تھے اس کے لئے ایک حل نکل آیا۔

مولانا نے قاضی عدیل عباسی صاحب سے ملاقات کی اور ان سے خواہش کی کہ وہ اس تجربہ کو پورے صوبہ میں پھیلادیں، قاضی صاحب مرحوم اس پر آمادہ ہوگئے، ۳۰؍۳۱؍دسمبر ۱۹۵۹ء اور یکم جنوری ۱۹۶۰ء کی تاریخوں میں بستی میں ایک

صوبائی کانفرنس بلائی، جس میں انہوں نے صرف صوبہ ہی سے نہیں بلکہ صوبہ کے باہر سے ممتاز مسلمانوں اور دانشوروں تعلیمی مسائل سے دلچسپی رکھنے والوں، قومی کارکنوں اور تنظیموں کے سربراہوں کو بلایا، اس پہلی کانفرنس کی صدارت کے لئے انہوں نے حضرت مولانا کا نام پیش کیا اور کونسل کی صدارت بھی مولانا ہی کے سپرد ہوئی، حضرت مولانا نے اس موقع پر خطبہ (عجلت میں ایک سفر کے دوران ٹرین پر لکھا، اس کا انگریزی اچھا ترجمہ ہوا، یہ کانفرنس اور اس کا خطبۂ صدارت ایک طرح سے مسلمان بچوں کے تعلیمی سمت میں ایک سنگ میل ثابت ہوا) جو ہندوستانی مسلمانوں کے تعلیمی مسائل کے سلسلہ میں ناقابل فراموش ہے۔

اس کانفرنس کے بعد کونسل کی صدارت جب سے مولانا نے قبول فرمائی اس کے ساتھ قاضی عدیل عباسی صاحب کا اخلاص اور ان کی دیدہ وری نے دینی تعلیمی کونسل کو ایک زندہ، متحرک اور باعمل تحریک بنادیا، دینی تعلیمی کونسل کے ذریعہ ایک بڑا خلاپُر ہوا، چٹکی فنڈ کی اسکیم کو ہر ہر گاؤں میں عام کرنے کے لئے ایک بڑی تعداد میں رضا کاروں کی ضرورت تھی، غالباً اسی وجہ سے وہ اسکیم پورے طور پر کامیاب نہ ہوسکی، البتہ حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ کی توجہ سے رابطہ عالم اسلامی مکہ مکرمہ نے ایک سالانہ مدد جاری کردی تھی، جو گزشتہ چند سال پہلے تک جاری تھی، بعض دفتری اور قانونی دشواریوں کی وجہ سے شاید اس کا سلسلہ منقطع ہوگیا۔

حضرت مولانا جو اس کونسل کے صدر ہیں، قاضی عدیل عباسی مرحوم کے اخلاص وعمل، بیدار مغزی، اور دوربینی کے معترف اور قدرداں رہے، ان کے ساتھ جناب ظفر احمد صاحب کے بھی قائل رہے، ظفر احمد صاحب سیتاپور کے ایک کامیاب وکیل تھے، قاضی صاحب سے ان کے دوستانہ تعلقات تھے، مولانا نے کاروانِ زندگی میں ان کا ذکر محبت واحترام کے الفاظ میں کیا ہے، افسوس کہ یہ دونوں

سرگرم کارکن ۱۹۸۰ء میں چند ماہ کے فصل سے آگے پیچھے دنیا سے رخصت ہو گئے، ان کے بعد الہ آباد کے ایک مخلص مسلمان ریاض الدین صاحب نے سکریٹری جنرل کا عہدہ سنبھالا، ان کے بعد لکھنؤ کے ایک مخلص دینی کارکن ڈاکٹر محمد اشتیاق حسین صاحب قریشی نے یہ عہدہ سنبھالا جو ابھی تک اپنی وسعت کی حد تک یہ خدمات انجام دے رہے ہیں، ڈاکٹر محمد اشتیاق حسین صاحب بھی ان دردمندان ملّت میں سے ہیں جو شروع سے اس کام میں شریک رہے، اور اس کے لئے مختلف اضلاع کا دورہ کیا، حضرت مولانا کے یہاں اخلاص کی قیمت واہمیت ہے اس کا اندازہ اس سے ہوگا کہ ڈاکٹر صاحب موصوف ایک خاص معاملہ میں ندوہ کے ذمہ داروں سے روٹھ گئے اور ندوہ سے اپنا تعلق منقطع کر لیا، ندوہ کے ساتھ اس کے ملحق ادارہ مجلس تحقیقات ونشریات سب سے بہ یک قلم مستعفی ہو گئے، یہی نہیں بلکہ تعلیمی کونسل سے بھی علاحدہ ہو گئے، حضرت مولانا نے ان کو منانے کی سعی فرمائی، ندوہ اور اس کی مجلس تحقیقات و نشریات سے ان کی بے تعلقی پر صبر کیا، مگر دینی تعلیمی کونسل سے ان کی علاحدگی کو مسلمان بچوں کی تعلیم کے سلسلہ میں ایک خسارہ سمجھا اور ان سے لجاجت سے التماس کیا کہ اس کام کو جاری رکھیں۔

مرحوم قاضی عدیل عباسی کے اخلاص کی قدر ان کی زندگی میں بھی کرتے تھے اور ان کے انتقال کے بعد بھی اس کو یاد رکھتے ہیں، مرحوم کے بھانجے ڈاکٹر مسعود الحسن عثمانی کو اس نسبت سے اور ان کی صلاحیتوں کی بناء پر ہمیشہ عزیز رکھتے اور ان کی کسی دعوت یا ان کے توسط سے جو دعوت مولانا کو دی گئی، اس کو ان حالات میں بھی قبول کیا جب کہ ان کی صحت پر ضعف اور تعب کا اثر تھا۔

دینی تعلیمی کونسل کے کام جاری ہیں اگر چہ مولانا کے اسفار، اور صحت کا مسلسل اضمحلال، ندوہ کے کاموں میں بہت زیادہ وسعت، کام کے تسلسل میں

رکاوٹ کا سبب ہوا موجودہ جنرل سکریٹری ڈاکٹر محمد اشتیاق قریشی بھی امراض کا شکار رہے، ان کی اپنے پیشہ (طب ہومیو پیتھی) کی مشغولیت کافی بڑھی ہوئی ہے، اور ندائے ملت ہفت روزہ بھی پابندی سے نکالتے ہیں، لڑکیوں کی تعلیم کے ایک بڑے مرکز (جامعہ نور الاسلام) کے وہ سرپرست ہیں، بہرحال وہ اب کچھ وقت دینی تعلیمی کونسل کے لئے نکالتے ہیں، ان کے ساتھ ڈاکٹر مسعود الحسن عثمانی جواب اس کے سکریٹری ہیں، اس کونسل کی ذمہ داریاں سنبھالے ہوئے ہیں۔ بارك الله فيهم

مسلم پرسنل لا بورڈ

آزادئ ملک کے بعد ہندو اصنام پرستی کی احیائیت کا کام زور وشور سے شروع ہوا اور مسلسل بڑھتا رہا۔ اور متعدد پارٹیوں کی طرف سے مطالبہ ہونے لگا کہ ہندوستان میں سارے فرقوں کا ایک عائلی قانون (Uniform civilCode) ہونا چاہئے۔ اس کے بغیر قومی وحدت اور یک رنگی نہیں پیدا ہوسکتی۔ حکومت نے مبہم الفاظ میں تائید شروع کردی اور خطرہ تھا کہ مسلمانوں کے مسائل وراثت، نکاح، طلاق سب کو ہندوانہ رسوم کا پابند کردیا جائے گا۔ عبدالحمید دلوائی نامی ایک شخص کی قیادت میں کچھ افراد حکومت کی تائید کرنے لگے۔ اس خطرہ کا احساس جن لوگوں کو ہوا، ان میں مولانا سید منت اللہ صاحب رحمانی، (امیر شریعت بہار واڑیسہ) پیش پیش تھے، ان کے منصب ومشاغل اور علمی تجربات نے اس سلسلہ میں بروقت رہنمائی کی۔ اور اس کے خلاف محاذ قائم کرنے میں اللہ نے ان کو کامیابی دی۔ انھوں نے فیصلہ کیا کہ اس کے خلاف منظم مہم اور تحریک چلائی جائے۔ چنانچہ آپ نے مسلم مجلس مشاورت، جماعت اسلامی، دارالعلوم دیوبند، ندوۃ العلماء کی تائید سے ۲۷/۲۸ دسمبر ۱۹۷۲ء کو بمبئی میں مسلم پرسنل لا کنونشن بلایا، جس میں بریلوی اثنا عشری، بوہرہ فرقہ اور اہل حدیث

جماعت کے نمائندے شریک ہوئے ، اور بورڈ کی تشکیل عمل میں آئی، جس کی صدارت کے لئے حضرت مولانا قاری محمد طیب صاحب (مہتمم دارالعلوم دیوبند) کا نام بالاتفاق منظور ہوا۔ اور جنرل سکریٹری کے لئے اس تحریک کے بانی اور کنونشن بلانے والے حضرت مولانا سید منت اللہ صاحب رحمانی قرار پائے۔اسی کنونشن کے زمانے میں عبدالحمید دلوائی صاحب کی قیادت میں ایک چھوٹا سا گروہ مظاہرہ کے لئے نکلا، عوام نے چپلوں اور جوتوں سے اس کا استقبال کیا اگر پولیس جلد اس کو اپنی حفاظت میں نہ لیتی تو اس سے زیادہ سنگین حالات پیش آسکتے تھے۔

حیرت کی بات یہ ہے کہ اگلے دن ٹائمز آف انڈیا کے بمبئی ایڈیشن میں ایک گوشہ میں پرسنل لا کنونشن کے جلسۂ عام کی خبر تھی، جس سے اس کام کی وسعت وعظمت کا کوئی اندازہ نہیں ہوتا تھا، اس کے برخلاف دلوائی صاحب کے مظاہروں کو ایسا چمکا کر دکھایا تھا، جس سے باہر کا آدمی یہ سمجھنے پر مجبور ہوتا کہ اس میں مسلمانوں کی حقیقی نمائندگی اور ان کے جذبات کی صحیح ترجمانی تھی، یہ ہندوستان کی غیر ذمہ دارانہ انگریزی، ہندی صحافت کا ایک نمونہ ہے، جو صرف حقائق کو حکومت اور اکثریت سے مخفی رکھنے کی کوشش کرتی ہے، بلکہ رائی کا پربت بنادیتی ہے اور حکومت اور پبلک دونوں کو گمراہ اور حقائق سے بے خبر رکھنے کے جرم کا ارتکاب کرتی ہے، جو ملک کی خدمت کے بجائے بدخدمتی اور روشنی پہنچانے کے بجائے اس کو تاریکی میں رکھنے کے مرادف ہے۔

اس کنونشن میں حضرت مولانا شریک تھے، اور اس کا دوسرا اجلاس جب علی گڑھ میں ہوا تو اس کا آپ نے افتتاح کیا۔اس موقع کی تقریر ہندوستان میں آزادی کے بعد مسلمانوں کے جذبات وخیالات کی صحیح نمائندگی تھی۔اس کی تفصیل کاروانِ زندگی کی جلد دوم میں موجود ہے۔

صدر مسلم پرسنل لا بورڈ حضرت قاری طیب صاحب کی وفات کے بعد

۱۹۸۳ء میں با اتفاق رائے حضرت مولانا کا نام صدر کے لئے طے کیا گیا۔ جب کہ مولانا اپنی علالت کے بناپر اس کنونش میں شریک نہیں تھے، اور نہ اس منصب کے قبول کرنے کے لئے راضی تھے، لیکن مولانا سید منت اللہ رحمانی کے اصرار پر آپ نے اس ذمہ داری کو قبول فرمایا۔ مولانا رحمانی کو حضرت مولانا بہت ہی احترام کی نظر سے دیکھتے تھے، جس کا سبب ان کا علم و بزرگی کے علاوہ یہ تھا کہ وہ بانی ندوۃ العلماء حضرت مولانا سید محمد علی مونگیریؒ کے صاحبزادے تھے بورڈ کی صدارت ۱۹۸۳ء سے اب تک حضرت مولانا کے ذمہ ہے، اور بار بار اپنی معذوری اور عمر کی زیادتی کے پیش نظر اس ذمہ داری سے سبکدوش ہونا چاہتے تھے، لیکن تادم تحریر مولانا ہی کو اس کی ذمہ داری اٹھانی پڑ رہی ہے۔ اور تادمِ حیات ۳۱ر دسمبر ۱۹۹۹ء تک آپ ہی اس کے ذمہ دار رہے۔

شاہ بانو کیس

مسلم پرسنل لاء بورڈ یوں تو ۱۹۷۲ء میں قائم ہو چکا تھا اور اس کے بڑے عظیم الشان اجلاس ملک کے بڑے بڑے شہروں میں منعقد ہوئے، لیکن اس کے پورے دور میں ۱۹۷۲ء سے لے کر ۱۹۹۹ء کی آخری تاریخ تک میں کوئی کارنامہ ایسا نہیں انجام پایا جو مسلمانوں کے سروں کو اونچا کرے اور ان کے اندر عزم و ہمت پیدا کر سکے سوائے دو واقعوں کے، ایک واقعہ ہے ''شاہ بانو کیس'' کا اور دوسرا واقعہ ہے ''وندے ماترم'' کو تمام مدراس پر عائد کرنے کا، یہ دونوں مسئلے جس طریقہ سے حل ہوئے تاریخ شاہد رہے گی کہ وہ صرف حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ کی تنہا بلا شرکت غیرے مساعی کا نتیجہ تھا، یوں تو حضرت مولاناؒ جب بھی کوئی کام کرتے تو اپنے ساتھ کسی کو یا کسی جماعت کو شریک فرما لیتے تا کہ یہ نہ کہا جائے کہ یہ کارنامہ صرف

مولاناؒ کی ذات سے انجام پایا، ان کی فطرت ''اَنا'' پر نہیں بلکہ ''انکارِ اَنا'' پر قائم تھی۔ انہوں نے خود اپنی زبان سے تفصیلات بیان کی ہیں لیکن اس کا اظہار نہیں کیا کہ یہ دونوں قضیہ جو ہندوستان کی آزادی کے بعد طے پائے وہ صرف اللہ تعالیٰ کی توفیق خاص اور ان کی محبوبیت کا نتیجہ تھی جو اللہ نے ان کو عطا فرمایا تھا۔ مولانا نے اپنے قلم سے ان دونوں واقعات کو جس طرح تحریر فرمایا ہے وہ کاروانِ زندگی کے حصہ سوم باب چہارم میں صفحہ ۱۱۱ سے لے کر صفحہ ۱۶۰ تک پوری تفصیل کے ساتھ موجود ہے۔

دوسرا مسئلہ ''وندے ماترم'' کو عام کرنے کا تھا، جس کے بارے میں ایک سرکلر حکومت کی وزارت تعلیم کی طرف سے نکل چکا تھا، حضرت مولانا اس زمانہ میں بیمار تھے جو کہ آخری مرض تھا، اس وقت یہ واقعہ پیش آیا اس کی تفصیل کاروانِ زندگی کے آخری حصہ ہفتم کے صفحہ ۲۰۴ سے ہم یہاں نقل کرتے ہیں کیونکہ اس سلسلہ میں بھی بعض غلط فہمیاں پھیلائی گئی ہیں۔

زندگی کا ایک پُرشور اور ہنگامہ خیز مرحلہ

ناظرین کو معلوم ہے کہ راقم نے کئی مہینے پہلے سرکاری اسکولوں میں لازمی طور پر ''بندے ماترم'' کا گیت پڑھنے کا حکم وقانون کے خلاف اسلام کے بنیادی عقیدۂ توحید کے منافی ہونے کی بنا پر اظہار رائے اور تبصرہ کیا تھا اور یہ کہ وہ اسلامی نقطہ نظر بلکہ عقائد کے لحاظ سے واضح اور طاقتور مشرکانہ گیت ہے، اس میں صاف صاف کہا گیا ہے۔

''دلوں کے اندر تیری ہی حقیقت ہے، تیری ہی محبوب مورتی ہے، ایک ایک مندر میں تو ہی درگا، دس مسلح ہاتھوں والی، تو ہی کملا ہے، کمل کے پھول کی بہار، تو ہی پانی ہے، علم سے بہرور

کرنے والی ہے میں تیرا غلام ہوں، غلام کا غلام ہوں، غلام کے غلام کا غلام ہوں، .... تیرا بندہ ہوں، میں بھارت ماتا کی وندنا کرتا ہوں"۔

مسئلہ محض وندے ماترم تک نہیں ہے، بلکہ ہر اسکول کے لئے یہ بھی لازم ہے کہ ہندوستان کا نقشہ اور "سرسوتی ماں" کی تصویر "۱۸×۳۰" سائز کی آویزاں کرے۔

طلبہ جب اسکول آئیں اور تعلیم کے لئے جمع ہوں، اور جب اسکول سے رخصت ہونے لگیں تو یہ دونوں تصویریں ان کے سامنے رکھی جائیں۔

سرسوتی وندنا کے بعد وہ قومی گیت گائیں۔

طلبہ اسکول چھوڑنے سے پہلے بھارت ماتا کی جے پکاریں، فزکس میں ہومی بھابھا، جگدیش چندر بوس کے حالات اور ان کے بارے میں اسباق شامل ہوں اور میتھ میٹکس میں تار پکار کے حالات اور معلومات۔

اس سلسلہ میں دار العلوم ندوۃ العلماء میں دینی تعلیمی کونسل کے ایک اجلاس میں جو ۸؍فروری ۱۹۹۸ء کو منعقد ہوا تھا، اس پر پورا تبصرہ ہوا اور اس کا حقیقت پسندانہ جائزہ لیا گیا اور اس کے بارے میں مسلمانوں کے تأثرات اور اضطرابات کا اظہار کیا گیا، پھر مسلم یونیورسٹی علی گڑھ میں منعقد ہونے والے دینی تعلیمی کونسل کے اجلاس (منعقدہ ۲۶،۲۷؍اپریل ۱۹۹۸ء کے خطبہ صدارت میں اس پر اور وضاحت و تفصیل کے ساتھ تبصرہ کیا گیا اور اس سلسلہ میں مسلمانوں کے موقف اور ان کے تأثرات اور نقطہ نظر کا اظہار کیا گیا، دینی تعلیمی کونسل کے دفتر اور اس کے ذمہ دار خاص طور پر اس کے جنرل سکریٹری ڈاکٹر اشتیاق حسین صاحب قریشی اس کا اظہار و اعلان کرتے

رہے، اس پر تقریباً ۶؍مہینے گزر گئے اور ہندو تنظیموں اور غیر مسلم صحافت (انگریزی و ہندی اخباروں ورسالوں) کا کوئی نمایاں اور احتجاجی ردّعمل ظاہر نہیں ہوا۔ ۱۲؍نومبر ۱۹۹۸ء کو دارالعلوم دیوبند کے اجلاس میں بھی جو مدارس عربیہ کے مسائل کے سلسلہ میں منعقد کیا گیا تھا ''وندے ماترم'' کے خلاف دارالافتاء (دارالعلوم دیوبند) کا فتویٰ سنایا گیا۔

لیکن ۱۹؍نومبر ۱۹۹۸ء کو اچانک معلوم ہوا کہ ہندی وانگریزی اخبارات کے نمائندے، ریڈیو اور ٹیلی ویژن یہاں تک کہ بی بی سی (B.B.C.) کے نامہ نگار اور ترجمان، اسٹار ٹی وی (STAR T.V.) زی ٹی وی (ZEE T.V.) کے نمائندے راقم سے انٹرویو لینا چاہتے ہیں، ان کے نمائندے دارالعلوم ندوۃ العلماء میں ۱۹؍نومبر کو تین مرتبہ گروہ در گروہ آئے اور انھوں نے راقم سے سوالات کئے اور اس کے جوابات کو ریکارڈ کیا، راقم کے جوابات کو ایک مقامی اُردو پرچہ(۱) سے، جس نے اس کو اپنے پہلے صفحہ پر شائع کیا ہے نقل کیا جاتا ہے۔

''لکھنؤ ۱۹؍نومبر ندوۃ العلماء کے ناظم، مسلم پرسنل لاء بورڈ اور دینی تعلیمی کونسل کے صدر مولانا علی میاں ندوی نے کہا کہ حکومت کی تعلیمی پالیسی ملک کے لئے انتہائی نقصان دہ ہے اور اس پوری جدوجہد سے کوئی ادنیٰ فائدہ ہونے والا نہیں۔

مولانا نے کہا کہ گاندھی جی، جواہر لال نہرو، مولانا آزاد اور دوسرے رہنماؤں نے، جو ملک کی آزادی میں پیش پیش تھے اور جنھیں ملک کا وقار اور مفاد عزیز تھا۔ بہت سوچ سمجھ کر یہ طے کیا تھا کہ اس ملک کی سلامتی اور بقا کا انحصار ہمیشہ جمہوریت، سیکولرزم اور عدم تشدد پر ہوگا اور جب یہ اقدار کمزور ہوں گی تو پورا ملک

---

(۱) اخبار ''ان دنوں'' لکھنؤ اشاعت ۲۰؍نومبر ۱۹۹۸ء

کمزور ہوگا۔ اس وقت حکومت تعلیم کی راہ سے جو کچھ کرنا چاہتی ہے اور جس طرح کا نصاب ونظام مرتب کیا گیا ہے وہ صرف مسلمانوں کے لئے بلکہ پورے ملک کے لئے سنگین اور خطرناک ہے''۔

مولانا علی میاں آج دن میں ندوہ کے مہمان خانہ میں مختلف اخبارات اور ٹیلی ویژن کے نمائندوں سے گفتگو کر رہے تھے۔

سوالات کے جواب میں مولانا نے بڑی وضاحت اور وقار واعتماد سے بھرپور لہجہ میں کہا ''مسلمان'' کے لئے سب سے زیادہ اہمیت ان کے عقیدہ توحید کی ہے اور وہ اس کی حفاظت ایمان کی شرط سمجھتے ہیں، اخبار نویسوں نے مختلف طرح کے سوالات کئے، وہ وندے ماترم اور سرسوتی وندنا کے مسئلہ پر مولانا کی رائے جاننا چاہتے تھے، اس کے جواب میں مولانا نے کہا کہ ہماری مخالفت صرف عقیدہ کی بنیاد پر ہے یہ خالص دینی اور شرعی مسئلہ ہے اور حکومت جس طرح اسکولوں میں اسے نافذ کرنا چاہتی ہے وہ میرے نزدیک مداخلت فی الدّین ہے۔''

نشر واطلاعات اور صحافت کے ان نمائندوں اور نامہ نگاروں کے بیانات اور تأثرات جب اخبارات میں شائع ہوئے تو اخباری نمائندوں، صحافیوں اور مختلف صحافتی وسیاسی حلقوں کے ترجمانوں نے دارالعلوم میں ایک ہجوم کیا، کبھی دارالعلوم کا مہمان خانہ (جو راقم کی قیام گاہ ہے) بھر جاتا اور کبھی مہمان خانہ کے سامنے میدان میں جو مسجد کے بازو میں اور وہ عصر کے بعد کی نشست گاہ رہتی ہے، دور تک ان کے دورویہ نشست رہتی تھی اور وہ مختلف سوالات کرتے اور ان کے جواب ریکارڈ کرتے تھے۔

راقم جو کسی سیاسی تحریک کا علمبردار تو الگ بات ہے اس کا کوئی کارکن یا

رضا کار بھی کبھی نہیں رہا، اس کا سارا مشغلہ اور ذوق ومزاج، مطالعہ اور تصنیف یا خالص دینی دعوت اور تفہیم کا ہے یا حسب توفیق الٰہی ذکر ودعا کا، وہ اس ہنگامہ خیز فضا اور ماحول سے پریشان خاطر اور مضطرب ہوا، البتہ اس کو اس سے تسکین ومسرّت ہوتی تھی کہ شاید عرصہ کے بعد پہلی مرتبہ ہندوستان کی غیر مسلم اکثریت کے سامنے مسلمانوں کا عقیدۂ توحید اور اس کے بارہ میں ان کی حسّاسیت (SENSITIVENESS) اور غیرت سامنے آئی، اور ان کو معلوم ہوا کہ مسلمان خدا کے سوا (چاہے کوئی کتنا ہی بڑا دینی پیشوا ہو) نہ اس کے سامنے سر جھکا سکتا ہے، نہ کسی طرح اس کی بندگی کا اظہارِ خیال کر سکتا ہے، یہ حقیقت میں ایک بہت بڑا اظہارِ حقیقت اور اسلام کا صحیح اور صریح تعارف تھا، جس کی سخت ضرورت تھی اور عرصہ سے یہ حقیقت یہاں کے غیر مسلم باشندوں بلکہ تعلیم یافتہ طبقہ کے سامنے بھی نہیں آئی تھی، اور کسی راہ سے یہ حقیقت یہاں کے باشندوں کے سامنے اتنی وضاحت اور جاذب نظر وتوجہ طریقہ پر پیش کرنی بھی مشکل تھی، لکھنؤ کے مشہور ومستند شیعہ مجتہد اور فاضل وقائد مولانا کلب صادق صاحب نے جنھوں نے اس قضیہ میں راقم کی کھل کر تائید کی اپنے بیان میں کہا کہ اثنا عشری طبقہ (شیعہ) اپنے محترم ومحبوب ترین امام، نواسۂ رسولؐ حضرت حسینؓ کے سامنے بھی سر جھکانے اور ان کو سجدہ کرنے کا قائل وروادار نہیں۔

ابھی ذہنی انتشار کی یہ غیر جارحانہ فضا قائم تھی کہ اچانک ایک آسمانی بجلی گرنے کی طرح راقم کے وطن رائے بریلی کے بیرونی محلہ دائرہ حضرت شاہ علم اللہؒ میں جو شہر میں بڑی تکیہ کے نام سے مشہور ہے(۱)، راقم کے لکھنے پڑھنے کی جگہ اور

---

(۱) عام طور پر اس کو تکیہ کلاں کہا جاتا ہے اور تقریباً تین سو برس سے وہ دینی وروحانی پیشواؤں کا وطن اور اصلاحی تحریکات کا مرکز چلا آرہا ہے، یہیں تیرہویں صدی ہجری کے شہرۂ آفاق دینی وروحانی قائد ومصلح اور مجاہد حضرت سید احمد شہید (۱۲۰۱ـ۱۲۴۶ھ) پیدا ہوئے اور انھوں نے اپنی ہندگیر اصلاحی ودعوتی تحریک شروع کی، ۱۲۴۶ھ میں بالاکوٹ (صوبہ سرحد) میں جام شہادت نوش کیا، تفصیل (باقی اگلے صفحہ پر)

مہمان خانہ میں جو بنگلہ کے نام سے مشہور ہے ۲۲/۲۳ نومبر کی درمیانی شب میں ۲ بجے رات کو اچانک چھاپہ پڑا۔(۱) اچانک موٹر بنگلہ کے سامنے آ کر رکی اس سے کچھ لوگ اترے اور اچانک انہوں نے دروازہ کھٹکھٹایا، عمارت کے اندر بحیثیت ایک محافظ کے عبدالرحمٰن نامی ایک صاحب سو رہے تھے، راقم لکھنؤ میں تھا اور عزیزوں اور مہمانوں میں سے کوئی بھی اس عمارت کے اندر نہیں تھا، دروازہ کھلنے پر دو تین آدمی اندر داخل ہوئے اور انھوں نے پوری عمارت کی تلاشی لی، الماریاں بھی کھلوائیں جن میں صرف کتابیں تھیں، ان کو کوئی قابلِ اعتراض یا خلاف قانون چیز نہیں ملی، وہ بالا خانہ کے اوپر بھی گئے جو بالکل خالی تھا، وہ انگریزی میں یہ کہتے ہوئے نکلے (NOTHING-NOTHING) کچھ نہیں، کچھ نہیں اور (USELESS) بھی کہا بے فائدہ، بے فائدہ۔

راقم کو اور اہلِ تعلق کو صبح ایک عزیز کے ٹیلیفون سے اس واقعہ کی اطلاع ملی جو نہ صرف راقم اور اس کے اہلِ قرابت اور اہل تعلق کے دل پر بجلی کی طرح گری بلکہ جب اس واقعہ کی خبر اخبارات میں چھپی اور اس کی عام اطلاع ہوئی تو نہ صرف ہندوستان بلکہ قریب کے ممالک عربیہ اور اسلامیہ بالخصوص سعودی عرب اور خلیج کے علاقہ پر ایک ''صاعقہ'' بن کر گری، ہندوستان سے اور خصوصیت کے ساتھ سعودی عرب سے ایک سیلاب کی طرح ٹیلیفون آنے شروع ہوئے، جس کی اس سے پہلے کبھی کوئی مثال نہیں دیکھی تھی، اسی کے ساتھ فیکس اور خطوط کا بھی ایک تانتا بندھ گیا

بقیہ حاشیہ صفحہ گزشتہ) کے لئے ملاحظہ ہو سیرت سید احمد شہیدؒ از مصنف و سید احمد شہید از چودھری غلام رسول مہر مدیر ''انقلاب'' لاہور۔

(۱) یہ بھی عجب اتفاق ہے کہ دار العلوم ندوۃ العلماء میں اسی ۲۲/۲۳ نومبر ۱۹۹۴ء کی درمیانی شب میں چھاپہ پڑا تھا پولیس کا ایک دستہ کسی کشمیری طالب علم کی تلاش کے لئے اندر داخل بھی ہوا اس نے گولی بھی چلائی جس سے ایک دو طالب علم زخمی بھی ہوئے، تاریخوں کا یہ توارد بھی عجیب ہے۔

اور یہ ایک ایسا سلسلہ تھا کہ دارالعلوم ندوۃ العلماء کے مہمان خانہ میں جہاں راقم کا قیام رہتا ہے علمی وتحریری کاموں میں مشغول رہنا مشکل ہوگیا، ہر چند منٹ کے بعد ٹیلی فون کا رسیو ہاتھ میں لینا پڑتا تھا اور بات کرنی ہوتی تھی، ممالک عربیہ میں جہاں خاص طور سے راقم کا تعارف محض ایک مصنف، عربی کے ایک اہل قلم اور مقرر، اور دین کے ایک داعی کی حیثیت سے ہے، اس حادثہ کو بڑی تعجب کی نگاہ سے دیکھا گیا اور ہندوستان کی جمہوری اور نا مذہبی حکومت کے بارہ میں بڑا استعجاب اور تحیُّر پیدا ہوا، وہاں کے اخبارات میں بھی یہ خبر شائع ہوئی۔

جہاں تک ہندوستان کا تعلق ہے یہاں بجلی کی طرح یہ خبر کانوں اور دماغوں اور دلوں پر پڑی اور ٹیلیفون اور خطوط کے علاوہ لوگ اپنے مقامات سے سفر کر کے آنے لگے، خود کانگرس اور سیاسی جماعتوں کے رہنما اور ذمہ دار لکھنؤ ملنے آئے اور انھوں نے اس حادثہ پر تعجب و تأسف کا اظہار کیا، ان آنے والوں کی مکمل فہرست دینی مشکل ہے چند ممتاز لوگوں کے نام لکھے جاتے ہیں۔

راج ناتھ سنگھ ریاستی صدر بی۔ جے۔ پی و جنرل سکریٹری اتر پردیش بی جے۔ پی، جعفر شریف صاحب سنٹر لیڈر کانگرس و سابق وزیر ریلوے ہندوستان، سلمان خورشید صاحب صدر کانگرس اُتر پردیش، آر۔ کے۔ چودھری لیڈر بہوجن سماج پارٹی، ظفر علی نقوی صاحب ممبر اقلیتی کمیشن، ایم اے احمدی صاحب سابق چیف جسٹس سپریم کورٹ، رام نریش یادو سابق وزیر اعلیٰ یو پی۔ کلیم الدین شمس صاحب اسپیکر بنگال رام نریش اگروال وزیر توانائی، پرمود تیواری، عمار رضوی صاحب وزیر تعلیم یو پی، سید حامد صاحب (سابق وائس چانسلر مسلم یونیورسٹی علی گڑھ) کانگریسی لیڈر، اور متعدد وزرائے یو پی۔

ان ہمدردی کرنے والوں اور اپنے تأثر و تأسف کا اظہار کرنے والوں

میں سونیا گاندھی صدر کانگریس کے تأثر اور اظہار تأسف کو خاص اہمیت حاصل ہے، جنھوں نے جناب نرائن دت تیواری جی کو جو یوپی کے کئی بار وزیر اعلیٰ رہے اپنے خط کے ساتھ راقم کے پاس لکھنؤ بھیجا اور وہ بڑے احترام و تأثر کے ساتھ ملے، یہاں ایک تاریخی یادگار اور شرافت نفس و خاندان کے نمونہ کے طور پر اس خط کا ترجمہ پیش کیا جاتا ہے۔

اکھل بھارتیہ کانگریس کمیٹی سونیا گاندھی صدر

۲۴-اکبر روڈ نئی دہلی، ۲۷/نومبر ۱۹۹۸ء

عزّت مآب محترم علی میاں صاحب

مجھے یہ جان کر حیرت اور دکھ ہوا کہ آپ کی رائے بریلی کی رہائش گاہ پر کئی نامعلوم لوگوں نے بغیر اجازت زبردستی گھس کر تلاشی کی جیسی غیر قانونی حرکت کی، اور اس طرح خلاف معمول کام کیا۔

مجھے تکلیف ہے کہ آپ جیسے دنیا بھر میں مانے جانے والے عالم کو بھی آپ کے حالات میں اس طرح پریشان کرنے کی کوشش ہورہی ہے۔ خبروں میں یہ بھی کہا گیا ہے کہ اس غیر قانونی کارروائی میں کسی سرکاری عملہ کا ہاتھ ہے۔

اس ضمن میں میں اپنے سینئر معاون جناب نارائن دت تیواری کو خاص طور پر آپ کے پاس بھیج رہی ہوں کہ وہ میری طرف سے آپ سے خود مل کر حالات کا جائزہ لیں اور ہمیں مطلع کریں۔

آپ کو معلوم ہے کہ ہمارا خاندان شروع سے ہی کس عزّت کی نگاہ سے آپ کی شخصیت کا احترام کرتا رہا ہے اور وہ اس سلسلہ کو قائم رکھے ہوئے ہے، آپ کی صحت اور سارے سماج کے لئے

آپ کی طویل عمر کی دعائیں مانگتی ہوں۔

سونیا گاندھی

جہاں تک عمومی ناپسندیدگی اور احتجاج کا تعلق ہے، پہلی مرتبہ رائے بریلی شہر میں ایسی مکمل ہڑتال ہوئی جس کی نظیر ماضی کی تاریخ میں دور تک نظر نہیں آتی، ہندو اور مسلمانوں کی (۱۰۰) سو فیصدی دوکانیں بند رہیں، یہاں تک کہ کوئی پان کی دوکان بھی کھلی نہیں رہی، اس عمومی ہڑتال کو کامیاب بنانے میں اکھلیش سنگھ جی کا بھی بڑا حصہ ہے، جن کو شہر کے مختلف طبقوں سے تعلق ہے، ہندوؤں کی دوکانیں بند ہونے میں ان کی کوششوں کا خاص حصہ ہے، وہ لکھنؤ آکر راقم سے ملے بھی اور اس واقعہ پر بڑے افسوس اور استعجاب کا اظہار کیا۔

لکھنؤ میں محدود پیمانے پر ہڑتال ہوئی اور شہر کے بعض علاقوں میں نمایاں طریقہ پر ہڑتال ہوئی۔

یو پی حکومت نے اس واقعہ پر جس میں بڑے پیمانہ پر احتجاج و استعجاب سامنے آیا ایک کمیٹی تشکیل کرنے کا اعلان کیا جو دس دن میں اس کی تحقیق کرے گی اور حکومت کو رپورٹ پیش کرے گی، ان سطور کی تحریر کے وقت تک اس کا نتیجہ سامنے نہیں آیا اور نہ حکومت کی طرف سے تلافی کا کوئی اقدام ہوا۔

آرڈر کی منسوخی اور وزیر تعلیم کی برطرفی

''وندے ماترم اور سرسوتی وندنا کے خلاف احتجاج کے نتیجہ میں جس میں مسلمانوں کے سارے حلقے شریک ہوئے اور مولانا مدظلّہ کے بیان کے ہر حلقہ سے تائید ہوئی، وزیر اعظم اٹل بہاری واجپئی اور وزیر داخلہ لال کرشن اڈوانی نے بیان دیا کہ یہ سب کے لئے لازمی نہیں ہے، وزیر داخلہ اڈوانی نے بھی کہا کہ وہ

یوپی کی حکومت سے رابطہ قائم کررہے ہیں، بعد میں ان لیڈروں نے بیان دیا کہ ایسا کوئی آرڈر نہیں دیا گیا ہے۔ یوپی کے وزیراعلیٰ کلیان سنگھ بھی یہی کہتے رہے کہ ایسا آرڈر نہیں دیا گیا۔

بعد میں تحقیق سے معلوم ہوا کہ وزیر برائے پرائمری تعلیم رویندر شکلا نے ایسا آرڈر بھیجا ہے، بعض ممبران پارلیمنٹ نے اس کی کاپی بھی دکھائی جس سے وزیراعظم اور وزیر داخلہ اور یوپی کے وزیراعلیٰ کلیان سنگھ پر غلط بیانی کا الزام عائد ہوتا تھا۔

آخر کار حکومت نے تسلیم کرلیا کہ ایسا آرڈر وزیر تعلیم نے بھیجا ہے، جس کو کلپ یوجنا کا نام دیا گیا ہے۔

۳ر دسمبر ۱۹۹۸ء کو حکومت یوپی نے اس آرڈر کو جس کا وہ انکار کرتی رہی ہے، کینسل کرنے کے آرڈرس جاری کئے۔

ہندوستان ٹائمس کے مطابق حکومت یوپی نے ''کلپ یوجنا'' جس میں وندے ماترم اور سرسوتی وندنا کے احکام تھے، سے متعلق سارے احکامات منسوخ کردیئے، اس سے یہ بات ثابت ہوگئی کہ حکومت نے اس قسم کے احکامات جاری کئے تھے، سرکاری حلقوں نے یہ وضاحت کی کہ یہ احکام صحیح سطح سے جاری نہیں کئے گئے تھے، ان حلقوں نے کہا کہ صوبائی حکومت مرکزی حکومت کی پالیسی کی پابندی کرے گی۔

اخبار نے مزید لکھا ہے کہ وزیراعظم نے اس سلسلہ میں وضاحت طلب کی تھی، کلیان سنگھ نے وزیر تعلیم سے وضاحت طلب کی، انھوں نے جواب دیا کہ اس موضوع پر اسمبلی میں بحث ہوچکی ہے، اور وہ آرڈر جو انھوں نے جاری کیا تھا دکھایا کہ وزیر توانائی رام نریش اگروال نے جو لوک تانترک کانگرس کے صدر ہیں اور حضرت مولانا سے کئی بار مل کر اس پروگرام سے اپنی بے تعلقی کا اظہار کرچکے ہیں، کابینہ میں سوال اُٹھایا کہ کابینہ کی منظوری کے بغیر یہ آرڈر کیسے جاری کیا گیا، کابینہ میں

کافی بحث مباحثہ کے بعد یہ آرڈر منسوخ کر دینے کا فیصلہ کیا گیا۔(۱)

دوسرے دن وزیر اعلیٰ نے غلط بیانی کے الزام میں وزیر برائے پرائمری تعلیم رونددر شکلا کوان کے عہدہ سے برطرف کر دیا، اس کے ساتھ ساتھ اس وزارت کے سکریٹری آر۔ ایس دویدی کا بھی ٹرانسفر کر دیا۔

وزیر موصوف پر حکومت کے ایک پریس نشریہ میں الزام لگایا گیا کہ انھوں نے کابینہ کی منظوری کے بغیر یہ احکام جاری کئے، اور وزیر اعلیٰ کو اس سلسلہ میں غلط اطلاعات دیں، جس کی وجہ سے پورے ملک میں سنسنی پھیل گئی۔(۲)

ملاقاتیں

۴؍دسمبر ۱۹۹۸ء کو رائے بریلی پہنچنے پر مختلف سیاسی حلقوں کے نمائندوں کی آمد کا سلسلہ شروع ہو گیا، سب سے پہلے کانگریس کے لیڈر اکھلیش سنگھ ایم۔ ایل۔ اے اور سماج وادی پارٹی کے لیڈر ڈاکٹر محمد مسلم ایم۔ ایل۔ اے اپنے رفقاء کے ساتھ ملنے آئے۔

۵؍دسمبر ۱۹۹۸ء کو (A.D.M.) اور (S.P.) رائے بریلی ملنے آئے اور واقعہ پر افسوس کا اظہار کیا، رائے بریلی شہر کے مسلم اور غیر مسلم سیاسی کارکنوں کی بڑی تعداد دن کے مختلف حصّوں میں ملاقات اور ہمدردی کے اظہار کے لئے آتی رہی۔

شام کو ساڑھے ۶ بجے لوک تانترک کانگریس کے صدر اور وزیر توانائی صوبہ یوپی رام نریش اگروال اپنی پارٹی کے دوسرے ارکان کے ساتھ ملنے آئے اور اس سلسلہ میں انھوں نے جو رول ادا کیا اس کا ذکر کیا۔

سیاسی پارٹیوں کے نمائندوں کے علاوہ اخباری نمائندوں کی آمد ورفت

---

(۱) ہندوستان ٹائمس ۴؍دسمبر ۱۹۹۸ء

(۲) ٹائمس آف انڈیا ۵؍دسمبر ۱۹۹۸ء

کا سلسلہ قائم ہے، حکومت کے اقدامات پر تأثر جاننے کے لئے ٹائمس آف انڈیا، ہندوستان ٹائمس، راشٹریہ سہارا کے نمائندوں نے ملاقاتیں کیں ۶ر دسمبر ۱۹۹۸ء کے اقدامات نے پہلے صفحہ پر ان رپورٹوں کو نمایاں طریقہ سے شائع کیا۔(۱)



(۱) از قلم مولوی سید واضح رشید ندوی استاذ دار العلوم ندوۃ العلماء و مدیر "الرائد" عربی

رابطہ العالم الاسلامی کا قیام

اور مجلس تاسیسی کی رکنیت

۱۹۶۰ء عرب ممالک کے لئے بڑی آزمائش کا زمانہ تھا، جیسا کہ اوپر عرض کیا گیا، کیونزم بے نقاب ہوکر عرب سرزمین پر اپنا پارٹ ادا کر رہا تھا، بحر محیط سے خلیج عرب کی آخری ریاست تک (من المحیط الی الخلیج) عرب ازم کا نعرہ تھا، اور صوت العرب کی حکومت، مصر اور شام کا گٹھ جوڑ تو چلا آرہا تھا، اَب یمن بھی (جس کے بادشاہ عبدالحمید تھے) جمہوریت عربیہ کا ایک رکن ہوگیا تھا، مصر، شام اور یمن کو ایک وفاقی سلطنت قرار دیا گیا تھا۔

اس وقت سعودی عرب نے بر وقت قدم اٹھایا اور اسلام کے نام پر ایک بین الاقوامی منبر قائم کردیا، جس کا نام رابطہ عالم اسلامی (مسلم ورلڈ لیگ) تجویز ہوا، اس کا پہلا جلسہ جس کی صدارت مرحوم شاہ سعود بن عبدالعزیز نے خود کی ۱۸؍ذی الحجہ ۱۳۸۱ھ کو مکہ مکرمہ میں منعقد ہوا۔

حسن اتفاق سے مولانا اس وقت مکہ مکرمہ میں موجود تھے، مدینہ منورہ کی اسلامی یونیورسٹی (الجامعۃ الاسلامیہ) کے قیام کو ایک سال ہوا تھا، جس کے رکن اساسی مولانا منتخب ہو چکے تھے، اس کا جلسہ ذی الحجہ میں حج کے بعد ۲۲؍ذی الحجہ کو ہونے

والا تھا، اس میں شرکت کے لئے آخری ذی القعدہ میں وہاں پہنچ چکے تھے، حج کے بعد آپ کا قیام مکہ مکرمہ میں ہی تھا، کہ رابطہ عالم اسلامی کے قیام کی تجویز پر عمل شروع ہوگیا، اس کے پہلے سکریٹری جنرل شیخ محمد سرور الصبان مقرر ہوئے جو پہلے وزیر مالیات رہ چکے تھے، اوران کا تعلق عوام سے براہ راست تھا، شیخ محمد سرور الصبا ن کے معتمد علیہ رفیق کار شیخ محمد صالح قزازؒ نے مولانا کو دعوت دی۔

بعد میں معلوم ہوا یہ سب پلان پہلے سے بن چکا تھا اورارا کین اساسی کے نام بھی طے پا چکے تھے، اس کے نمائندے فلپائن، سنگاپور، ملیشیا، ہندوستان، پاکستان، عراق، مصر، اردن، الجزائر، اور مراکش سے ایسے افراد لئے گئے تھے جو اپنی دینی و علمی حیثیت سے اپنے ملکوں میں اپنے عہدوں کے اعتبار سے یا اپنی شخصیت کے بناء پر ممتاز تھے، چند شخصیتیں ایسی تھیں جو نہ صرف اپنے ملک میں بلکہ عالم اسلام میں اپنا وزن رکھتی تھیں ان میں ہندوستان سے مولانا سید ابوالحسن علی ندوی مدظلہ اور پاکستان سے مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ تھے، اس کے ارا کین میں اضافے ہوتے رہے تاکہ ہر ملک کی نمائندگی ہو، اس بین الاقوامی ادارہ کا تعلق حکومتوں سے نہیں تھا، منجملہ سعودی عرب کے تمام ممبروں کا انتخاب ان کی ذاتی خصوصیات کی بناء پر ہوا تھا، یہ اور بات ہے کہ ان شخصیات میں سے بعض ایسے بھی تھے جو اپنے ملک میں کسی عہدے پر فائز بھی تھے۔

رابطہ کے قیام کے بعد کاتب الحروف سعودی ریڈیو سے مستعفی ہوکر رابطہ کے سکریٹریٹ میں اسکے کئی شعبوں کا انچارج تھا، اس لئے رابطہ اور مولانا کے درمیان واسطہ بھی تھا۔

مولانا کو یہ خیال ہوا کہ ہندوستان اتنا بڑا ملک ہے کہ بہت سے نمائندوں کے ملک اس کے ایک ضلع کے برابر ہیں، اورآپ کا مزاج بھی یہی ہے کہ وہ تنہا کسی کام

کا سہرا اپنے سر نہیں باندھنا چاہتے جیسا کہ اس کتاب کے ابتدائی صفحات میں بیان کیا جاچکا ہے، مولانا نے شیخ سرور صبیان سے اس خواہش کا اظہار کیا کہ ہندوستان سے مزید ایک ممبر لیا جائے، اسی عرصہ میں ایک بزرگ نے شیخ محمد سرور کو لکھا کہ ہندوستان اتنا بڑا ملک ہے اس کی دینی جذبات لاتعداد ہیں، اور اس میں ایسے ایسے اکابر پیدا ہوئے، اس کی نمائندگی رابطہ میں نہیں ہے، ان بزرگ نے مولانا سید ابوالحسن علی ندوی کو نظر انداز اس طرح کیا کہ ان کی نمائندگی گویا ہندوستان کی نمائندگی ہی نہیں ہے، یہ خط شیخ نے مولانا کو بھیج دیا، اور مولانا کی رائے دریافت فرمائی، اس زمانے میں مولانا محمد منظور نعمانیؒ ایک ساتھ ہی رہتے تھے، اور ایک دوسرے کے "رفیق محترم" تھے، اور ہر معاملہ میں آپس میں مشورہ بھی کرتے تھے، رابطہ سے جس خط کی نقل آئی وہ مولانا منظور نعمانی نے بھی دیکھی ان کو یہ بات بری لگی، مولانا نے تو ایک حرف بھی زبان سے نہیں نکالا، البتہ مولانا نعمانیؒ نے براہ راست مجھ سے فرمایا (جب کہ ہندوستان آیا ہوا تھا) ان صاحب کے لئے تو میری ہرگز رائے نہیں ہے جب کہ راقم مکہ مکرمہ اپنے کام پر یہ عاجز واپس گیا تو شیخ نے پوچھا کہ شیخ ابوالحسن سے دریافت کرو کہ اگر کسی دوسرے ممبر کو ہندوستان سے لیا جائے تو وہ کون ہو؟ میں نے حضرت مولانا کی خدمت میں شیخ کا پیام پہنچادیا، مولانا نے جواب دیا جو ابھی میرے کاغذات میں موجود ہے، اس میں تحریر فرمایا کہ حسب ذیل اسماء میں سے کسی کو منتخب کیا جائے۔ مولانا قاری طیب صاحب مولانا حبیب الرحمٰن اعظمی، مولانا منت اللہ رحمانی، مولانا منظور نعمانی، یہ تمام حضرات دیو بند کے مدرسہ فکر کے قائدین میں ہیں، مولانا نے کسی ندوی عالم کا نام نہیں لیا، حالانکہ اس وقت مولانا عبدالسلام قدوائی ندوی، مولانا شاہ معین الدین ندوی، مولانا محمد اویس ندوی، اور مولانا ابواللیث ندوی بھی اس منصب کے بجا طور پر مستحق ہوسکتے تھے، مگر مولانا کی وسعت قلبی اور اکابر دیو بند کا احترام جو محفوظ رکھتے تھے اس لئے

ہندوستان سے دوسرا رکن مولانا چاہتے تھے کہ مدرسہ دیو بند کا ہو رابطہ کے قیام کے کئی سال بعد کی بات ہے، میں نے کہا کہ مولانا سے دریافت کر کے بتاؤں گا، اتفاق سے میں جب لندن میں تھا اور اسی زمانہ میں حضرت مولانا کا قیام اس بلڈنگ کے ایک کمرہ میں ہوا جس کے ایک کمرہ میں میں کرایہ دار تھا، مولانا سے میں نے دریافت کیا کہ ہندوستان سے کس کو ترجیح دیتے ہیں، رابطہ کے سربراہ چاہتے ہیں کہ دوسرا شخص وہ ہو جو آپ کا ہم خیال ہو۔ مولانا محمد منظور نعمانی کے متعلق آپ کی کیا رائے ہے وہ مناسب ہوں گے؟ کیونکہ مولانا نے فرمایا ان کی اصابت رائے، اخلاص کا میں قائل اور معترف ہوں، جب میں مکہ مکرمہ واپس آیا تو شیخ محمد سرور الصبان نے پھر یہ سوال کیا کہ شیخ ابوالحسن سے قریب تر شخص کون ہے؟ میں نے عرض کیا کہ مولانا محمد منظور نعمانی، مولانا کے رفیق کار، دوست اور ہر دینی کام میں شریک رہتے ہیں، اور ایک دوسرے کا احترام بھی ملحوظ رکھتے ہیں، شیخ نے کہا تو پھر وہی مناسب ہوں گے، اس طرح مولانا منظور نعمانی کا نام منتخب ہو گیا، اس پر جماعت اسلامی کے حلقہ سے طنز و تشنیع اور دوست نوازی کا الزام بھی لگایا گیا اور ابھی حلقوں میں یہ آواز اٹھی کہ "مولانا علی میاں" نے دوست نوازی کی ملّت اسلام کی نمائندگی نہیں کی (۱) لیکن جو حقیقت حال تھی وہ بے کم وکاست اوپر ذکر کر دی۔

رابطہ کے تمام ممبروں کے درمیان، سعودی عرب کے مشائخ کبار میں شیخ محمد بن ابراہیم شیخ عبدالملک بن ابراہیم اور شیخ بن باز کو مستثنیٰ کرتے ہوئے مولانا کا مقام سب سے بلند اور ممتاز رہا اور یہ بات صرف ابتدائی دور کی نہیں بلکہ ہر دور میں یہ بات دیکھنے میں آئی، رابطہ کے سالانہ اجلاس میں پہلے روز گورنر مکہ افتتاح کے لئے آتے ہیں اگر وہ نہ آئے تو نائب گورنر جو کوئی شہزادہ ہی ہوتا ہے،

---

(۱) قومی آواز کے ایک شمارہ میں جلی سرخی سے یہ کہا گیا تھا۔

شیخ بن باز جو دم تحریر راہی جنت ہو چکے ہیں جب کہ زندہ رہے رابطہ کی مجلس تاسیس کے صدر ہوا کرتے تھے، کوئی خصوصی مہمان جیسے مالدیپ کے صدر مامون صاحب، ڈائس پر بٹھائے جاتے تھے، اور اگر مولانا شریک ہوئے تو آپ کو بھی ڈائس پر جگہ دی جاتی، اور آپ کی موجودگی میں ''کلمة الوفود''یعنی ممبروں کی نمائندگی کا خطاب آپ ہی کے ذمہ ہوتا۔

ایک سال جس زمانہ میں شیخ محمد صالح نے مجھ سے رابطہ کے ذمہ داروں کے سامنے فرمایا، واللہ شیخ ابوالحسن کے نہ آنے کی وجہ سے اجلاس پھیکا (لا یملأ العیون) معلوم ہوتا ہے، وہ ہوتے تو جلسہ میں وقار اور نورانیت محسوس ہوتی ہے۔

ابھی دو سال پہلے کی بات ہے کہ علامہ شیخ محمد ناصر العبودی نے فرمایا کہ ''کوئی حرج نہیں ہے شیخ ابوالحسن پہلے جلسہ میں نہ آسکے، دوسرے روز تیسرے روز آجائیں، ان کا ایک گھنٹہ کے لئے ہی شرکت کرنا رابطہ کی معنویت میں اضافہ کرتا ہے، یہ رابطہ کے لئے مکسب (Gain) ہے کہ شیخ ابوالحسن تھوڑی دیر ہی کے لئے آجائیں۔''



رابطہ ادب اسلامی

اس نام سے ایک ادبی تحریک عالم اسلام میں قائم ہے، اور صرف اردو اور عربی زبان تک اس کا حلقہ محدود نہیں ہے، عربی کے علاوہ ترکی اور بنگالی زبانوں میں بھی اس تحریک کو عام کرنے کی کاوش جاری ہے، عرب میں اس تحریک کا مرکزی دفتر ریاض میں ہے، برصغیر میں ندوۃ العلماء نے یہ ذمہ داری قبول کی ہے اس کی تاریخ اور اس کے قیام کے محرکات مختصراً بیان کرنے سے پہلے یہ واضح کرنا چاہتے ہیں کہ ادب اسلامی ہے کیا؟ اور اس کی سرپرستی میر کارواں مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندوی رحمۃ اللہ علیہ نے کیونکر قبول فرمائی۔

"ادب" کا لفظ سنتے ہی آپ کے ذہن میں نظم و نثر کا وہ ڈھانچہ سامنے آجاتا ہے جو عوامی زبان، روز مرہ کی گفتگو، اور جو بلا تصنع باتوں سے علاحدہ ہو، نثر میں جس کے فقرے چست ہوں، ضلع جگت ہو، سیدھی سادی بات کو عام گفتگو کی سطح سے بلند کر کے پیش کیا گیا ہو۔

عربی زبان و ادب کی تاریخ پر ایک نظر ڈالئے تو معلوم ہوگا کہ اسلام سے پہلے اور اسلامی سلطنت کے قائم ہونے کے ڈیڑھ سو سال تک سوائے شعر کے نثر میں ادب کی کوئی قسم نہیں تھی، قرآن کریم ہی ایک اعلیٰ ترین نمونہ تھا اور جو آج تک ہے جس

کے آگے تمام ادباء نے سرخم کردئے تھے، اسلامی عصر کے خاتمہ اور عصر عباسی کی ابتداء سے نثر عربی کے متفرق نمونے سامنے آتے رہے، ''نهج البلاغه'' اور ''الكامل'' للمبرد میں بے شک نثری ادب کے نمونے ملتے ہیں، قطع نظر اس سے کہ وہ نثری نمونے الحاقی ہیں یا مصنوعی ہیں یا ان حضرات کا کلام ہے جن کی طرف ان کی نسبت کی جاتی ہے، بہر نوع وہ ادبی شہ پارے ضرور ہیں جو زور کلام کے نمونے ہیں، جن کے الفاظ وتراکیب وہ نہیں ہیں جو انسان اپنی روزمرہ میں استعمال کرتا ہے ان میں غریب الفاظ اور پیچیدہ ترکیبیں زیادہ ہیں، ان میں خطابت کا زور ہے، صنائع و بدائع کی کثرت ہے، جو زندگی کے فطری بہاؤ کی نمائندگی نہیں کرتے، احادیث نبویہ میں بے شک وہ نثر ہے جو فطری بہاؤ پر قائم ہے، اور جو بلا تصنع انسان استعمال کرتا ہے اور ان کو آپ ادب کہہ سکتے ہیں مگر اس وقت سے آج تک ادب کا نام اسی طرح کی نثر کو دیا گیا جس میں لکھنے والے کی طباعی، حاضر جوابی، طبیعت کی آمد یا آورد سے سجایا گیا ہے۔

۱۹۳۹ء میں حضرت فقیدالامہ مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندوی رحمۃ اللہ علیہ نے قرآن کریم کی آیات، صحابہ کرام کے خطبات، بشمول نہج البلاغہ اور احادیث نبویہ کے وہ حصے جن میں کسی واقعہ کی تفصیل ہے اور جس میں روزمرہ کی بات، بلا تصنع بات آئے دن کی بات قلمبند کی گئی ہیں جن کو ادب میں نہیں شمار کیا جاتا تھا ان کو مولاناؒ نے جمع کیا۔ اور اس کے بعد دوسرے اصناف ادب کے نمونے جو اخلاقی تربیت میں معاون ہوں ان کو یکجا کیا، جیسا کہ ''مختارات'' کے تعارف میں راقم نے تفصیل سے ذکر کیا ہے کہ ان کی قدردانی سب سے پہلے عربی زبان کے ماہرین فن نے کی، نصاب تعلیم بنانے والی کمیٹیوں نے اس کو سراہا، اور عرب علماء فطرتاً انصاف پسند اور دوسروں کی کاوشوں کی قدر کرنے والے ہیں، علاقائی یا مدرسائی تعصب (مدرسوں کے مابین جو

تعصب اور اپنے آپ کو سب سے اونچا اور بڑا دکھانے کا جذبہ ہوتا ہے اس کے لئے
میں نے "مدرسائی" کا لفظ استعمال کیا ہے) سے وہ بہت بلند ہیں، انھوں نے اس کی
پذیرائی کی اور سیکڑوں قسم کے منتخبات ومختارات کے درمیان اس کو ترجیح دی۔ غرض
مولانا کی مختارات نے فکر کی ایک راہ کھول دی اور ادبی نظریہ کے طور پر اس کو تسلیم
کیا۔ یہ کتاب مصر وحجاز اور کویت میں ستر ہزار کی تعداد میں شائع ہوئی اور اب تک
چھپتی رہتی ہے۔

اس طرح ادب اسلامی کا ایک نیا تصور عربی میں سامنے آیا۔ لیکن قرآن و
حدیث کو ادب کا معیار بنا کر ادب کو اسلامی رنگ دینے کی یہ کوئی نئی کوشش نہیں تھی
دوسری جامعات کے اساتذہ نے بھی یہ سعی کی کہ ادب کو ایسے تصورات دیئے جائیں جو
دینی واخلاقی روح پیدا کرنے میں معاون ہوں، چنانچہ ۱۹۵۸ء میں ملک عبدالعزیز
یونیورسٹی میں ایک ادبی مذاکرہ ہوا تھا۔ مگر اس فکر کو غذا دینے والوں نے زیادہ دلچسپی
نہیں لی۔ اور بعد میں یہ رجحان ختم ہو گیا، اور کچھ لوگ "قومیت عربیہ" کی فکر کو
غالب کرنے کی فکر میں لگ گئے، اور نبطی شاعری کو ترقی دینے اور زندہ کرنے میں
ان کی مساعی بڑھ گئیں، مقامی ریڈیو نے ایسے مجالس شعریہ (مشاعرے) کی ہمت
افزائی کی۔

حضرت مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندوی رحمۃ اللہ علیہ کے پیش نظر جو تصور
تھا وہ مذکورہ فکر کے حاملین سے مختلف بھی تھا اور بلند بھی، وہ ادب صرف ان تحریروں اور
خطبات وقصص کو نہیں سمجھتے تھے جن کو عام طور سے ادب کا نام دیا گیا ہے یا جن پر
ادب کا ٹھپہ لگا ہے، ان کی نظر میں قرآن کریم اور احادیث نبویہ کے بعد جو ادب کے
نمونے تھے، وہ سلف کی کتابوں، ملفوظات اور اصلاحی مکاتیب میں زیادہ ملتے ہیں
نہ کہ صرف وہ کتابیں یا ایسی تحریریں جن پر ادب کی مہر لگی ہو اور جن کو عام طور پر ادب

کہا جاتا ہے، جو ادب عالیہ کی نمائندہ نہیں ہیں، وہ فن بلاغت اور صنائع و بدائع کا نمونہ ضرور ہیں مگر زندگی سے ہم آہنگ نہیں ہیں۔

مختارات لکھنے کے بعد مولانا نے ابتدائی درجات کے لئے قصص النبیین اور القرأۃ الراشدۃ بھی تین، تین جلدوں میں مرتب کی، اس کا باعث یہ تھا کہ ندوہ جو اصلاح نصاب کا داعی اور قدیم وجدید کا سنگم ہے، دین کی قدروں کا محافظ اور علوم حاضرہ سے استفادہ کا قائل ہے، یہاں بھی مصر کی ریڈریں پڑھائی جاتی تھیں جس میں زبان آموزی کی صلاحیت ضرور تھی مگر اس کے مضامین ایسے تھے جن سے نہ دینی شعور پختہ ہوتا نہ قرآن وحدیث سے مناسبت ہوتی، اور نہ برصغیر کے بچوں کو اپنے وطن سے کچھ مناسبت ہوتی جیسے ''الاھرام'' ''ابوالہول'' پر مضامین، دریائے نیل میں پانی کی سطح کا بلند ہونا وغیرہ وغیرہ، مولانا کو اس کا احساس ہوا اور انھوں نے دینی مذاق پیدا کرنے والے اور ہندوستان میں مسلمانوں کی تاریخ کے روشن پہلو سے آگاہ کرنے کے لئے بچوں کے لئے یہ سلسلہ لکھا، جو اپنے مقاصد میں سو فیصد کامیاب ہوا، مگر مختارات سے اس کا مقصد جدا تھا، مختارات ایک فکری سنگ میل ثابت ہوا جس کو لوگ ادب نہیں سمجھتے تھے اس کو ادب بتایا گیا، اور ادب کی اجارہ داری، صرف افسانوں، کہانیوں، کہاوتوں، نظم ونثر کے مرصع مجموعوں تک محدود نہیں رہی بلکہ ادب میں ایسے عناصر جمع کر دئے گئے جس سے اس کے بولنے والے جن کی مادری زبان عربی تھی ان کا لب ولہجہ محفوظ ہو گیا اس طرح یہ بات کہ جس زمانہ میں رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت ہوئی اس وقت لوگ کس طرح باتیں کرتے تھے، محاورات بلاتکلف کس طرح استعمال کرتے تھے، ایک کی بات کاٹ کر اگر کوئی اپنی بات کہنا چاہتا تو کیا پیرایہ اختیار کرتا، کسی بات کو زور دے کر کہنا چاہتا تو کس طرح مافی الضمیر ادا کرتا۔

مختارات کا امتیاز اس بلت سے نمایاں ہوا، چنانچہ جیسا کہ اوپر گذرا نجد کے ایک سر برآوردہ

ادیب وصاحب قلم استاذ عبد العزیز الرفاعی نے حضرت کعب بن مالکؓ پر جو کتابچہ لکھا اس میں صراحت کے ساتھ لکھا ہے کہ مجھے حضرت کعبؓ کے متعلق سب معلوم تھا مگر یہ نہیں معلوم تھا کہ حضرت کعبؓ ادیب بھی تھے اور ان کا بیان کردہ واقعہ ایک ادب پارہ ہے خدا بھلا کرے ہندوستان کے شیخ ابوالحسن علی ندوی کا جنھوں نے ہماری آنکھیں کھول دیں۔

مختارات تو ۱۹۳۹ء-۱۹۴۰ء میں مکمل ہو کر چھپی مگر سالہا سال گوشۂ گمنامی میں اور صرف ندوہ کے احاطہ میں محفوظ رہی، پھر وقت آیا کہ دنیا نے اس کی قدر کی۔ اور وہ کتاب ایک تحریک کی بنیاد بن گئی، کثرت سے اہل علم کے خطوط آنے لگے، اخبارات میں تبصروں کے کالموں میں اس کا ذکر آنے لگا، اور اس کے ساتھ قصص النبیین اور القرأۃ الراشدہ کی قدر بڑھی کہ سید قطب شہیدؒ نے یہاں تک لکھ دیا کہ دینی مقصد کو سامنے رکھتے ہوئے میں نے بھی اس طرح کی ریڈریں لکھی ہیں اور میرے ساتھیوں نے بھی کوئی کوتاہی نہیں کی ہے مگر ہندوستان میں ایک عربی النسل صاحب قلم شیخ ابوالحسن نے جو سلسلہ مرتب کیا ہے وہ سب پر فائق ہے۔ اس تحریر پر بھی کئی سال گذر گئے۔

مولانا کو یہ خیال ہوا کہ ادب اسلامی کے اس رخ کو جس کا نمائندہ حدیث نبوی ہے، اور خلفائے راشدین کے خطبات میں ان کو مقبول بنانے کی دعوت دی جائے، چنانچہ ندوہ کے احاطہ میں حجاز ومصر اور فلسطین کے ادباء کو ایک اجتماع کی دعوت دی گئی، دعوت نامہ مولانا کی طرف سے بھیجا گیا، حضرت مولانا کی مقبولیت عام ہو چکی تھی، ان کی طرف سے بھیجی ہوئی دعوت پر مصر، شام، خلیج عرب، اور سعودی عرب کے نامور ادباء نے دعوت قبول کی اور ۱۹۸۱ء میں اپریل کی ۱۷ر سے ۱۹ر تک ایک اجتماع ہوا، جس میں نجد کے سربرآوردہ ادیب اور صاحب قلم شیخ عبد العزیز الرفاعی، جامعہ ازہر کے متعدد اساتذہ، جدہ کے کنگ عبد العزیز کے

متعدد اساتذہ نے شرکت کی، یہ اجتماع اس درجہ کامیاب رہا کہ اس میں پڑھے جانے والے مقالات کو مصنفین نے کتابی شکل میں شائع کیا، ڈاکٹر محمود زینی، اور استاذ الاساتذہ علامہ عبدالرحمٰن حسن حبنکہ میدانی (شام) نے اپنے اپنے مضمون کتابی شکل میں شائع کئے جو اس اجتماع کی یادگار ہیں۔ قاعدہ ہے کہ جب کوئی کانفرنس ہوتی ہے تو کام ختم نہیں کیا جاتا بلکہ اس کو جاری رکھنے کے لئے ایک کمیٹی بنادی جاتی ہے جو اس کام کو باقی رکھے۔ اسی طرح کی ایک کمیٹی بن گئی، مگر مولانا کا مزاج انجمن سازی اور تحریک چلانے کا نہیں تھا، وہ کام کرنا جانتے تھے، فکر رسا کی دولت انھیں حاصل تھی، مگر تحریک چلانا ان کے مزاج سے ہم آہنگ نہ تھا، اس لئے اس کانفرنس سے ندوہ کو فائدہ ضرور ہوا، اس کی شہرت بڑھی، ہندوپاک اور عرب کے اساتذۂ فن نے ندوہ کو آکر دیکھا، یہاں کی پرسکون علمی وروحانی فضا سے متاثر ہوئے مگر بعد میں اس کو بڑھانے اور تحریک بنانے کا کام نہیں ہوا۔

اس اجتماع کے دوسال بعد ۱۹۸۴ء میں ریاض کی کنگ سعود (ریاض یونیورسٹی) یونیورسٹی کے چند مقتدر اساتذۂ ادب عربی نے اس کو تحریک کی شکل میں لانے کا منصوبہ بنایا، استاذ محمد قطب (سید قطب کے بڑے بھائی) اور صاحب قلم ادیب استاذ احمد عبدالعزیز الرفاعی کے مشورہ سے اس کی سرپرستی کے لئے مولانا کا نام منتخب کیا، اور اس زمانہ میں رابطہ عالم اسلامی کا اجلاس ہورہا تھا جس کے لئے حضرت مولانا مکہ مکرمہ میں مقیم تھے مصر وشام کے اساتذہ نے وفد کی شکل میں حضرت مولانا کی قیام گاہ پر آکر یہ تجویز پیش کی کہ مولانا اس کی صدارت قبول فرمائیں، مولانا نے اس کو منظور فرمایا، کیونکہ موضوع سے ان کو قلبی وذہنی وابستگی تھی، عرب ممالک میں انجمن سازی ممنوع ہے اور اجتماعی کام بغیر حکومت کی خاص اجازت کے نہیں ہوسکتا، اس لئے عربی شعبہ ریاض میں پرائیوٹ طور پر قائم ہوا، حضرت مولانا نے اس کا اردو شعبہ ہندوستان میں قائم کیا، اور

اپنے بھانجے مولانا سید محمد رابع حسنی ندوی موجودہ ناظم ندوۃ العلماء کو اس کی ذمہ داری سونپ دی۔ وہ سکریٹری کی حیثیت سے اس کام میں مشغول ہو گئے، اور پہلا اجلاس ندوہ میں ہوا، پھر ہندوستان کے دوسرے صوبوں میں اس کے اجتماع ہونے لگے، اور سلسلہ چل پڑا، سعودی عرب کے سربرآوردہ افراد نے ایسی اور تحریک کے لئے مالی پیشکش بھی کی مگر حکومت سے اجازت حاصل کرنا دشوار تھا۔ حضرت کی وفات سے ایک سال پہلے یہ مرحلہ بھی طے ہوا ڈاکٹر عبدالقدوس ابو صالح جو اس خدمت کو انجام دے رہے تھے اور جو اب اس کے صدر ہیں انھوں نے تحریکی شکل میں اس کو ایک انجمن بنایا اور اس کی مجلس عاملہ کا اجلاس مدینہ منورہ میں پہلے پرائیوٹ طور پر ہوتا تھا، اب اعلانیہ ہوا، اردو عربی اور ترکی زبانوں پر مشتمل ان اجتماعات میں مقالات پڑھے گئے جو استنبول میں ہوئے۔ اردو برانچ کا شعبہ سب سے زیادہ سرگرم رہا اور مولانا سید محمد رابع حسنی نے پورے جوش و عزم کے ساتھ اس کام کو آگے بڑھایا تقریباً ہر صوبے میں اب تک اس کے اجلاس ہوتے رہے ہیں۔ عرب ممالک میں صرف قاہرہ میں ایک اجتماع عام ہوا جس میں بچوں کے لئے ریڈریں تیار کرنے والے مشہور مصنف کامل گیلانی کو ایوارڈ دیا گیا تھا اس میں حضرت مولانا اپنی صحت کی کمزوری کی وجہ سے شریک نہ ہو سکے استنبول میں اب تک تین عام اجلاس ہوئے جس میں ایک اجلاس کا موضوع ''مولانا سید ابوالحسن علی ندوی کی خدمات'' تھا، اس میں مصر و شام کے ادباء نے ہندوستان سے گئے ہوئے ادباء کے شانہ بشانہ اپنے مقالات پڑھے۔

اس تحریک کے چار رسالے اس وقت نکل رہے ہیں اور جو کئی سال سے جاری ہیں، جن میں سب سے زیادہ ضخیم، دیدہ زیب اور اعلیٰ درجہ کے علمی و تحقیقی اور ادبی مجلّات کے مقابلہ میں بلکہ اس سے بڑھ کر علمی اہمیت کے حامل معلوم ہوتے ہیں، وہ رسالہ 'الادب اسلامی' ہے جس کے سرنامہ پر آپ کا نام سرپرست کی حیثیت سے درج

رہا کرتا تھا، اب چونکہ اس تحریک کے صدر ڈاکٹر عبدالقدوس ابو صالح ہیں اس لئے ان کا نام اس جگہ پر آ گیا ہے۔ دوسرا عربی رسالہ مراکش کے شہر "وجدۃ" سے نکلتا ہے، جس کے سرپرست ڈاکٹر حسن الامرانی ہیں۔ "اردو" میں "کاروان ادب" کے نام سے ایک سہ ماہی شمارہ جو اپنی معنویت اور حجم دونوں کے لحاظ سے ممتاز ہے تحریک کے سکریٹری جنرل اور حال "نائب صدر" مولانا سید محمد رابع حسنی ندوی کی ادارت میں نکلتا ہے، جن کا تعاون جامعہ ملیہ دہلی یونیورسٹی کے شعبہ اسلامیات کے ڈین ڈاکٹر ضیاء الحسن ندوی اور دہلی یونیورسٹی کے سابق صدر شعبۂ عربی ڈاکٹر محسن عثمانی انجام دے رہے ہیں، چوتھا پرچہ "قافلۃ الادب الاسلامی" کے نام سے کراچی کی شاخ سے نکلنا شروع ہوا ہے جس کے پروفیسر ڈاکٹر ظہور احمد اظہر سرپرستی فرماتے ہیں اور وہی اس کے رئیس التحریر ہیں بنگلہ دیش سے استاذ سلطان ذوق ندوی نے متعدد کتابچے اور رسالے شائع کئے ہیں۔

جیسا کہ میں نے اوپر عرض کیا کہ حضرت مولاناؒ نے رابطہ ادب اسلامی کے سلسلہ میں اندرون اور بیرون ملک جہاں جہاں کانفرنسیں ہوتیں سب میں شرکت کی، بیرون ہند کا آخری اجلاس لاہور (پاکستان) میں ہوا جس میں حضرت مولانا کی شخصیت اور دل آویزی نے چار چاند لگا دئے تھے، ادب اسلامی کا قافلہ آج بھی رواں دواں ہے اور اپنے موسس کا مقام تاریخ میں ثبت کر چکا ہے۔



عرب ممالک سے روابط میں پختگی

دمشق یونیورسٹی میں "استاذ زائر"

حضرت مولانا حجاز و مصر اور شام و سوڈان کے طویل سفر سے ۱۹۵۱ء میں وطن واپس تشریف لائے تھے اور یہاں "پیام انسانیت" کے عنوان سے اللہ تعالیٰ نے آپ سے خاص خدمت لی، دار العلوم (ندوۃ العلماء) کی خدمت (جو عملاً سرپرستی تھی اور ہے) آپ نے انہماک سے انجام دینا شروع کی، اسی زمانہ میں آپ کے مرشد و شیخ حضرت مولانا شاہ عبد القادر رائے پوری آپ کی دعوت پر لکھنؤ تشریف لائے، اور دو تین سال یہ معمول رہا، آپ کی تالیف "تاریخ دعوت و عزیمت" کا سلسلہ شروع ہوا، جس کا ذکر ہم آپ کی تالیفات کے سلسلہ میں کریں گے۔ دوسری طرف عرب ممالک سے رابطہ پہلے کے بہ نسبت بڑھ گیا تھا، اور مصر و شام کے علمی حلقوں میں آپ کا شمار وقت کے مصلحین و اکابر میں ہو گیا تھا، پہلی مرتبہ مصر و شام آپ بغیر کسی دعوت کے اپنے دینی ذوق اور تبلیغی مہم پر گئے تھے، یہ اور بات ہے کہ آپ کی جو پذیرائی ہوئی وہ کسی مدعو مہمان داعی سے زیادہ ہی ہوئی، جس کی نظیر اس صدی میں نہیں ملے گی، لیکن مولانا کا یہ سفر اور قیام عام سطح سے کہیں زیادہ بلند تھا، ان کی کتاب "ماذا خسر العالم بانحطاط المسلمین" نے مولانا کو ایک علمی و دینی مقام عطا کر دیا تھا،

اور وہاں کے مقتدر علماء نے آپ کی شخصیت کو پہچاننے میں تاخیر نہیں کی ماذا خسر کی اشاعت کافی ہوئی اور اس کے ہر سال یا سال میں دو ایڈیشن نکلنے لگے، یہاں تک کہ دینی علوم سے وابستہ اور عام اسلامی ثقافت سے کوئی روشناس شخص اس کتاب اور کتاب کے مصنف سے ناواقف نہیں رہا، عرب علماء، ''الاخوان المسلمون'' کے رہبروں اور اس کے ممبروں سے آپ کی خط و کتابت رہی، مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندوی مدظلہ کے ساتھ برصغیر کی ایک اور شخصیت کی عرب ممالک میں شہرت ہوئی، وہ تھے مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی، جن کے بعض رسائل کا ترجمہ مولانا مسعود عالم ندوی نے کیا تھا، اور عراق و حجاز کا دورہ بھی کر چکے تھے نیز جماعت اسلامی میں ایک شعبہ دارالعروبہ قائم کیا تھا، جس کا کام مولانا مودودی کی تالیفات کا عربی ترجمہ کرنا تھا، جماعت اسلامی کو عام طور پر الاخوان کی تحریک کا اردو ایڈیشن سمجھا جاتا تھا، اگرچہ یہ واقعہ کے خلاف ہے مگر مولانا مودودی اسلامی انقلاب کے قائد ہونے کی وجہ سے اور اس وجہ سے کہ ان کو کلمہ حق کی پاداش میں پھانسی دیئے جانے کا حکم ہو گیا تھا اور کئی روز جیل کی اس کوٹھری میں وہ قید رہے جس میں پھانسی پانے والے مجرمین رکھے جاتے ہیں، ان اسباب کے بناء پر الشیخ ابوالحسن الندوی کے ساتھ استاذ مودودی کا نام بھی علمی حلقوں میں معروف ہوا۔

مولانا سید ابوالحسن علی ندوی مدظلہ کی شخصیت کسی پارٹی یا سیاست میں دخیل ہونے کی وجہ سے نہیں بلکہ محض ان کے اخلاص و علم کی وجہ سے معروف ہوئی، مولانا بلاشبہ ندوہ کے معتمد تعلیم تھے، مگر ندوہ ہی کو کون جانتا تھا؟ شاذ و نادر کوئی علم دوست جو دنیا بھر میں ہونے والے علمی کاموں سے اور علمی کاموں کے مراکز سے واقف تھا، وہ جانتا تھا، ندوہ ہی کیا کسی بھی ہندوستانی درس گاہ کے جاننے والے اس وقت بہت ہی محدود افراد تھے۔

بہر حال مولانا کے علمی وزن دینی مقام غیرت اسلامی سے وہاں فضلاء کی اچھی خاصی تعداد واقف ہو چکی تھی، آپ کی شہرت کسی سیاسی لیڈر کی طرح نہیں تھی جس کو عام راہ رو یا دوکان دار، اور دفتری کام کرنے والے جانتے، آپ کی شہرت کا دائرہ علمی و دینی حلقوں میں یونیورسٹیوں میں، دانش گاہوں میں طلبہ اور اساتذہ کے ماحول اور پڑھے لکھے لوگوں میں رہا، ۱۹۵۵ء میں دمشق یونیورسٹی میں اسلامیات کا شعبہ کلیة الشرعیة، کے نام سے قائم ہوا اور صدر حکومت (جمہوریہ سوریہ) نے منظوری دے دی، اور اس کے پہلے پرنسپل الاستاذ مصطفیٰ السباعی مقرر ہوئے، ڈاکٹر مصطفیٰ السباعی نے کوشش کی کہ عالم اسلام کے چیدہ، منتخب روزگار علماء اور مشاہیر علم و فن کو اپنے کالج کلیة الشرعیة میں جمع کرلیں، چنانچہ الاستاذ محمد الغزالی، شیخ علال فاسی، استاذ محمد المبارک، شیخ مصطفیٰ زرقاء کو تدریسی خدمت کے لئے دعوت دی، برصغیر ہندو پاکستان سے مولانا سید ابوالحسن علی ندوی کو دعوت دی۔

مولانا نے تدریسی خدمت قبول نہیں فرمائی، ملک کے اندر (یعنی ہندوستان میں) مولانا سے متعلق بہت کام تھے، خود ندوہ کی ذمہ داری بھی آپ پر تھی، دوسرے ملازمت کی پابندی نا قابل تصور تھی، آپنے بجائے مستقل پروفیسر شب کے چند لیکچرس دینے پر آمادگی ظاہر فرمائی، ڈاکٹر مصطفیٰ السباعی نے صدر حکومت شکری القوتلی سے منظوری حاصل کر کے "وزیٹنگ پروفیسر" کی حیثیت سے دمشق آنے کی دعوت دی، حضرت مولانا نے اطلاع دی کہ وہ تاریخ اسلام کی عہد آفریں، انقلابی، اصلاحی وتجدیدی کوششوں اور ان کی اہم شخصیتوں پر لکچر دیں گے، اس موضوع کا انتخاب اس لئے فرمایا کہ اس عنوان سے وہ کالج اور یونیورسٹی کے نوجوان طلبہ، فضلاء اور اساتذہ کے سامنے اسلامی تاریخ کے مطالعہ کا نتیجہ و ماحصل پیش کرسکیں گے جو اس تاریخ ساز سرزمین میں نئے سرے سے دینی فکر و عمل اور اصلاح وانقلاب حال پر آمادہ کر سکے اور ایک

مہمیز کا کام دے۔

ملک شام کی یونیورسٹی میں استاذ زائر کی حیثیت سے جانا ایک بڑے اعزاز کی بات تھی، حضرت مولانا مناظر احسن گیلانی چوں کہ خود ایک یونیورسٹی کے صدر شعبہ رہ چکے تھے، اور وہ اس منصب کی اہمیت کو جانتے تھے، بلکہ اس کی اہمیت کا اندازہ معاصر علمائے کرام میں صرف انہی کو تھا، انہوں نے مولانا کو خط کے ذریعہ مبارک باد دی، مولانا گیلانیؒ کے مکتوب گرامی کا اقتباس ''کاروانِ زندگی'' جلد اول میں موجود ہے۔

اخبار ''الجمعیۃ اس کے بعد اخبار ''مدینہ'' (بجنور) (۱) میں بھی اس تاریخی امتیاز کی خبر پڑھی جو صدیوں کے بعد ہندوستان کو حاصل ہوا، علامہ صفی الدین بدایونی کے بعد شاید آپ دوسرے ہندی عالم ہیں جن کو شام میں پڑھانے اور اپنے علوم سے شامیوں کو فائدہ پہنچانے کا موقعہ ملا، بلکہ صفی ہندی تو خود وہاں گئے تھے، اور آپ کو تو وہاں کی حکومت اور جامعہ نے طلب کیا، و شتّان بینهما یہ امتیاز آپ کی شخصیت تک میں محدود نہیں بلکہ سارے ہندی علماء کے لئے سرمایہ افتخار ہے، یالیت کثر الله امثالكم فينا(۲) ڈاکٹر صاحب اور آپ کے سارے خاندان کی خدمت میں مبارک باد پیش کرتے ہوئے جو خوشی ہو رہی ہے اس کا اظہار لفظوں میں نہیں ہو سکتا، خدا ہی جانتا ہے، آپ نے بھی ایک مرتبہ فرمایا تھا کہ آپ کے خانوادہ عز و شرف کے ساتھ دل سے تعلق کی وہی نوعیت معلوم ہوتی ہے جو اپنے گھر کے لوگوں سے آدمی رکھتا ہے، معلوم نہیں کب تک روانگی ہوگی، آپ ابن تیمیہ اور ابن القیم کے گھر

---

(۱) ا۔ حضرت گیلانیؒ نے اخبارات کا حوالہ دیا ہے جس کے ذریعہ اطلاع ملی تھی، اس کا واقعہ یہ ہے کہ قومی آواز لکھنؤ میں ان دنوں ایک ندوی فاضل مولوی محمود الحسن صاحب کام کرتے تھے (جواب سعودی سفارت خانہ دہلی میں کام کرتے ہیں) انھوں نے یہ خبر شائع کردی تھی جس سے مدینہ بجنور اور الجمعیۃ دہلی نے نقل کی تھی۔

(۲) کاش آپ جیسے لوگ ہماری ملت میں زیادہ ہو جائیں۔

جارہے ہیں، کتنے علمی تحائف سے علماء ہند کو سرفراز فرمائیں گے۔

علامہ شامی کے پاس فقہی کتابوں کا ذخیرہ ہندوستان سے پہنچا میرے لئے یہ نیا علم ہے جو آپ ہی کے ذریعہ مجھ تک پہنچا ہے(۱) اب شامی کے وطن سے اس کا معاوضہ حاصل کیجئے۔

دمشق کا یہ دوسرا سفر تھا، پہلا سفر مصر وسوڈان کے سفر کے بعد ۱۹۵۱ء میں ہوا تھا، جس میں دمشق کے علاوہ حمص وحماۃ میں بھی علماء ومشائخ سے ملاقاتیں ہوئی تھیں، اور متعدد تقریریں ہوئیں، جس نے وہاں کی علمی ودینی تاریخ پر دیرپا نقوش چھوڑے، جن کی یاد ان بزرگ سال ومشائخ کے دل میں اب بھی ہے جو اس وقت موجود تھے، جیسے مفتی اعظم سوریہ شیخ احمد کفتارو، استاذ راتب النفاخ جو اس وقت جواں سال ادیب اور صاحب قلم تھے، اور اب ان کا شمار دانشمندان کہن سال میں ہوتا ہے، کمال الدین الخطیب جن کا ''ترجمان السنۃ'' ابھی تک نکلتا ہے، مگر وہ خود اب سعودی عرب میں پناہ گزیں ہیں، استاذ بہاء الامیری معروف اسلامی شاعر اور ادیب جو بعد میں شام کے پاکستان اور سعودی عرب میں سفیر مقرر ہوئے تھے، رابطۂ ادب اسلامی کی کانفرنس لکھنؤ میں تشریف لاچکے ہیں، استاذ امین المصری (۲) مکۃ المکرمۃ کے کلیۃ الشریعہ میں مدرس حدیث تھے، اور تعلیمی امور میں دخل رکھتے تھے، جب مکہ مکرمہ کے کلیۃ الشریعہ کو یونیورسٹی کا درجہ دینا طے ہوا، تو وزیر تعلیم شیخ حسن عبداللہ کے یہ مشیر اور معتمد تھے، علامہ شیخ بہجۃ البیطار (۳) اور علامہ

(۱) اشارہ ہے مولانا کی تحریر روزنامچہ شرق اوسط کی طرف۔

(۲) استاذ امین المصری شام کی وزارت تعلیم کی طرف سے پاکستان میں عربی کی تعلیم عام کرنے کے لئے مبعوث کئے گئے تھے جہاں انھوں نے چند ریڈریں لکھیں، پاکستان میں ان کا تعلق حضرت مولانا احمد علی لاہوری سے ہوگیا تھا، وہ پوری متشرع داڑھی رکھتے تھے، اور سعودی عرب میں ان کی بڑی قدر تھی۔

(۳) علامہ شیخ بہجۃ البیطار شام کے متمول اور مقبول عام عالم، امام ابن تیمیہ کے بڑے معتقد اور ان کے افادات کے داعی وناشر تھے۔

الشام شیخ حَبنّکه المیدانی (۱) اسی قدوقامت کے علماء ادباء و مشائخ سے دوستانہ مراسم قائم ہوئے۔

یہ دوسرا سفر دمشق یونیورسٹی کی دعوت پر ہوا، اس وقت مولانا بھی جوان تھے، تنہا سفر کرتے تھے، کاروانِ زندگی میں مولانا نے ذکر فرمایا ہے کہ اپریل میں ایک نئی سروس ایرانڈیا کی شروع ہوئی تھی اس کی پہلی پرواز میں فرسٹ کلاس کی ایک سیٹ شیخ یوسف فوزان کونسل سعودی عرب برائے ہند (بمبئی) کی وساطت سے ملی، دہلی سے بمبئی اور بمبئی سے دمشق تشریف لے گئے، وہاں ایرپورٹ پر کلیة الشریعه کے پرنسپل ڈاکٹر مصطفیٰ السباعی، سینئر اساتذہ جن میں استاذ محمد المبارک (۲) اورالاستاذ احمد الزرقاء (۳) بھی تھے، ان حضرات نے گرم جوشی سے استقبال کیا، اور فندق یرموک دمشق میں آپ کو ٹھہرایا۔

پہلا لکچر شعبان ۱۳۷۵ھ مطابق (اپریل ۱۹۵۶ء) کو یونیورسٹی کے مرکزی ہال میں شام کے چار بجے ہوا، جس کا عنوان تھا "التجدید و المجددون فی تاریخ الفکر الاسلامی" یونیورسٹی کے طلبہ واساتذہ کے علاوہ داعیان شہر اور ممتاز اہل ذوق کو دعوت دی گئی تھی، ہال کچھا کچھ بھرا ہوا تھا، اور گیلری میں طالبات و خواتین تھیں، اس لکچر کے بعد ہر چہار شنبہ کو ایک لکچر دینا طے ہوا، اور ہر محاضرہ (لکچر) کے موقعہ پر داعیان وعلماء کو دعوت دی جاتی تھی، آٹھواں اور آخری محاضرہ حجۃ الاسلام

---

(۱) شیخ حسن حبنکہ صوفی منش قدیم طرز کے عالم جلیل تھے ان کے نامور فرزند شیخ عبدالرحمٰن حبنکہ اب مکہ مکرمہ میں ہیں اور درجنوں کتابوں کے مصنف ہیں۔

(۲) الاستاذ محمد السبارک بہت ہی ذی علم اور تجربہ کار استاذ تھے قرآن کریم کی بلاغت پر ان کی کئی کتابیں ہیں، اسلامی نظام معیشت اورعلم الاجتماع پر ضخیم کتابوں کے مؤلف تھے، ۱۴۰۱ھ میں وفات ہوئی۔

(۳) الاستاذ احمد زرقاء فقہ واصول فقہ کے تسلیم شدہ ماہرین میں شمار ہوتے تھے، ریاض میں مقیم رہے، اور تحقیق وتالیف کا ایک ادارہ ان کی سرکردگی میں کام کررہا ہے۔ اگست ۱۹۹۹ء میں وفات پائی۔ رحمۃ اللہ علیہ

الامام الغزالی مصلحا اجتماعیا کے عنوان پر تھا، پہلے محاضرہ کے بعد رمضان کا مقدس مہینہ آگیا اس لئے جلسہ کا وقت ۸۔ بجے شب کو مقرر ہوا، مگر حاضرین کی دلچسپی کسی محاضرہ میں کم نہیں ہوئی، ان محاضرات میں شرکت کرنے والے شام کے چوٹی کے ادباء وعلماء اور جامعہ کے اساتذہ تھے، ان محاضرات میں پابندی سے شرکت کرنے والے ڈاکٹر معروف الدوالیبی بھی تھے جو ایک زمانہ میں وہاں کے وزیر اعظم رہ چکے تھے، اور اب سالہا سال سے سعودی عرب میں ایوان شاہی کے ایک مشیر کی حیثیت سے ریاض میں مقیم ہیں۔

علامہ الشیخ بہجۃ البیطار اور ڈاکٹر مصطفیٰ احمد الزرقاء ان حاضرین میں تھے، جو محاضرہ شروع ہونے سے پہلے آکر اپنی نشستوں پر بیٹھ جایا کرتے تھے۔

دمشق میں اس مرتبہ مولانا کا قیام تین ماہ رہا، منجانب اللہ مرجوعۂ خلق اور مقبولیت عام وخاص کی کوئی تاویل وتوجیہ نہیں کی جاسکتی، استاذ راتب النفاخ نے .... مجھ سے بیان کیا ہے کہ شیخ ابوالحسن نہ پہلے محاضر تھے اور نہ آخری زائر، ان سے پہلے بھی یونیورسٹی میں لکچر دینے کے لئے امریکہ، انگلستان کے مستشرقین آئے، مصر کے شیخ الازہر اور نامور علماء ازہر آئے، عراق کے برگزیدہ بزرگ شیخ امجد الزہاوی آئے مگر جو کشش شیخ ابوالحسن کے محاضرات میں تھی وہ کسی میں نہ پہلے دیکھی گئی اور نہ ان کے محاضرات کے بعد دوسرے پروفیسروں کے لکچروں میں نظر آئی۔

شام کے ایک عارف بزرگ شیخ احمد الحارون العسل الحجار سے ملاقات کا ذکر حضرت مولانا نے کیا ہے، مولانا کی سوانح میں ایک بات منجانب اللہ یہ دیکھی گئی کہ اہل اللہ، مشائخ طریقت اور اصحاب احسان وعزیمت کا آپ کی طرف طبعی رجحان رہا، اور ان میں سے جس سے بھی ملے وہ خود آپ کا گرویدہ ہوا، جس طرح ہندوستان کے تمام بزرگان دین کے آپ محبوب ومقرب رہے، اسی طرح عرب

ممالک میں بھی جو خاصان خدا خاموشی کے ساتھ عبادت اور اپنے مریدوں کی تربیت میں مشغول تھے، ان تک مولانا خود پہنچے یا وہ بہ نفس نفیس مولانا سے ملنے آئے اور الارواح جنود مجندة کا نظارہ دنیا نے دیکھا، شام کے بزرگ شیخ احمد الحجار کی مجلس میں اپنے ایک کرم فرما محمود الغراب کے بار بار کہنے پر تشریف لے گئے، اس کے بعد وہ خود مولانا سے ملنے کے لئے بار بار آپ کی قیام گاہ پر آنے لگے اور مولانا کی اس دلچسپی کو دیکھ کر دوسرے شامی دانشوران کی مجالس میں آنے جانے لگے۔

دمشق یونیورسٹی کی دعوت پر یہ سفر ہوا، اس لکچرز کے علاوہ بھی وہاں کے قیام سے مولانا نے فائدہ اٹھایا، لبنان اور ترکی کے سفر ہوئے اور کوئی سفر بھی ایسا نہیں تھا جس کے دینی و علمی فوائد وہاں کے باشندوں کو نہ پہنچے ہوں۔

اس سفر میں حلب سے حیدر باک (جو ترکی حدود کا آخری ریلوے اسٹیشن ہے) ٹرین سے سفر ہوا، قسطنطنیہ، انگورہ، قونیہ (مولانا روم کا مسکن و مدفن) کو جا کر دیکھا اور کہیں ایک تماشہ بیں اور سیاح کی حیثیت سے نہیں بلکہ ایک معروف داعی الی اللہ کی حیثیت سے تشریف لے گئے اور وہاں کے متعدد لوگوں کے دلوں میں اپنی یاد چھوڑ آئے، جو آج بھی ان لوگوں کے دلوں میں تازہ ہے جو زندہ سلامت ہیں۔



دمشق کی مؤتمر اسلامی

ڈاکٹر سعید رمضان (۱) کی تجویز اور ڈاکٹر معروف الدوالیبی (۲) کے تائید سے اس زمانہ میں جبکہ مولانا کا قیام وہاں تھا اور ترکی جارہے تھے، مؤتمر اسلامی کا ایک اجلاس منعقد کرنے کا منصوبہ بنایا تھا، اور ڈاکٹر سعید رمضان نے مولانا سے وعدہ لے لیا تھا کہ اس اجلاس میں شرکت کریں، خواہ اس کے لئے دوبارہ ہندوستان سے آنا پڑے، چنانچہ ۲۶/جون کو پہلے اجلاس کی تاریخ طے پائی، اس کانفرنس میں شرکت کے لئے متعدد ممالک عربیہ واسلامیہ سے ممتاز لوگ آئے تھے۔

پاکستان سے مولانا مفتی محمد شفیع صاحبؒ، مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ اور مولانا ظفر احمد انصاریؒ تشریف لائے تھے، جلسہ کے صدر سابق وزیراعظم انڈونیشیا

(۱) ڈاکٹر سعید رمضان مولانا کے بہت مقرب اور بہت ہی عزیز رفقائے کار میں تھے، مولانا سے ان کو ایسی عقیدت تھی جو کسی مرید مخلص کو ہو، جب حضرت مولانا پہلی بار مصر گئے، اس وقت وہ نوجوان وکیل تھے، اخوان کے ایک مقدمہ میں ان کی بحث سن کر مولانا بہت متاثر ہوئے تھے، پھر جنیوا کے اسلامک سینٹر میں انھوں نے دعوت دی، مولانا کے رسائل کے ترجمے جرمن اطالوی، فرنچ میں کرائے، اور مولانا سے ملنے کے لئے انڈونیشیا سے واپسی پر لکھنؤ آئے تھے، ۱۹۹۲ء میں جنیوا میں ان کا انتقال ہوا، اور مصر میں ان کی تدفین ہوئی، ان کا ماہنامہ ''المسلمون'' ایک بلند پایہ علمی مجلہ تھا جس کے لئے مولانا نے افتتاحی مضامین لکھے جو ''الارکان الاربعۃ'' کی تالیف کا سبب ہوا۔

(۲) شام کے سابق وزیراعظم، اور دیوان ملکی سعودی کے مشیر، مؤتمر العالم الاسلامی جس کا صدر دفتر کراچی ہے اس کے سابق صدر۔

ڈاکٹر محمد ناصر تھے اور دو نائب صدر تھے، ایک مولانا سید ابوالحسن علی ندوی، اور دوسرے مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی، اس کانفرنس میں جو ہوا اور مولانا نے جو اس کا تأثر لیا وہ ایک خط میں مولانا منظور نعمانیؒ کو تحریر فرمایا تھا، یہ مکتوب ماہنامہ الفرقان لکھنؤ کی، ذی قعدہ ۱۳۷۵ھ کی اشاعت میں شائع ہوا تھا، اس کا پورا متن یہ ہے۔

محب گرامی قدر زید لطفہ

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ،

امید ہے کہ مزاج بخیر ہوگا۔ گرامی نامہ جو رائے پور سے ارسال کیا تھا مجھے ایک مہینہ کی تاخیر سے ملا، کچھ تاخیر تو میرے سفر ترکی کی وجہ سے ہوئی، کچھ خط ہی کسی غلطی کی وجہ سے غیر معمولی تاخیر سے پہنچا، خط پڑھ کر اور حالات معلوم کرکے بڑی مسرت حاصل ہوئی اور بار بار پڑھا۔

ترکی کا سفر ایک دیرینہ آرزو تھی، اللہ تعالیٰ نے اس سفر میں میری آرزو پوری کی، اگرچہ وقت کم رہ گیا تھا اور دو ہفتہ سے زیادہ کی گنجائش نہ تھی، پھر بھی دل نہ مانا اور اس عزیز سرزمین کی زیارت ہوگئی، جو کچھ دیکھا جو کچھ سنا اور جو حالات معلوم ہوئے وہ میرے لئے خلاف توقع تھے، اگرچہ یہ سن چکا تھا کہ ترکی کی لادینیت اور اسلام سے بےتعلقی کی جو روایات بیان کی جاتی ہیں ان میں بڑا مبالغہ ہے، لیکن ترکوں کی دینداری کے جو مناظر آنکھوں سے دیکھے اور اسلام سے ان کا جو شغف اور گہرا تعلق دیکھنے میں آیا اس سے ایک طرف اس کا اندازہ ہوا کہ اسلام کی اس قوم کے دلوں میں کیسی مضبوط اور گہری جڑیں تھیں جو اتاترک کی کوہ کنی اور تیشہ زنی کے

باوجود قائم ہیں، دوسری طرف اسلام کی اندرونی قوت اور حیات پر ایمان بڑھ گیا جوان تمام صدموں کو برداشت کرلے گیا، اور ترکی میں ایک زندہ مذہب کی طرح موجود ہے اور اپنے سابق اقتدار کی طرف واپس آنے کے لئے بے چین، کہا جاسکتا ہے کہ کسی اسلامی ملک کے مسلمانوں کو اسلام سے شاید اتنا دلی لگاؤ اور اس کا اتنا ادب واحترام نہ ہو جتنا ترکوں کو ہے، آپ کو یہ معلوم کرکے مسرت ہوگی کہ میں اس سفر میں بالالتزام روزنامچہ لکھتا رہا ہوں، اس میں یہ سب مشاہدات وتاثرات آگئے ہیں۔ آپ کے لئے شاید اس سے زیادہ موزوں کوئی تحفہ نہ ہوگا۔

ترکی سے دمشق واپسی ہوئی، میں آخر شوال تک اپنے کام سے فارغ ہوگیا تھا، اور طبیعت پر جلد واپسی کا تقاضا تھا، لیکن سعید رمضان نے سخت اصرار کیا کہ مؤتمر اسلامی میں جو ذیقعدہ میں ہونے والی ہے شرکت کرتا جاؤں، دمشق میں ہوکر اس مؤتمر میں شرکت کئے بغیر چلا جانا جب کہ وہ ہندوستان سے بلارہے تھے، ان کی سمجھ میں نہیں آتا تھا، انھوں نے یہاں تک کہا کہ اگر ہندوستان جانا اس وقت ضروری ہی ہو تو آپ کو مؤتمر میں شرکت کے لئے مستقل آنا پڑے گا، میرے لئے اس سے یہ آسان تھا کہ میں شرکت کرتا جاؤں، آپ سعید رمضان کے تعلقات اور خصوصیات سے واقف ہیں، ان کے سوا کوئی ہوتا تو میں صاف معذرت کردیتا، لیکن سعید رمضان سے انکار کرنا میرے لئے مشکل تھا، چنانچہ وعدہ کرلیا اور اس درمیانی وقفہ میں ترکی چلا گیا وہاں سے واپسی عین وقت پر ہوئی، آدھی

رات کو میں پہنچا اور صبح سے مؤتمر شروع ہو رہی تھی، سعید رمضان کو بے چینی سے انتظار تھا، انھوں نے اسی دن کے پروگرام میں میرا نام اور تقریر رکھی تھی، اور اس پروگرام کا اعلان ہو چکا تھا، میرے پہنچنے سے ان کو بڑی مسرت ہوئی اور میں شریک ہو گیا۔

مؤتمر اپنے موضوع و مقصد کے لحاظ سے بہت کامیاب رہی بیشتر ممالک اسلامیہ کے وفود شریک ہوئے، انڈونیشیا سے لے کر مراکش تک کے نمائندے موجود تھے، اہل ملک اور حکومت کی طرف سے بھی اچھا استقبال اور تعاون رہا، صدر جمہوریہ، وزیر اعظم، صدر پارلیمنٹ نے مؤتمر کے مندوبین کے اعزاز میں دعوتیں دیں، تقریریں بڑی مؤثر اور پر جوش ہوئیں، تجاویز بھی اچھی منظور ہوئیں، اور بعض مفید تجویزیں پاس ہوئیں، دنیائے اسلام کے مختلف حصوں کے لوگوں کو ایک دوسرے سے ملنے اور تبادلہ خیال کرنے کا موقع ملا، اور اسلامی محبت و اخوت کا مؤثر مظاہرہ ہوا، یہ پہلو قابلِ تحسین و مسرت بخش تھا، اور اس لحاظ سے مؤتمر کامیاب تھی لوگوں کا تأثر یہ تھا کہ کسی جماعت یا ادارہ کی دعوت پر اتنا نمائندہ اور وسیع اجتماع کم دیکھنے میں آیا ہے۔

دو چیزیں میرے لئے اس مؤتمر میں کوفت اور انقباض کا باعث ہوئیں اور آپ سے اس کا اظہار کر دینے میں حرج نہیں، ایک تو یہ کہ مؤتمر پر اول سے آخر تک سیاسی و مجلسی ذہن اور فضا غالب تھی۔ وہی دستوری موشگافیاں، وہی خطابت کے مظاہرے، وہی پر جوش تقریریں، مندوبین میں سے بعض کا بے ضرورت بولنے پر

اصرار، ہم ہندوستان میں اس مرحلہ سے بہت کچھ گزر چکے ہیں، اور یہ سمجھنے لگے ہیں کہ یہ طریقہ فرسودہ ہوگیا، اب عمل اور جدو جہد و قربانی کا دور ہے، مگر ابھی بہت سے عرب ممالک میں مجلسی زندگی کا وہ دور چل رہا ہے، اس کے ساتھ اب تبلیغی اجتماعات میں شرکت و تعلق نے ہم کو ان مؤتمرات و کانفرنسوں کے لئے اور بھی غیر موزوں بنادیا ہے اب طبیعت اس کی عادی ہوگئی ہے کہ اسلامی اجتماعات میں نمازوں اور جماعتوں کا اہتمام ہو، سکینت ، وقار اور توجہ الی اللہ کی فضا ہو، لایعنی سے اجتناب ہو، شرکائے مجلس و رفقائے کار پر اس کا اثر ہو، مگر یہ ایک سیاسی مؤتمر تھی اور طبیعت جن چیزوں کی جویا ہے ان کی کمی اس سیاسی فضا میں محسوس ہوتی تھی۔

دوسری چیز جو میرے انقباض کا باعث ہوئی ، وہ یہ کہ مودودی صاحب جب پہلے عمومی اجتماع میں جو یونیورسٹی ہال میں ہو رہا تھا اسٹیج پر آئے تاکہ کانفرنس کے متعلق اور مسئلہ فلسطین کے متعلق اپنے خیالات کا اظہار کریں تو انھوں نے منتظمین جلسہ سے خواہش ظاہر کی کہ ان کی اردو تقریر کا ترجمہ میں کروں، میں بعض وجوہ سے اس کو اچھا نہیں سمجھتا تھا لیکن انھوں نے کئی بار اس کا تقاضہ کیا اور منتظمین جلسہ نے جو ہم لوگوں کے ذہنی اختلاف سے بخوبی واقف نہیں ، اصرار کے ساتھ مجھ سے اس کی خواہش کی کہ میں ترجمہ کردوں، مجبوراً طبیعت کے انقباض کے ساتھ یہ خدمت انجام دینی پڑی اگر چہ تقریر کا تعلق صرف مسئلہ فلسطین سے تھا، اور اس میں کوئی ایسی بات نہ تھی جو میرے لئے موجب انقباض ہوتی لیکن

صرف اس بنا پر کہ کہیں لوگ اس ترجمانی کو نظریات کے اتحاد پر محمول نہ کریں مجھے اس میں تردد تھا، اس لئے میں یہی مناسب سمجھتا تھا کہ مجھے اس خدمت سے معاف رکھا جائے، آپ میرے افتادِ طبع سے واقف ہیں مجھ سے انکار پر اصرار نہ ہوسکا، جس سے طبیعت پر ایک انقباض جو خلاف طبع کام کرنے سے پیدا ہوجاتا ہے طاری ہوگیا اور کئی روز تک اس کا اثر رہا۔

مؤتمر کے اختتام پر مندوبین ومدعوئین عمان وبیت المقدس چلے گئے تاکہ وہاں پناہ گزینوں کی حالت بچشم خود دیکھیں اور حالات معلوم کریں، میں نے سعید رمضان سے اس سفر کی شرکت سے معذرت کردی تھی، واپسی کی تیاریوں میں مشغول ہوگیا، بغداد وکراچی دہلی ورائے پور ہوکر آپ کے پاس پہونچنے کا نظام ہو، اللہ تعالیٰ خیریت سے ملائے۔

والسلام
ابوالحسن علی

جامعہ اسلامیہ مدینہ منورہ

جامعہ اسلامیہ مدینہ منورہ کا قیام ۱۹۶۲ء میں عمل میں آیا ہے، اس کے قیام سے دوسال پہلے ۱۹۶۰ء سے اس کی تیاریاں شروع ہوگئی تھیں، حکومت کی سطح پر کیا سوچا جارہا تھا، یہ تو مجھے معلوم نہیں ہے البتہ غیر حکومتی سطح پر وہاں کے علماء وادباء اور اصحاب قلم جو اخبارات میں لکھ رہے تھے، وہ میرے سامنے کی بات ہے اس وقت "البلاد السعودیہ" جو سہ روزہ تھا، ایک روزنامہ کی شکل میں نکل رہا تھا، اس میں سعودی دانشوروں کے آراء پابندی سے شائع ہوا کرتے تھے، استاذ عبداللہ بالخیر جو بعد میں وزیر اعلام ہوگئے تھے، انہوں نے ایک مختصر مضمون لکھا کہ جامعہ کا قیام مدینہ منورہ میں اسلامی تعلیم کے لئے اور دنیا بھر کے مسلمانوں کے لئے دعاۃ (مبلغین) تیار کرنے کے لئے ایک مبارک و مسعود قدم ہے جس کے لئے جلالۃ الملک سعود بن عبدالعزیز کا سب کو شکر گذار ہونا چاہئے، میری تمنا ہے کہ یہ جامعہ عام یونیورسٹیز سے ممتاز ہو اس کے مناہج اور شعبے (Faculties) کا تعین بہت حکمت عملی اور مقصد کے مطابق ہونا چاہئے، اور عالم اسلام کی اہم شخصیات جو دینی و دعوتی میدان میں ممتاز ہیں ان کی رائے لی جائے اور وہ اس کی مجلس شوریٰ میں شریک ہوں، سماحۃ الشیخ علال الفاسی شیخ بشیر الابراہیمی، شیخ حسنین محمد مخلوف، شیخ ابوالحسن الندوی، شیخ ابوالاعلیٰ المودودی،

سے رائے لی جائے اوران کا تعاون حاصل کیا جائے، اس مضمون کے ہفتہ عشرہ بعد استاذ صالح محمد جمال (ایڈیٹر الندوہ اورمشہور صاحب قلم جو اکثر و بیشتر داخلی امور پر لکھا کرتے تھے) نے اپنی رائے دی، اور شیخ عبداللہ بالخیر کی تائید کی کہ عالم اسلام کی معروف علمی ودینی شخصیات کے تجربات سے فائدہ اٹھایا جائے، انھوں نے کچھ نام لئے ان میں مولانا سید ابوالحسن علی ندوی اور مولانا ابوالاعلیٰ مودودی کے اسماء تھے، ان کے چھوٹے بھائی اورمشہور مصنف اور صاحب طرز ادیب استاذ احمد محمد جمال نے بھی یہی بات اپنے انداز سے لکھی، اوران کے مقالہ میں بھی یہ دونام شامل تھے، پھر یہ سلسلہ چل پڑا، ملک کی سب سے بڑی دینی شخصیت محمد ابراہیم آل شیخ کی تھی، ان کے چھوٹے بھائی شیخ عبدالملک بن ابراہیم حجاز کی جمعیۃ ھیئات الامر بالمعروف والنھی عن المنکر کے صدر نے بھی ان کی تائید کی اور استاذ محمد احمد شمیل (ایک حضرمی عالم تھے جو سعودی ہو گئے تھے، اوران کی آٹھ دس ضخیم کتابیں شائع ہو چکی ہیں، کمیونزم اورقومیت عربیہ کے مخالفین میں تھے) انہوں نے شرح وبسط سے جامعہ کی تاسیس کے بارے میں لکھا اور یہ اتفاق کہ انہوں نے بھی سید ابوالحسن علی ندوی اور مولانا مودودی کا نام لکھا، الاستاذ عبدالقدوس الانصاری نے اپنے ماہنامہ "المنھل" میں ایک مقالہ لکھا، اور اصحاب الرائے میں دوسرے ناموں کے ساتھ ان دونوں بزرگوں کے بھی نام لئے۔

مجھے یاد ہے کہ آخری مضمون شیخ محمود الصواف کا تھا، جس میں انہوں نے لکھا کہ جامعہ کی ہئیت ترکیبی کے متعلق جو آراء نشر ہو رہے ہیں وہ قابل قدر ہیں، اور جن اصحاب الرائے سے مشورہ کی خواہش کی جارہی ہے اس میں دونام شیخ ندوی، استاذ مودودی کے مشترک ہیں، میں ایک نام شیخ امجد الزھادی بغدادی کا اضافہ کرنا چاہتا ہوں۔

چنانچہ ۱۹۶۲ء میں جب جامعہ کا قیام عمل میں آیا اس کی "مجلس الاستشاری"

میں یہ دونام بھی تھے، اوران تمام ممبروں میں جب تک مجلس باقی رہی مولانا سید ابوالحسن الندوی مدظلہ اس کے ممبر رہے، مولانا مودودی اس کے ابتدائی دوسال تک شریک رہے، اس کے بعدان کی مقامی ضرورت اورتحریکی سرگرمیوں نے اس کا موقع نہیں دیا، دوسرے ممبر حضرات مستقل اس کے ممبر نہیں رہے ہرپانچ سال پر بادشاہ کے دستخطوں سے مجلس کے ارکان کی تجدید ہوتی تھی، اس طرح بہت سے ممبر حتیٰ کہ خود شیخ محمد محمود صواف بھی ہیں، ان کی ممبری سے نکل گئے مگر مولانا سید ابوالحسن علی ندوی کا نام مستقل رہا، تا آنکہ اس مجلس کا ۱۹۹۷ء میں خاتمہ ہوگیا، اورصرف مقامی اراکین رہ گئے جن سے عندالضرورۃ مراجعت کی جاسکتی ہے۔

جامعہ اسلامیہ کے قیام کے بعد جن مشاہیر علماء اسلام سے درخواست کی گئی کہ وہ آکر اس جامعہ میں تدریس کی خدمت انجام دیں، ان میں شیخ علال الفاسی اور مولانا سید ابوالحسن علی ندوی کے نام سرفہرست تھے، اتفاق یہ کہ دونوں نے اس سے معذرت کرلی، تدریس کے جس منصب پر مولانا کو بلایا جارہا تھا اس میں سواری کے لئے موٹر، رہنے کے لئے بنگلہ اور پانچ ہزار ریال ماہوار تنخواہ تھی، جس کی قوت خرید آج کل کے لحاظ سے ۳۰/ ہزار ریال ہوتی ہے۔

جامعہ اسلامیہ کے پہلے رئیس (چانسلر) الشیخ محمد ابراہیم آل شیخ تھے اور نائب الرئیس (وائس چانسلر) الشیخ عبدالعزیز بن باز (رحمۃ اللہ علیہما) مقرر ہوئے۔

الامین العام کا عہدہ علامہ شیخ محمد بن ناصر العبودی کے سپرد ہوا، شیخ بن باز علیہ الرحمۃ اور علامہ عبودی کی خواہش پر مولانا نے دوماہ کے لئے استاذ زائر کی حیثیت سے لکچر دینا قبول فرمایا، اور مدینہ کی مناسبت سے النبوۃ والانبیاء فی ضوء القرآن کے عنوان سے آٹھ خطبات (لکچر) ہوئے، سفر کی تفصیلات کاروانِ زندگی کی پہلی جلد کے آخر میں موجود ہے، اس لئے لکھی ہوئی باتوں کو دہرانا بے سود ہے، البتہ مولانا

نے اپنے قلم سے جو باتیں نہیں لکھی تھیں یعنی مولانا کا نام وہاں کے مشاہیر علماء وادباء نے اتنی کثرت سے لیا تھا کہ رکن مجلس استشاری ہونے سے پہلے ہی گویا طے شدہ بات تھی۔

ایک بات اور قابل ذکر ہے کہ مدینہ منورہ میں مولانا کا قیام بستان نورولی میں ہوا کرتا تھا، یہ بستان اب ختم ہو چکا ہے اور وہاں چھ منزلہ عمارت بن گئی ہے، اس بستان میں مولانا سے ملنے کے لئے شیخ بن باز برابر آیا کرتے تھے، نیز مختلف ممالک کے طلبہ اور اساتذہ پابندی سے عصر کے بعد آیا کرتے تھے، یونیورسٹی کے اساتذہ کے علاوہ بھی متعدد جمعیات کی طرف سے دعوتیں آتی رہیں، اور مولانا کی تقریریں ہوتی رہیں، ان میں پابندی سے شرکت کرنے والوں میں شیخ محمود اور شیخ اسعد الغزالی تھے، سید علی فدعق (مئیر جدہ) کسی جلسہ میں شریک نہیں ہوئے مگر مجھ سے کہتے رہے کہ مولانا اردو میں بولیں یا عربی میں مجھے ایک ایک تقریر چاہئے، اور اس کے لئے ایک شخص کو مدینہ بھیجنے کے لئے میں تیار ہوں، اس کے ہوائی جہاز کا کرایہ اور قیام و طعام کے مصارف میرے ذمہ ہوں گے۔

راقم ناچیز سعودی ریڈیو میں ملازم تھا اس لئے میرا خود جانا مشکل تھا، البتہ ایک صاحب عدنان المہر وسی کو تیار کیا تھا، جو سعودی ریڈیو کے مدینہ منورہ میں نمائندہ تھے، وہ عربی تقریروں کا ماحصل لاکر استاذ علی حسن فدعق مرحوم کو دیا کرتے تھے، وہ اپنے خاص کالم میں جو اخبارات کے لئے ''علی الریق'' لکھا کرتے تھے، وہ مولانا کی تقریروں کے بعض فقرے یا ایسے جملے جو ان کے خیالات کی ترجمانی کرنے والے تھے، نقل کیا کرتے تھے، یہ سب ۶۴۔۱۹۶۳ء کی باتیں ہیں۔

عرب قومیت کا طوفان

اور غیرت دینی کا تقاضہ

مغرب کی استعماری طاقتوں نے اسلام کو ہر زمانہ میں اپنا سب سے بڑا حریف اور خطرناک دشمن سمجھا ہے، وہ سب کچھ برداشت کرسکتی ہیں، مگر مسلمانوں کا اتحاد برداشت نہیں کرسکتی ہیں، حکیم مشرق علامہ اقبال کا یہ شعر کوئی وہمی یا شاعرانہ مبالغہ نہیں بلکہ صورت حال کا خلاصہ اور نچوڑ ہے کہ ان طاقتوں کا واحد نمائندہ (ابلیس) کہتا ہے۔

ہے اگر مجھ کو خطر کوئی تو اس امت سے ہے
جس کی خاکستر میں ہے اب تک شرار آرزو

یہودیوں کا سازشی ذہن اور عیسائیوں کے وسائل نے مل کر اسلام کو ٹکرے ٹکرے کردینے کا منصوبہ ایک صدی پہلے بنالیا تھا، جس کے اثرات رفتہ رفتہ ظاہر ہوئے، سب سے پہلے ترکوں کو عرب سے جدا کیا، مسلمانوں ہی کے ہاتھوں خلافت اسلامیہ کو ہمیشہ کے لئے ختم کردیا، اور عربوں کو پہلے ترکوں کے مقابلہ کے لئے "قومیت عربیہ" کا نعرہ دیا، اس نعرہ کو باقاعدہ ایک تحریک کی شکل دی گئی، فلسطین کے عرب باشندوں کو ان کے وطن سے نکال کر باہر کیا اور ان کی جگہ پر یہود کو بسایا، ان کی

حکومت قائم کی اور اب اس کی پہرہ داری اور حفاظت کا کام بھی خود یہی انگریز کر رہے ہیں، (انگریز سے مراد صرف برٹش نہیں ہیں بلکہ تمام مغربی طاقتیں) پھر بھی ان کو چین نہیں آیا۔

ان کو خطرہ تھا کہ اگر مسلمانان عالم سے عربوں کا ربط رہا تو دنیا کے نقشہ پر مسلمان ایک عظیم طاقت بن کر ابھر آئیں گے، اس لئے عرب لیگ قائم کی جو ''ورلڈ مسلم لیگ'' کے لئے موت ثابت ہوئی، ملاحظہ ہو اس کتاب کا صفحہ جس میں جارج لائڈ کی سازش کا واقعہ نقل کیا گیا ہے، عرب قومیت کو عرب مزاج کا ایک جزء بنانے میں مصر کے قبطیوں اور عراق و شام اور لبنان کے یہودیوں اور عیسائی اہل قلم نے پوری طاقت لگادی ہے، انہوں نے الغائے خلافت ۱۹۲۱ء کے بعد عربی کا ''نیا ادب'' ایجاد کیا، جس کی ابتداء سیکولرازم سے ہوئی، اور عیسائیوں کا قدیم نظریہ ''خدا کا حق خدا کو دو اور حکومت کا حق حکومت کو دو'' کلیسا کا حکومت سے کوئی ربط نہیں ہے، مذہب انسان کا داخلی اور شخصی معاملہ ہے'' آدمی اپنے بنائے ہوئے خدا'' کو جس طرح چاہے پوجے، بشرطیکہ حکومت اور حکمرانی کا نام نہ لے، اس تحریک کے مقبول ہونے کے بعد دوسرا مرحلہ وطن کی پرستش کا آیا، وہ یہودی و نصرانی ادباء اور اہل قلم جو امریکہ اور یورپ میں جا کر بس گئے ہیں، انہوں نے اپنے چھوڑے ہوئے وطن کی سرزمین شام و لبنان کو اس طرح یاد کیا جیسے کوئی مخلص خدا کا بندہ یاد الٰہی میں گم رہتا ہے، ان عرب نژاد امریکی شعراء نے ''ادب المہجر'' کے نام سے نظم و نثر کا ایک انبار لگادیا، ان میں سے بڑے بڑے عالمگیر شہرت کے فنکار پیدا ہوئے، جیسے خلیل جبران، ایلیا ابو ماضی، فرحات میخائل نعیمہ، وغیرہ جنہوں نے اپنے آباء واجداد کے وطن کو اپنا معبود قرار دیا، اس کا اثر عرب کے نوجوانوں پر پڑا، یورپ کے صنعتی انقلاب نے سوجھایا کہ ''مذہب پیروں کی بیڑیاں ہیں'' ہر شخص جس ضابطہ

اخلاق کی پیروی کرنا چاہے کرسکتا ہے، بات یہاں پر ختم نہیں ہوتی عرب قومیت کا زہر جب رگ وپے میں سرایت کرگیا، تو وہ خود ایک دین بن گیا، اسلام کے متوازی (PARALLEL) دین بن گیا اور اس کے مقابل مسلم فاتحین اور حضرت عمرو بن العاصؓ کا کوئی احسان نہیں مانتا کہ انہوں نے ارض کنانہ کو ارض اسلام بنادیا، اس کے بجائے فراعنۂ مصر کی تقدیس ہونے لگی، جمال عبدالناصر نے برسر عام اپنی "سات ہزار سالہ تہذیب" پر فخر کیا، اور اسلام کے بارے میں عیسائی مورخین اور یہودی مفکرین کا رویہ رہا کہ اندر اندر اسلامی عقائد کی جڑ کاٹتے رہے، مگر بظاہر ایسا معلوم ہوتا کہ وہ عام اصول پسندی کی بات کرتے ہیں اور ان کا فن رہا کہ وہ سخت سے سخت اور انتہائی جاہلانہ اور سوقیانہ بات کو ایجابی انداز میں کہتے ہیں کہ سننے والے کو محسوس نہ ہو کہ کیا کہہ گیا، مثلاً ہٹی کی تاریخ العرب میں دیکھئے قرآن کے متعلق لکھتا ہے "یہ مسلمانوں کی مذہبی کتاب اس میں دو ٹکڑے ایسے ہیں جو حسن وصداقت کے حامل معلوم ہوتے ہیں۔ یعنی پورا قرآن لایعنی ہے (اتفاق سے) دو آیتیں سچی اور اچھی معلوم ہوتی ہیں۔

البعث العربی پارٹی کے جنرل سکریٹری آنجہانی پروفیسر میشل عفلق (۱) اپنی پارٹی کی سالانہ رپورٹ بابت ۱۹۶۵ء میں لکھتے ہیں۔

> عرب نے ہر زمانہ میں اپنی زندگی کا ساتھ دیا ہے، اس کا قدم تاریخ میں کبھی پیچھے نہیں رہا، یہاں تک کہ ریگستانی بدوؤں نے اپنی ناخواندگی کے تاریک ماحول میں بھی اس وقت کے اوہام وتصورات کے مطابق مذہب ہی کو اپنی ترقی کا زینہ بنایا، مگر عرب ہمیشہ بڑھتے رہے، ترقی پسندی اس کی فطرت ہے، وہ تاریخ کے کسی موڑ پر آکر رک نہیں جاتا، بھٹک نہیں جاتا مگر ریگستان سے

---

(۱) پروفیسر میشل عفلق بعث پارٹی کے بانی اور سربراہ تھے (عہدہ کے لحاظ سے جنرل سکریٹری) اصلاً شامی عیسائی تھے، آخر عمر میں عراق آگئے تھے اور وہیں فوت ہوئے۔

نکل کر اس کو شاہراہ حیات پر آنا ہی تھا۔

(مجلّہ الحبش العربی دمشق، جون ۱۹۵۸ء)

یہ واقعہ ہے کہ عربوں میں قومیت کی تحریک کے اولین قائد و علم بردار مسیحی دانشور اور ادباء و شعراء جن کو ترکوں سے عقیدہ و مذہب اور اخوت اسلامی کا کوئی رشتہ نہ تھا وہ اس مغربی ثقافت کے حامل تھے جس کی بنیاد ہی قومی عظمت و قوم پرستی کے جذبہ پر ہے، اس وقت اس تحریک کے لیڈر ڈاکٹر کارس نمبر، ابراہیم الباز جی، استاد نجیب العاذ ردی لبنانی عیسائی تھے، اس کے بعد قومیت کے اس مغربی مفہوم کا زمانہ آیا جو ایک مستقل فکر اور فلسفہ ہے اور اس میں ساری حمیت و حرارت اور شعائر و مقدسات پائے جاتے ہیں جو مذہب کے ساتھ مخصوص ہیں۔

لبنانی مسلمان فاضل ناصر الدین اپنی مقبول عام کتاب (قضية العرب) میں لکھتے ہیں:

> عربوں کا مسئلہ ایک مؤمن آزاد فطرت عاقل، شریف، صالح، صاف دل، خوددار اور بلند نظر عرب کے نزدیک ایمان کے مسئلہ سے کم نہیں، وطن پر ایمان وطن کے لئے ٹھیک اس طرح جس طرح اللہ پر ایمان، اللہ کے لئے ہوسکتا ہے۔

عربوں کے مسئلے اور اس کے مقاصد و مضمرات کے متعلق لکھتے ہیں:

> وہ (یعنی عرب قومیت) جہالت، افلاس، بیماری، ظلم و ناانصافی اور ہر قسم کی بدعنوانی اور عصبیت عربیہ کے سوا ہر عصبیت کا مقابلہ کرے گی، یہ قومیت دین و سیاست کی تفریق پر ایمان رکھتی ہے، وہ اہل دین کو سیاست میں حصہ لینے کی اجازت نہیں دے گی، ایک عرب کے لئے اس کی تعلیم یہ ہوگی وہ جہاں بھی ہو دو چیزوں کے

لئے پورا تعصب برتے، ایک اپنی قومیت کے لئے، ایک حق و صداقت کے لئے۔

یہی مصنف ''العروبۃ'' یعنی عربیت کی تشریح کرتے ہوئے صاف اور واضح الفاظ میں لکھتا ہے۔

قومیت عربیہ پر ایمان راسخ رکھنے والے ہم عرب قوم پرستوں کے نزدیک عروبہ بجائے خود ایک دین ہے، اس لئے کہ وہ اسلام اور مسیحیت دونوں سے پہلے سے اس دنیا میں موجود ہے، وہ آسمانی مذاہب کے اخلاق و معاملات اور فضائل کا خود بھی حامل ہے

عرب اس وقت تک ترقی نہیں کر سکتے جب تک کہ عربیت اور عربی اصول ان کا مذہب نہ بن جائے، اور وہ اس کے لئے اتنے غیرت مند، حساس اور پر جوش نہ ہوں گے، جتنے مسلمان نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے قرآن مجید کے لئے عیسائی کیتھولک رحم دل مسیح کی انجیل کے لئے، پروٹسنٹ لوتھر کی اصلاحی تعلیمات کے لئے اور فرانس کے انقلابی روس کے جمہوری اصولوں کے لئے ہیں، اور اس کے لئے ایسا تعصب نہ برتیں جس کا مظاہرہ سینٹ پیٹر کی دعوت پر صلیبیوں نے کیا تھا۔

خلاصہ یہ کہ عرب مسلمان مشرق وسطیٰ کی اس چھوٹی سی مگر زیرک، ہوش منداور چالاک مسیحی اقلیت کی سازش کا شکار ہوئے ہیں، جس کا رشتہ صرف عربی قومیت کی بقاء و ترقی سے وابستہ ہے، اور جو صرف اسی راستہ سے عالم عربی کی قیادت حاصل کر سکتی ہے، اور اس کو عالم اسلام سے منقطع کر سکتی ہے جس کا اس اقلیت کے ساتھ اصل عقائد اور تاریخ سے کوئی رشتہ نہیں ہے۔

عیسائیوں اور یہودیوں کی ان سازشوں کا زہر ۱۹۵۲ء کے بعد پورے عالم عرب کے جسم میں سرایت کر گیا، یہ وہ زمانہ ہے جب شاہ فاروق کو جلاوطن کر کے مصری فوجیوں نے اپنی حکومت قائم کر لی تھی، جس وقت کہ مصر میں انقلاب آیا ہے اس کا مسلمانوں نے تہ دل سے خیر مقدم کیا تھا، جو لوگ موروثی حکومتوں کی برائیوں سے واقف ہیں، ان کے لئے اس صورتحال کا سمجھنا کچھ مشکل نہیں، انھیں ان کے سلبی پہلوؤں کا احساس بہت رہا ہے، شاہ وقت کی عیاشیوں کے افسانے کوچہ و بازار میں سنے جاتے تھے، خوشامدیوں کی ثناخوانیاں اور اخبار نویسوں کی منافقانہ لن ترانیاں اور انشاپردازوں کے فقرے پڑھتے وقت ایسا محسوس ہوتا کہ سب تھیٹروں کے اداکار ہیں، ہمارے حضرت مولانا جس زمانہ میں قاہرہ تشریف لئے گئے وہ ملک فاروق بن فواد کا زمانہ تھا، شاہ کی شاہ خرچیوں کے تذکرے لوگ بے باکی سے کرتے تھے، ان کی برائیاں، زندگی کی گندگیاں ایسی نہ تھیں جو چھپی رہتیں، جب مصر کا انقلاب آیا اور شاہی دور ختم ہوا تو حضرت مولانا بھی ان لوگوں میں تھے جنھوں نے مصر کے لئے اس کو فال نیک سمجھا اور ایک بہت طاقتور مضمون ذهب عصر الف وليلةانقرض عهد لف ليلة وليلة (کا زمانہ ختم ہوا) لکھا۔

یہ مضمون استاذ احمد حسن زیات کے ''الرسالہ'' میں شائع ہوا، اور اس سے منبر الشرق نے نقل کیا، مگر عالم اسلامی کی بدقسمتی کی یہ خوشی عارضی ثابت ہوئی، جنرل نجیب جن کو فوج نے آگے بڑھایا تھا، اور جو ایک سال تک صدر جمہوریہ رہے، ان سے پہلا انٹرویو لیا گیا اور اخبا نویس نے پوچھا کہ آپ کس کو اپنا آئڈیل سمجھتے ہیں، مرحوم نے جواب دیا: گاندھی جی کو، مسلمانوں کو یہ پڑھ کر دھچکا سا لگا وہ متوقع تھے کہ جنرل نجیب ''اسوۂ حسنہ'' کو اپنا آئڈیل بنائیں گے، خلفائے راشدین کو اپنا مقتدا بتائیں گے، پھر معلوم ہوا کہ اصل قائد انقلاب جمال عبدالناصر تھے، اور ان کی پشت پناہ طاقت

سوویت یونین کی تھی، اور مصر کے اس انقلابی حکومت کا قبلہ مکہ نہیں ماسکو تھا، اور وہ سب شروع ہو گیا جو مغربی طاقتیں چاہتی تھیں، علماء کی طرف سے ایک آواز نہیں اٹھ سکتی تھی، قائد انقلاب کا یہ جملہ اشتری الفتویٰ بفرخة (یعنی علماء کی میرے نزدیک کوئی قیمت نہیں ہے ان کا فتویٰ ایک چوزے میں خرید تا ہوں) اس عہد میں سوویت یونین کی اجارہ داری تھی، مصر کا ریڈیو صوت العرب کے پروگرام جن سے کان پڑی آواز نہیں سنائی دیتی تھی، ایک سے ایک ماہر فن، آرٹسٹ، اپنی تمام محرومیوں کا سبب یہ سمجھنے لگے تھے، کہ جب تک قومیت عربیہ پر ایمان کامل نہیں نصیب ہوگا نجات نہیں مل سکتی، جس طرح مسلمان یہ یقین رکھتے ہیں (اور یہ حقیقت بھی ہے) کہ جب تک ہمارا عقیدہ اور ایمان درست نہ ہوگا اللہ تعالیٰ کی طرف سے مدد حاصل نہیں ہوگی، غرض یہ حالات تھے جن سے واقفیت اور براہ راست معلومات حضرت مولانا کو تھیں، اور آپ کے مدرسہ فکر کو اس کی خبر تھی۔

البعث الاسلامی عربی ماہنامہ نے اس معرکہ میں ایک انفرادی رول ادا کیا، محمد میاں مرحوم کے قلم سے ایسے آتشیں مقالات نکلے کہ مصر کی حکومت کو وزارت خارجہ سے احتجاج کرنا پڑا، اور محمد میاں کو وزارت خارجہ میں بلا کر سوال جواب کرنا پڑا، مصر، دمشق، بغداد، میں اس ماہنامہ کا داخلہ بند تھا، انگلستان میں جو مصری نوجوان زیر تعلیم تھے وہ البعث الاسلامی کے اداریوں کو اپنے قلم سے نقل کر کے ذاتی خطوط کی شکل میں مصر و شام بھیجا کرتے تھے۔

حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی مدظلہ کی وہاں کے علماء اور خاص طور پر اسلامی انقلاب کے خواہشمندوں کے ساتھ خط و کتابت بھی تھی، اور مکہ مکرمہ میں ان سے ملاقاتیں بھی رہا کرتی تھیں، اس صورت حال کی واقفیت کی بناء پر آپ کا پہلا مقالہ جو ایک رسالہ کی حجم رکھتا تھا، شائع ہوا، اس کا عنوان تھا ''ردة ولا أبابكر لها''

ارتداد پھیل رہا ہے، مگر کوئی ابوبکر نہیں ہے جو اس کا مقابلہ کرے، یہ رسالہ شام کے مسلم نوجوانوں نے ایک لاکھ کی تعداد میں شائع کیا، اور ایک حج کے موقعہ پر منیٰ اور عرفات میں تقسیم کیا، اسی طرح مولانا کا رسالہ ''اسمعوها منّي صريحة أيها العرب'' اے عربو! مجھ سے صاف صاف سن لو! ایک لاکھ سے زیادہ کی تعداد میں شائع ہو کر تقسیم ہوا۔

اسی دوران مصر کی مؤتمر اسلامی نے جس کے سکریٹری مرحوم انور السادات تھے ایک کانفرنس کرنا چاہی جس کا مدعا یہ تھا کہ جمال عبدالناصر کے خلاف جو دنیا میں ''غلط فہمی'' پھیلائی گئی ہے اس کا سد باب کیا جائے، اس کے لئے مصر کے سفیر نے خود آکر مولانا کو دعوت نامہ دیا۔ پھر مؤتمر کو ختم کر کے اس کی جگہ مجمع البحوث الاسلامية کا نام عمل میں آیا۔ اور توفیق عویضہ اس کے سکریٹری جنرل تھے، توفیق عویضہ کا خیال تھا، (اور صحیح خیال تھا) کہ ہندوستان میں ایک مولانا علی میاں ہی تو عالم و مفکر نہیں ہیں، کیوں نہ ہم براہ راست دوسرے مدرسوں سے مولویوں کو بلا کر جمال عبدالناصر کے کارناموں سے روشناس کرائیں، چنانچہ مجمع البحوث کی کانفرنس مصر میں بلائی گئی، ہندوستان کی وزارت خارجہ کے سکریٹری نے مولانا سے کہا آپ اس میں شرکت کریں اور آپ جس کو منتخب کریں گے اس کو دعوت دیں گے، مولانا نے صاف انکار کر دیا، اس انکار کے بعد استاذ توفیق عویضہ نے چند علماء کو براہ راست مدعو کیا۔

مولانا کا رویہ ایک نظریہ اور عقیدہ کا نتیجہ تھا، مصری حکومت نے علماء دین اور دعوت و جہاد کی روح پیدا کرنے والوں کے ساتھ جو معاملہ کیا، جمال عبدالناصر نے برسر اقتدار آتے ہی اخوان کے لیڈروں کو بے گناہ قتل کرنا شروع کیا، جیل میں ان لوگوں کے ساتھ جن کا جرم کلمہ حق تھا وہ سلوک کیا جو اسرائیل نے عرب نوجوانوں کے ساتھ کیا تھا، ایذا رسانی کے نئے طریقے جو ہٹلر کے وقت میں جرمنی میں ایجاد

ہوئے تھے وہ سید قطبؒ، ان کی بہن امینہ قطب پر آزمائے، ان کی تفصیلات ابھی دستاویزوں میں محفوظ ہیں، جن کی تفصیل میرے موضوع سے خارج نہیں ہے، مگر اس سنگین دور کی تاریخ سے خارج ہے، ان حالات میں مصری حکومت کی دعوت قبول کرنا گویا، اس کے مجرمانہ کردار کی خاموش تائید ہوتی۔

صدر عبدالناصر کی مخالفت کا مولانا نے جو بیڑا اٹھایا اور ''البعث الاسلامی'' نے جو کردار ادا کیا وہ عرب مسائل سے قریبی واقفیت کا نتیجہ تھا، کسی ایک شخص، یا ایک گروہ کا قصہ نہ تھا، نبوت محمدی سے بغاوت اور اسلام سے عملاً ارتداد کا معاملہ تھا، حضرت مولانا پر مختلف جہات سے ہندوستان میں اعتراضات ہوئے، غیر ملک کے داخلی معاملات سے ہمیں کیا سروکار؟

ایک کتاب بھی ایک حلقہ سے مولانا کے رویہ پر تنقید ذرا بدزبانی اور لکھنے والے نے اپنی ہمہ دانی کا اظہار کرتے ہوئے لکھا تھا، مولانا نے جیسا کہ اوپر گذرا، مجمع البحوث الاسلامیۃ کی دعوت قبول نہیں فرمائی تھی اور ہندوپاک کے متعدد علماء کو اس اجلاس کی شرکت سے سرفرازی حاصل ہوئی جن کو ہلٹن ہوٹل سے شاہی محل قصر قبہ ہیلی کوپٹر سے لے جایا گیا ایک ڈرامہ یہ دیکھایا گیا کہ جمال عبدالناصر کے بیٹے سائیکل پر اسکول جاتے ہیں (ان کے حفاظتی دستے جو ہمیشہ اردگرد ساتھ ہوتے تھے اس کو نظرانداز کیا گیا) مذکورہ رسالہ میں حضرت مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندویؒ سے زائد لکھنے والے نے اپنے آپ کو دانا و بینا اور بین الاقوامی سیاست سے واقف کار ظاہر کیا۔ لیکن یہ کسی ملک کا نہیں بلکہ دین کے بقاء کا معاملہ تھا، ''ردة ولا ابابكر لها'' کھلم کھلا ارتداد ہو رہا ہے اور کوئی ابو بکرؓ نہیں جو اس کا مقابلہ کرے، کی صورت حال تھی، بہرحال مولانا نے خود اپنے قلم سے ''صدر ناصر کی مخالفت کیوں؟'' کے عنوان سے اس کی توضیح فرمائی تھی، جو ندائے ملت کے شمارہ ۴ راگست ۱۹۶۷ء میں شائع

ہوئی تھی، ضرورت ہے کہ اس مضمون کو یہاں نقل کردیا جائے کیونکہ مولانا کی سوانح کا ایک اہم باب ہے، الحب فی اللّٰہ و البغض فی اللّٰہ (اللہ کے لئے محبت اور اللہ کے لئے بغض) اس کا یہ نمونہ ہے۔

مجھے اس کا اقرار ہے

میں ہندوستان میں صدر ناصر کا بہت بڑا مخالف سمجھا جاتا ہوں، اور تعجب نہیں اگر بہت سے لوگ مجھے اس ملک میں ان کا سب سے بڑا مخالف سمجھتے ہوں، مجھے بھی اس کا اقرار ہے کہ میں دس بارہ برس سے ان کا شدید مخالف اور ناقد رہا ہوں، اور عربی، اردو دونوں زبانوں میں، نیز تقریر و تحریر کے ذریعہ ان پر شدید تنقید کرتا رہا ہوں، میں اپنے اس طرز عمل کے بارے میں کسی معذرت اور تاویل کی ضرورت نہیں سمجھتا، البتہ بعض غلط فہمیوں کے ازالہ کے لئے کسی قدر وضاحت و تفصیل کی ضرورت محسوس ہوتی ہے، اس سلسلہ میں اگر اپنی حقیر ذات سے متعلق بھی کچھ عرض کرنا پڑے اور ''جگ بیتی میں تھوڑی سی آپ بیتی'' بھی آجائے تو امید ہے کہ اس کو ایک ضرورت و مجبوری سمجھ کر گوارا کیا جائے گا۔

نہ غلط فہمی نہ خام خیالی

صدر ناصر سے میری مخالفت کی بنیاد عام طور پر یہ سمجھی جاتی ہے کہ وہ قومیت عربیہ کے اس وقت سب سے بڑے علمبردار ہیں، اور میں اس کا شدید مخالف، اس میں کوئی شبہ نہیں کہ میں قومیت عربیہ کو اس کے اعتقادی اور فلسفیانہ تصور کے ساتھ، جو مغربی ''نیشنلزم'' کا حقیقی مفہوم اور مزاج ہے، عالمگیر اخوت اسلامی اور ''جامعہ اسلامیہ''

کا رقیب اور حریف سمجھتا ہوں، اور اس بارہ میں تاریخ وسیاست کے ایک طالب علم اور دنیا کے تجربات وواقعات سے سبق لینے والے ایک انسان کی حیثیت سے کسی غلط فہمی اور خام خیالی میں مبتلا نہیں ہوں، اور نہ کسی جماعتی تعصب اور فقیہانہ تشدد کا شکار ہوں، اس اندیشہ کی تصدیق کے لئے عرب قوم پرست رہنماؤں کی تحریروں، تقریروں، اوران کے اعلانات وبیانات کی شہادت کافی ہے، جس کا ایک حصہ میں نے اپنے اس رسالہ میں بھی نقل کیا ہے، جو "عرب قوم پرستی اسلامی نقطۂ نظر سے خطرناک کیوں؟" کے نام سے ستمبر ۱۹۶۴ء میں شائع ہوا تھا، اور میں نے اس کی چند محدود کاپیاں حال ہی میں مخصوص اہل علم اور ممتاز اصحاب کے پاس بھجوائی ہیں، اس قوم پرستی کی تخریبی صلاحیت اس کی ہلاکت آفرینی، اس کی انانیت پروری، اور اس کی جارحانہ فطرت کے متعلق جدید سیاسی لٹریچر میں اتنا لکھا جاچکا ہے کہ اس پر اب کسی اضافے کی گنجائش نہیں ہمارے اس دور میں خود مغرب میں اس کو رجعت پسندی اور فرسودہ خیالی کی علامت سمجھ لیا گیا ہے، ایک مسلمان کی حیثیت سے جس کا عقیدہ "اِنَّ هٰذِهٖ اُمَّتُكُمْ اُمَّةً وَّاحِدَةً وَّاَنَا رَبُّكُمْ فَاعْبُدُوْنِ پر ہے اور جو نسل آدم کی اخوت ومساوات اور لافضل لعربي على عجمي ولا لعجمي على عربي الا بالتقویٰ" کا قائل ہے، یہ فرض ہے کہ دنیا کے کسی گوشہ اور خصوصیت کے ساتھ وسیع دنیائے اسلام کے کسی دور دراز حصہ میں بھی قومیت کا نعرہ بلند کیا جائے تو وہ اس سے نبرد آزما اور برسرِ پیکار ہو جائے، اسی بناء پر ان قائدین نے جن کو اسلامی حمیت اور ایمانی فراست سے حصہ وافر ملا تھا، ترک قوم پرستی، ایرانی قوم پرستی، یہاں تک کہ ہندوستانی نیشنلزم تک کی مخالفت کی۔

چو کفر از کعبہ برخیزد

لیکن یہ نعرہ جب اس سرزمین سے بلند کیا جاتا ہے، جہاں دنیا کے بت کدوں

کے بجائے خدا کا گھر بنایا گیا تھا، اور جس کو اس دعوت اخوت و پیغام انسانیت کا آخری اور سب سے مضبوط حصار قرار دیا گیا تھا تو ایک ایسے شخص کے لئے جس کو اس کا یقین ہے کہ اسلام خدا کا آخری دین اور عرب اس کے حامل و امین ہیں، یہ بات برداشت سے باہر ہو جاتی ہے کہ وہ اس کو کسی بڑے سے بڑے سیاسی یا مادی مفاد کی خاطر نظر انداز کر دے، اور وہ ایک ذہنی و روحانی کرب کے ساتھ بے اختیار پکار اٹھتا ہے کہ

ع چو کفر از کعبہ برخیزد کجا ماند مسلمانی؟

اخوت اسلامی کی حریف نبوت محمدی کی رقیب

اس قوم پرستی میں جب قدیم تہذیب کے احیاء کی سرمستی، اور آباء پرستی کا عنصر بھی شامل ہو جاتا ہے تو وہ نہ صرف اخوت اسلامی کی حریف، بلکہ نبوت محمدی صلی اللہ علیہ وسلم کی رقیب بھی بنتی نظر آتی ہے، وہ جس رفتار سے ترقی کرتی ہے اسی رفتار سے محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سیادت و امامت کا عقیدہ، اور ان کے "دانائے سبل" "ختم الرسل" اور "مولائے کل" ہونے کا اعتقاد بھی کمزور ہوتا چلا جاتا ہے، یہ سب اندیشہ ہائے دور دراز اور تخیل پرور ذہانت کے کرشمے نہیں ہیں، وہ حقائق ہیں جن کا غالی عرب قوم پرستوں کے مضامین، پرجوش عرب نو جوانوں کی مجلسوں اور مصر و شام کی ادبی اور سیاسی مجلسوں میں ہر وقت مشاہدہ کیا جا سکتا ہے، اور ہمارے محدود علمی ذخیرے میں اس کا خاصا حصہ محفوظ ہے، صدر ناصر کی ذات سے اس عرب قوم پرستی کو جو قوت و تازگی اور جو بین الاقوامی اہمیت حاصل ہوئی اس سے کوئی انصاف پسند انکار نہیں کر سکتا، اس بناء پر اگر کوئی ایسا شخص جو عربوں کو اسلام کا رأس المال، اور ان کی مقدس سرزمین کو دنیائے اسلام کا روحانی دار السلطنت، اور محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا قلعہ سمجھتا ہے، بے چینی محسوس کرے، اور اس کے قلب و قلم سے کچھ آہ و فغاں

نکل جائے تو تعجب کی کوئی بات نہیں کہ

دل ہی تو ہے نہ سنگ وخشت

درد سے بھر نہ آئے کیوں؟

ایک بڑی دینی سعادت

میرے لئے اس عرب قوم پرستی کی بنیاد پر صدر ناصر کی مخالفت ایک بڑی دینی سعادت تھی اور ہے، اور میں اس پر کوئی شرمندگی محسوس نہیں کرتا، لیکن میری مخالفت کی بنیاد تنہا یہ بات نہیں، انصاف کی بات یہ ہے کہ شام کے بعثی لیڈر اور عراق کے متعدد قوم پرست مفکر اور صاحب قلم، اس بارے میں صدر ناصر سے زیادہ غلو رکھتے ہیں، انہوں نے اس کو ایک فلسفہ کے طور پر، اور اسلام کے متوازی ایک نظام کی حیثیت سے پیش کیا، اس کے متعدد نمونے میری کتاب ''مسلم ممالک میں اسلامیت اور مغربیت کی کشمکش'' میں آچکے ہیں، لیکن میں ان میں سے کسی کو عالم عربی کی روح، اور دنیائے عرب کی آئندہ نسلوں کے لئے اتنا خطرناک نہیں سمجھتا کہ ان کو اپنی مخالفت وتنقید کا مستقل موضوع بناؤں، اور ان پر بار بار توجہ کروں۔

نامذہبیت، مادیت اور کمیونزم کا نقیب اور داعی

صدر ناصر سے میری مخالفت کی بنیاد اس سے کہیں زیادہ گہری، وسیع اور معنی خیز ہے، وہ تنہا قومیت عربیہ کے علمبردار نہیں، وہ عالم عربی میں ایک بنیادی، ہمہ گیر اور نہایت دوررس تبدیلی کے داعی اور علمبردار ہیں، وہ عالم عربی کا رخ اس مرکزی نقطہ سے ہٹا کر جو اس کے فکر وعمل، شوق وتمنا، اور جذبہ وجوش کا قبلہ رہا ہے، ہمہ گیر مادیت اور نامذہبیت کی طرف پھیرنا چاہتے ہیں، اور اس مقصد کے حصول کے لئے وہ ایسے دوررس اور وسیع انتظامات اور تبدیلیاں کررہے ہیں جن کا اثر

(اگر کوئی عظیم انقلاب اور غیر معمولی واقعہ پیش نہ آیا تو) نسلوں اور صدیوں تک قائم رہے گا، ان کو اس مقصد کے حصول کے لئے وہ وسائل و مواقع اور وہ اثر ورسوخ بھی حاصل ہو گیا ہے، جو اس وقت تک کمال اتاترک ترکی میں قیادت کے مختصر دور کو مستثنیٰ کر کے ابھی تک کسی اسلامی ملک کے قائد یا سربراہ کو حاصل نہیں ہوا تھا، اور وہ پورے عزم و تنظیم، اور ایک سوچی سمجھی اسکیم کے ساتھ اس منزل کی طرف رواں دواں ہیں، وہ نہ صرف مصر بلکہ پورے مشرق وسطیٰ میں کمیونزم کے سب سے بڑے نقیب اور سب سے مؤثر داعی ہیں، وہ اگرچہ ہمیشہ ''اشتراکیت عربیہ'' اور اب کچھ عرصے سے ''اشتراکیت علمیہ'' کا نام لیتے ہیں لیکن درحقیقت ان کی منزل مقصود اور ان کا منتہائے نظر اشتمالیت یا کمیونزم ہے۔

ہندوستان کے طبقہ علماء سے گلہ

افسوس ہے کہ ہمارے ہندوستان کے بہت سے اہل علم، ممالک عربیہ کے جدید تغیرات اور تازہ واقعات سے پورے طور پر واقف نہیں، ان کو اندازہ نہیں کہ اس مدت میں وہاں کیا فکری اور ذہنی انقلاب رونما ہو گیا، اور معاملہ کہاں سے کہاں پہنچ گیا ہے ان کا ذریعہ معلومات زیادہ سے زیادہ مصر و شام کے چند مذہبی رسالے، اور علمی و فقہی تصنیفات، یا وہ معلومات ہیں، جن کی ان ملکوں کے سفارت خانے اشاعت کرتے رہتے ہیں وہ سمجھ رہے ہیں کہ وہاں جو کچھ ہو رہا ہے، وہ صرف سرمایہ دار طبقے کی چند ناانصافیوں کا خاتمہ، مصری معاشرہ کی اصلاح اور معاشی زندگی کی تنظیم ہے، ان میں سے بہت سے لوگ اب بھی اس طرز عمل کے لئے قرآن مجید کی آیات سے استدلال، اور حضرت ابوذر غفاریؓ کی زندگی سے مثال پیش کرتے ہیں۔

مصر کی اشتراکیت کو روس کی سند قبولیت

حالانکہ اب مصر کی ''اشتراکیت'' کو خود سوویت دیس کے ذمہ دار اور سربراہ سند دے چکے ہیں، اور وہ اس کی پیش رفت وترقی اور حکمت عملی سے بالکل مطمئن ہیں، میں یہاں پر روسی ذمہ داروں اور کمیونزم کے سرکاری نمائندوں کے چند بیانات پیش کرتا ہوں:۔

''سوویت نیوز'' رسالہ نے اگست ۱۹۶۶ء کے شمارے میں متحدہ عرب جمہوریہ میں اشتراکیت پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھا:۔

''متحدہ عرب جمہوریہ نے اپنے جن اہم اور بنیادی منصوبوں کا اعلان کیا ہے، اور جن میں سوشلسٹ سماج کی تعمیر بھی شامل ہے، ان کو سوویت عوام کی مکمل تائید وحمایت حاصل ہے اور وہ اس کی پوری طرح قدر کرتے ہیں۔''

آگے لکھتا ہے

واقعہ یہ ہے کہ متحدہ عرب جمہوریہ اور سوویت یونین کے تعلقات عام تعاون کے دائرے سے بلند ہیں وہ سیاست خارجہ میں لینن کے اصولوں کی بنیاد پر قائم ہیں۔''

مصر کے قومی منشور ''المیثاق الوطنی'' پر تبصرہ کرتے ہوئے کوسی گن نے اپنی جو رائے ظاہر کی تھی، اس کو مصر کے مشہور اخبار ''الاہرام'' (یاد رہے کہ مصر میں تمام اخبارات قومیائے جا چکے ہیں) نے ان الفاظ میں نقل کیا ہے۔

''میثاق وطنی کی ایک اہم اور اصولی دستاویز کی حیثیت سے ہمارے نظر میں بڑی اہمیت ہے۔'' (الاہرام ۲۱ رمئی ۱۹۶۶ء)

''سوویت نیوز'' میں یہ بھی شائع ہو چکا ہے کہ انقلاب مصر کے چودھویں

جشن کے موقع پر صدر برزنیف اور وزیر اعظم کوسی گن نے جو تہنیتی پیغام بھیجے ان میں کہا گیا ہے کہ

''روسی، مصری قوم اور حکومت مصر کی ان کامیابیوں پر دلی مسرت کا اظہار رکرتے ہیں، جو انھوں نے ایک اشتراکی اور جمہوری سماج کی تعمیر میں اپنی انتھک اور پیہم کوششوں کے ذریعہ حاصل کی ہیں۔''

مساجد اور مدارس دینیہ اشتراکی سماج کے معمار

ان کوششوں کی تفصیل کے لئے جو خالص مذہبی اداروں (مساجد و مدارس دینیہ) سے لے کر، ادب، صحافت و سیاست کے حلقوں اور میدانوں تک پھیلی ہوئی ہیں، اور یہ معلوم کرنے کے لئے کہ موجودہ نسل کو نئے قالب میں ڈھالنے اور آنے والی نسلوں کو اسی معیار کے مطابق پیدا کرنے کے لئے کیسی پرعزم اور منظم کوشش ہو رہی ہے، اس کی ضرورت تھی کہ کم سے کم اس دس برس کے عرصے کے مصری اخبارات و رسائل کے فائلوں اور سرکاری منشورات و مطبوعات پر نظر ڈالی جائے، لیکن یہ بات چونکہ ہندوستان میں آسانی سے ممکن نہیں اس لئے یہاں صرف چند نمونے پیش کئے جاتے ہیں۔

مصر کے سرکاری اخبار ''الجمهورية'' میں ۱۵/جولائی ۱۹۶۶ء کے شمارے کے مذہبی ضمیمہ (الملحق الديني) میں وزارت اوقاف کے ترجمان کا حسب ذیل بیان شائع ہوا۔

''وزارت اوقاف قدرتی طور پر ایک ایسی یونیورسٹی میں تبدیلی ہو گئی ہے جس کا مقصد اور جس کا مشن عرب سماج میں سوشلسٹ اصولوں کا نفاذ ہے''

وہ آگے کہتے ہیں:۔

"جدید انقلاب کا مقصد یہ ہے کہ مساجد کو ایسا کر دیا جائے کہ وہ سوشلسٹ سماج میں اپنا کردار ادا کرسکیں، اور ایسا فرد صالح تیار کرسکیں جو جدید ترقی پسندانہ اور اشتراکی سماج میں حصہ لے سکے"۔

ڈاکٹر احمد کمال، مصر کے سرکاری مذہبی رسالہ "منبر الاسلام" میں لکھتے ہیں:

"ہر مسجد ایک ادارے کے ماتحت ہوگی، اور اس ادارے کی نگرانی عرب سوشلسٹ یونین کی مقامی شاخ کے سپرد ہوگی، اور یہ شاخیں ایک عمومی تنظیم کے ساتھ مربوط ہوں گی، جن کا کام یہ ہوگا کہ وہ اپنے حلقوں میں سوشلسٹ ثقافت کے پروگراموں اور منصوبوں کو روشناس کرا سکیں"۔

کمیونزم کا عربی ایڈیشن

ان اقتباسات میں اگرچہ ہر جگہ اشتراکیت کی اصطلاح آئی ہے، اور بظاہر کمیونزم سے لیک مختلف نظریہ نظر آتا ہے، جس میں کمیونزم کی انتہا پسندی اور غلو نہیں ہے، لیکن یہ درحقیقت اشتمالیت اور کمیونزم کی پہلی منزل اور اس کا عربی ایڈیشن ہے، جس کو حالات کی مجبوری کی بناء پر اختیار کیا گیا ہے، اگر ایسا نہ ہوتا تو روس کے ذمہ دار اور راسخ العقیدہ رہنما کبھی اس پر اظہار اطمینان وخوشنودی نہ کرتے۔

اشتراکیت اور نامذہبیت کی ہمہ گیر کوشش کا نتیجہ

اشتراکیت اور نامذہبیت کی اس بھرپور ہمہ گیر اور منظم کوشش کا نتیجہ یہ ہے کہ اس دس بارہ برس کے عرصہ میں مصر وشام اور عراق میں خصوصیت کے ساتھ اور دوسرے عرب ممالک میں عمومیت کے ساتھ نوجوان اور تعلیم یافتہ طبقہ، اندر سے اتنا

بدل چکا ہے اور اس تیزی کے ساتھ بدلتا چلا جا رہا ہے کہ اس کا اندازہ یہاں بیٹھ کر کرنا مشکل ہے اگر ہمارے علماء دین ان کی بے تکلف مجلسوں میں شریک ہو کر ان کے اصلی خیالات اور اندرونی جذبات سنیں تو شاید وہ سر پکڑ کر بیٹھ جائیں کہ اس عرصہ میں اسلام کے اس بنیادی مرکز میں اتنا عظیم انقلاب رونما ہو چکا ہے، وہ انقلاب جس کو بعض اوقات صرف ذہنی و تہذیبی ارتداد نہیں بلکہ (سخت قلبی اذیت کے ساتھ) اعتقادی ارتداد بھی کہنا پڑے گا۔

اولاد ابرہیم کی آذری و بت تراشی

یہ انقلاب جہاں بھی رونما ہو، اور جہاں بھی اس کے رونما ہونے کا خطرہ محسوس ہو، افسوسناک وتشویش انگیز ہے، لیکن جب یہ انقلاب ایک ایسے میدان میں رونما ہونے لگتا ہے، جس پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ کرامؓ کی اولین بہترین کوششیں صرف ہوئیں، اور جو ان کی تمناؤں کا مرکز اور قیامت تک آنے والی مسلمان نسلوں کی امید گاہ ہے، تو معاملہ کی سنگینی اور تشویش کا پہلو بہت بڑھ جاتا ہے، جب ایک مسلمان، اولاد ابراہیم کو آذری و بت تراشی کرتے ہوئے دیکھتا ہے، اور جن کو خدا نے دنیا کا مرکز اور جن کے شہر کو عالم اسلام کا قبلہ بنایا تھا، وہ کعبہ کا طواف کرنے کے بجائے بار بار ماسکو کا احرام باندھتے، اور کریملن کا طواف کرتے ہوئے دیکھے جاتے ہیں تو دنیا نگاہوں میں اندھیر ہو جاتی ہے اور بے اختیار زبان و قلم سے فریاد نکل جاتی ہے۔

دل عبث لب بہ شکوہ وا نہ کند
شیشہ تا نہ شکند صدا نہ کند

عالم عربی سے مولانا کے گہرے روابط

میں اس کو اپنی بدقسمتی سمجھوں یا خوش قسمتی کہ مجھے عالم عربی کی کمزوریوں اور

بیماریوں اور اس کے سر پر منڈلانے والے خطرات سے واقفیت کے وہ مواقع حاصل ہوئے جو (خاص اسباب وحالات کی بنا پر) ہندوستان میں میرے محدود علم میں بہت کم لوگوں کو حاصل ہوئے ہوں گے۔ میری تعلیم و تربیت شروع سے عرب اساتذہ کے ماتحت ہوئی اور بدو شعور ہی سے اس سرزمین سے اپنے وطن کا سا انس اور واقفیت پیدا ہوگئی۔ ۱۹۴۷ء سے پہلے مجھے ہندوستان سے باہر جانے کا اتفاق نہیں ہوا، لیکن عرب کی سرزمین پر قدم رکھنے سے پہلے میں وہاں کی تحریکات، رجحانات، مکاتب خیال اور شخصیتوں سے اتنا واقف ہوگیا تھا کہ مجھے کسی عرب ملک میں کبھی اجنبیت اور بیگانگی کا احساس نہیں ہوا، اس کے بعد بار بار مجھے مشرق وسطیٰ کے دورے کا موقع ملا، اور تقریباً پوری عرب دنیا کی سیاحت کی، سیاحت بھی زائرانہ نہیں محرمانہ، میں عربی دنیا کے تمام اہم مرکزوں میں مہینوں اور ہفتوں رہا ہوں، اور ایک فرد خاندان کی حیثیت سے ان کی زندگی کے مطالعہ اور ان کے حقیقی خیالات وجذبات سے واقفیت کا موقع ملا ہے، معذرت اور احساس ندامت کے ساتھ عرض کرنا پڑتا ہے کہ مجھے ان کے فطری محاسن ان کے قومی خصائص، ان کے خداداد کمالات، ان کی حسن طبیعت، ان کے سوز دروں، اسی کے ساتھ ان کی مشکلات، ان کی آزمائشوں، ان کے مسائل اور ان کے مصائب کا جیسا علم ہے، قدرتی طور پر بہت سے ان اصحاب کو نہیں ہے، جو اپنے علم وفضل، دین وتقویٰ، علمی کمالات یا سیاسی خدمات میں مجھ سے بدرجہا فائق اور میرے لئے لائق صد عزت واحترام ہیں۔ یہ کوئی کمال نہیں، حکمت الٰہی کی کرشمہ سازی ہے، محض انعام نہیں، امتحان وآزمائش بھی ہے، عربوں کی عالی ظرفی طبعی شرافت کریم النفسی، اور اخوت اسلامی کا کرشمہ تھا، کہ انھوں نے مجھے ایک فرد خاندان کی طرح، اپنے حالات پر تبصرہ وتنقید کرنے اپنے مسائل پر بحث کرنے، اور ان کا حل پیش کرنے کی اجازت دی، اور اس کو نہ صرف خندہ پیشانی اور بشاشت کے ساتھ سنا، بلکہ ان

خیالات کی اشاعت اور توسیع کی مخلصانہ کوششیں کیں۔

عربوں کی کمزوریوں، خامیوں اور کوتاہیوں پر آزادانہ تنقید

۲۳/ جولائی ۱۹۵۱ء کو میں نے دمشق یونیورسٹی کے ہال میں ممبران پارلیمنٹ، اساتذہ جامعہ علماء اور عمائد شہر کے جلسہ میں جس کی صدارت یونیورسٹی کے عیسائی وائس چانسلر مشہور عرب فاضل قسطنطنین زریق کر رہے تھے، فلسطین کے مسئلہ اور اس کے حل پر اپنا مقالہ پڑھا جو "فلسطین کے المیہ کے بنیادی اسباب" کے نام سے دمشق، بیروت اور بغداد میں بار بار چھپا ہے، میں نے اس مقالہ میں موجودہ عربوں کی بنیادی کمزوریوں، ان کے رہنماؤں کی خامیوں، اور کوتاہیوں پر آزادنہ تنقید کرتے ہوئے مسئلہ فلسطین کا حل پیش کیا تھا، عربوں نے اس مشورے کو جو ایک مسافر اور غیر ملکی کی زبان سے پیش ہوا تھا، اور جس میں تنقید کی تلخی بھی تھی، نہ یہ کہہ کر رد کر دیا، کہ "یہ ہمارے گھر کا معاملہ ہے، باہر کے کسی آدمی کو مشورہ دینے کا کیا حق ہے؟ اور نہ وہ اس صاف گوئی اور احتساب پر چیں بہ جبیں ہوئے، اسی طرح ۱۹۵۶ء میں مؤتمر اسلامی دمشق کے جلسے میں "مسئلہ کا تعلق عالم اسلام کے دینی شعور کی بیداری سے" کے عنوان سے میں نے پھر ایک مقالہ پڑھا اور اس کی اسی طرح پذیرائی ہوئی، اسی طرح دمشق، بیروت، عمان بغداد اور مکہ معظّمہ میں عرب دوستوں کے سامنے اپنے ناقدانہ خیالات، اپنے مخلصانہ مشورے اور اپنے تأثرات وجذبات پیش کرنے کا بار بار اتفاق ہوا، اور انھوں نے ہمیشہ فراخ دلی اور عالی ظرفی کا ثبوت دیتے ہوئے ان کا پر جوش خیر مقدم کیا۔

"نوا میری عربی رہی"

یہ ذاتی داستان جس کا سنانا میرے لئے کچھ زیادہ خوشگوار و آسان کام نہیں

ہے، اس لئے پیش کی گئی کہ ناظرین کو معلوم ہو جائے کہ میں نہ عربی دنیا سے بیگانہ اور اجنبی ہوں نہ میری معلومات سکنڈ ہینڈ ہیں، اور نہ میں نے عرب رہنماؤں پر تنقید کا کام اور عربوں کی زندگی کے احتساب کا فریضہ ان کے مصائب اور ان کی ناکامیوں کے اسباب پر بحث کا سلسلہ صرف عرب واسرائیل کی اس جنگ کے موقع پر شروع کیا ہے، اور نہ میں اچانک اور بے وقت اس میدان میں آ گیا ہوں، میں اپنے کو (ایک مسلمان کے رشتہ سے بھی اور عربی ثقافت کے ناطے سے بھی) اس وسیع و عظیم عرب خاندان کا جو مراکش سے بغداد تک پھیلا ہوا ہے ایک فرد سمجھتا ہوں، میں ان کے دکھ سکھ میں شریک ہوں، میری قسمت ان کی قسمت سے وابستہ ہے، ان کی عزت سے میری عزت اور ان کی ذلت سے میری ذلت ہے، میرے تخیلات کی دنیا، میری تمناؤں کا مرکز، میرے طائر روح کا حقیقی نشیمن، عرب کی محبوب سرزمین، اس کی زبان وادب اور اس کی تہذیب وثقافت رہی ہے، عربی دنیا کے اس پورے اثاثہ اور سرمایہ پر (جس کی حفاظت اور سربلندی کے لئے قومیت عربیہ کا نعرہ بلند کیا جاتا ہے) میرا حق کسی طٰہٰ حسین، کسی عقاد، کسی احمد امین یا کسی کرد علی سے کم نہیں، میرا خمیر اور میرا آب وگل ہندوستان کی سرزمین سے ہے، مجھے اس کا اعتراف بھی ہے اس پر فخر بھی، لیکن میں نے اردو سے زیادہ عربی زبان کو اپنے اظہار خیال کا ذریعہ بنایا، اور مجھے اقبال کے الفاظ میں یہ دعویٰ کرنے کا حق ہے کہ

میرا ساز گرچہ ستم رسیدہ زخمہائے عجم رہا
وہ شہید ذوق وفا ہوں میں کہ نوا مری عربی رہی

عرب دنیا ایک فیصلہ کن دوراہے پر

مجھے بار بار جو چیز ہندوستان میں اس فغاں سنجی اور تلخ نوائی پر مجبور کرتی ہے،

اور جس کی وجہ سے میں عالم عربی کی ان شخصیتوں پر بھی تنقید سے بالا نہیں رہ سکتا، جن کو عربی دنیا اور بیرونی ممالک میں بھی بڑی مقبولیت حاصل ہے، وہ میری یہ مجبوری ہے کہ میں ان خطرات سے آنکھیں نہیں بند کر سکتا، جو موجودہ عالم عربی میں اسلام کو بحیثیت مکمل اور آخری دین کے اور عربوں کو اس کے پر جوش داعی، اور وفادار سپاہی کے درپیش ہیں، آج عالم عربی (ان انقلابی رہنماؤں اور فوجی ڈکٹیٹروں کی بدولت جو مصر و شام، عراق اور الجزائر پر قابض ہیں، افسوس کہ اب اس فہرست میں لیبیا اور سوڈان کا بھی اضافہ ہو گیا) ایک ایسے ذہنی بحران سے دوچار ہیں جس کی مثال ظہور اسلام کے بعد سے اِس وقت تک نہیں ملتی، آج عرب دنیا ایک فیصلہ کن دوراہے پر کھڑی ہے، اگر موجودہ انقلابی قیادتیں، جو صرف ماسکو کی خیمہ بردار ہیں، کامیاب ہو گئیں، تو خدانخواستہ عرب دنیا اسلام سے اتنی دور ہو جائے گی کہ پھر اس کو اسلام کی طرف لانے کے لئے کسی معجزے کے ظہور، اور کسی مسیحا نفس داعی اور مجدد کے پیدا ہونے کی ضرورت ہوگی، صرف اتنا ہی نہیں بلکہ اس کی خداداد صلاحیتیں، اور اس کی بے نظیر قوت عمل، اسلامی اثرات کے ازالہ میں صرف ہوں گی، جس کے آثار اس وقت بھی ان ممالک میں دیکھے جا سکتے ہیں، آج وہاں دین کے داعیوں کی ''سرکوبی'' اور دینی شعائر کے مٹانے کے لئے اس عزم و صلاحیت کا اظہار کیا جا رہا ہے جس کی نظیر غیر اسلامی ملکوں میں ملنی مشکل ہے، میں اِس حقیقت کے اظہار کے لئے دل سے معذرت خواہ ہوں۔

ہمارے ملک کے بہت سے علماء کی سطحی قسم کی سیاسی دلچسپیاں ترکی کے پچھلے دور کے علماء کی طرح اتنی بڑھ گئی ہیں کہ ان کو فکر و مطالعہ اور روزمرہ کے واقعات و حقائق کے ساتھ اپنے کو ہم آہنگ رکھنے کا موقع نہیں ملتا، اس کا نتیجہ ہے کہ ان کو بہت سے انقلابات کی اس وقت خبر ہوتی ہے، جب وہ اپنے نقطہ عروج پر پہونچ جاتے ہیں،

اوران کے فطری نتائج ظاہر ہونے لگتے ہیں، یہی معاملہ ترکی کے انقلاب کے موقع پر پیش آیا کہ ہمارے علماء عرصہ تک (اور شاید بعض اب بھی) کمال اتاترک کو اسلام کا بطل اعظم اور مجدد سمجھتے رہے، اوران کو اس کے دورس اقدامات اور ترکی کو مغرب کے سانچے میں ڈھالنے کی کوششوں کا علم اس وقت ہوا جب وہ اپنی آخری شکل کو پہنچ گئیں اور اس کا خطرہ محسوس ہونے لگا کہ ترکی کا رشتہ عالمگیر اسلامی برادری یہاں تک کہ اپنے ماضی اور اپنی قدیم ثقافت سے بالکل منقطع ہو جائے گا۔

علماء کے اس طبقہ کی جو سیاسی مزاج رکھتا ہے، دوسری کمزوری یہ ہے کہ وہ جب کسی مسلمان قائد کو کسی مغربی طاقت کو چیلنج کرتے ہوئے اور اس سے آنکھیں ملاتے ہوئے دیکھتا ہے، یا وہ کسی موقع پر کسی مغربی طاقت بالخصوص برطانیہ کو زک پہنچا دیتا ہے، تو پھر وہ اس کارنامہ کو اس کی عظمت کے لئے کافی سمجھ لیتا ہے، اور پھر وہ نہ صرف اس کوتاہیوں اور نافہمیوں سے چشم پوشی ضروری سمجھتا ہے، بلکہ بعض اوقات اس کی اسلام دشمنی بھی اس کی نظر میں کچھ زیادہ قابل لحاظ ولائق التفات نہیں ٹھہرتی، اور وہ اس پر ادنیٰ سی تنقید بھی گوارا نہیں کرتا بلکہ بعض اوقات تنقید کرنے والے کو پوری ناخدا ترسی کے ساتھ ضمیر فروش اور برطانیہ نواز یا امریکہ کے زرخرید کا خطاب دینے لگتا ہے۔

اصل معیار اسلام سے وابستگی اور ناوابستگی

کسی حقیقت پسند و متوازن انسان کے لئے بھی یہ رویہ مناسب اور درست نہیں چہ جائے کہ ان لوگوں کے لئے جن کو محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے جانشین اور ان کے دین و شریعت کے وارث وامین ہونے کا دعویٰ ہے، اور جو چاہتے ہیں کہ دنیا ان کو اس نگاہ سے دیکھے جن کا اس طبقہ سے انتساب اور تعلق ہے، جس کی پسندیدگی

و ناپسندیدگی حمایت و مخالفت کا اصل معیار، ایمان و عقیدہ کا مسئلہ اور اسلام سے وابستگی کا و ناوابستگی کا سوال تھا، ان کے سامنے تو حضرت عمرؓ حضرت علیؓ کا اسوہ ہونا چاہیے ان کے نزدیک حدود شریعت کی حفاظت کے لئے ایک قیمتی شخص کا ضائع کر دینا اور آئی ہوئی سلطنت کا کھو دینا جائز اور معقول تھا۔

"یہ تو آباء تھے تمہارے"

اور صحابہ اور ائمہ اسلام کے اس عمومی نمونے کے علاوہ خود ان کے اکابر کا اسوہ ان کے سامنے ہونا چاہیے، انھوں نے اپنی زندگی کے آخری لمحے تک اصول و عقائد تو الگ رہے، بدعات و رسوم کے ساتھ بھی رواداری نہیں برتی، اور بہت سے اصلاحی و تبلیغی فوائد کے باوجود جو ان کے اختیار کرنے میں متوقع تھے، ان سے اختلاف ہی کرتے رہے اور عوام کی ایک بڑی تعداد کی ملامت و اعتراض کا نشانہ بننا گوارا کیا، انھوں نے کسی شخص کی ظاہری ترقی، مادی کامیابی اور اس کی سیاسی فتوحات کی بنا پر اس کے دینی انحراف یا عمل تحریف کو معاف نہیں کیا، اور اس کا پوری اخلاقی جرأت کے ساتھ احتساب کیا، اور بعض اوقات ان کو یہ فرض، عوام کے جذبات اور زمانے کے سیلاب کے خلاف ادا کرنا پڑا، اور وہ "كلمة حق عند سلطان جائر" کے ثواب کے مستحق ہوئے۔

جہاں تک صدر ناصر کی ذات اور قیادت کا تعلق ہے، ان کو تو اتاترک کی طرح کوئی ایسی "فتح مبین" بھی حاصل نہیں ہوئی، جس کی وجہ سے کسی کو صحیح فیصلہ کرنا مشکل ہو جاتا، بلکہ معاملہ بالکل برعکس ہے، اس پندرہ سولہ برس کی مسلسل تیشہ زنی اور "کوہ کنی" کا ماحصل اور خلاصہ "کوہ کندن و کاہ برآوردن" کے سوا کچھ نہیں نکلا، یہ ممالک جوان ڈکٹیٹروں کے اقتدار میں ہیں، اپنے بہترین فرزندوں اور منتخب

مردان کار سے محروم ہو گئے ہیں، دینی، اخلاقی، علمی اور حد یہ کہ سیاسی اور معاشی حیثیت سے بھی یکسر دیوالیہ اور کھوکھلے ہیں، عام زندگی پورے طور پر مفلوج ہو کر رہ گئی ہے زندگی کی کوئی نشان وعلامت اور اظہار خیال کی کوئی آزادی پائی نہیں جاتی، معاشی حیثیت سے سخت تباہ حال وخستہ ہیں، ملک کی آمدنی کے تمام وسائل وذخائر ایک ذات کے پروپیگنڈے اور اس کی پارٹی کی تشہیر اور حفاظت میں صرف ہو رہے ہیں، ایک عام شہری اس سے زیادہ تباہ حال ہے، جتنا استعمار کے منحوس دور یا شخصی سلطنت کے معتوب عہد میں تھا، زندگی، ضمیر، روح، کسی کو بھی کوئی آسودگی اور لذت حاصل نہیں، چشم دید گواہوں کا بیان ہے کہ ایک فاروق کے بجائے اب ہر بڑا فوجی افسر اور پارٹی کا لیڈر فاروق بنا ہوا ہے، یہ وہ سب حقائق ہیں جواب دنیا کے سامنے آچکے ہیں، ان پر پردہ نہیں ڈالا جا سکتا ہے۔

امید کی ایک کرن تھی مگر ۔۔۔۔

امید کی صرف ایک کرن تھی، جو ان ساری تاریکیوں پر حاوی وغالب ہو سکتی تھی، وہ یہ کہ فلسطین کو آزاد کرالیا جائے گا، اسرائیل کو اگر پورے طور پر تباہ نہ کر دیا جائے گا، تو کم سے کم اس کے جرائم کی ایسی سزا دی جائے گی کہ وہ برسوں تک عربوں کی طرف نظر اٹھا کر نہ دیکھ سکے گا، اس پندرہ برس کے عرصہ میں سب سے زیادہ اسی کی امید دلائی جاتی رہی، اسی نام پر عربوں کو اتحاد کی دعوت اور قومیت عربیہ کے جھنڈے کے نیچے آنے کا پیام دیا گیا، اسی کی خاطر ماسکو اور کمیونسٹ ممالک سے روابط پیدا کئے گئے، اور عربی خودداری، اسلامی غیرت، اور کمیونسٹ ممالک سے تعلقات کے نتائج کو نظر انداز کر کے اسلحہ، جنگی وسائل وحربی ذخائر کی دریوزہ گری میں کوئی دقیقہ نہیں اٹھا رکھا گیا، مصر کی قیادت نے اخیر دنوں میں ببانگ دہل یہ اعلان کرنا شروع

کردیا کہ ہم اسرائیل کو صفحہ ہستی سے مٹا کر رکھدیں گے، اور ایسا ہونا ان تیاریوں کے پیش نظر اور ان تقریروں اور اعلانات کی روشنی میں جن سے زمین و آسمان بھر گئے تھے، قرین قیاس تھا، اس میں تو کسی کو بھی شبہ نہ تھا کہ اسرائیل کو اس مقابلہ میں ایسی زک اٹھانی پڑے گی کہ وہ برسوں جنگ کا خواب نہ دیکھ سکے گا، بات صرف یہیں تک محدود نہیں رہی بلکہ مصر نے آبنائے تیران اور خلیج عقبہ کی ناکہ بندی کردی اور اسرائیل کے جہازوں کو گزرنے کی اجازت منسوخ کردی، اقوام متحدہ کے فوجی حفاظتی دستہ کو ہٹ جانا پڑا۔

مصر میں جنگ کا بادل برسنے کو تلا کھڑا تھا، اور ساری دنیا کی نگاہیں اس کے افق پر لگی ہوئی تھیں، کہ اسرائیل نے حملہ کردیا، لوگ ان ۱۵ ربرسوں کی تیاری کا نتیجہ دیکھنے کے لئے سراپا اشتیاق تھے، کہ اچانک مصری فوجوں کی پسپائی کی خبریں آنے لگیں، اسرائیل کے ہوائی حملے نے چند گھنٹوں میں مصر کی فضائی طاقت کا خاتمہ کردیا، یہودی (جن کی بزدلی کم سے کم عالم اسلام میں ضرب المثل تھی) یلغار کرتے ہوئے چلے آئے اور ان کو کہیں بھی روکا نہ جاسکا جزیرہ نمائے سینا پر یہود کا قبضہ ہوگیا، تیران عقبہ سے مصری فوجیں بے دخل ہوگئیں، نہر سوئز کو بند کردینا پڑا اور اس پر یہودیوں نے اپنے حق کا دعویٰ کرنا شروع کردیا، اس طرح صدر ناصر کے اس سب سے بڑے کارنامہ پر بھی پانی پھر گیا، اردنی علاقہ میں الخلیل کا محبوب اسلامی شہر جس کو مدفن خلیل ہونے کا شرف حاصل ہے، اور نابلس کا گلزار و پررونق شہر یہودیوں کے قبضے میں چلے گئے، سوئز کے پورے مشرقی ساحل پر اسرائیل کا اس طرح قبضہ ہوگیا کہ سوئز کا مغربی ساحل اور اس کے مصری شہر ہر وقت اسرائیل کی زد میں آگئے ہیں اور پورا ملک خطرہ میں۔

اندوہ ناک بات

سب سے زیادہ اندوہناک بات یہ ہوئی کہ مسجد اقصیٰ آٹھ سو برس تک مسلمانوں کی تولیت میں رہنے کے بعد یہودیوں کے قبضے میں چلی گئی اور پورے دو ہزار برس کے بعد یہودی اس پر قابض و متصرف ہوئے، دو ہزار برس سے یہودی بیت المقدس کی دیوار گریہ کے نیچے کھڑے ہو کر اپنی بداعمالیوں اور نامرادیوں کا ماتم کرتے تھے، اور یہ ان کی ایک دینی سنت، اور موروثی فریضہ تھا، اس فتح کے بعد ان کے سب سے بڑے عالم اور مذہبی پیشوا خام نے اس رسم کو موقوف کیا کہ اب اس کی ضرورت نہیں۔

بدترین خود پرستی اور بے دانشی

جنگوں میں بہت سی خلاف قیاس باتیں پیش آئی ہیں، اور ملکوں اور سلطنتوں کی شکست تاریخ کا کوئی غیر معمولی واقعہ نہیں، لیکن ایک صاحب عقیدہ اور صاحب کردار قوم کی قوت مدافعت اس کی معنوی طاقت، اس کا اپنے عقائد کی صحت اپنے مقاصد کی عظمت پر یقین، نیز قائد کی قائدانہ صلاحیت، برسوں ایک اقلیت کو ایک اکثریت کے سامنے ایک چھوٹے ملک کو بڑے ملک کے سامنے صف آرا اور نبرد آزما رکھتی ہے۔ اور بعض اوقات اس سے جنگ کا پانسہ پلٹ جاتا ہے، یہاں تو ایک وسیع عرب دنیا کا مقابلہ چھوٹی سی اسرائیلی ریاست سے تھا، جو عرب ملکوں سے گھری ہوئی تھی، لیکن دنیا نے استعجاب اور مسلمانوں نے بڑے کرب و الم کے ساتھ پانچویں دن یہ سن لیا کہ عربوں کی مرکزی قیادت (مصر) نے جنگ بندی منظور کر لی، عالم اسلام کی آنکھیں کھلی کی کھلی رہ گئیں، اور مسلمانوں کا سر ندامت و ذلت سے جھک گیا، میں اپنے محدود مطالعۂ تاریخ کی بنا پر یہ عرض کر سکتا ہوں کہ سقوط بغداد کے بعد سے پوری

دنیائے اسلام میں مسلمانوں کو اتنی بڑی ذلت کا کبھی اور کہیں سامنا نہیں ہوا، اس لحاظ سے یہ بات اور بھی سنگین تھی کہ نیم وحشی، صحرا نشیں تاتاریوں کے برخلاف یہودی اپنی بزدلی، زندگی اور دولت کی محبت اور اپنی طویل و عالمگیر غلامی کے لئے ساری دنیا میں بدنام و ذلیل تھے، مسلمانوں کی گھٹی میں یہ بات پڑی ہوئی تھی کہ یہودی ہمیشہ غلام و ذلیل رہیں گے، اور وہ مرد میدان و اہل شمشیر و تفنگ نہیں، اس واقعہ سے مسلمانوں کے قلب و دماغ اور ان کے تاریخی حاسے اور تجربہ کو جو صدمہ پہنچا اس کا اندازہ نہیں کیا جاسکتا ان کے اعتماد علی النفس اور احساس عزت پر (جس پر صلاحیت کا اور عزم و ولولہ کا انحصار ہے) اس واقعہ سے جو چوٹ پڑی اس کے بیان کرنے کے لئے الفاظ نہیں، مصر میں اس سے جو دل شکستگی، احساس کہتری، اور افسردگی پیدا ہوئی اور جس طرح مصریوں کے قدم مختلف محاذوں سے اکھڑنے لگے، اسماعیلیہ کے مشہور شہر کی آبادی جس طرح عظیم تعداد میں تخلیہ کرتی نظر آئی، عام زندگی پر مایوسی کی جو تاریکی چھا گئی اس کا اندازہ کرنا کچھ مشکل نہیں، یقین کے ساتھ کہا جاسکتا ہے، کہ صدیوں سے عالم اسلام میں کسی ایک شخص کی خود پرستی و بے دانشی سے اتنا نقصان نہیں پہنچا، اور اس سے اتنا بڑا رقبہ زمین اور اتنا وسیع حلقہ متاثر نہیں ہوا، جتنا کہ صدر ناصر کی خود پرستی اور بے دانشی سے۔

احتساب، قوم کی زندگی کی علامت

قومیں خود اپنے اور اپنے قائدین کے احتساب سے زندہ اور باقی رہتی ہیں بعض جمہوری مزاج قوموں نے تو جنگ کے جیتنے والوں اور اپنے ملک کی عزت بچا لینے والوں تک کا احتساب کیا ہے اور ان کو اپنا کام ختم کر لینے کے بعد ریٹائر کر دیا ہے، قومیں بڑی بڑی شکستیں کھانے کے بعد سنبھل گئی ہیں، جرمن قوم ایک تباہ شدہ ملک کے ملبہ

کے نیچے سے زندہ و توانا نمودار ہوئی، جاپان نے ہیروشیما اور ناگاساکی کے المیہ کے بعد اپنی زندگی کا نیا سفر شروع کیا، یہ سب بے لاگ احتساب، بے لوچ اعتراف، اور قیادت کی صالح تبدیلی سے عمل میں آیا، ہم کو امید ہے کہ احتساب کا یہ فرض خلوص اور جرأت کے ساتھ ادا کیا جائے گا، ایک غیر جانبدار نقاد، اور ایک بے لاگ مؤرخ کی طرح ان غلطیوں اور کمزوریوں کی نشاندہی کی جائے گی، جن کی وجہ سے سنت اللہ کے مطابق یہ شکست برداشت کرنی پڑی، اور پھر زندگی کی تبدیلی، ایمانی قوت، حقیقت پسندی اور اس ابدی آئین کی پابندی کے ساتھ جو قوموں اور جماعتوں کی فتح اور ارجمندی کے لئے خدا کی طرف سے مقرر ہوا ہے، اور جس کا تعلق عالم غیب سے بھی ہے اور عالم اسباب سے بھی، زندگی کا نیا سفر شروع کیا جائے گا، اور پھر یہ سب واقعات داستان پارینہ اور قصۂ کہن بن کر رہ جائیں گے۔ (۱)

صدر ناصر سے مخالفت کے اسباب مولانا نے خود جس تفصیل اور جس محتاط انداز میں بیان فرمادیئے ہیں اس پر مزید کچھ کہنے کی ضرورت نہیں ہے، البتہ قومیت کی تحریک کس درجہ عرب ممالک میں مقبول ہو چکی تھی اندازہ اس سے کیا جائے کہ ۱۹۶۱ء میں پنڈت جواہر لال نہرو وزیر اعظم ہند سعودی عرب کا دورہ کرنے والے تھے، اس وقت نجد کے مشہور جغرافیہ داں استاذ حمد الجاسر ایک ماہنامہ ''العرب'' نکالا کرتے تھے، اس کے اداریہ کا عنوان تھا مرحباً برسول السلام ''خوش آمدید پیغمبر امن'' اور جب پنڈت نہرو ظہران کے ہوائی اڈے پر پہونچے تو وہاں مقیم مصریوں نے جن کے ساتھ سعودی بھی تھے، اسی نعرہ "مرحباً برسول السلام" سے استقبال کیا۔

مکہ مکرمہ میں قومیت عربیہ نے یہ دن دکھایا کہ احمد السباعی (۲) اور محمد حسین

(۱) ندائے ملت لکھنؤ، ۴ راگست ۱۹۶۷ء بحوالہ عالم عربی کا المیہ، ص ۱۶۸۔

(۲) یہی احمد السباعی عرب نیشلسٹ تھے جنھوں نے حرم شریف کی توسیع کے خلاف مرحوم ملک فیصل سے کہا تھا کہ اب کافی توسیع ہو چکی ہے اس پیسے سے کارخانے لگائے جائیں۔

زیدان (یہ دونوں اپنے وقت کے صاحب قلم تھے، اصلاً مصری تھے، سعودی عرب میں بس گئے تھے) نے یہ لکھنا شروع کیا کہ قریش تاریخ کے امجاد میں داخل ہیں، ان میں ابولہب ہوں یا عمرو بن ہشام (جس کا لقب ابوجہل ہے) ان کا احترام ہمیں ملحوظ رکھنا چاہیئے، چنانچہ دار قریش کے نام سے ایک دارالاشاعت کا قیام عمل میں آیا اور دارالندوۃ کے احیاء کی اپیل ہونے لگی، اور اسی مناسبت سے ''الندوۃ'' نامی ایک ہفتہ وار پرچہ نکالا۔ جس کو استاذ احمد محمد جمال اور ان کے بڑے بھائی صالح محمد جمال (رحمۃ اللہ علیہما) نے خرید کر ''مسلمان کیا'' دار قریش کے تحت ایک تھیٹر بنایا جارہا تھا جس میں اسلام اور ماقبل اسلام کی تاریخ کو ڈراموں کی شکل میں پیش کیا جانے والا تھا، اس کے لئے ایک عمارت بھی بن چکی تھی، مگر علماء نجد کی بروقت گرفت اور دخل اندازی نے اس فتنہ کو دفن کیا، شام تو پہلے سے قومیت کا داعی تھا، کیونکہ وہاں عیسائیوں اور شیعوں کے تمام فرقے موجود تھے، اور فرنچ تہذیب نے وہاں دین سے بیگانگی کے لئے زمین ہموار کر رکھی تھی، لبنان میں تو عیسائیوں کی اکثریت دکھائی گئی ہے جواب تک ہے اور جہاں کا صدر دستور کے مطابق کوئی عیسائی ہوتا ہے، یمن، عدن، جیسی چھوٹی چھوٹی ریاستیں عرب قومیت کا نعرہ لگانے والوں میں پیچھے پیچھے تھیں، مغربی پٹی کی طرف دیکھئے جس میں الجزائر، مراکش، لیبیا، اور تیونس ہیں تو نظر آئے گا کہ الجزائر پر کمیونسٹوں کا قبضہ تھا(۱) مراکش میں شاہی نظم تھا، جواب تک چل رہا ہے، اس لئے سرکاری طور پر کمیونزم کا پروپیگنڈہ نہیں چل سکا، مگر یونیورسٹی کے طلبہ کے اندر شورش تھی، لیبیا کے صوفی منش، شاہ ادریس السنوسی کو معزول کر کے ایک فلسطینی الاصل کرنل قذافی قابض ہو گئے، اور فرانس کے ملٹری اسکول کے تربیت یافتہ فوجیوں نے ان کا ساتھ دیا، وہ صدر ناصر کے قوت بازو تھے،

---

(۱) یہ ملک جو بیس لاکھ مسلمانوں کی قربانیوں سے آزاد ہوا تھا، فرانس کے استعمار سے نکلا اور سوویت یونین کی گود میں گرا۔

بلکہ ان سے دو قدم آگے، سب سے پہلے ان کو قرآن کی اصلاح کی سوجھی، اس کو مختصر کر کے اور نئی ترتیب سے پیش کرنے کی تجویز کی، مثلاً قل هو الله احد، میں سے قل نکال دو، کیونکہ یہ تو حکم ہے، حضرت موسیٰ علیہ السلام کے قصے جو قرآن میں آئے ہیں ان کو انجیل سے ملا کر دیکھا جائے، اور مکررات کو حذف کر کے اور ٹوٹی کڑیوں کو انجیل سے لے کر جوڑا جائے، اور جو متضاد ہو اس کو حذف کیا جائے، مگر یہ آواز اس قدر نامانوس تھی کہ ہزار در ہزار افراد کے قتل کر دینے سے بھی کام نہیں چلتا، اس لئے حکمت و سیاست اور ''وقت حاضر کے تقاضوں'' کو اور موجودہ عصر کے ''فلسفۂ حیات'' کو سمجھانے کے لئے سبز کتاب وجود میں آئی اور ریڈیو ٹیلی ویژن سے نشر کیا جانے لگا، جس کا سلسلہ جاری ہے، اور اس سبز کتاب نے قرآن کا درجہ حاصل کر لیا، تیونس کے صدر احمد بورقیبہ نے اعلان کیا کہ اگر کوئی ''مولوی صاحب'' رمضان کے روزوں کی ترغیب دیں گے تو ان کو سزا دی جائے گی، کیونکہ اس سے مزدوروں کی قوت عمل کمزور ہوتی ہے، خلاصہ یہ کہ اسلام سے جب رشتہ ٹوٹا تو قومیت کے فدائی کن کن کھائیوں اور کھڈ میں گرے ان کی داستان قابل عبرت ہے، ضلوا ضلالا بعیدا (بہک کر بہت دور نکل گئے)۔

اور یہ سب شاخسانہ ہے مغرب کی نیشلزم کو اپنانے کا، اور یہی مقصد تھا مغرب کی استعماری طاقتوں کا اور مشرق کے یہودیوں کا جنہوں نے اپنے چہروں پر کمیونزم کا پر فریب نقاب ڈال رکھا تھا، اس زمانے کے حالات کا جائزہ لینے والوں کو معلوم ہوگا کہ مصر، شام الجزائر، یمن ہر جگہ نعرہ دیا گیا قومیت کا اور عملاً سب سوویت یونین کے تابع تھے، گویا قومیت عربیہ کمیونزم کا ایک پردہ تھا، اس لئے کہ جہاں جہاں قومیت کی تحریک اٹھی وہاں اشتراکیت کے افکار (سوویت یونین کے مفہوم میں) اور فلسفہ حیات نے اپنی جگہ بنالی۔

یہ باب تشنہ رہ جائے گا اگر اس دور کا ذکر نہ کر دیا جائے کہ عرب ممالک میں کمیونزم جو قومیت کا لبادہ اوڑھ کر آئی، اس کا انجام کیا ہوا؟ اس دور کے مؤرخ کے سامنے قومیت کے عروج اور زوال کی مکمل تاریخ ہے، اس کے سامنے وہ ایام بھی ہیں جب صدر جمال عبدالناصر پورے عرب ممالک کے ہیرو تھے۔

صدر ناصر کی پے در پے کامیابیاں، برطانیہ، امریکہ اور اسرائیل کا سہ طرفی مصر پر حملہ اور اس کا ناکام رہنا اور روس کی دخل اندازی پر ان طاقتوں کا سویس سے بے نیل مرام واپس جانا، نہر سویس کی تأمیم (قومیانے) کے واقعہ سے زیادہ اہم تھا، پھر نہر سویس کو بند کر کے مصر پورے مشرق وسطیٰ ہی کا نہیں بلکہ پورے مشرق ممالک کا ہیرو بن گیا تھا، جس نے کمیونزم کے لئے عربوں اور غیر عربوں دونوں کے دل و دماغ کے دروازے کھول دیے تھے، مصر کے ریڈیو کا ایک پروگرام "صوت العرب" کے نام سے ۲۴ گھنٹے کام کرتا تھا، اس کے تبصرے، اور اس تبصرہ کو پڑھنے والے "احمد سعید" کی آواز الجزائر سے لے کر خلیج کی آخری سرحد تک گلی گلی میں سنی جاتی تھی، عوام اور سیاسی ذہن رکھنے والے تو الگ رہے، خود علمائے وقت جو دل سے اشتراکیت سے نفرت رکھتے تھے، خوشامدانہ لہجہ اختیار کرنے پر مجبور تھے، راقم نے مصری ریڈیو سے ایسے علماء کے درس قرآن بھی سنے ہیں جس میں ایک عالم فرما رہے تھے کہ اسلام نے کسی ہنر کو فرد کی ملکیت نہیں قرار دیا، علم کی دولت اگر کسی کے پاس ہے تو اس کو چاہئے کہ دوسروں کو دے، تاکہ اشتراکیت فی العلم کی روح پر عمل ہو، گویا اشتراکیت مال میں یا سیاست میں تو تسلیم شدہ ہے، علم میں بھی "الاشتراکیة" ہے یہی انداز فکر سیاست کے ایوانوں اور ریڈیائی تقریروں سے لے کر مسجدوں اور خانقاہوں میں عام ہو گیا تھا۔

افسوسناک انجام

۵ر جون ۱۹۶۷ء کو مصر کی ذلت آمیز شکست ہوئی جس کی تفصیل دنیا کو معلوم

ہے اگر اس معرکہ میں مصر کامیاب ہوتا، تو تنہا جمال عبدالناصر کی کامیابی ہوتی اور کمیونزم کی جڑیں صرف مصر ہی میں نہیں بلکہ من المحیط الی الخلیج (بحر سے خلیج تک) مضبوط ہو جاتیں، مگر جب شکست ہوگئی تو تمام عرب ممالک نے اپنی شکست سمجھا اور مسلمانان عالم جن کو قومیت عربیہ نے کاٹ کر علاحدہ کر دیا تھا اقوام عالم کے سامنے شرمندہ ہوئے۔

قومیت عربیہ، جیسا کہ لفظ سے ظاہر ہے عربوں کو متحدہ کر کے مغربی طاقتوں اور اسرائیل سے نبرد آزما ہونے کی تحریک تھی، مگر کیا یہ واقعہ کبھی رونما ہوا کہ عرب متحد ہو گئے ہوں؟ تاریخ گواہ ہے کہ اسلام کے علاوہ کسی طاقت نے عربوں کو کبھی متحد نہیں کیا، جمال عبدالناصر کے انتقال کے بعد جب حکومت کی باگ ڈور انور السادات نے اپنے ہاتھوں میں لی اس وقت ملک (مصر) کی کیا نوعیت تھی، اس کا ذکر صدر انور السادات اپنی خودنوشت "البحث عن الذات" میں اس طرح کرتے ہیں:۔

كانت التركةالتى ورثتها من عبدالناصر فى حالة يرثى لها. فمن الناحية السياسية وجدت أنْ علاقتنا مقطوعة مع جميع انحاء العالم ماعدا الاتحاد السوفيتى وفى العالم العربى ساد مانادى به عبدالناصر وسمى بالتقد يمية والرجعية وبناء على هذا التقسيم التعسفى كان يقيم أولا يقيم علاقاته بدول الأمة العربية . وقد أخذ درساً حين رأى أن الذى وقف الى جانبه بعد هزيمة سنة ١٩٦٧ كانوا من ظل طول حياته يصفهم بالرجعية

مثل السعودية والكويت والملك السنوسي ملك ليبيافهم الذين دعموه بالمال بعد الهزيمة.

عبدالناصر سے جو مجھے وراثت میں ترکہ ملا وہ لائق ماتم ہے سیاسی لحاظ سے میں نے دیکھا کہ سوائے سوویت یونین کے ساری دنیا سے ہمارے تعلقات کٹے ہوئے ہیں اور عرب ممالک میں جس کو عبدالناصر نے دوحصوں میں بانٹ رکھا تھا، ''ترقی پسند'' اور ''رجعت پسند'' یہی تقسیم قائم تھی، اور اسی مجرمانہ سخت گیر تقسیم کی بنیاد ہی پر کسی سے اتحاد یا اختلاف ہوسکتا ہے۔

اس کو ایک سبق یہ بھی ملا کہ جن ملکوں نے مصر کو شکست کے بعد ان کو مالی مدد دی وہ وہی عرب ممالک تھے جن کو عبدالناصر رجعت پسند کہا کرتے تھے، جیسے سعودی عرب، کویت اور لیبیا کے (سابق) بادشاہ شیخ سنوسی۔

جیسا کہ اوپر عرض کیا کہ اگر اسرائیل سے جنگ میں مصر کامیاب ہوتا تو تنہا اور صرف تنہا جمال عبدالناصر کی کامیابی ہوتی، اور جب ناکامی ہوئی تو وہ تمام مسلمانوں اور عربوں کی ناکامی ہوئی، یہی وہ بات تھی جس کی طرف ہندوستان کے مرد درویش، مولانا سید ابوالحسن علی ندوی نے توجہ دلائی تھی، اور ان کی سرپرستی میں نکلنے والے مجلّہ (البعث الاسلامی) مسلسل لکھتا رہا، کہ قومیت کے نام پر اتحاد کا مطلب یہ تھا، کہ سب متحد طاقت ہو کر اسرائیل کا مقابلہ کرتے، لیکن عرب قومیت کی بنیاد ہی اس پر پڑی تھی کہ وہ اسلام کے بجائے ایک دین اور تہذیب بن کر ابھرے، اور یہ عرب کے یہودی و مسیحی چاہتے تھے، اور یہی مغرب کی پلاننگ تھی، اور یہی سوویت یونین کی اسکیم تھی، اگر کوئی اس کو تفصیل سے سمجھنا چاہے تو مولانا کے مضامین جو اس موضوع سے متعلق ہیں، ''عالم عربی کا المیہ'' پڑھ لے اور اگر تحقیق کرنا چاہے تو انورالسادات مرحوم

سابق صدر مصر کی خودنوشت سوانح عمری کا مطالعہ کرلے، جن سے زیادہ مصری سیاست، قومیت، اور کمیونزم کا محرم راز دوسرا نہیں ملے گا، جو شروع سے آخر تک صدر ناصر کے ساتھ رہے، آخر میں اس کتاب البحث عن الذات سے چند سطریں نقل کرتا ہوں جس سے معلوم ہوگا کہ اس عہد میں مصری ریڈیو نے کس درجہ عوام کو حقیقت سے دور رکھا تھا، جون ۱۹۶۷ء کی شکست کے بعد جب بقول صدر انور السادات کے ہم سب ایک طرح کی نفسیاتی اضطراب سے گزر رہے تھے اور روس بھی زبانی جمع خرچ سے زیادہ کوئی مدد نہیں پہنچا رہا تھا، ایک عالم بے خودی (ذہول) ہم پر طاری تھا، (۱) میرا روزانہ کا معمول چار کیلو میٹر ٹہلنے کا تھا، اس روز نہ جانے کتنے کیلو میٹر کی مسافت میں نے بے خودی میں طے کرلی، اس زمانے میں جب کہ ہمارے شکست کی خبر تمام دنیا میں پھیل چکی تھی، مصر کے عوام کو بتایا گیا تھا کہ ہماری فتح ہو رہی ہے، عوام خوشی سے ناچ رہے تھے، صدر انور السادات لکھتے ہیں:۔

ومما كان يزيدفى ذهولى وتمزق نفسى ماكنت أشاهده يومياًمن جماهير الشعب وقد امتلأت بها اللوريات قادمة من مديرية التحرير وهى تسد شارع الهرم الواسع العريض. كانت تسير متراصة والجميع يهتفون ويهللون ويرقصون فرحاًبا لنصر المزعوم الذى تذيعه عليهم أجهزةالاعلام ساعة بعد ساعة.

كانت فرحتهم بالنصرتثير فى نفسى احساساً

---

(۱) انور السادات، البحث عن الذات، باب ۴، ص ۲۹۰، اس کتاب کا انگریزی فرنچ جرمن، الین، ملیین، عراقی، ڈنمارکی، اسپین، اور جاپانی زبانوں میں ترجمہ ہو چکا ہے، برصغیر کے حضرات انگریزی ترجمہ کا مطالعہ کرسکتے ہیں۔

قويأبالاشفاق عليهم والأسى لهم والحنق على من كانوا السبب فى خداعهم وخديعة مصر بأكملها.لقد تمنيت على الله وأناأراقب مواقب النصرهذه، الصادقة الزائفة معاً، أن يصيبنى بأزمة قلبية كالتى أصابتنى سنة ٦٠ حتى لا أعيش لأرى حال هذا الشعب الطيب الكريم عند ما يفيق على الحقيقة و يعرف أن هذا النصر الذى زينوه لهم ليس الا كارثة رهيبة نزلت بهم.(١)

میری حواس باختگی کو جو بات بڑھا رہی تھی، جس سے میرا کلیجہ پھٹ رہا تھا، وہ مناظر تھے جن کا میں روزانہ مشاہدہ کر رہا تھا، عوام بڑی لاریوں میں بھرے ہوئے سامنے سے گذر رہے تھے، ان لاریوں کا ایک سلسلہ تھا ایک کے پیچھے دوسری، تعداد میں اتنی زیادہ کہ شارع الہرم جو بہت لمبی چوڑی سڑک ہے اس سے گزرنا بہت مشکل ہو گیا تھا، یہ لاریاں میدان تحریر سے نکلا کرتی تھیں، اور اس پر سوار عوام نعرے لگاتے تالیاں بجاتے اور خوشی سے ناچ رہے تھے، ایک فرضی کامیابی پر جس کی خبر ہر گھنٹے گھنٹے پر ہمارے وسائل اطلاعات نشر کر رہے تھے۔

فتح ونصرت کی خبروں پر اس عوام کا رقص وسرور میرے دل میں ان پر انتہائی ترس پیدا کر رہا تھا، دوسری طرف ان لوگوں پر طبیعت کے اندر انتہائی غصہ پیدا ہو رہا تھا، جو ان عوام کو ایسے ریڈیائی بیان سے دھوکہ دے رہے تھے وہ عوام ہی کو نہیں بلکہ پورے مصر کو دھوکہ دے رہے تھے۔ میں اپنی آنکھوں سے مسرت اور خوشی کے وہ

---

(١)انور السادات: البحث عن الذات ص ٢٢٨

جلوس دیکھ رہا تھا جن کی مسرت بناوٹی نہیں تھی لیکن جس بات پر ان کو مسرت تھی وہ بناوٹی اور دھوکے میں ڈالنے والی تھی مجھے بار بار یہ محسوس ہوا کہ کہیں اس طرح کا قلبی دورہ نہ پڑ جائے جو ۱۹۶۰ء میں پڑا تھا، اور میں وہ وقت نہ دیکھ سکوں جبکہ ہماری شریف دل، محبت کرنے والی قوم حقیقت سے آگاہ ہوگی اور جب وہ جانیں گے کہ فتح ونصرت کے جو مناظر انھیں دکھائے گئے تھے وہ درحقیقت ایک خوفناک حادثہ تھا جس سے وہ دوچار ہوئے تھے۔

لیکن یہ حالات دیرپا نہیں رہے، البتہ عوام کو طرح طرح سے مختلف قسم کے نعروں میں مشغول رکھا گیا، البتہ قومیت کا نعرہ کھوکھلا ہوکر رہ گیا، اس کا پشت پناہ روس جواب صدر مصر کے خط کا جواب بھی نہیں دیتا تھا، جمال عبدالناصر کے ناگہانی انتقال کے بعد صدر انور السادات کو حقائق کا سامنا کرنا پڑا، بیس ہزار روسی مشیروں کو ملک سے نکالا، امریکہ سے تعلقات استوار کئے، اسرائیل کے آگے جھکے، کمیونزم کا بخار ٹوٹا، اور اس کے ساتھ قومیت کی تحریک بھی سرد خانے میں رکھی گئی، وہ لوگ جو اسلام کو عجائب خانہ میں رکھنے کی تجویز کررہے تھے، خود تاریخ کے لئے عبرت بن گئے۔



مولانا کی تصانیف

تعداد کے لحاظ سے ۱۷۶ کتابوں کی فہرست ۱۴۱۹ھ میں مولانا محمد طارق زبیر ندوی نے شائع کی ہے، اردو کتابیں اس کے علاوہ ہیں جن میں اکثر وہ جو آپ کی عربی تصنیفات کا ترجمہ ہیں، اور چند کتابیں ایسی ہیں جو اصلاً اردو میں لکھی گئی تھیں، ان کے عربی ترجمے ہوئے، ایسی کتابیں جو صرف ایک ہی زبان میں ہوں بہت کم ہیں، یہ تو تعداد (کمیّت) کی بات ہوئی۔

کیفیت و معنویت کے لحاظ سے دیکھئے تو معلوم ہوگا کہ اللہ تعالیٰ کی توفیق خاص نے آپ کے قلم کو قبولیت اور تحریر کو نورانیت عطا فرمائی ہے، جو کتاب لکھی اس کو پسند کرنے والے پہلے وہ حضرات ہوئے جو اس فن کے مرد میداں تھے، جس فن پر وہ کتاب لکھی گئی۔

مولانا نے سیرت احمد شہیدؒ کے عنوان پر عربی میں ایک مقالہ ۱۶ سال کی عمر میں لکھا تھا جس کو پسند کرنے والے علامہ تقی الدین ہلالی اور علامہ رشید رضا تھے، علامہ رشید رضا نے اس کو کتابی شکل میں بھی شائع کیا، یہ مولانا کی عربیت کی سند تھی، جو دلائل الاعجاز اور اسرار البلاغۃ کے شارح اور مفتی محمد عبدہ کے علمی جانشین نے دی، جو اپنے زمانہ میں عالم اسلامی کے مقبول و معروف مفسر قرآن اور محقق تھے۔

اس موضوع پر اردو میں جب ایک کتاب لکھی تو اس کی قدردانی کرنے والے حکیم الامت مولانا اشرف علی تھانوی، مولانا سید حسین احمد مدنی، علامہ سید سلیمان ندوی تھے، ہندوستان کے علمی افق پر ایک ماہ تابندہ ہو کر یہ کتاب نمودار ہوئی، جب عربی میں ماذا خسر العالم بانحطاط المسلمین لکھی تو مصر و شام کی یونیورسٹیز کے ماہر اور تاریخ امم کے بڑے بڑے اسکالرس نے ہاتھوں ہاتھ لیا، علامہ شام شیخ محمد المبارک جو زبان و بیان اور اجتماعیات اور فن تاریخ میں اتھارٹی تسلیم کئے گئے تھے، انہوں نے اس کتاب کو اس صدی کی بہترین کتاب قرار دیا۔

بچوں کی تعلیم کے لئے جب عربی میں ریڈریں قصص النبیین اور القراءۃ الراشدۃ لکھیں تو اس کی قدردانی اور اعتراف کرنے والوں میں سید قطب (شہید) تھے، جنہوں نے خود اسی مقصد سے چند ریڈریں لکھی تھیں، دنیا میں قیمت و اہمیت اسی رائے کی ہوتی ہے، جو اہل اختصاص اور فن کے ماہرین نے دی ہو، طاقت وہی طاقت کہلائے گی جس کو اہل قوت نے تسلیم کیا ہو، اور اس کا لوہا مانا ہو، ثانویہ درجات کے طلبہ کے لئے مختارات لکھی، تو سعودی وزارت تعلیم کے ماہر فضلاء نے اس کو نصاب مطالعہ میں جگہ دی اور چالیس ہزار نسخے طلب کئے، جس کو کویت کے دار القلم نے فراہم کیا، عربی کے تسلیم شدہ ادیب، صاحب اسلوب انشاء پرداز استاد عبدالعزیز الرفاعی (علیہ الرحمۃ) نے اپنے المکتبۃ الصغیرۃ سے شائع ہونے والی کتاب کعب بن مالك میں لکھا ہے کہ

> ’’میں کعب بن مالک رضی اللہ عنہ کا ذکر بارہا پڑھ چکا تھا، لیکن ان کی یہ حیثیت کہ وہ ایک ادبی صلاحیت کے مالک تھے اور ان کے اندر واقعہ بیانی کی بھرپور قوت تھی اور یہ کہ ان کا بیان کردہ واقعہ ایک ادبی شہ پارہ ہے، استاد شیخ ابوالحسن الندوی کی مختارات

سے معلوم ہوا، اور جب اس نظر سے کعب بن مالک کا واقعہ
دوبارہ پڑھا تو محسوس ہوا کہ یہ ادبی شاہکار ہے"۔

مولانا نے "تاریخ دعوت وعزیمت" لکھی اس کا لفظ لفظ ان کے مرشد حضرت مولانا شاہ عبدالقادر رائے پوری اور شیخ الحدیث مولانا محمد زکریا رحمۃ اللہ علیہما نے سنا، اور ذکر کی مجلسوں میں اس کا اعادہ کرایا، تاریخ دعوت وعزیمت میں تزکیۂ نفس اور تربیت روحانی کا جو ذکر ہے وہ صوفیائے کرام کے یہاں مقبول ہوا، اس فن کے یہی بزرگان دین امام ہیں، ان بزرگوں نے اس کی قدردانی فرمائی۔

غرض یہ کہ جو کتاب لکھی، یا جو تقریر کی اس کی تحسین ان لوگوں نے پہلے کی جن کا وہ فن تھا، بہرحال ہم اس باب میں چند تصانیف کا ذکر کریں گے، کیونکہ ۱۷۸ کتابوں کی خصوصیات اس کے بارے میں اہل فن کی آراء، اس کے ترجموں کی تفصیل بیان کرنے کے لئے مستقل کئی جلدیں درکار ہیں۔



سیرت سید احمد شہیدؒ

"کیفیت ایمانی کے جاں نواز جھونکے تاریخ اسلام میں بارہا چلے ہیں، لیکن ایمان ویقین اور خلوص وللّٰہیت کی ایسی باد بہاری ہمارے علم میں کم از کم اس ملک میں اس سے پہلے نہیں چلی نہ اس سے پہلے اتنے بڑے پیمانے پر عزم و توکل، جوش جہاد، ایمان و احتساب، شوق شہادت اور یقین آخرت کے ایسے نمونے دیکھنے میں آئے، آدم گری اور مردم سازی، اصلاح وانقلاب کے ایسے محیر العقول واقعات بھی اصلاح وتربیت کی تاریخ میں نایاب نہیں تو کم یاب ضرور ہیں۔"

(مصنف نے کتاب کی ابتداء ان جملوں سے کی تھی، جس نے وسعت اختیار کی تو ایک کتاب بن گئی) یہی چند جملے سیرت سید احمد شہید کا خلاصہ اور عطر ہیں، پوری کتاب اسی محور پر گھومتی ہے، صرف اس پر نہ جایئے کہ یہ مختصر تحریر بہت دلکش اور شگفتہ ہے، قابل اہمیت بات یہ ہے کہ اس کے اندر بے انتہا توازن اور احتیاط ہے مثلاً یہ فقرے "ہمارے علم میں" کم از کم اس ملک میں" اسی طرح آخری جملہ" اصلاح وتربیت کی تاریخ میں نایاب نہیں تو کم یاب ضرور ہیں" راقم عرض کرتا ہے کہ تاریخ کی یہ

حقیقت پسندی نایاب نہیں تو کم یاب ضرور ہے، جن حضرات نے مشائخ واکابر کی سوانح عمریاں پڑھی ہیں، وہ اگر صداقت ووسعت قلبی کے ساتھ جائزہ لیں تو ان کو نظر آئے گا کہ اس توازن واحتیاط کی کوئی مثال اردو لٹریچر میں نہیں ملے گی، اگر یہی بات ہم روایات سوانح نویسی کے پابند ہو کر لکھتے تو عبارت کچھ اس طرح ہوتی۔

"سید الاصفیاء، امام الاتقیاء، وارث علوم نبوت، رہنمائے راہ شریعت و طریقت حضرت مولانا وسیدنا سید احمد بن عرفان شہید قدس اللہ سرہ کی سوانح حیات دراصل ایمان ویقین کی حکایت ہے، اخلاص وللّٰہیت کے چمنستان میں جو باد بہاری آپ کے وجودِ مسعود سے چلی اس کی مثال صحابہ کرامؓ کے بعد چشم فلک نے نہ کبھی دیکھی ہوگی اور نہ آئندہ اس کی امید ہے، یہ ملک ہندوستان کیا عرب وعجم، مشرق و مغرب میں کہیں دور دور اس عزم وتوکل اور جوش جہاد کی مثال نہیں مل سکتی، شوق شہادت کے وہ واقعات جن کو سن کر ایسا محسوس ہو کہ یہ ملائکہ کے قصے ہیں، فرشتوں کی باتیں ہیں، انسانی تاریخ میں ابنیاء اور ان کے اصحاب وحواریین کے علاوہ کہیں نہیں دیکھی گئی ہے۔"

سیرت سید احمد شہید جس کے مطالعہ کرنے والے صرف عوام ہی نہیں، علماء نے اپنے عزم میں قوت اور نئی امنگ محسوس کی بقول مولانا محمد منظور نعمانی "خوب یاد ہے کہ اسے پڑھ کر اپنے اندر ایک آگ سی بھڑک گئی" (۱)، یہ کتاب جو ۱۹۳۹ء میں لکھنؤ سے شائع ہوئی، کلکتہ سے پشاور تک ایک سال کے اندر اندر پھیل گئی۔

ہر شخص اپنے زاویہ نظر سے کسی تحریر کی قوت بیانیہ کا اندازہ کرتا ہے، اور اس کی افادیت یا عدم افادیت پر رائے قائم کرتا ہے، راقم نے بزرگوں کے تذکرے پڑھے ہیں، ان تذکروں سے اس کتاب کو جداگانہ نوعیت کی کاوش سمجھتا ہے۔

(۱) مولانا محمد منظور نعمانی: "مولانا مودودی کے ساتھ میری رفاقت کی سرگزشت اور اب میرا موقف" ص ۳۳۔ شائع کردہ الفرقان بکڈپو، لکھنؤ۔ ۱۹۹۸ء

اس کے اسباب میرے مطالعہ کے حدود میں یہ ہیں۔

۱۔ لکھنے والے کا اخلاص اور صدق شعور، قلب وذہن کی پاکیزگی اس پورے تذکرے میں جلوہ گر ہے۔

۲۔ مشرقی انداز کے مبالغوں سے یکسر پاک ہے۔

۳۔ ریسرچ اور تحقیق کا جو اعلیٰ ترین معیار اس وقت رائج ہے خاص طور پر شخصیات پر ریسرچ کرنے کا جو عصری نہج Modern method ہے اس معیار پر اس کتاب کا جائزہ لیا جائے تو کوئی کمی نہیں محسوس ہوگی کیونکہ اس کی ترتیب بالکل اس طرح کی ہے جو عصر حاضر میں ریسرچ کا انداز و معیار ہے۔

مثلاً:۔

نفس موضوع کی تشریح، جچے تلے انداز میں کتاب کے مقاصد، بغیر کسی تمہید اور لاطائل پیش بندی کے۔

ماٰخذ کا بیان

کتاب کا خلاصہ چند صفحات میں۔

جس شخص کی شخصیت زیر مطالعہ ہے اس کا زمانہ، اس دور کی سیاسی، سماجی، اقتصادی اخلاقی حالات کا مستند حوالوں سے جائزہ۔

خاندان، ولادت، سلسلہ تعلیم، طفولیت اور نوجوانی کس ماحول میں گزری اور اس وقت کے مشاغل جس سے مزاج کا رخ معلوم ہوتا ہے، اور سیرت سازی میں جس کا دخل ہے۔

اوصاف ذاتی، سفر وحضر، ملنے والے اور معیاری شخصیتوں سے تعارف اور ان کا اثر۔

عملی خدمت میں قدم کب اور کس عنوان سے رکھا۔

وہ اصلی کارنامہ جس سے صاحب سیرت کی شخصیت ممتاز ہوئی، اس کی تدریجی منزلیں۔

اس نے جن لوگوں کی تربیت کی ان کے اوصاف۔

جس طرح کہ درخت کی خصوصیت بیان کرنے کے بعد اس سے پیدا ہونے والے پھل (ثمرات) کا تعارف کرایا جائے اسی طرح ایک سیرت ساز اور تاریخ ساز شخصیت سے جو لوگ متاثر ہوئے، ان کی سیرتوں کے نمونوں نے اس کتاب کی تکمیل کی ہے۔

عصر حاضر کی کسی بڑی سے بڑی یونیورسٹی میں کسی تجربہ کار پروفیسر کے سامنے یہ (Syno psis) (مخطط) پیش کیا جائے تو وہ کوئی کمی نہیں محسوس کرے گا، یہ دوسری بات ہے کہ عصر حاضر کے ریسرچ میں یہ ضروری ہوتا ہے کہ صاحب سیرت کا کوئی نقص یا کمزور پہلو کو ضرور بیان کیا جائے تا کہ منصفانہ جائزہ کا فرضی معیار قائم رہے، اور پوری بحث کو معروضی بحث و تحقیق کا نتیجہ قرار دیا جائے، اگر کسی یورپین یونیورسٹی میں یہ کتاب پیش کی جاتی تو وہاں یہ اعتراض کیا جاتا کہ مقالہ نگار نے زیر بحث شخصیت کا تعلق کسی اقتصادی اسکیم سے نہیں جوڑا، اور یہ نہیں بتایا کہ اس نے اپنے مالی فارغ البالی کے لئے یہ سب ڈھونگ رچایا تھا، موڈرن انسٹی ٹیوٹ میں تحقیق کی تکمیل کے لئے یہ بات ضروری ہے جو اس کتاب میں نہیں ہے، ایک یورپین یونیورسٹی میں میرے ایک ساتھی نے شیخ محمد عبدالوہاب پر ریسرچ کیا، ان کے پروفیسر (مشرف) کا اصرار رہا کہ ''حصول قیادت وحصول مال وجاہ'' سے ان کی تحریر کا کوئی ربط نہیں قائم کیا گیا، وہ طالب علم جو اپنی حکومت کے اسکالرشپ پر کام کررہا تھا، اس نے کہا یہاں سے بغیر ڈگری لئے جانا ممکن ہے، مگر یہ اضافہ کرکے ڈگری نہیں لے سکتا، مجبوراً پروفیسر صاحب کو بادل ناخواستہ ریسرچ کرنے والے کی بات ماننا پڑی، مگران کے ریسرچ کو Low Grade دیا گیا۔

بہر حال یہ کتاب جو ۱۹۳۹ء میں چھپی تھی اور دو سال پہلے لکھی گئی تھی، اس

وقت اس کا معیار وہ تھا، جو آج ساٹھ سال کے بعد تحقیق و ریسرچ کا معیار ہے۔

لہٰذا نتیجہ کے طور پر آپ کہہ سکتے ہیں کہ یہ کتاب اپنی ترتیب کے لحاظ سے اردو میں ایک معیار ہے، جس پر تادم تحریر کوئی اضافہ نہیں ہوا ہے، یوں اللہ تعالیٰ ہر بات پر قادر ہے، وفوق کل ذی علم علیم، سنت الٰہی ہے۔



مختارات (قسم النثر)

عربی نثر کے ادبی حیثیت سے ممتاز ٹکڑوں کا مجموعہ جو ادب آموزی کے لئے منتخب کر کے یکجا کیا گیا ہو، اس کو ''مختارات'' کا نام دیا گیا ہے، اس طرح کے مجموعات ہر زبان میں تیار ہوئے ہیں اور عرب ممالک میں تو ماہرین فن کی ایک کمیٹی تقریباً ہر سال ایسے مجموعے نکالتی رہی ہے۔ یوں بھی عربی مزاج انتخاب و اختیار کو پسند کرتا ہے، مختارات البارودی، حماسۃ ابوتمام، حماسۃ بحتری، مجموعۃ من النظم والنثر، المطالعۃ العربیۃ، اور اس طرح کی درجنوں کتابیں ہماری لائبریریوں میں دستیاب ہیں لہٰذا صرف ادبی ٹکڑوں کا یکجا کر دینا کوئی بے مثال کام نہیں ہے۔

یہ بھی نہیں کہا جاسکتا ہے کہ عربی کے نثری انتخاب میں لوگوں نے دینی عنصر کا لحاظ نہیں رکھا ہے، واقعہ یہ ہے کہ سعودی عرب تو سعودی عرب ہے جو حرمین شریفین کا امین ہے، مصر اور یمن میں جو نثری انتخاب کے مجموعات شائع ہوئے ہیں ان میں قرآن کریم کی آیت، احادیث شریف کے اقتباس دیئے جاتے ہیں، مملکت سعودیہ عربیہ میں تو کئی رکوع قرآن شریف کے، اور متعدد احادیث حکمت و دانائی کی باتیں ہوتی ہیں، اور حکومت کی تعلیمی سیاست میں ہے کہ دین سے طلبہ کو مانوس رکھا جائے۔

لہٰذا یہ کہنا کہ مختارات کی قدر اس لئے ہوئی کہ اس میں اسلامی فکر غالب ہے کلیۃً صحیح نہیں ہے۔

ایک طرف یہ حقیقت ہے جو اوپر کی سطروں میں بیان کی گئی، دوسری طرف یہ واقعہ ہے کہ ان ماہرین فن نے جنہوں نے خود اس طرح کے مختارات مرتب کیۓ ہیں انہوں نے مختارات کو اہمیت دی کہ ثانویہ کے مطالعہ کے لئے اس کو منتخب کیا، مصر و شام میں اہل علم و ادب نے اس کی قدر دانی کی۔

بات صرف یہ ہے کہ جن لوگوں نے ادبی مقطوعات (۱) کا انتخاب کیا ان کے پیش نظر زبان کے ساتھ دین واخلاق کا سبق بھی دینا تھا، انہوں نے صرف ان مقطوعات کو چنا جن پر ''ادب'' کی مہر لگی تھی، اور جن کے لکھنے والے ادیب کہے جاتے تھے، جیسے نثر میں المبرد، علی القالی، عبدالحمید الکاتب، القاضی الفاضل، جاحظ، حریری، بدیع الزماں، اور ان کے معاصرین واتباع، لیکن کسی نے یہ نہیں دیکھا کہ قرآن وحدیث سے زیادہ کوئی عبارت ادب عالیہ کا نمونہ نہیں ہوسکتا، احادیث میں بھی چند حکمت ایجاز کے نمونے جوامع الکلم ہی نہیں بلکہ طول طویل روایتیں بھی ادب عالیہ کے نمونے ہیں، مثلاً امّ المؤمنین حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا اور صحابی رسول حضرت کعب بن مالکؓ کی بیان کردہ داستانیں بھی اعلیٰ ادبی مقام رکھتی ہیں، اور دراصل زبان انہی حضرات کی گفتگوؤں، بیانات، اور تقریروں سے مرتب ہوئی ہے، صرف ونحو کے قواعد انہی کی بولی سے مرتب کیۓ گئے ہیں، اسی طرح خلفائے راشدین حضرت ابوبکر صدیقؓ، عمر فاروقؓ، عثمان غنیؓ، علی مرتضیٰؓ کی تقریریں بھی ادبیت وجامعیت کا نمونہ ہیں، جن سے زبان آموزی کا کام لیا جاسکتا

---

(۱) چنے ہوئے ادبی ٹکڑوں کے لئے موزوں لفظ اردو میں نہ مل سکا اس لئے مجبوراً مقطوعہ اور اس کی جمع مقطوعات کا لفظ استعمال کر رہا ہوں، اسی طرح میں نے مجموعہ کی جمع مجموعوں کے بجائے مجموعات پسند کیا ہے (اہل زبان سے معذرت کے ساتھ)۔

ہے، مصنف نے دوسرے درجہ پر ان مقطوعات کو بھی لیا ہے، جو ادب کے نام سے مشہور ہیں، اور جن کے اسالیب بیان کو جاننا ایک طالب علم کے لئے ضروری ہے۔

ایک ادبی کتاب پر تبصرہ کرنے اور رائے دینے کا حق ایک ادیب ہی کو پہنچتا ہے، مختارات کو عربی زبان کے مستند و معروف صاحبِ قلم جس کی نظر میں قدیم و جدید ادبی سرمایہ موجود ہے جس نے رطب و یابس سب پڑھا، اور پڑھایا ہے، وہ کیا کہتا ہے، اس نے کس نظر سے مختارات کو دیکھا، میری مراد سید علی طنطاوی سے ہے جو تسلیم شدہ ناقد اور صاحبِ اسلوب ادیب ہیں، لکھتے ہیں:

> اگر کسی ادیب کے ذوق کا اندازہ اس کی پسند سے کیا جا سکتا ہے تو ہمارے قارئین کے علم میں یہ بات لانا کافی ہوگا کہ ابھی تھوڑے عرصہ کی بات ہے کہ ادبی منتخبات کے متعدد مجموعات کا ہم لوگوں نے جائزہ لیا، تا کہ یہ ان میں سے کسی ایک مجموعہ کو شام (سوریہ) کے مدارس شرعیہ کے ثانوی درجات کے لئے انتخاب کریں، اس کمیٹی کے تمام افراد نے ان مجموعات کی چھان بین شروع کی، اور واضح رہے کہ اس کمیٹی کے تمام ہی افراد ادباء ہیں، تلاش و جستجو اور بحث و تفتیش کے بعد ہم سب نے متفقہ طور پر ان تمام منتخبات میں سے ایک مجموعہ منتخب نثر عربی کا پسند کیا وہ ہے مختارات ابوالحسن (۱)

بہت دنوں سے میری آرزو تھی کہ ہم لوگ (یعنی اساتذہ ادب عربی) اپنے شاگردوں کو اس تنگ و تاریک قید خانہ سے نجات دلائیں، جس میں ہم نے ان کو پھنسا رکھا ہے، ان کو آزاد فضا میں سانس لینے کا موقع دیں، ان کو دن کی روشنی دکھائیں،

---

(۱) عربی میں وہ نام جو کنیت سے لئے جائیں وہ اپنی جگہ پر لقب کا کام دیتے ہیں، اردو کی طرح مولانا وغیرہ کے بجائے ابوالحسن کہہ دینے کا مطلب احترام سے نام لینا ہے۔

ہم اپنے منتخب مضامین میں جاحظ کے مقطوعہ "وصف الکتاب" سے ان کو نکالیں جس میں ایک معنی کے متعدد ہم معنی الفاظ (مرادفات) کے سوا کچھ نہیں رکھا ہے، ان کو ابن العمید کے لفظی کرتب اور الصاحب (ابن العباد) کے کیچڑوں اور القاضی الفاضل کے گھروندوں سے نکالیں جن کو پڑھ کر طلبہ ادب سے متنفر ہو جاتے ہیں، اور ہم ادب سے ان کو مانوس کرنے کے بجائے بیزار کرتے ہیں، ہم نے بارہا کہا کہ ابوحیان التوحیدی، جاحظ سے زیادہ تحریر پر قدرت رکھتا ہے، اگرچہ جاحظ کے پاس سنی سنائی باتوں کا زیادہ ذخیرہ ہے اور علمی طور پر فائق ہے، اور لچھے دار بات کرنے میں ممتاز ہے، اس کی استاذیت میں کوئی شبہ نہیں، اسی طرح حسن بصری، ان دونوں سے زیادہ بلیغ تھے، اور ابن السماک حسن بصری سے بھی زیادہ بلیغ تھے (۱)

امام غزالی نے جو الاحیاء (احیاء علوم الدین) میں اور ابن خلدون نے مقدمہ میں جو لکھ دیا ہے، ابن جوزی کے (صید الخاطر) میں جو لکھا ہے ابن ہشام نے جو سیرت میں لکھا ہے، امام شافعی نے جو الاُم (کتاب الام) میں لکھا ہے اور سرخسی نے مبسوط میں جو لکھا ہے (یعنی جو زبان استعمال کی ہے اور خوب صورت پیرایہ بیان اختیار کیا ہے،) وہ طالب علم کو ادب سکھانے کے لئے کہیں زیادہ بہتر اور اولیٰ ہے بہ نسبت ابن عباد کی حماقتوں کے مطالعہ سے، اور حریری اور ابن الاثیر کے تعمیر کردہ لفظی گھروندوں سے۔

میں نے اس موضوع پر بار بار لکھا لیکن کوئی اس کی طرف متوجہ نہیں ہوا، نتیجہ یہ کہ میں ادب کی تعلیم سے مایوس ہو گیا تھا، مگر ابوالحسن کی کتاب مجھے مل گئی تو دیکھا کہ انہوں نے ادبی کتابوں کو چھانا اور پھٹکا ہے، اس کے خس وخاشاک سے

---

(۱) مشہور اصحاب قلم ادباء فن کی کتابیں صدیوں سے پڑھائی جارہی ہیں، ان کے متعلق یہ آراء شاید ان لوگوں کے لئے نامانوس معلوم ہوں گی جو روایتی طور پر تقلیدی ادب کے شناسا ہیں، لیکن یہ حقیقت ہے جس کی صداقت جاننے کے لئے کافی مطالعہ اور وسعت نظر اور صحت ذوق کی ضرورت ہے۔

الگ کیا ہے اور اس کے اندر سے زر خالص نکال کر اپنی کتاب میں محفوظ کر دیا ہے۔

یہ کتاب ۱۹۳۹ء میں لکھی گئی تھی، چھپی نہیں تھی، راقم نے مؤلف ہی سے یہ کتاب سبقاً سبقاً اس وقت پڑھی جب یہ قلمی تھی، پھر ۱۹۴۰ء میں پہلی بار طبع ہو کر آئی، ٹائپ کی سہولت تو نہ تھی مگر جن صاحب نے کتابت کی انہوں نے ٹائپ کے حروف سے اپنے حروف ملا دیئے تھے، یہ کتاب ندوہ کے درجہ پنجم میں داخل تھی دوسرے مدارس کی ''جلالت شان'' بھلا کیوں اس کتاب کی طرف متوجہ ہوتی جو ایک نوجوان کی لکھی ہوئی تھی، اور وہ بھی ندوہ سے، مدرسائی عصبیت جس کا مزاج یہ ہے "ترابنا احسن من تیجانھم" میرے یہاں کی خاک ان کے زر و جواہر سے مرصع تاج سے بہتر ہے، ہاں پنجاب یونیورسٹی نے اور اس کے بعد دوسری یونیورسٹیز نے اپنے نصاب میں اس کو جگہ دی تھی، اس کتاب کا عروج اس وقت ہوا جب یہ کتاب چھپ کر عرب ممالک میں گئی وہاں کے دانشوروں، جن کو حقیقی معنوں میں دانشور کہا جا سکتا ہے، سید علی طنطاوی اور الشرباصی اور اسی قد و قامت کے ماہرین ادب اہل زبان نے اس کو دیکھا، جیسا کہ سید علی طنطاوی کی تقریظ سے معلوم ہوگا کہ اس کو ایک فرد نے نہیں بلکہ ادباء، اہل قلم، و اہل زبان کی لجنہ (کمیٹی) نے جانچ کر تمام منتخبات پر اس کو ترجیح دی، رہا ملک کے اندر تو ہے ادب شرط، منہ نہ کھلوائیں۔

اس کتاب کا تیسرا ایڈیشن جب کویت سے ۱۴۰۶ھ میں شائع ہوا تو اس پر مولانا نے ایک مبسوط مقدمہ لکھا، جس میں تفصیل کے ساتھ پورے ادبی سرمایہ کا محاکمہ کیا ہے، اور احادیث نبویہ کی ادبی خصوصیات پر سیر حاصل گفتگو کی ہے، کاروانِ زندگی میں اس کی طباعت کے مراحل کا ذکر ہے۔

مختارات نے ایک سنگ میل کا درجہ حاصل کیا ہے، یہی بنیاد بنا ہے ادب اسلامی کی تحریک کا، ادب صرف نظم و نثر کے ان مجموعات میں محصور نہیں ہے، جن

پرادب کا ٹھپہ لگا ہے، یا جو ادب کے نام پر لکھی گئی ہیں، ادب کا نمونہ وہ تحریریں نہیں ہیں جن کے لکھنے والے ایک بات کو بیان کرنے کے لئے سیدھے سمت قلم نہیں ہلاتے بلکہ ترچھے اور آڑے کھینچا کرتے ہیں وہ قلم جو امرأالقیس کے گھوڑے کی طرح

مكر مفر مقبل مدبر معا(۱)

چلتا ہو یا جس میں غریب الفاظ اور نامانوس محاورات کا بے جا اور بلاوجہ استعمال طالب علم کے سر پر اس طرح گرتا ہو کہ

كجلمود صخر حطه السيل من على (۲)

ادب اپنے مقصد کو بھرپور مقتضائے حال کے مطابق، اچھے الفاظ، طبعی و بے ساختہ ترکیبوں سے ادا ہونے والی بات کو کہتے ہیں، قرآن کریم اور احادیث نبویہ سے بڑھ کر ادب کہیں نہیں مل سکتا۔

ادب اسلامی کی عالمی تحریک کا یہ سنگ بنیاد اسی کتاب نے رکھا، اور الجزائر مراکش سے لے کر خلیج تک ادباء و علماء نے آ کر اس کو خراج تحسین ادا کیا ہے۔



---

(۱) شاعر گھوڑے کی تعریف کرتا ہے کہ

یہ حملہ کرتا ہے، بھاگتا ہے، ایک ہی ساتھ آگے بھی بڑھتا ہے اور پیچھے بھی مڑتا ہے،

(۲) ایک پتھر کا چٹان ہے جو سیلاب نے اوپر سے گرا دیا ہو۔

ماذا خسر العالم بانحطاط المسلمین

اس کتاب کا اردو نام ”انسانی دنیا پر مسلمانوں کے عروج و زوال کا اثر“ ذرا طویل ہے اس لئے میں نے اس اردو تحریر میں عربی ہی کا نام باقی رکھا ہے، کیونکہ اس نام سے یہ کتاب زیادہ مشہور ہے، فارسی، انگریزی، انڈونیشی، ملیزی، ترکی زبانوں میں ترجموں کے عناوین مختصر ہیں۔

اس کتاب کے مندرجات اور ان کا تجزیہ کرنے سے پہلے ضرورت ہے کہ اس فکر کی وضاحت کر دی جائے، جس کے نہ سمجھنے سے عرب ممالک میں تو نہیں، ہندوستان کے بعض افراد کو غلط فہمی ہوئی ہے، ایک بقلم خود...... کی تحریر نظر سے گزری جس میں انہوں نے لکھا تھا کہ میرے خیال میں تو عنوان ہی غلط ہے، دنیا کو مسلمانوں کے عروج و زوال سے کیا فائدہ، نقصان پہونچ سکتا ہے؟ اس کا نام ہونا چاہئے تھا ”مسلمانوں کے زوال سے مسلمانوں کو کیا نقصان پہونچا“ اس لئے بھی وضاحت ضروری ہے کہ مصنف کا یہ عقیدہ ہے کہ اسلام سارے عالم کے لئے رحمت بن کر آیا تھا، اور آخری نبی کی آخری امت کے ذریعہ سارے عالم کی اصلاح مقصود تھی، جس طرح ہر پیغمبر اپنی امت کا شاہد بنا کر اٹھایا جائے گا، اور رسول صلی اللہ علیہ وسلم تمام امتوں اور ان کے انبیاء پر شاہد بنا کر لائے جائیں گے۔

وَيَوْمَ نَبْعَثُ فِيْ كُلِّ أُمَّةٍ شَهِيْدًا عَلَيْهِمْ مِنْ اَنْفُسِهِمْ وَجِئْنَا بِكَ شَهِيْدًا عَلٰى هٰؤُلَاءِ ط (سورۃ النحل۔۸۹)

''اور جس دن ہم ہر امت میں ایک گواہ جو انہیں میں سے ہوگا ان کے مقابلہ میں قائم کریں گے اور ان لوگوں کے مقابلہ میں آپ کو گواہ بنا کر لائیں گے۔''

اسی طرح رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی امت تمام امتوں (اقوام عالم) کے لئے نگراں ونگہبان بنا کر مبعوث ہوئی ہے، یہ صریح اعلان ہے کہ بعثت محمدی سے سارے عالم کی اصلاح مقصود ہے، اور جب تک اور جہاں بھی انسان پائے جائیں گے، وہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی امت دعوت کا فرد ہوگا۔

مسلمانوں نے اپنے عروج کے زمانہ میں دنیا کو نئی قدروں سے آگاہ کیا تھا، عدل کا دنیا کو ایک معیار دیا تھا، حکمرانی کے رموز بتائے تھے، اور جو حکمراں نہ تھے، انھوں نے دینی واخلاقی رہنمائی کے اصول پر کاربند تھے، اور وہ سارے عالم کے لئے نمونہ تھے، اگر ان عالمگیر اسلامی قدروں پر مسلمان قائم رہتے تو دنیا امن وسلامتی کی نعمت سے بہرہ مند ہوتی، مگر ان کا زوال دراصل انسانی قدروں کا زوال تھا، اور دنیا عدل ومساوات، انسان دوستی، شرافت نفس اور اعلیٰ انسانی تہذیب سے محروم ہوگئی اور عالم کا سارا فتنہ وفساد اسی وجہ سے ہے کہ اسلامی اصول پر عمل کرنے والے مغرب کے معیار کو کار آمد سمجھنے لگے، خدا پرستی، اور دنیا سے بے لوثی کی مثالیں جو بزرگان دین نے اپنے قول وعمل سے دکھائی تھیں وہ ختم ہوگئی، ایک زمانہ تھا کہ ایک ایک فرد لاکھوں انسانوں کے دلوں پر حکمرانی کرتا تھا، ایک گوشہ نشیں اپنے بوریائے فقر پر بیٹھ کر بادشاہت کرتا تھا، وہ سلاطین وقت کو اپنے آگے جھکنے پر مجبور کرتا تھا، یہ ایمانی طاقت کا سوتا خشک ہوگیا، مسلمانوں کے زوال کی وجہ سے پوری دنیا ان

نمونوں سے محروم ہوگئی، لہٰذا امت اسلام کا زوال قوم یا ملت کا زوال وخسارہ نہیں تھا، بلکہ عالم کا خسارہ تھا۔

اس عہد میں عرب مفکرین نے بھی اسی طرز پر سوچنا شروع کردیا ہے، عربی کا ایک لفظ وصایۃ جس کا ترجمہ اب Trusty ship کرسکتے ہیں بقدیم تاریخی حقائق پر نظر رکھنے والے اہل فکر ونظر نے یہ تسلیم کرلیا ہے کہ امت اسلام کو "وصایۃ الامم" کا منصب عطا ہوا ہے، مسلمان اس عالم میں تاریخ ساز عالم Factor کی حیثیت رکھتے ہیں وہ نقال ومقلد Actor نہیں ہیں مغرب کے پروپیگنڈہ سے مسحور ہوکر مسلمان احساس کہتری کا شکار ہوئے، دین کے مسلمات وحقائق کی تاویل کرنے لگے، منصب وصایۃ سے تو پہلے ہی دستبردار ہوچکے تھے، قرآن شریف کی تفسیر بھی ایسی کرنے لگے جو یورپ سے معذرت کا انداز لئے ہوئے تھی، جو باتیں یورپ کے پیمانۂ اخلاق کے مطابق نظر نہیں آئیں، ان کو اسلام سے خارج کرنے لگے، یورپ نے بھی اگر واقعی کسی کو اپنا دشمن سمجھا اور جن سے صلیبی جنگوں کے انتقام کی آگ ٹھنڈی نہیں پڑی ہے، وہ مسلمان ہیں، دنیا میں سینکڑوں مذاہب ہیں، ہزاروں تہذیبیں ہیں، بے شمار عبادتوں کے طریقے ہیں ان میں جو مشہور مذاہب ہیں ان کے مطالعہ کے لئے برطانیہ اور امریکہ کی یونیورسٹیوں میں شعبے پائے جاتے ہیں، مثلاً بودیسٹ شینٹو، سکھ، یہودی، نصرانی، ان میں سے کسی مذہب کے خلاف تحقیق وبحث کے عنوان پر پچاس سال میں اتنی کتابیں نہیں شائع ہوئی ہیں، جس قدر صرف ایک دہے کے اندر اسلام سے متعلق یورپ کی مختلف زبانوں میں شائع ہوچکی ہیں۔

انتقام کی ایک جنونی کیفیت اور ان مصنفین کی ہذیانی بلکہ ہسٹریائی کیفیت ختم ہونے پر نہیں آتی اور کوئی زمانہ فیضی اور ابوالفضل جیسے فضلاء سے خالی نہیں رہا ہے، جب کہ دشمن کے ہاتھ میں تلوار دیکر اپنی گردن خم کرنے والے نہ رہے ہوں۔

ایسے عالم میں ایک جرأت ایمانی کا اظہار اس طرح ہوتا ہے کہ تاریخ اور فلسفہ تاریخ کی روشنی میں اور مشاہدات وتجربات عالم کے تناظر میں ایک ایسی تحقیق سامنے آئی جس میں مسلمانوں کو اپنا مقام یاد دلایا گیا، جن افراد کے اندر مایوسی اور احساس کہتری کی سیاہیاں تہہ بہ تہہ جم گئی تھیں، سیاہیوں کو کھرچ کھرچ کر صاف کیا گیا، اہل علم وانصاف اور تحقیقی کام کرنے والے مشرق ومغرب میں جن کے اسکالرشپ کا لوہا مانا گیا ہے، انہوں نے مقصد اور بیان مقصد کے اسلوب کو پہلی نظر میں تاڑ لیا۔

اور سب سے پہلے اس کتاب کی پذیرائی وہاں ہوئی جہاں عالم اسلام کے چیدہ علماء، دانشور، اور علوم اسلام (کتاب اللہ وسنت نبوی صلی اللہ علیہ وسلم) کے ماہرین کا مجمع ہے، اور تادم تحریر اس کتاب کے ستر سے زائد ایڈیشن قانونی اجازت سے اور بہتیرے ایڈیشن بغیر اجازت کے شائع ہو چکے ہیں۔ اس پر دمشق یونیورسٹی کے ایک صاحب نے پی، ایچ، ڈی بھی کیا ہے، اور کوئی پڑھا لکھا شخص ''مثقف'' نہیں سمجھا جا سکتا، اگر اس نے اس کتاب کا مطالعہ نہیں کیا ہے، آئندہ صفحات میں ہم چند اقتباسات پیش کریں گے، جن سے ہمارے اردو کے بقلم خود ''مجتہدین'' کو معلوم ہوگا کہ ان کی معراج عقل سے ابھی گرد کارواں بہت دور ہے۔

کتاب کا پہلا باب ''جاہلیت عالمیہ'' کی تصویر کشی پر مشتمل ہے، سیرت نگار علماء کا روایتی اسلوب یہ ہے کہ وہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت سے پہلے اہل مکہ یا بعض عرب قبائل کی اعتقادی وعملی کمزوریوں کی نشاندہی کرتے ہیں مثلاً معاشی بے انصافی، اخلاقی بدعنوانی اور انارکی کو شرح وبسط سے بیان کرتے ہیں، جس میں دختر کشی، سرقہ ورہزنی، شراب نوشی، اور قمار بازی (جوا کھیلنا) آپس کی جنگیں اور طویل مدت تک انتقام کا سلسلہ قائم ہونا وغیرہ۔

''ماذا خسر'' کے مصنف نے صرف عربوں کے نہیں بلکہ تمام انسانی آبادی

کا اخلاقی سروے پیش کیا ہے، اور عرب کے باہر ساری دنیا میں جو جاہلی نظام رائج تھا، اس کی واقعات وحقائق کی روشنی میں تصویر پیش کی ہے، تاکہ معلوم ہو کہ انسانیت عالمگیر پیمانے پر کس پستی بلکہ خودکشی، اور خودسوزی کی منزل پر پہونچ گئی تھی، اور قرآن نے جو عربوں کو مخاطب کرکے فرمایا ہے "كُنتُمْ عَلَىٰ شَفَا حُفْرَةٍ مِّنَ النَّارِ" (تم آگ کے گڈھے کے کنارے پر پہونچ گئے تھے۔) وہ صرف عربوں کا حال نہیں، بلکہ اس وقت تمام عالم کا حال یہی تھا، اور اسلام کا ظہور کن نامساعد حالات، اور کس تاریک ماحول میں ہوا، اور اس انسانیت کی نشاۃ ثانیہ کے لئے کتنا عظیم اور کس درجہ دشوار کام انجام پایا۔

اس حقیقت کو ثابت کرنے کے لئے کہیں یکجا اتنا مواد نہیں ملتا، جتنا "ماذا خسر" میں موجود ہے، کیونکہ اس زاویہ سے کسی نے پہلے سوچا بھی نہ تھا، کہ جاہلیت کا مسکن صرف عرب قبائل کے علاقے ہی نہیں بلکہ سارا عالم اس شکنجہ میں تھا، لہٰذا ہر براعظم بلکہ ہر بڑے ملک کے حالات، اخلاقی گراوٹ، اور انسانی بربادی کے قصے کو مختلف ماٰخذ ومصادر سے حاصل کئے گئے، اس کی خاطر برسہا برس کی دیدہ ریزی اور مختلف زبانوں کے لٹریچر تہذیب وتمدن اور رسوم واعیاد سے متعلق معلومات جمع کرنا تھا، یہ کام چیونٹیوں کے منھ سے شکر کے دانے جمع کرنے اور اس کا انبار لگانے کے مرادف تھا۔

یہ کام اللہ تعالیٰ کی عطا کردہ توفیق وتائید غیبی کے بغیر ناممکن تھا، اس باب کا حق ادا کرنے کے لئے مصنف کو کتب خانے کھنگالنے پڑے، اور اس کتاب کا یہ نادر باب ہے کہ یہ مضمون کہیں یکجا پہلے نہیں دیکھا گیا۔

کتاب کا دوسرا باب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت سازی کے تابناک نمونوں پر مشتمل ہے اس باب میں دکھایا گیا ہے کہ درس گاہ نبوت سے جو نسل

تعلیم پاکر نکلی اس کی زندگی ایمان لانے سے پہلے کی زندگی سے کس درجہ مختلف تھی، اور یہ کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے تربیت نفوس میں کس کو اولیت کا درجہ دیا ہے، کام کہاں سے شروع ہوا اور کہاں ختم ہوا، اور یہی طریقہ قیامت تک کے لئے کامیابی کا ضامن اور انقلاب حال کا ذریعہ ہے، اس باب میں حوالہ جات قرآن کریم، احادیث نبویہ اور سیرت وتاریخ کی کتابیں ہیں، اور چونکہ سب عربی مآخذ ہیں اور قرآن کریم سے رات دن کا سابقہ، تفسیر کی تدریس اور احادیث نبویہ سے اشتغال کی بنیاد پر مصنف کو آسانی ہوئی ہوگی، لیکن ان آیات واحادیث اور تاریخی حوادث سے مفید نتائج نکالنا ایک دیدہ ور مفسر اور صاحب بصیرت عالم کا کام تھا جس کی نظر میں قدیم وجدید مآخذ دونوں ہوں۔

تیسرے باب میں مسلمانوں کے زوال کی المناک داستان سنائی گئی ہے، اور اس کے تاریخی انحطاط اور انحطاط کے حقیقی اسباب پر روشنی ڈالی گئی ہے، پھر ترکوں کا میدان قیادت میں آنا اور عالم اسلام کے خلافت سے محروم ہونے کا ذکر ہے، پھر ترکوں میں انحطاط کس طرح شروع ہوا، اور اس کے واقعی اسباب کیا تھے، ان کا تاریخی امانت کے ساتھ اسباب وعلل کی روشنی میں جائزہ لیا گیا ہے، اس کتاب میں ترکی کی تاریخ پر گہری نظر رکھنے والے مصنفین کی تحریروں سے فائدہ اٹھایا گیا۔

کتاب کا چوتھا باب یورپ کی نشاۃ ثانیہ (Renaissance) پر مشتمل ہے جس میں دکھایا گیا ہے کہ یورپ کے منصب قیادت پر آنے اور دنیا کی زمام کار اپنے ہاتھ میں لینے کے کیا محرکات تھے، اور اس کے مادی اسباب کیا تھے؟، اور یورپ نے کس طرح اور کیوں عیسائیت سے انحراف کیا؟، اور خالص مادیت کے راستہ پر پڑ گیا، اس کو علمی تجزیہ کے ساتھ اور تاریخی معلومات کی روشنی میں مرتب کیا گیا ہے،

یورپ میں مذہب وسائنس کی آویزش، ریاست وحکومت کی رقابت، اور یورپ کے اخلاقی زوال اور نئے اخلاقی تصورات، اقدار وقوم ونسل پرستی کے ارتقاء کے سلسلہ میں مصنف کے مطالعہ کی وسعت نظر آتی ہے، اس باب میں مصنف علماء کی صف سے نکلنے والے پہلے عالم دین ہیں جن کی یورپین مصادر پر اتنی گہری نظر ہے، اس باب میں مصنف نے جن مآخذ سے کام لیا ہے، وہ اکثر انگریزی میں ہیں، اور انگریزی میں لکھی ہوئی درجنوں کتابوں سے مصنف نے استفادہ کیا ہے، اس ضمن میں آپ کی انگریزی سے واقفیت کا ذکر بھی بے محل نہ ہوگا، مولانا کی لکھی ہوئی انگریزی تحریر پر تو نظر نہیں پڑی لیکن مولانا کو بولتے ہوئے دیکھا ہے، مولانا انگریزی کم بولتے ہیں، مگر جب بولتے ہیں تو صحیح انگریزی میں مافی الضمیر ادا کر لیتے ہیں، اور پڑھتے ہیں تو روانی کے ساتھ اور ایک ایک لفظ سمجھتے ہیں، ان کے اقتباسات سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ دوسرے کے نقل کردہ خیالات نہیں ہیں، بلکہ خود پڑھ کر موضع استدلال کی طرف اشارہ کرتے ہیں، پانچواں اور آخری باب کتاب کا نچوڑ اور حاصل ہے جس میں یہ بتایا گیا ہے کہ اب عالم اسلام کس طرح اپنے کھوئے ہوئے مقام کو حاصل کر سکتا ہے، اور دنیا کو بدامنی، انارکی ، انسان کشی سے نجات دے سکتا ہے، اس سلسلہ میں ایمان و عمل، روح دعوت، اخلاق وروحانیت سے لے کر حربی اور صنعتی تیاریوں اور عالم اسلام کو خود کفیل بننے کا مشورہ دیا گیا ہے، آخر میں عربوں کو عالم اسلام کی قیادت اور اس کے منصب امامت سنبھالنے کی پرزور دعوت دی گئی ہے، اور ان کمزوریوں کی نشاندہی کی گئی ہے، اور ان کے ازالہ کی تدبیریں بتائی گئی ہیں، اس کتاب کا بڑا طاقتور اور مؤثر حصہ وہ ہے جس کا عنوان ''محمد صلی اللہ علیہ وسلم روح العالم العربی'' ہے جس میں بتایا گیا ہے کہ عربوں کو جو کچھ نصیب ہوا وہ سب محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے قدموں کے صدقہ اور آپ کے طفیل میں ہوا، اگر وہ اس نعمت کی ناشکری کرتے

ہیں اوراس کی قدر وقیمت کاانکار ہے اوران کواپنی جاہلیت یادآتی ہے اورقومیت عربیہ میں اپنی ترقی وسربلندی نظرآتی ہےتوذرااس عطیہ کوواپس کرکے دیکھیں ان کے پاس کیارہ جاتا ہے، کتاب کا یہ حصہ جذبات وعقیدہ کے ساتھ حقیقت پسندی کا آئینہ ہے، ان فقروں میں مصنف کے دل ودماغ کا عطرآ گیا ہے، ذات نبوی سے وہ وابستگی جوآپ کے خون کے ذرات میں پیوست ہے اور ہوش سنبھالنے کی عمر سے لیکر اس عمر تک جس حقیقت عظمیٰ سے آپ کے دل کا تار بند جڑا ہے اس کو برملا اور واشگاف انداز میں کہنے کا موقع ملاتو روح کا سازدل کے سوز سے ہم آہنگ ہوگیا۔

یہ بات میلادخوانی، یاوعظ خوانی کی مجلس میں نہیں کہی گئی، جہاں مبالغہ آویز روایت سن کراہل محفل جھوم اٹھتے ہیں اور درود وسلام کا نذرانہ بہ آواز بلند پیش کرنے لگتے ہیں، یہ بات عربی زبان میں کہی گئی اوراس کے مخاطب جذبات سے مغلوب عوام نہیں تھے، بلکہ چوٹی کے اسکالرس، عرب اور مسلمانوں کی تاریخ کے ایک ایک حادثہ پر گہری نظر رکھنے والے علماء اور دانشور تھے، انہوں نے اس طرح یہ بات سنی جیسے کوئی نئی بات ان کے سامنے رکھی گئی ہے، یا جیسے کسی سوتے ہوئے انسان کوکوئی سوئی چبھوکر بیدار کرے، مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ اس وقت ایک ہفتہ وار اخبار ''منبر الشرق'' قاہرہ سے نکلا کرتا تھا، اس نے پورے صفحہ پر ''محمد رسول اللہ ﷺ روح العالم العربی'' کا عنوان دیکراس طرح اس باب کے اہم فقرے نقل کئے تھے، جیسے کوئی انکشاف ہوا ہے، یہ کہنے والے کی زبان کی تاثیر اور جذبات کی صداقت کا اثر تھا، خود مصنف (حضرت سید مولانا ابوالحسن علی ندوی رحمۃ اللہ علیہ) کو اپنے قلم سے نکلے ہوئے ان الہامی فقروں پر اس درجہ اعتماد تھا کہ مولانا اپنی خودنوشت سوانح ''کاروان زندگی'' کی پہلی جلد صفحہ ۲۶۳ پر تحریر فرماتے ہیں۔

''اگر کسی بدعت اور فتنہ کا اندیشہ نہ ہوتا تو مصنف وصیت

کر جاتا کہ کتاب کے یہ صفحات اس کے کفن میں رکھ دیئے جائیں،
کہ وہ ان کو اپنے لئے ذریعہ مغفرت اور وسیلۂ شفاعت سمجھتا ہے"

اس کتاب کے چھپنے سے پہلے مصنف کی دل شکستگی اور دعاء، پھر امید سے بڑھ کر اللہ تعالیٰ کی طرف سے اس کی طباعت کا انتظام، اور چھپنے کے بعد اس کی مقبولیت، یہ تینوں مراحل ایک ایسے مصنف کے لئے جس کی عمر تقریباً تیس سال سے زیادہ نہ تھی، زندگی کے انقلابی مراحل تھے، جن کو حضرت مولانا نے خود بے کم وکاست بیان کر دیا ہے، اور اس وقت جبکہ مقبولیت عند اللہ اور عند الناس کے عروج پر انہوں نے پہنچا دیا ہے، اپنی ابتدائی زندگی کی بے چارگی کو کوئی دوسرا ہوتا تو ذکر نہ کرتا، ایک واقعہ یا سانحہ قابل ذکر ہے، کہ جب کتاب مکمل ہوگئی وہ کتاب جو سینکڑوں کتابوں کے مطالعہ کا نچوڑ اور برسوں کی کاوش کا نتیجہ تھی، اس کی طباعت کا سامان نہیں تھا، حسب ذیل سطریں کاروانِ زندگی سے نقل کرتا ہوں۔

"اسی عرصہ میں ۱۹۴۷ء میں میرا حجاز کا سفر پیش آیا، اس وقت حرم مکی کے خطیب وامام ایک مصری عالم شیخ محمد عبد الرزاق حمزہ تھے، وہ وسیع النظر عالم اور متنوع الکمالات شخص تھے، جدید مطبوعات پر ان کی نظر وسیع وعمیق تھی، میں نے ان کی خدمت میں کتاب کا مسودہ پیش کیا، انھوں نے اس کا مطالعہ کیا، وہ پہلے شخص تھے جنھوں نے کتاب کے متعلق بلند الفاظ میں اپنا تأثر ظاہر کیا، اور مجھے اس کے طبع کرانے کی تاکید کی، میں نے ایک دن مطبعة الكردی میں جا کر جو مکہ معظمہ کا واحد تجارتی مطبع تھا، اس کی طباعت کا تخمینہ حاصل کیا، اس زمانے میں افریقہ کے ایک تاجر آئے ہوئے تھے، جو خود بھی ذی علم وصاحبِ نظر، اور اسکے ساتھ مخیّر اور فیاض بھی تھے، میں ایک دن ہوٹل "لوکانده" جاکر ان سے ملا، کتاب کا تعارف کرایا، اور اس کے چھپنے کی ضرورت کا اظہار کیا، وہ جدید تقاضوں اور نئی نسل کے ذہن سے واقف نہیں تھے،

شاید مذہب حنفی کی تائید میں کوئی قدیم جدید کتاب ہوتی تو وہ بڑی پیش کش کرتے، انھوں نے ایک رقم (جو شاید دو سوریال تھی اس وقت ہندوستانی سکہ کی قیمت تقریباً برابر تھی) عنایت فرمائی، میں نے قبول تو کرلی، مگر بہت دل شکستہ ہوا، جہاں ہم لوگوں کا قیام تھا اس کا راستہ حرم شریف سے ہو کر بھی جاتا تھا، میرا وضو تھا سیدھا حرم شریف گیا، اور دل شکستگی کے عالم میں ملتزم پر اس کتاب کی طباعت کے سامان ہونے اور قبولیت کی دعاء کی' اس دعا کی قبولیت کا اثر ایسا ہوا کہ مصر کی سب سے بڑی اکیڈمی نے اس کو شائع کیا، اور اب تک اس کے بہت سے ایڈیشن نکل چکے ہیں، انگریزی، فرنچ، اٹالین، فارسی، انڈونیشی زبانوں میں ان کے ترجمے شائع ہوئے اور بقول حضرت مؤلف کی یہ کتاب میرے لئے وزیٹنگ کارڈ بن گئی، اس کے مصنف ہونے کی حیثیت سے میرا تعارف کرایا جانے لگا۔

یہ محض اللہ کا انتظام تھا کہ ان افریقی بزرگ نے اس کی طباعت کا بار اپنے ذمہ نہیں لیا، ورنہ وہ دل شکستگی پیدا نہ ہوتی، اور نہ وہ ملتزم کی دعا ہوتی، جس کی قبولیت فلق الصبح کی شکل میں نمودار ہوئی۔

کتاب کے چھپنے کے بعد بھی اس طرح دل شکستگی کا ایک اور مرحلہ پیش آیا، ڈاکٹر احمد امین جو لجنة التألیف والترجمة والنشر کے ڈائرکٹر اور مشہور علمی کتابوں "فجر الاسلام، ظهر الاسلام" کے مصنف اور مجلة "الثقافة" کے ایڈیٹر تھے، ان کی کمیٹی نے اس کتاب کو شائع کرنے کی شفارش کی، لیکن خود استاذ احمد امین نے شاید کتاب پڑھی نہیں یا سرسری نظر ڈالی، اور کمیٹی کے فیصلہ پر اس کی اشاعت لجنة التألیف کی طرف سے منظور کرلی گئی، مگر ایک جملہ مقدمہ میں لکھ گئے کہ، میں قاری سے معذرت چاہوں گا کہ اگر اس کو کسی عبارت میں غموض (وضاحت کی کمی) محسوس ہو کیونکہ مؤلف فاضل بہر حال ایک ہندی نژاد ہیں۔

اس جملہ سے مصنف کو ایک دھچکا ضرور لگا ہوگا، حجاز میں جب یہ جملہ استاذ سید علی فدعق، استاذ احمد عبدالغفور عطار، شیخ عبدالرزاق حمزہ نے پڑھا تو سب کو برا لگا، اور مجھے یاد ہے بعض حضرات تو اپنی زبان پہ قابو نہیں رکھ سکے، مگر خدا کا انتظام اپنی جگہ پر اٹل تھا، ڈاکٹر احمد امین کے اسسٹنٹ، قاہرہ یونیورسٹی کے اسکالر جو بعد میں پروفیسر ہوئے، ڈاکٹر شکری فیصل نے خود اس رسالہ الثقافۃ میں جس کے ایڈیٹر ڈاکٹر احمد امین تھے، ایک مکمل جائزہ، تبصرہ اس کتاب پر شائع کیا، اور اس میں ڈاکٹر شکری فیصل نے لکھا، اس کا پورا ترجمہ مرحوم مولانا محمد الحسنی نے کیا تھا وہ درج ذیل ہے

''کیا مسلمان اپنے اندر خود اعتمادی پیدا کر سکتے ہیں، اور انسانی قافلہ کی پہلی صف میں اپنی پرانی جگہ پر واپس آ سکتے ہیں، جب کہ صورت حال یہ ہے کہ وہ ضعف کی ظلمتوں میں گھرے ہوئے ہیں، کیا وہ نظام زندگی جو یورپ میں رائج ہے اور جس کی تقلید ایشیا والے بھی کرنا چاہتے ہیں زندگی کے تمام تقاضوں کو پورا کرتا ہے اور اس کے اندر اخلاقی بلندی، مادی ترقی اور روحانی و مادی اقدار کی باہم آمیزش کا پورا سامان موجود ہے، کیا یورپ انسانی زندگی کو ان بلند مقاصد کی طرف لے جانا چاہتا ہے، جو عقل وفکر کے آغاز ہی کے ساتھ انسان کے مدنظر تھے، یا وہ اس شاہراہ سے ہٹ گیا ہے اور اپنی منزل مقصود سے دور ہو گیا ہے؟ ہم کس صورت سے معاصر تہذیب کی کمزوریوں سے باخبر ہو سکتے ہیں وہ کون سے عناصر ہیں جن سے یورپ محروم ہے، وہ کون مہیب خطرہ ہے جو اس کے اندر پوشیدہ ہے اور قریب ہے کہ اس کو تباہ کر دے، کون کون سی قومیں اور مذاہب اس زبردست

بوجھ کو اٹھا سکتے ہیں، غلطی کی اصلاح خالی جگہ کی خانہ پری اور صحیح رہنمائی کا بوجھ؟

وہ کون سا رشتہ ہے جو عالم اسلام کو عالم عربی سے منسلک کرتا ہے، مسلمان عربوں کو کس نگاہ سے دیکھتے ہیں اور اہل عرب کا مقام خود ان کی نظروں میں کیا ہے؟، اہل یورپ کا نقطۂ نظر مسلمانوں اور عربوں کے بارے میں کیا ہے؟ مسلمانوں کے آپس کے تعلقات اور مسلمانوں اور اہل عرب کے تعلقات کی کیا نوعیت ہے؟، عربوں اور مسلمانوں کی آرزوؤں میں یکجہتی کیوں کر ہے؟ ان کے امراض و نقائص یکساں کس طور پر ہیں؟، یہ امراض کیا ہیں ان کا علاج کیا ہے؟

مسلمانوں کے سفر کا آغاز کہاں سے ہو؟، وہ کس طرح اپنے ماضی، حال اور مستقبل سے باخبر بنیں، اور سمجھ سکیں کہ زمانہ کی دوڑ میں وہ کس منزل پر ہیں؟، اسلام کے منتہائے نظر اور کفر کے منتہائے نظر میں کیا فرق ہے؟، اور دنیا کو کیا نقصان پہنچا، جب مسلمان اپنے مقاصد کو فراموش کر کے بیٹھ رہے؟

یہ سب سوالات اور ایک دوسرے سے پیوستہ عنوانات اس کتاب کا موضوع ہیں بلکہ وہ کتاب میں اسی صورت سے نظر آتے ہیں، کتاب آپ کو ایک موضوع سے دوسرے موضوع کی طرف لے جاتی ہے، ایک کڑی سے دوسری کڑی ملتی ہے، اور ایک مقصد سے دوسرے مقصد تک پہنچاتی ہے لیکن ایک بڑا نصب العین پوری کتاب پر برابر چھایا رہتا ہے، یہ وہ نصب العین ہے جس

کا خلاصہ ڈاکٹر احمد امین نے کتاب پر اپنے مقدمہ میں لکھا ہے۔

''یہ کتاب مسلمانوں سے احساس کہتری کو دور کرنا چاہتی ہے، جو انحطاط سے اور اپنی کمزوری کے احساس سے اور مغربی تہذیب کو وہ درجہ دینے کی وجہ سے جس کی وہ مستحق نہیں ہے پیدا ہو گیا ہے''۔

مصنف نے کتاب کو پانچ ابواب پر تقسیم کیا ہے، باب اول عہد جاہلیت، باب دوم جاہلیت سے اسلام کی طرف، باب سوم اسلامی عہد، باب چہارم مغربی عہد، باب پنجم اسلامی قیادت، پھر ہر باب بہت سے ذیلی عنوانات پر مشتمل ہے مصنف نے کوشش کی ہے کہ وہ سب باہم مربوط رہیں اور اس مقصد تک رہنمائی کریں جو کتاب کا اصل موضوع ہے۔

سب سے پہلے مصنف نے زمانہ جاہلیت کی بہترین تصویر کشی کی ہے، اس میں انھوں نے دکھایا ہے کہ انسانیت پر نزع کا عالم طاری تھا، فساد خشکی وتری میں پھیل چکا تھا، اور دنیا کو اسلام اور اس کی تعلیمات کی سخت ضرورت تھی، باب دوم (جاہلیت سے اسلام کی طرف) میں مصنف نے انبیاء کے مختلف اصلاحی طریقوں کو بیان کیا ہے، بالخصوص رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا طریق دعوت واصلاح کی تاثیر وتربیت اور اس عظیم معجزہ کا ذکر کیا ہے جس نے ایک نئی اور طاقتور نسل اور جدید اور بیدار سوسائٹی کو پیدا کیا۔

باب سوم میں کئی فصلیں ہیں ایک فصل اسلامی قیادت کے بارے میں ہے اور اس میں اسلامی اصولوں اور اقوام و مذاہب

پر اسکے اثر ونفوذ کا بیان ہے، دوسری فصل اسلامی زندگی کے انحطاط وتنزل کے بارے میں ہے، جس میں انحطاط وزوال کے اسباب کا جائزہ لیا گیا ہے، تیسری فصل قیادت عثمانی کے بارے میں ہے، باب چہارم میں مغربی عہد کی داستان بیان کی گئی ہے، جو یورپ کی بت پرستی اور مسیحیت اوران دونوں کا نزاع، پھران دونوں کا امتزاج، وطن پرستی اور قومیت کا ظہور، مادیت کا غلبہ اور زندگی کے ہرشعبہ پراس کا اقتدار اور جاہلی رجحانات وخیالات کا نئے سرے سے تسلط جیسے مباحث پر مشتمل ہے۔

جب مصنف ہم کو باب پنجم تک لے جاتے ہیں، اس وقت ہمیں یہ ایمان حاصل ہو چکا ہوتا ہے کہ جو جاہلیت بعثت نبوی سے قبل دنیا پر حاوی تھی وہی جاہلیت آج بھی دنیا پر حاوی ہے گویا کہ دنیا نے اپنی وہی پرانی شکل اختیار کرلی ہے جو اس دن تھی جس دن مسلمان جزیرہ نمائے عرب سے دنیا کو جاہلیت اور بت پرستی کے چنگل سے بچانے کے لئے نکلے تھے، (ص ۲۴۳) اوراس لئے ضروری ہے کہ عالم اسلام نئے سرے سے ترقی کرے اور عالم عربی بھی نئے سرے سے بیدار ہو، اور ضروری ہے کہ یہ نشاۃ ثانیہ انھیں بنیادوں پر ہو جن بنیادوں پر نشاۃ اولیٰ ہوئی تھی، میری مراد ان دو اصولوں سے ہے جن پر (جیسا کہ مصنف کا خیال ہے) پوری اسلامی تحریک کا دارومدار ہے، یعنی جہاد واجتہاد (ص ۵۸)

یہ حقیقت ہے کہ کتاب اصلاح کی ایک باشعور آواز ہے جو دل کی گہرائیوں سے نکلی ہے اور ایمان سے لبریز ہے میں نے

محسوس کیا کہ ایک اسلامی دنیا اس کی سخت حاجتمند ہے، اور اس کی حالت سدھر نہیں سکتی جب تک وہ علمی شعبہ میں اجتہاد اور عسکری شعبہ میں جہاد کی طرف خاص توجہ نہ دے، اسی لئے مصنف ان دونوں اصولوں پر بہت اصرار کرتے ہیں اور ان پر بہت زور دیتے ہیں یہاں تک کہ کوئی باب اور کوئی فصل اس سے خالی نہیں جاتی، وہ جنگی صنعت کا ذکر کرتے وقت اس کے انحطاط کو ترکوں کے تنزل کا سبب بتاتے ہیں، (ص ۱۱۷) پھر وہ اسی بات کو مسلمانوں اور عالم عربی کے عروج کے باب میں دہراتے ہیں (ص ۲۲۸) بلکہ وہ اس سے بھی آگے بڑھ کر کہتے ہیں کہ علمی و صنعتی شعبوں میں عالم اسلام کا جمود ہی وہ سبب تھا جس کی وجہ سے اس کو طویل غلامی، ذلیل زندگی اور ظالم مغربی اقتدار کا مزہ چکھنا پڑا۔ (ص ۲۲۹)

میں نے کہا تھا کہ مصنف نے کتاب میں اپنے مقصد کو حاصل کرنے کے لئے مختلف راستے اختیار کئے ہیں کبھی وہ محقق کے روپ میں نظر آتے ہیں کبھی مبلغ کے، کبھی مومن کی صورت میں ظاہر ہوتے ہیں، کبھی تاریخ و قصص کی راہ اختیار کرتے ہیں، کبھی عبرت و نصیحت کا انداز اختیار کرتے ہیں، کبھی منطق و استدلال سے کام لیتے ہیں، کہیں خطابت کا طرز جھلکنے لگتا ہے، مگر بہت کم!

کتاب میں دو چیزیں بظاہر کھٹکنے والی ہیں پہلی چیز تطویل واطناب مثلاً یہ عنوانات، یورپ خودکشی کی طرف...... ایٹم بم اور اس کی لرزہ خیزیاں لیکن یہ تطویل بلاوجہ نہیں ہے، اس کا مقصد

خیال کی توثیق اور دل و دماغ کو اس منظر سے بھر دینا ہے، دوسری چیز وہ خطابی رنگ ہے جو کہیں کہیں نظر آجاتا ہے، لیکن اس کا مقصد بھی پورے طریقے سے دل و دماغ کو متاثر کرنا ہے اور غالباً اسی کا نتیجہ ہے کہ ناظر دیکھتا ہے کہ مغربی تہذیب پر شدید تنقید کی گئی ہے اور اس کے زوال و خودکشی پر بار بار زور دیا گیا ہے، اور کتاب کے بہت سے صفحات اس سے پر ہیں، جبکہ ظاہر ہے کہ صرف اتنی ہی بات (اگر مصنف جہاد و اجتہاد پر زور نہ دیتے) مسلمانوں کے زوال و اضمحلال کو دور کرنے کے لئے کافی نہ تھی بلکہ وہ ان میں اپنے حریف کی طرف سے اطمینان اور بے خوفی کا سبب بن سکتی تھی۔

دوسری چیز جو مصنف کو ممتاز کرتی ہے اور ان کو اسلام کے عظیم مفکرین کی صف میں داخل کرتی ہے وہ حیات انسانی کے ارتقا پر ان کے جامع وسیع اور گہری نظر ہے، پانچوں ابواب جن پر کتاب مشتمل ہے، ان کی وسعت نظری ظاہر کرتے ہیں جس میں عام انسانی تاریخ کا جائزہ لے کر اس کو ایک خاص نقطہ پر مرکوز کیا گیا ہے، کتاب کے ان صفحات کے اندر اسلامی تاریخ کے ساتھ ساتھ مغربی ممالک کی تاریخ بھی (مذہبی و اجتماعی حیثیت سے) ملے گی، مذہبی تحریکات کے واضح اور روشن نقوش، اخلاقی تحریکات کے عام میلانات و رجحانات، ان کا عروج و زوال اور نشیب و فراز، یہ سب چیزیں ہیں جو آپ کو واضح نتیجہ تک پہنچاتی ہیں۔

لیکن یہ بڑے انقلابات و تحریکات مصنف کو جزئی واقعات

کے حوالے واستشہاد سے غافل نہیں کرتے، وہ بسا اوقات روزمرہ
کے واقعات سے استدلال و برہان کا کام لیتے ہیں اس لئے کہ
ان چیزوں کی بھی بحث و تحقیق کے میدان میں ایک جگہ ہے اور
ان کے وسیلے سے اہم نتائج تک باریابی ہوسکتی ہے ان مثالوں
نے ایک طرف کتاب کو زندگی اور نشاط عطا کیا ہے، دوسری طرف
وہ کتاب کی پوزیشن بھی مضبوط کرتی ہیں اور غالباً ۱۴۰-۱۵۶ کے
صفحات جہاں مصنف نے یورپ کی مادیت پر بحث کی ہے ان
کے طرز بیان اور اسلوب کی بہترین مثال ہے جو فکر عام کو سمیٹنے
کے ساتھ جزئی مثالوں پر بھی مشتمل ہے۔

مصنف جہاں کہیں بھی کسی رائے اور نظریہ کا اقتباس پیش
کرتے ہیں تو فوراً اس کا حوالہ، ماخذ بیان کر دیتے ہیں اور اس طور
پر وہ امانت داری اور وفا شعاری کی ایک مثال قائم کرتے ہیں جس
کی ہمیں آج کل سخت ضرورت ہے، اگرچہ یہ اقتباسات کبھی کبھی
ہلکے قسم کے بھی ہو گئے ہیں اہم اقتباسات اور ضروری حوالوں
کے پہلو ہی میں آپ کو مصر الفتاه (ص ۶۲) کا حوالہ بھی ملے گا،
دوسری جگہ مجلة الاثنین (ص ۲۱۱) کے کسی مقالہ سے اقتباس
کیا گیا ہے، ظاہر ہے کہ مقالہ نگاروں نے مضامین بر سبیل تفریح
لکھے ہوں گے اگرچہ اس تفریح کے پیچھے حقائق کا سایہ بھی ہے۔

اسلوب کتاب کے متعلق ایک بات اور عرض کرنا ہے ڈاکٹر
احمد امین نے کتاب پر مقدمہ لکھتے وقت یہ جملہ لکھا ہے "اور قاری
سے میری معذرت؟ اگر اس میں چند غامض عبارتیں نظر آئیں،

اس لئے کہ فاضل مصنف ہندی نژاد اور ہندی تہذیب کے فرزند ہیں جنھوں نے عربی علم وادب اپنی جدو جہد اور محنت سے حاصل کیا ہے اگر چہ کتاب (اور اس میں کوئی شبہ نہیں) بلیغ اور خوبصورت تشبیہات سے خالی نہیں''۔

کیا کتاب میں غامض عبارتیں پائی جاتی ہیں؟ میں تو نہیں سمجھتا حقیقت تو یہ ہے کہ کتاب کا ایک خاص وصف اس کا یہی واضح اسلوب ہے، اور شاید اسلوب کی یہی شگفتگی، عقیدہ، ونظریہ کے نکھار اور اس پر ایمان ویقین کا عکس ہے، اس کے علاوہ یہ اسلوب بہت پختہ اور متین ہے مصنف قرآن مجید سے استشہاد پر پوری طرح قادر ہے، (مثال ۱۶۷، ۵۶، ۵۵، ۵۳۔۵۴) بہت سی جگہ حدیث اور اشعار سے بھی استشہاد ہے (ص ۸۴) قرآنی اور دوسری عربی ترکیبوں کا بہترین استعمال عنوانات کا لاجواب انتخاب اور تنوع، اور ہر چیز کو اپنی جگہ رکھنا گویا وہ اسی کے لئے تھی، یہ سب باتیں ایک متین پختہ، واضح اور شگفتہ اسلوب کی نشانی ہیں۔

ایک چیز اور ہے جس کی طرف اشارہ کرنا ضروری ہے کہ کتاب عالم اسلام کے مسائل پر ہندوستانی طرز فکر کا نمونہ ہے، خواہ مصنف نے اپنے افکار پیش کئے ہوں یا اپنے معاصر مفکرین کے افکار کو نقل کیا ہو، اور ہم مسلمانوں کو اس کی سخت ضرورت ہے کہ ہمارے افکار ونظریات ایک دوسرے سے قریب آئیں اور ہم سمجھ سکیں کہ ہندو پاک، مشرقی جزائر، ایران وافغانستان کے

مسلمان عالم اسلام کے مسائل میں کیا نقطہ نظر رکھتے ہیں اور ان کا طرز فکر کیا ہے، ورنہ اس کے بغیر اصلاح و ترقی کی کوششیں ناقص اور ناتمام رہیں گی۔

ایمان و یقین اور زندگی سے لبریز صفحات مسلمانوں کی موجودہ حالت پر باشعور افسوس اور ان کے اندر خیر کے سرچشموں کو چھیڑنے کی مبارک کوشش، اسلامی قیادت کے صحیح خدوخال اور اس کے اوصاف و خصائص کی تصویر (ص ۸۲) اسلام کے بلند نصب العین کی طرف توجہ، روحانی زندگی اور پاکیزہ مادی زندگی کے اجتماع کی گرم جوشی سے دعوت فکر اسلامی کے مابعد الطبیعی اور کلامی مباحث کی پیچیدگیوں سے ہٹا کر، حقیقت پسندانہ فکر، روشن اور زندہ ایمان اور توحید خالص کی طرف رہنمائی جو زندگی اور انسانی فکر کے تمام عقدے حل کرتی ہے۔ ایسی زندگی کے احیا کی کوشش جو رنگ و نسل کے امتیازات سے پاک ہے، عالم عربی کو اس پیغام کی ذمہ داری سنبھالنے کی دعوت یہ ہے کہ کتاب (ماذا خسر العالم بانحطاط المسلمین) اور اس بنیاد پر یہ کتاب اس قابل ہے کہ مشرق عربی کا کوئی گھر اس سے خالی نہ رہے، اور ہمارا کوئی نوجوان اس کے مطالعہ سے محروم نہ رہے، شاید وہ ہمارے نوجوانوں میں یقین واعتماد پیدا کر سکے اور اس گمشدہ راہ پر لا سکے جو بہت عرصہ ہوا چھوٹ چکی ہے۔

اگر اس کتاب کا کام صرف یہی ہوتا کہ وہ ان موضوعات پر ابھار دیتی تب بھی وہ بہت قابل شکر اور لائق ستائش تھی، اور

ڈاکٹر احمد امین کو جنہوں نے جیسا کہ مجھے معلوم ہے کتاب کے لئے اپنی صحت وقوت کی پروانہ کرتے ہوئے بے دریغ اپنا وقت خرچ کیا، اور "لجنة التأليف " کو جس نے ہم کو عظیم اسلامی مفکر سید ابوالحسن علی ندوی سے تعارف حاصل کرنے کا موقع دیا میرا بہت شکریہ"!

"ماذا خسر العالم بانحطاط المسلمين" پر سید قطب شہید رحمۃ اللہ علیہ نے دوسرا مقدمہ لکھا جس میں کتاب کی پوری روح آگئی ہے، اور دل کھول کر انتہائی فراخ دلی سے اس کے محاسن کا اعتراف کیا ہے، ڈاکٹر احمد شرباصی اور دوسرے اساتذہ ازہر، اساتذہ جامعۃ القاہرہ نے اپنے تاثرات لکھے ہیں، اگر سب کو جمع کر دیا جائے تو دو سو صفحہ سے زیادہ کی ایک کتاب مرتب ہو جائے۔

واضح رہے کہ عربی میں شائع ہونے سے پہلے اس کا اردو ترجمہ ہندوستان میں چھپ چکا تھا، اور اس کے بعض اقتباسات مولانا سید حسین احمد مدنی رحمۃ اللہ علیہ نے اپنے خود نوشت سوانح "نقش حیات" میں نقل کیے ہیں۔

استاذ جواد مرابط' اور ڈاکٹر مصطفیٰ سباعی نے اس کو صدی کی بہترین کتابوں میں شمار کیا ہے۔



تاریخ دعوت وعزیمت

یہ کتاب جو اردو میں پانچ جلدوں اور عربی میں چار اجزاء پر مشتمل ہے، ان بزرگان سلف کی انفرادی خصوصیت اور جہادی کارناموں کی تفصیل ہے جنھوں نے مصنف کی ذہنی تشکیل اور ذوق ورجحان کی تعمیر میں اپنا گہرا نقش ڈالا ہے۔ یہ کتاب 'اسلامی تاریخ' کے ضمن میں شمار کی جاتی ہے، لیکن حقیقت میں تاریخ اسلامی کے علاوہ دعوت دین کے مختلف انواع واسالیب کی داستان ہے۔ ان شخصیات کی دعوتی جدوجہد کا بیان اس لیے نہیں کیا گیا ہے کہ تاریخ میں ان کا نام زندہ رہے یا اس لیے کہ تاریخ نویسی کا ذوق مصنف پر غالب تھا، بلکہ جو روح ان تذکروں میں کام کر رہی ہے وہ یہ ہے کہ ان مصلحین امت نے اپنے اپنے زمانوں میں دعوت کا کون سا میدان تلاش کیا اور کس طرح اسلام کے چراغ کو باطل کی آندھی میں روشن رکھا۔ جن بزرگوں کے تذکرے اس کتاب کے متعدد اجزاء میں پھیلے ہوئے ہیں ان میں ہر ایک نے امت محمدیہ کے لیے رشد وہدایت کا فرض ایسے اوقات میں انجام دیا ہے جس سے اس یقین میں اضافہ ہوتا ہے کہ رسول صلی اللہ علیہ وسلم خاتم النبیین تھے اور آپ کی سنت پر قائم رہتے ہوئے دین کی حفاظت اور اصل دین کی مدافعت کے لیے آپؐ کی امت کے ہر دور میں مصلحین پیدا ہوتے رہے۔

یہ کتاب جن خطبات کا مجموعہ ہے اس کی ابتدا یوں ہوئی کہ دمشق یونیورسٹی میں کلیة الشریعه (یہاں کی اصطلاح میں شعبۂ اسلامیات) قائم ہوا تو عالم اسلام کے ممتاز ترین اسکالرس کو تدریس کی دعوت دی گئی جن میں برصغیر (ہندو پاکستان و بنگلادیش) سے حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی مدظلہ کو دعوت دی گئی، آپ نے مستقلاً پروفیسر شپ کی قبولیت سے معذرت کر لی البتہ چند خطبات دینے پر راضی ہوئے۔ جس کا گزشتہ صفحات میں ذکر آچکا ہے، بہر حال یونیورسٹی کی مجلس انتظامیہ نے اس شرط کو منظور کر لیا اور اسی کو غنیمت سمجھا اور بحیثیت 'استاذ زائر' آپ کو خطبات دینے کے لیے مدعو کیا۔ یہ واقعہ ۱۳۷۵ھ مطابق ۱۹۵۶ء کا ہے۔

آپ نے ان خطبات کا موضوع خود پسند کیا اور یونیورسٹی نے آپ کے پسندیدہ عنوان پر خطبات پیش کیے جانے کی سرکاری منظوری دی۔

ان خطبات کا سلسلہ دو ماہ جاری رہا، ہر خطبہ ہفتہ میں ایک بار (چہار شنبہ کے روز) ہوا کرتا تھا جس میں شرکت کے لیے اساتذہ و طلبہ کے علاوہ شہر کے اعیان و علماء کو باقاعدہ دعوت نامے بھیجے جایا کرتے تھے۔ اور اس وقت کے مشاہیر علماء و مفکرین، شیوخ وقت پابندی سے شریک ہوتے تھے۔

یونیورسٹی میں جو خطبات پڑھے گئے وہ ظاہر ہے عربی ہی میں تھے لیکن بعد میں مصنف مدظلہ نے اس سلسلہ کو آگے بڑھایا۔ اور جیسا کہ عرض کیا گیا مقصد تاریخ نویسی نہیں بلکہ مردان فکر و عمل کی سیرت نویسی تھا۔ اس لیے مصنف کی فکر اور ان کے دینی ذوق کا آئینہ ان شخصیات کی سیرت میں دیکھا جا سکتا ہے دمشق یونیورسٹی میں جن مردان فکر و عمل (اصحاب دعوت و عزیمت) کے کارناموں پر روشنی ڈالی گئی اور جنھوں نے ایک سوانحی سانچہ اختیار کیا ان میں حضرت عمر بن عبدالعزیز، امام حسن بصری اور ان کے خلفاء امام احمد بن حنبل، شیخ ابوالحسن اشعری اور ان کے رفقاء، امام غزالی،

شیخ اکبر (معروف بہ غوث اعظم) عبد القادر جیلانیؒ اور مولانا روم (جلال الدین رومی) رحمۃ اللہ علیہم ورضی عنہم تھے۔

حضرت مصنف مدظلہ نے اس سلسلہ کو اردو میں آگے بڑھایا اور ایک مستقل کتاب امام احمد ابن تیمیہؒ پر تصنیف فرمائی۔ اس کا عربی ترجمہ مولانا سعید الرحمٰن اعظمی صدر شعبۂ عربی ادب دار العلوم ندوۃ العلماء نے کیا ہے تیسرا حصہ مکمل حضرت مجدد الف ثانی رحمۃ اللہ علیہ کی سیرت پر ہے اور اس میں طویل جامع مقدمہ حضرت مولانا نے عربی میں تحریر فرمایا اور اصل کتاب کا ترجمہ مولانا سلمان حسینی ندوی استاذ حدیث دار العلوم ندوۃ العلماء نے کیا، نیز حضرت شاہ ولی اللہ رحمۃ اللہ علیہ پر مکمل ایک جلد تحریر فرمائی اس کا ترجمہ بھی مولانا سلمان حسینی ندوی نے کیا ہے، اور اب چاروں جلدیں عربی میں یکساں گٹ اپ کے ساتھ بہت دیدہ زیب حروف اور اعلیٰ قسم کے کاغذ پر دار ابن کثیر دمشق نے شائع کیا ہے، اس خدمت کے انجام دینے میں سرگرمی و دلچسپی سے حصہ لینے کی توفیق سید عبد الماجد الغوری کو حاصل ہوئی، جو دمشق میں زیر تعلیم ہیں انھوں نے حضرت مولانا کی سوانح بھی لکھی ہے۔ جس کے دو اڈیشن نکل چکے ہیں اور اس پر علامہ شیخ احمد کفتارو کا مقدمہ اور ڈاکٹر مصطفیٰ الخن و ڈاکٹر وہبہ الزحیلی کے پیش لفظ ہیں جس میں حضرت مولانا سے بے انتہا عقیدت واحترام کا اظہار کیا ہے۔

تاریخ دعوت وعزیمت کے اس نئے اڈیشن (سیرین) پر مقدمہ ڈاکٹر مصطفیٰ الخن نے لکھا ہے جو یونیورسٹی کے پروفیسر ہیں انھوں نے اپنے مقدمہ میں حضرت مولانا کو مجددین امت اسلام کی صف میں شمار کیا ہے، اور انتہائی عقیدت، احترام سے کتاب اور مصنف کتاب کا ذکر کیا ہے۔

اس کتاب کے اردو ترجمہ پر پروفیسر وصی احمد صدیقی نے بیش بہا اور گراں قدر تبصرہ کیا ہے، جو دراصل پوری کتاب کی روح ہے اور اس لائق ہے کہ اس کی ابتدائی قسط

یہاں نقل کر دی جائے، پروفیسر وصی احمد اردو، فارسی اور انگریزی، ادبیات کا اعلیٰ ذوق رکھتے ہیں اور وسیع النظر فاضل ہیں پروفیسر صدیقی نے حضرت مولانا کی تقریباً تمام کتابوں کی تلخیص کر دی ہے اور ان کے تبصرے جیسا کہ عرض کیا گیا تمام پہلوؤں کا احاطہ کئے ہوئے ہیں اس لیے تاریخ دعوت و عزیمت اور اس کے بعد چند دوسری کتابوں کا خلاصہ وتبصرہ بجائے نئے سرے سے لکھنے کے موصوف ہی کی تحریریں نقل کر دی ہیں۔

مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندوی مدظلہ کی کتابی سیریز تاریخ دعوت وعزیمت علمی حلقوں میں بہت معروف رہی ہے، مولانا نے اپنی ملت کے روحانی وارثوں کے نام اور کام کو ایک لوح سیمیں پر ثبت کیا ہے، اور زمین کے یہ ستارے اپنی چمک سے آسمان کے تاروں سے کہیں زیادہ منور نظر آرہے ہیں، یہ سروش غیبی کی آواز ہیں ادب سے سننے کے مستحق، زندگی کی تفسیر کے لئے اپنی تسکین قلب کے لئے، اپنی ہمت برقرار رکھنے کیلئے کتاب میں بیان کردہ ان باکمالوں کے حالات زندگی اور کارناموں کا مطالعہ بہت کافی ہے، ان میں ایسے واقعات کا ذکر بھی ہے، جنھیں اکثر لوگ جانتے ہیں، لیکن کتاب میں ان کو پڑھ کر ایسا لگتا ہے کہ قاری پر ایسے راز یکایک فاش ہو گئے ہیں جن سے وہ اب تک آگاہ نہ تھا، یہ انگارے، بجھے نہ تھے مگر تاریخ کے خاکستر میں دب گئے تھے، انھیں مولانا نے کرید کرید کر نکالا ہے، اور پھونک پھونک کر پھر روشن کیا ہے۔

جیسے سمندری جہازوں کا قطب نما ہوتا ہے جہاز کا کوئی رخ ہو وہ ایک ہی سمت اشارہ کرے گا، اور جہاز کی رہبری کرے گا، ایسے ہی مولانا کی تحریر کا مقناطیس ہے، اس کا رخ ہمیشہ خدا کی طرف رہتا ہے سوانح اور تاریخ کی اس کتاب میں حضرت مولانا نے عقائد کی عقلی تصدیق کرنے کی کوشش نہیں کی ہے، اور روحانی امور

کو مادی صداقت کی طرح بیان نہیں کیا ہے، مذہب کو ریاضی اور سائنس کی ایک شاخ کی طرح نہیں برتا شاید یہی وجہ ہے کہ کوئی مضمون پڑھتے وقت آپ دیکھیں گے کہ جو کچھ آپ پڑھ رہے ہیں وہ آپ کے ذہن سے اترتا نہیں بلکہ زندہ رہتا ہے، صورت اور معنی ہیئت اور مضمون، صورت اور مفہوم بحیثیت مجموعی پوری کیفیت کے درمیان ایک توازن اور روحانی ہم آہنگی ہوتی ہے، پڑھنے والا ایک عجیب خوشگوار حیرت میں مبتلا ہوتا ہے کہ مضمون کو کس طرح خانوں میں بانٹے اتنا حصہ نفسیاتی بصیرت اتنا حصہ تاریخی صداقت، اتنا حصہ صوتی خوشگواری اور اتنا حصہ مصنف کی شخصیت ہے، حضرت مولانا کا بیان زندگی اور تاریخ کے ادراک میں کسی نقطۂ انجام کو قبول نہیں کرتا بلکہ مسلسل اپنے دائرہ نظر کو وسیع سے وسیع تر بناتا چلا جاتا ہے، ان عظیم شخصیتوں کا بیان اس طرح ہے کہ ان کے احساسات میں عظمت جذبات میں نیکی، استدلال میں صداقت اور کارناموں میں حسن نظر آتا ہے، ان کے اور ایک عامی کے درمیان محبت کا تعلق ہوتا ہے، یہ وہ مقدس سلسلہ ہے جو عوام کے نفوس کو ان عظیم نفوس کے ساتھ متعلق کرتا ہے جن سے ایک مقناطیس کی طرح لہریں اٹھ اٹھ کر لوگوں کے روحانی زندگیوں کو ایک دوسرے کے ساتھ مربوط کرتی ہیں، یہ وہ مبارک لوگ ہیں جنھوں نے مذہب کی تجدید کے ساتھ معاشرے کی تجدید بھی کی ہے وہ جذبات جو اس کتاب کے مطالعہ سے پیدا ہوئے ہیں دل کو ایسی نرمی اور دماغ کو ایسی بالیدگی بخشتے ہیں جو انسان کو پہلے سے زیادہ دیندار اور دانا بنا دیتے ہیں، بھولے بسرے پیمانوں اور زور زبردستی سے توڑے ہوئے رشتوں کے باوجود نوع انسان کی وسیع سلطنت کو مذہبی جذبے اور اتحاد کے رشتے میں مربوط کرتے ہیں۔

ان سلسلہ واقعات کے بیان میں حضرت مولانا نے ہر سچائی کی گواہی دی ہے ہر خوشی کی بات کو چار چاند لگایا ہے، اور ہر غم میں معنی پیدا کیے ہیں۔

تاریخ پر یہ مجبوری عائد ہے کہ وہ واقعات اور انسانی افعال کو من وعن بیان کرے، مورخ اس بات کا مجاز نہیں کہ اخلاقی ہدایت یا عبرت کے خاطر نیکی کو نیکوتر اور بدی کو بدتر بنا کر دکھائے مگر مولانا کے یہ ممدوح کائنات کے ایک افضل اخلاقی نظام کو ضرور پیش کرتے ہیں، یہ جذبہ پیدا ہوتا ہے، کہ ان پاکیزہ روحوں کی پاک بینی نیکی کی تقلید کی جائے۔

ایک اچھے مضمون میں ایک مکمل وحدت ہوتی ہے اس کے پڑھنے کے بعد قاری کو فنی مہارت کا لذت بخش احساس، بصیرت میں اضافہ اور ایسے جذبات اور واردات کی شناخت کا لفظ آتا ہے جو خود اس کے اندر موجود ہیں، اس کتاب کو پڑھ کر ایک بیتاب خواہش دل میں پیدا ہوتی ہے، کہ اے کاش ماضی کے دور دراز سائے مستقبل کا آئینہ ہو جائیں۔

دین کے تجدید اور اصلاح کرنے والی مبارک ہستیوں کے ساتھ ان لوگوں کا بھی ذکر ہے جو مسلمان کے ایمانی غیرت کے محافظ ہوئے، جن کے کارناموں نے ساری دنیا میں مسلمانوں کی ایک مرتبہ پھر دھاک جمادی اور ہمیں حضرت خالد بن ولیدؓ حضرت سعد بن وقاصؓ اور حضرت عمرو بن العاصؓ جیسے مجاہدین اور جاں فروش سپہ سالاروں کی طرح ایک نام دوسرے ناموں کے ساتھ نظر آتا ہے، جس کی عظمت کے آگے ساری مسیحی دنیا نے گھٹنے ٹیک دیئے، جس کی بے مثال شجاعت اور نرم دل نے اسے مغربی ناول نویسوں کے لئے مرکزی کردار کی فراہمی کی، میرا مطلب سلطان صلاح الدین ایوبی سے ہے ان کے حالات کے بیان میں وہ لوگ بھی آگئے جو ناکام مجاہد اور ہزیمت نصیب غازی رہے، اور جن کی شہادت ہی ان کا انعام رہی۔

سب سے آخر میں مولانا روم اور ان کی مثنوی کا بیان ہے یہ اکیلے شاعر ہیں جو اس فہرست میں آئے صرف اس لئے کہ ان کی مثنوی کو "ہست قرآن درزبان

پہلوی'' کہا گیا ہے'' ان کی مثنوی ہمیشہ میرے ذہن میں ملٹن کی جنت گمشدہ کا خیال لاتی ہے، انسان کی پہلی حکم عدولی سے ملٹن کی نظم شروع ہوئی۔

کوئی شک نہیں یہ بے مثال نظم ہے اور دونوں کا تقابلی مطالعہ بالکل ایسا ہی ہے جیسے سینٹ پال کی عیسائیت اور مذہب اسلام کا مقابلہ ایک طرف ملٹن نے ابلیس کو جوش عمل اور شاہانہ شان وشوکت کا مجسمہ دکھایا اور اسے خراج عقیدت پیش کیا، دوسری طرف مولانا روم نے فرمایا'' زیرکی ز ابلیس وعشق از آدم ہست مولانا روم کے عشق کے نکتہ کو جس طرح حضرت مولانا نے واضح کیا ہے میں اس کا بیان آگے کروں گا مگر مجھے علامہ اقبال کا خیال آتا ہے جو پیر رومی کے مرید تھے لیکن ابلیس کے لئے نرم گوشہ دل میں رکھتے تھے، جنھوں نے جاوید نامہ میں خود مولانا روم کی زبان سے اسے خواجہ اہل فراق کا خطاب دلایا ہے، مولانا روم کی مثنوی دانتے کی بھی یاد دلاتی ہے، جو یقیناً امور محبت کا جاننے والا تھا، اپنی محبوبہ بیٹرس کو جنت کی ایک مقدس ہستی بنا دینے اور اس کے حسن اور اپنی محبت کی درجہ بدرجہ ترقی کے قدم بہ قدم اپنے کو عرش خداوندی کے پائے تک پہونچا دینے کی داستان شاعری کا ایک بے حد شاندار کارنامہ ہے، طربیہ خداوندی کا وہ حصہ جو بہشت سے تعلق رکھتا ہے، محبت کی شان میں ایک حمدیہ ترانہ ہے یہی لفظ محبت مولانا روم کی زبان میں اپنے خاص معنوں کے ساتھ عشق ہو گیا ہے، ورنہ اس سے پہلے کے صوفی شاعروں مثلاً عطار اور سنائی نے اس لفظ کا استعمال کم کیا ہے۔

اس کتاب کا دیباچہ خود ایک بے مثال علمی اور تحقیقاتی کام ہے اور دوسرے مصنفین اس دیباچہ کے حوالہ سے سند اعتبار حاصل کر سکتے ہیں۔

اس نمونہ کا دیباچہ اپنی کتاب کے لئے ابن خلدون نے لکھا تھا، جس نے یورپ کے علمی حلقوں میں تہلکہ مچا دیا تھا، اور جس نے فلسفہ تاریخ کو ایک سائنٹفک،

مضمون کی حیثیت سے پیش کیا تھا، مگر وہ دیباچہ اس علم کے مبادیات اور اصولوں سے معاملہ رکھتا ہے کوئی شک نہیں ابن خلدون نے اپنے نتائج کا استنباط بڑی ذہانت سے کیا ہے، مگر مذاہب کا تقابلی مطالعہ اور خاص طور پر مسلمانوں کے عروج اور انحطاط سے اپنا معاملہ نہیں رکھا ہے۔

کتاب کے مقدمے میں حضرت مولانا نے اصلاح وتجدید کی ضرورت اور تاریخ اسلام میں ان کا تسلسل بیان کیا ہے، اور ابتداء اس طرح ہوتی ہے، کہ اللہ کا دین مکمل ہے مگر زندگی متحرک اور تغیر پذیر ہے اور اسلام کے ابدی عقائد وحقائق ایسے ہیں کہ وہ ہر دور میں دنیا کی رہنمائی کر سکتے ہیں، ہماری امت کو جو زمانہ دیا گیا ہے وہ سب سے زیادہ انقلابات سے پر ہے، ماحول کے اثرات کا مقابلہ کرنے کے لئے ہر دور میں ایسے اشخاص پیدا ہوتے رہے جو دین کی تعلیمات کو زندگی میں منتقل کرتے رہے۔

اسلام نے اپنے سارے حریفوں کو شکست دی، باطنیت، صلیبوں کے حملے اور تاتاریوں کی یورش علاوہ اسلام کے کسی اور دین کو بالکل توڑ دیتے، لیکن اسلام اسے برداشت کر گیا، تحریفات، بدعات، مشرکانہ رسوم، نفس پرستی الحاد اور لادینیت کا اسلام پر بارہا حملہ ہوا مگر ہر دور میں ایسے لوگ پیدا ہوئے جنھوں نے اسلام کی مدافعت کی، دوسرے مذاہب کی تاریخ میں ایسی شخصیتوں کی بڑی کمی رہی ہے سینٹ پال نے عیسائیت کے ساتھ منفی کام کیا، تحریف کے ساتھ بہت سے بدھ رسوم کو اس سے وابستہ کر دیا، صدیوں پر صدیاں گزرتی گئیں مگر کوئی مصلح عیسائیوں میں نہیں پیدا ہوا،

پندرہویں صدی میں مارٹن لوتھر نے تھوڑی سی اصلاح کی کوشش کی مگر معاملات اتنا بگڑ چکے تھے کہ عیسائی مفکرین عیسائیت سے خود مایوس ہو گئے۔

ہندو مذہب میں بھی یہی ہوا، وہ ایک غیر عملی مذہب بن کر رہ گیا، بہت جلد اس نے اپنا اثر کھو دیا اور گوتم بدھ کی آمد ہوئی، انھوں نے ترک دنیا، تہذیب نفس اور

خواہشات سے مقابلہ کا نیا مذہب دیا، لیکن جلد ہی مورتیاں اور رسوم پھر اس پر حملہ آور ہوئے، بانی مذہب کے سادہ اور بلند اخلاقی درس الہیاتی موشگافیوں کے انبار کے نیچے دب گئے، پھر شنکر آچاریہ نے اس مذہب کو اپنے ملک سے بے دخل کر دیا۔

مذہب کو زندہ اشخاص کی ضرورت ہوتی ہے، اسلام کی تاریخ میں کوئی مختصر مدت ایسی نہیں پائی جاتی جب اسلام کی دعوت بالکل بند ہو چکی ہو، ایسے طاقت ور اشخاص پیدا ہوتے رہے جو ہر فتنہ کا مقابلہ کرتے رہے، قدریت، جہمیت، اعتزال، خلق قرآن، وحدت الوجود اپنے وقت کے بڑے اہم عقائد تھے، لیکن اسلام نے ان پر فتح پائی اور اب ان کی تفصیل صرف تاریخ عقائد میں محفوظ ہے۔

تجدید و انقلابات دعوت و اصلاح اسلام کی تاریخ ہی کی طرح مسلسل ہے، یہ تاریخ زیادہ تر ان کتابوں میں محفوظ ہے، جس میں شاگردوں اور مریدوں نے اپنے اساتذہ اور شیوخ کے نصائح، ملفوظات، حقائق اور معارف قلم بند کئے ہیں، ساتھ ہی ساتھ مجددین اور مصلحین کے مکتوبات اور مواعظ کے مجموعے ہیں، دعوت و عزیمت اس امت کے ہر دور میں اپنا کام کرتی رہی۔

یہ کتاب ان لوگوں کا بیان ہے، جنھوں نے جاہلیت اور مادیت کا مقابلہ کیا، امت میں ایمانی روح پیدا کی، دین کے ماخذ اور اس کی تعبیرات پر اعتماد کو از سر نو استوار کیا، امت کو نئے فتنوں میں پڑنے سے باز رکھا، اجتہاد کا دروازہ کھولا معاشرہ میں احتساب کا فرض ادا کیا، اور ایک نئے علم کلام کی بنیاد ڈالی۔

آیئے اب ہم ان اہم شخصیتوں ان کے زمانے اور ان کے کارناموں کا حال پڑھیں۔

کتاب کی ابتدا پہلی صدی کی اصلاحی کوششوں کے بیان سے شروع ہوتی ہے، جس کے اولین مصلح اور مجدد حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ تھے، بنی امیہ کے دور میں

ایسا لگتا تھا کہ وہ جاہلی رجحانات جو خلافت راشدہ کے اثر سے دب گئے تھے، پھر لوٹ آئے ہیں، اور اہل حکومت کی بے دین زندگی سے پوری اسلامی سوسائٹی متاثر ہورہی ہے، بنی امیہ کی حکومت ایسی مستحکم تھی کہ اس کو شکست دینا ناممکن نظر آتا تھا، مگر خود انھیں میں سے ایک شخصیت معجزہ کی طرح سامنے آئی وہ حضرت عمر بن عبدالعزیز کی تھی، سلیمان بن عبدالملک کے یہ جانشین حضرت عمر فاروقؓ کے جانشین نظر آنے لگے ان کی زاہدانہ زندگی تقویٰ اور احتیاط کافی معروف باتیں ہیں جن کا بیان غیر ضروری ہے، جو بات اہم ہے وہ یہ ہے کہ انھوں نے حکومت کا نقطہ نظر بدل دیا ان کا تاریخی جملہ ہے۔

''محمد دنیا میں ہادی بنا کر بھیجے گئے تھے، تحصیلدار بنا کر نہیں بھیجے گئے تھے''

ساری مدت خلافت وہ اِس اصول پر گامزن رہے اور ملک کے مصالح و منافع پر ہمیشہ دین واخلاق کو ترجیح دی معلوم ہوا کہ یہ نقصان کا سودا نہ تھا، انھوں نے اسلامی نظام مالیات اور طرز حکومت کی تشریح کی حکام کو دعوت وتبلیغ کی ترغیب دی، انھوں نے خود فرائض اور سنن کی تشریح کی، ان کے خطوط اور فرامین پڑھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کے قالب میں خالص اسلامی ذہن اور اسلامی روح کارفرما تھی، تقریباً ہر فرمان میں قرآن پاک کی آیتیں تحریر فرمائیں، اور لکھا کہ میں تم لوگوں کو اس قرآن اور اس پر عمل نہ کرنے کے نتائج بد سے ڈراتا ہوں، حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ کی مدت خلافت بہت مختصر رہی۔

اب دوسری صدی کی اصلاحی کوششوں کا بیان ہے، حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ کی وفات کے بعد حکومت پھر اسی ڈگر پر آگئی تھی جو ان سے پہلے تھی بلکہ اپنی خرابیوں میں کچھ اور بڑھ گئی وہ خطرہ جس کا سرکار دوعالم نے اظہار کیا تھا، یعنی مجھے تمہارے بارے میں فقر وافلاس کا خطرہ نہیں مجھے جو کچھ خطرہ ہے وہ اس بات کا کہ دنیا کی تم پر

ایسی آسائش اور فراخی ہو جیسے تم سے پہلے لوگوں پر ہوئی تھی اور تم بھی اس میں ایک دوسرے سے مقابلہ شروع کر دو، اور تم کو بھی وہ اس طرح ہلاک کر دے جیسے اگلوں کو ہلاک کیا تھا، یہ خطرہ پیش آگیا، اس خطرہ کا مقابلہ کرنے کے لئے کچھ مخلص اور سرفروش بندے میدان میں آئے انھوں نے امت کے ایمانی اور روحانی تسلسل کو قائم رکھا، اس دور کے ایمانی دعوت کے سب سے بڑے علم بردار حضرت حسن بصری سامنے آئے، ان کی شخصیت بڑی جامع دل آویز اور بڑی پرکشش تھی، وہ بلند پایہ مفسر اور مستند محدث تھے، اور دین میں پورا تبحر اور گہری بصیرت رکھتے تھے، اور ساتھ ہی ساتھ فصیح البیان مقرر تھے، ان کی جامعیت کا یہ عالم تھا کہ ان کی مجلس میں قسم قسم کے لوگ جمع ہوتے تھے، کوئی حدیث حاصل کر رہا ہے کوئی تفسیر میں استفادہ کر رہا ہے، کوئی فقہ کا درس لے رہا ہے کوئی مقدمات کے فیصلہ کرنے اور قضا کے قوائد سیکھ رہا ہے، ایسا لگتا تھا کہ وہ ایک بحر ذخار ہیں، جو موجیں لے رہا ہے، اور ایک روشن چراغ ہیں جو مجلس کو پر نور کر رہا ہے، پھر امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کے سلسلے میں ان کے کارنامے اور حکام اور امراء کے روبرو پوری فصاحت اور پر شکوہ الفاظ میں اظہار حق کے واقعات بھلانے کی چیزیں نہیں۔

امام غزالیؒ نے احیاء العلوم میں لکھا ہے کہ اس پر اتفاق ہے کہ حسن بصریؒ کا کلام انبیاء کے طرز کلام سے بڑی مناسبت رکھتا ہے اسی طرح ان کا طرز زندگی صحابہ کرامؓ کی طرز زندگی سے بہت مشابہ تھا، ایک غیر مسلم فلسفی (ثابت بن قرہ) کا مقولہ ہے کہ امت محمدیہ کی جن ممتاز ترین شخصیتوں پر دوسری امتوں کو رشک آنا چاہئے ان میں حسن بصریؒ بھی ہیں۔

حسن بصریؒ کے مواعظ دور صحابہؓ کی قوت اور سادگی کا نمونہ ہیں جن میں دنیا کی بے ثباتی اور آخرت کی اہمیت ایمان و عمل کی تلقین اور فریب نفس کی مذمت ملتی

ہے، اردو میں ترجمہ زبان کی خوبی کو ویسا ہی قائم نہیں رکھ سکتا ہے، لیکن اس کے دل کو چھونے والی کیفیت ختم نہیں ہوتی۔

''ہائے افسوس! لوگوں کو امیدوں اور خیالی منصوبوں نے غارت کیا، زبانی باتیں ہیں، مگر عمل کا نام نہیں، علم ہے مگر صبر نہیں، ایمان ہے مگر یقین سے خالی، آنے جانے والوں کا شور ہے مگر ایک بندہ خدا ایسا نظر نہیں آتا جس سے دل لگے'' مومنین (اولین) کے کان میں جب خدا کی یہ پکار پہونچی تو انھوں نے اسی وقت اس کی تصدیق کی اور اس پر لبیک کہا، اس کا یقین ان کے دل کی گہرائی میں اتر گیا، ان کا دل ان کا بدن اور ان کی نگاہیں خدا کی عظمت اور ہیبت میں جھک گئیں۔

حضرت حسن بصریؒ حق گوئی، اخلاقی جرأت اور شجاعت میں بھی ممتاز تھے، انھوں نے خلیفۂ وقت یزید بن عبدالملک پر برملا تنقید کی حجاج کی سفاکی مشہور ہے مگر ان کی زبان اس کے زمانہ میں بھی اظہار حق سے باز نہیں آئی، انھوں نے نفاق اور منافقین کی نشاندہی کی، انھوں نے فرمایا کہ اس امت پر کیسے کیسے منافقین غالب آگئے ہیں، جو پرلے درجے کے خود غرض ہیں۔

حضرت حسن بصریؒ کی وفات کے بائیس برس کے بعد خلافت بنی امیہ کا خاتمہ ہوا، اور خلافت عباسیہ کا آغاز ہوا، حضرت مولانا نے لکھا ہے کہ خلافت ایسی قومی اور نسلی بنیادوں پر قائم ہوگئی تھی، کہ اس کے مقابلہ میں کوئی آواز اور کوئی تحریک اس وقت تک موثر نہیں ہوسکتی تھی جب تک کہ اس کو شرافت نسب اور علو خاندان کی سند حاصل نہ ہو، اسی لئے خلافت اموی اور خلافت عباسی کے خلاف جنھوں نے علم جہاد بلند کیا ان کا تعلق اہل بیت سے تھا، زید بن علی بن الحسین نے ہشام بن عبدالملک کے مقابلہ میں علم جہاد بلند کیا اور شہید ہوئے۔

حضرت محمد ذوالنفس الزکیہ نے مدینہ طیبہ اور ان کے بھائی ابراہیم بن

عبداللہ نے کوفہ میں منصور کے خلاف علم جہاد بلند کیا، دونوں حضرات شہید ہوئے، ان کی کوششیں ناکامیاب ہوئیں، لیکن اسلامی تاریخ کی آبرو انھیں جواں مردوں سے قائم ہے۔



مسلم ممالک میں اسلامیت اور مغربیت کی کشمکش

اصل کتاب عربی میں لکھی تھی، الصراع بین الفکرۃ الاسلامیۃ و الفکرۃ الغربیۃ فی الاقطار الاسلامیۃ۔ماذاخسر العالم بانحطاط المسلیمن کے بعد یہ دوسری کتاب ہے جس کا موضوع امت اسلامیہ کے مشاکل ومسائل سے ہے، حضرت مصنف مدظلہ کا طریقہ بحث وتحقیق صرف یہ نہیں ہوتا کہ وہ مصائب کی داستان بیان کریں، یا مشکلات بیان کر کے مسلمانوں کے اندر بزدلی پیدا کریں، جو ان کی ہمت شکنی کا سبب ہو، بلکہ وہ مسلمانوں کے ذہن سے احساس کہتری دور کر کے ان کے اندر اسلام پر فخر کرنا سکھاتے ہیں، مصائب کا سامنا کر کے اس کے ازالہ کی شکل بتاتے ہیں، وہ خطرات کو بیان کر کے چھوڑ نہیں دیتے، بلکہ اسے دور کرنے کی راہ بھی سمجھاتے ہیں، آپ کی تالیف ایک حقیقت پسندانہ اور عادلانہ جائزہ ہے، کہ اس وقت عالم اسلام میں کیا ہو رہا ہے؟ اور مسلمانوں کی صحیح پوزیشن کیا ہے؟ کویت کے مجلّہ " المجتمع "میں اس کتاب کا تعارف وتبصرہ علامہ احمد محمد طحان کے قلم سے شائع ہوا ہے، اس کا ترجمہ یہ ہے:

''حضرت ابوالحسن'' مولانا سید ابوالحسن علی ندوی مدظلہ اس کتاب میں ہمیں

اس راہ پر لے گئے ہیں، جو انھوں نے فکر اسلامی کے میدان میں تاریخ کے گہرے مطالعہ اور اس کے علمی تجزیئے اور صحیح نتائج حاصل کرنے کے بعد نکالی ہے، اس کتاب میں بہت سے ایسے عوامل و مؤثرات ذہنی شورشوں اور اصلاح حال کے لئے ابھرتی شخصیات، تنظیموں، انجمنوں، انفرادی اور اجتماعی کاوشوں کا ذکر علمی و عقلی بنیادوں پر کیا گیا ہے، یہ کتاب ایک سوالیہ نشان ہے، ان سازشوں، اور چوطرفی حملوں کا مسلمانوں کے پاس کیا علاج ہے؟ کیا منفی اثرات کو قبول کر کے بیٹھ جانا اور اسلامی مورچہ کو چھوڑ کر الگ ہو جانا یا ان حالات کا مردانہ وار مقابلہ کرنا؟ پھر یہ سوال کہ موجودہ عصری شکست خوردگی کی ذہنیت کو عام کرنا اور میدان عمل سے راہ فرار اختیار کرنا مصلحت کا تقاضہ؟ اور کیا تعلیم یافتہ طبقہ اس خلا کو پر کرنے پر قادر ہے؟ اور کیا وہ اس بیسویں صدی میں عملی طور پر موجودہ اور آنے والی نسلوں کے لئے اخلاقیات کی بنیاد پر اور سیاسی سوشل (اجتماعیاتی) اور عسکری تنظیم پر قادر ہے؟ اور کیا وہ اپنے محدود وطنیت کے تصور سے آگے بڑھ کر پوری امت کی اصلاح حال کا کوئی ذریعہ بن سکتا ہے؟ اور ان مصنوعی حصار کو توڑ کر آگے بڑھنے کا حوصلہ رکھتا ہے؟ اور قرآن کے سایہ میں اپنی شناخت قائم کرسکتا ہے؟

یہ کتاب اپنی گوناگوں خصوصیات کی بنا پر مصنف کو معاصر علماء کی صف میں ایک ممتاز مقام عطا کرتی ہے، جس کی کاوش کا محور دین کی سلامتی اور ایمان کی قوت ہے۔

علامہ احمد محمد طحان ایک وسیع النظر صاحب علم ہیں، قدیم و جدید اسلامی لٹریچر پر ان کی نظر ہے، اس کتاب پر تبصرہ کرتے ہوئے آخر میں لکھتے ہیں۔

ان الكاتب قد جمع بين مزايا عديدة جعلته من اقدر الباحثين المعاصر ين على معالجة الامور الا سلامية ضمن عقلية علمية دقيقة وايمان هادئ ۔

(اس کتاب کے مصنف کے متعدد امتیازی اوصاف (جو اس کتاب میں جھلکتے ہیں) ایسے ہیں جنھوں نے اسلامی امور کی گتھیاں سلجھانے میں اور علمی و عقلی بنیادوں پر مسائل کا حل بتانے میں اپنے تمام معاصر علمائے تحقیق میں سب سے بلند مقام پر کھڑا کر دیا ہے۔)



تہذیب وتمدن پر

اسلام کے اثرات واحسانات

یہ کتاب اصلاً عربی میں لکھی گئی تھی، اور اردو وانگریزی میں اس کے ترجمے شائع ہو چکے ہیں، یہ کتاب ایک غیر جانبدارانہ علمی جائزہ ہے، جس میں دکھایا گیا ہے، کہ اسلام نے دنیا کو کیا دیا، کتاب داعیانہ خطابت اور علمی استدلال کا مجموعہ ہے، انسانی تمدن کا ایک تاریخی جائزہ بھی ہے، اور دوسرے ادیان مذاہب کا تعارف بھی، اسلوب بیان خطیبانہ اور عالمانہ دونوں ہیں، اس کتاب میں مولانا نے اسلام کے جن احسانات کا ذکر فرمایا ہے، اور اس کی تفصیل بیان کی ہے کہ دنیا کو اسلام نے کیا عطا کیا، وہ حسب ذیل دس مرکزی عنوانات کے تحت آتے ہیں۔

(۱) عقیدہ توحید، تمام منفی وفلسفی چوں وچراں سے الگ ہو کر خالص، وجدانی اور واقعاتی تجزیہ کے ساتھ پیش کئے گئے۔

(۲) توحید ورسالت کے متعلق وہ عقیدہ جو تمام عالم اسلامی میں یکساں طور پر پایا جاتا ہے۔

(۳) یہ دکھایا گیا ہے کہ بنی آدم سب ایک دوسرے کے بھائی ہیں، اور سب

یکساں طور پر احترام وتعارف کے مستحق ہیں، مساوات، اور فطری ہم آہنگی ان کا امتیاز ہونا چاہیے۔

(۴) عورت کا صحیح مقام اور عزت و احترام کا درجہ جو اسلام نے دیا اس کا کسی قوم وملت نے اس کو مستحق نہیں سمجھا تھا، اس کے حقوق و واجبات دونوں کی پوری باریک بینی اسلام نے عطا کی ہے۔

(۵) دنیا میں اسلام ہی سب سے پہلا مذہب ہے، جس نے رنگ، نسل، زبان، وطنیت کے تنگ دائروں سے نکال کر ایک آفاقی برادری عطا کی، جس کے تمام افراد آپس میں بھائی بھائی ہیں۔

(٦) یہ دنیا کی جامعیت اور خدمت خلق اور بقائے زیست کے لئے ہر کام کو عبادت کا درجہ دینا۔

(۷) انسان کے اندر سے اس احساس کہتری کو دور کرنا کہ وہ پیدائشی طور پر کسی نعمت سے محروم ہے، یا کسی مرتبہ ومنصب کا حقدار نہیں ہے، بلکہ ہر انسان انسانی حقوق میں دوسروں کے برابر ہے، پیدائشی طور پر نہ محروم ہے نہ سرفراز، صرف عمل اُس کے بلند ہونے یا پست ہونے کا معیار ہے۔

(۸) علم اور عقل کو کام میں لانے، اس کو بڑھانے، اس سے دنیا کو فائدہ پہونچانے، اور خود فائدہ اٹھانے کا حق کسی ایک فرد، یا کسی خاص نسل کے لئے مخصوص نہیں ہے، بلکہ وہ ایک عالمی میراث ہے، جس کے سب برابر طور پر مستحق ہیں۔

(۹) دین اور علم کے درمیان ایک مقدس رشتہ ہے، علم بغیر دین کے ظلمت ہے، اور دین بغیر علم کے فتنہ کا سبب ہوسکتا ہے۔

(۱۰) ایک ایسی قوم انسان کے اندر اٹھائی گئی ہے جس کو یہ ذمہ داری سونپی گئی ہے

کہ دوسروں کو صحیح راستے پر چلائے، اور عدل کے میزان پر قائم رکھے، اور وہ دنیا کے خیر و شر میں ذمہ دارانہ کردار ادا کرے، جس کو عربی میں (وصایۃ) کہتے ہیں۔

اسلام کے لئے عطا کردہ اصول ہیں، جو اس کو تمام دنیا میں ممتاز کرتا ہے۔

یہ کتاب دمشق اور بیروت کے دار ابن کثیر نے شائع کیا ہے۔



ارکان اربعہ

اسلام میں عبادات کا کیا درجہ ہے، اور ان کے اندر کیا حکمتیں پوشیدہ ہیں، اس موضوع پر اہل علم وقلم حضرات نے گفتگو کی ہے، کسی نے اس کا ربط مادی فوائد سے جوڑا ہے، زکوٰۃ کے موضوع پر جب لکھا تو اس کا سلسلہ اقتصادیات سے قائم کیا، نماز کا فلسفہ یہ بتایا کہ اس سے اوقات میں ضبط ونظم پیدا ہوتا ہے، طبیعت اطاعت کی عادی ہو جاتی ہے، روزہ ضبط نفس کی مشق کراتا ہے اور حج ایک سالانہ مؤتمر ہے جس کا مقصد یہ ہے کہ مسلمانان عالم ایک جگہ جمع ہو کر اپنے مسائل مشاکل کا حل سوچیں، ''ارکان اربعہ'' کے مصنف نے ان عبادتوں کو فطرت انسانی کا تقاضہ اور بشریت کا زیور قرار دیا ہے، انسان کی خصوصیت اور اس کی فطرت کا مطالبہ بتاتا ہے کہ اس کے بغیر انسان کا وجود ایک لاشہ رہ جاتا ہے، اس کے اندر انسانی خصائل مفقود ہو جاتے ہیں، روح انسانیت عبادتوں کے بغیر ماہئی بے آب کے مانند تڑپتی رہتی ہے، دوسرے مذاہب کی عبادتوں اور اسلام کی تعلیم کردہ عبادتوں میں کیا فرق ہے؟ جبکہ اسلامی عبادات روح کی غذا اور مزاج شریعت کی دوا ہے، دوسرے مذاہب میں عبادات نامعلوم خوف سے نجات کا اور دنیاوی منافع کے حصول کا ذریعہ ہیں۔

مصنف مدظلہ نے جہاں انسانی نفسیات کا تجزیہ کیا ہے وہاں ایسا محسوس

ہوتا ہے کہ فطرت بشری ایک آئینہ کی طرح سامنے آگئی ہے۔

انسان مجموعۂ اضداد ہے

ان آسمانی صحیفوں میں ایسے نصوص وارشادات بھی ملتے ہیں، (اور علم وتحریر سے ان کی تصدیق ہوتی ہے،) جن میں اس عجیب وغریب مخلوق کی فطرت و نفسیات بیان کی گئی ہے، اور اس کے خمیر میں متضاد کیفیات وصفات کی جو عجیب و غریب آمیزش ہے، اس سے پردہ اٹھایا گیا ہے، درحقیقت اس کائنات کی تمام مخلوقات وموجودات میں انسان سے زیادہ نازک اور لطیف اس سے زیادہ عجیب و غریب اور اس سے زیادہ مجموعہ اضداد اور کوئی نہیں ہے، وہ کمزور ہے، لیکن قوت و طاقت کا پرستار ہے محتاج ہے لیکن مال ودولت کا عاشق ہے، فانی ہے، لیکن حیات ابدی کا خواہاں ہے، امراض وخطرات سے دوچار ہے، لیکن صحت وطاقت کا طلب گار ہے، کم ہمت بھی ہے، اور عالی حوصلہ بھی، اس کی حاجتیں بے شمار، اس کی تمنائیں غیر محدود، اس کے احساسات حباب سے زیادہ نازک اور اس کے جذبات ہر لمحہ تغیر پذیر، اس کی پیاس بجھتی ہے، نہ کسی سے اس کو سیری ہوتی ہے، ہر قدیم چیز سے دل برداشتہ اور ہر جدید کا دلدادہ، جو چیز میسر ہے، اس سے روگرداں، اور جو معدوم ومفقود ہے، اس کی جستجو میں سرگرداں اس کی خواہشات کی تعداد اس کی سانسوں سے زیادہ اور اس کی ضرورتوں کی فہرست اس کی عمر سے زیادہ طویل، اور یہ محدود دنیا اس کی آرزوؤں کی تکمیل کے لئے ناکافی ہے۔

درحقیقت ایک اقتباس کے بعد سیری نہیں ہوتی ہے، پوری کتاب اس دل آویز طریقہ پر فطرت انسانی کی نقاب کشائی کرتی ہے اس کے ذیلی عنادین سے شاید کسی قدر کتاب کی گہرائی اور مصنف مدظلہ کی طبیعت کی آمد کا اور مضامین کے

الہامی انداز کا پتہ چلتا ہے،

خدا اور انسان کے تعلق کی صحیح اور معقول شکل

پوری کائنات محو عبادت اور سر بسجود ہے۔

اس کائنات میں انسان کا مقام، دوسری مخلوقات سے اس کے امتیاز کا راز

موزوں طریقہ عبادت

اس کی شخصیت کا لباس

نماز کی مقدار و تعداد میں تخفیف کا راز اور اس کے نفسیاتی فوائد اور اثرات

اسی طرح زکوٰۃ کے باب میں رب اور بندے کا تعلق اور اس تعلق کا تقاضہ، مظاہر ربوبیت اور لطف و عنایت فطرت انسانی کا خاصہ اور زندگی و تمدن پر اس کا اثر، کوئی چیز انسان کی حقیقی ملک نہیں، اسلام کے اقتصادی نظام کا بنیادی تخیل ہر چیز خدا کی ملکیت ہے، اسی طرح کے عناوین سے زکوٰۃ کے تمام جزئیات سے بحث کی ہے،
صوم کے باب میں مصنف مدظلہ نے انسان کی اس خصوصیت کے بیان سے آغاز کیا ہے، کہ انسان انسان ہے نہ حیوان ہے اور نہ فرشتہ، روح و جسم کی باہمی کشمکش اور ان کے متضاد رجحانات کی اصلاح صوم سے ہوتی ہے، اخلاقی قدروں کی تشکیل کیلئے نبوت کی چارہ سازی، اس ضمن میں صوم کی تمام قسموں کو، سحور میں تاخیر اور افطار میں عجلت کا راز بتایا گیا ہے، رمضان کو عبادت کا عالمی موسم اور اعمال صالحہ کے جشن عام سے تعبیر کیا گیا ہے۔

حج کے بیان میں گفتگو یہاں سے شروع کی گئی ہے، کہ اسلام توحید دین اس میں وساطت و وکالت کی ضرورت نہیں ہے، توحید خالص اور اس کی اہمیت پر اس سے زیادہ گہرائی اب تک کسی نے اس طرح وضاحت نہیں کی ہے، شعار اللہ کی حکمت انسان کی فطرت میں عشق کا عنصر علم سے محبت پیدا ہوتی ہے، اور اس لئے

قرآن نے اس پر زور دیا ہے۔

کتاب کا یہ جزء علیحدہ رسالہ کی شکل میں شائع کر کے بعض عرب اہل علم نے حج کے موقع پر تقسیم بھی کیا ہے۔

جو حضرات حضرت شاہ ولی اللہؒ کے طرز بیان اور اسلوب بحث سے مانوس ہیں، خاص طور پر ''حجۃ اللہ البالغہ'' کے اسلوب و بیان سے ان کو محسوس ہوگا کہ کتاب ''حجۃ اللہ البالغہ'' کا مبارک تتمہ ہے، اور اس رنگ میں ڈوب کر حکمتوں کے موتی مصنف نے یکجا کر دیئے ہیں۔

بعض اہل نظر مصنفین نے اپنی دیدہ وری کا اظہار اس طرح کیا ہے، کہ اس کتاب کی اہمیت و افادیت پر دل کھول کر داد دی اور بلند الفاظ میں اس کی قدر دانی کی، پاکستان سے محترمہ مریم جمیلہ نے ایک طویل خط میں اپنے تأثر کا ذکر کرتے ہوئے لکھا کہ اس موضوع پر ایک منفرد کتاب ہے، جس نے اسلام پر میرے یقین کا اضافہ کیا۔



جب ایمان کی باد بہاری چلی

(اذاهبت ريح الايمان)

سیرت سید احمد شہید کی دعوت وتبلیغ اور تحریک جہاد کے اثرات کا، مصنف مدظلہ نے اپنی خاص تالیف میں مختصراً ذکر کیا ہے، لیکن یہ واقعات جو چشم فلک نے صدر اول کے بعد کہیں اور کبھی نہیں دیکھے ایمان کا جوش، یقین کی قوت، اور اصحاب عزیمت کی شجاعت محاسبہ نفس کی داستانیں ایسی نہیں ہیں، جن پر سرسری نگاہ ڈالتے ہوئے کوئی مصنف گزر جائے، ان میں ہر ایک واقعہ تاریخ کا بے مثل اور انوکھا حادثہ ہے، دنیا کی تحقیر، شہادت کا شوق، اللہ تعالیٰ کی رضا پر دنیا کی تمام نعمتوں کو قربان کردینے کا جذبہ، حضرت سید احمد شہیدؒ اور ان کے رفقاء کے اندر جس طرح موجزن تھا، اور جس درجہ اس کے اندر گہرائی تھی وہ مادی دنیا کے لئے عجائب میں سے ہے، مگر جب ایمان کے روح پرور جھونکے چلیں گے تو وہ صورت حال سامنے آئے گی جس کی تاویل سے انسانی عقلیں عاجز ہیں، سید احمد شہیدؒ کی زندگی اور جہادی کارناموں کے درمیان جو عجائب وغرائب دنیا نے دیکھے اس کی جھلکیاں اس کتاب میں پیش کی گئی ہیں، جس کا نام مصنف مدظلہ نے "اذاهبت ريح الايمان" رکھا، اور اس کا ترجمہ اردو میں "جب ایمان کی باد بہار چلی" ہے اس کے کئی ایڈیشن مختلف سائزوں میں شائع ہو چکے ہیں، اور بہت سے اہل علم نے اس کتاب کو پڑھ کر سید احمد شہیدؒ کی پوری سیرت وسوانح پڑھنے کی آمادگی محسوس کی۔

”قادیانی اور قادیانیت“

گزشتہ صدی میں انگریزوں نے دشمنی، کی ایک نئی شکل نکالی، جس سے وہ اسلام کی وحدت کو پارہ پارہ کرنا چاہتے تھے، اور حضور کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی عظمت کو اپنی سازشی ذہنیت کا نشانہ بنا رہے تھے، اس طرح کہ وہ ایک شخص کو پیغامبر بنا کر برصغیر میں کھڑا کر گئے، اس شخص کا نام غلام احمد قادیانی ہے، یہ شخص ایک سرکاری دفتر میں معمولی درجہ کا کلرک تھا، اور علمی واخلاقی کسی لحاظ سے ایک بلند کردار انسان کا درجہ نہیں حاصل کر سکا، مگر انگریز جس طرح آج کل سلمان رشدی اور تسلیمہ نسرین کی حفاظت میں کروڑوں روپے خرچ کر رہا ہے، کیونکہ ان دونوں نے اسلام اور قرآن کے خلاف بدگوئی کی ہے، تو ظاہر ہے کہ جو شخص پورے دینی نظام کو الٹنے پر آمادہ ہو، اس کی سرپرستی کیوں نہ کرتے؟

قادیانیت نبوت محمدی کے خلاف ایک سنگین اور بے ہودہ سازش تھی، جس کی بیخ کنی کے لئے اللہ نے مسلمان علماء کو توفیق دی، لیکن جو مٹھی بھر انسان گمراہ ہو چکے تھے، ان کی نسلیں پھیل رہی ہیں، اور دوسرے سادہ لوح مسلمانوں کو دھوکہ دینے میں کامیاب بھی ہو رہے ہیں، اہل حق کو اس کی بڑی فکر تھی، کہ مسلمانوں کی خاموشی کی وجہ سے کہیں یہ فتنہ عام نہ ہو جائے، چنانچہ حضرت مولانا مدظلہ کے شیخ مولانا شاہ

عبدالقادرؒ رائپوری کی فرمائش پر مولانا نے اس موضوع پر قلم اٹھایا، آپ کی یہ کتاب، علمی اور سنجیدہ حلقوں میں پڑھی گئی، رابطہ عالم اسلامی نے متعدد زبانوں میں اس کے ترجمے کرائے، اور اللہ کے بہت سے بندوں کو توبہ کی توفیق عطا ہوئی، اس کتاب کا ایک امتیاز یہ بھی ہے کہ مصنف نے اپنے اعلیٰ تہذیبی معیار کو گرنے نہیں دیا ہے، اور جو بھی گفتگو کی ہے وہ علمی اور اخلاقی حدود کے اندر ہے، اخلاقیات سے گرا ہوا کوئی جملہ، کسی بدترین دشمن کے لئے بھی گوارہ نہیں کیا، اس کا اعتراف خود قادیانیوں کو بھی ہے، اور اس پر تبصرہ کرتے ہوئے مولانا امین احسن اصلاحیؒ نے یہ لکھا تھا۔

مصنف کے جذبہ غضب پر ان کا حلم غالب ہے، اور ان کو وہاں بھی غصہ نہیں آتا جہاں غصہ آنا چاہئے۔



کاروان مدینہ

پروفیسر وصی احمد صدیقی

یہ کتاب حضرت مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندوی کی مختلف تقریروں اور سیرت پر مضامین کا مجموعہ ہے، ان مضامین میں تنوع اور بوقلمونی ہے لیکن قدر مشترک یہ ہے کہ ان سب کا تعلق ایک ہی ذات گرامی سے ہے، یعنی سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم سے ان کی تعلیمات، پیام اور ان کے احسانات کا بیان ہے، کتاب ایسی ہے جس کو پڑھ کر اس ذات مبارک سے محبت اور جذباتی لگاؤ ہزار گنا بڑھ جاتا ہے اور وہ کیفیات جو خوابیدہ سی لگتی ہیں، اکدم بیدار ہو جاتی ہیں، مصنف نے لکھا ہے کہ ایک عجمی نژاد دور افتادہ کے اس سے زیادہ اور بس میں کیا ہے، یہ حضرت مولانا کا عجز ہے، ورنہ اس کتاب پر اقبال کا یہ شعر پوری طرح منطبق ہوتا ہے،

سپاہ تازہ بر انگیزم از ولایت عشق

کہ در حرم خطر از بغاوت خرد است

علامہ علی طنطاوی نے جن سے مقدمہ لکھنے کی فرمائش کی گئی تھی، اسے غیر ضروری سمجھا اور اس کی بڑی معقول وجہ پیش کی ہے، کہ اس کی ضرورت نہ کتاب کو ہے نہ مصنف کتاب کو شاید کچھ مشک والی بات ان کے ذہن میں رہی ہو جس کا اظہار

انھوں نے نہیں کیا ہے البتہ اپنے احساسات انھوں نے بڑی سادہ زبان میں پیش کر دیئے ہیں، یہ سادگی محاکات پر غالب نہیں ہوئی، لکھتے ہیں کہ اس زمین کو محبوب اعظم محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کے قدموں نے سرفراز کیا، اس کی ہوا میں آپ کے انفاس کی عطر بیزی ہے اور اس کے پانی کو آپ کے حیات بخش لبوں نے مس کیا ہے کیوں کسی مسلمان کا دل اس شہر کے شوق میں بے تاب نہ ہو جائے، اپنے متعلق لکھا ہے کہ یہ بعد زمانہ کا اثر ہے یا غفلت قلب کا یہ جذبات اور احساسات سرد پڑ گئے تھے، مگر مولانا کی اس کتاب کو پڑھ کر شوق نے ان کے دل نے پھر انگڑائی لی، اور سینہ میں پھر تپش پیدا ہوئی، وہ نغمہ جو کھو گیا تھا انھیں اس نثر میں ملا جو کہ حقیقتاً شاعری ہے لکھتے ہیں برادرم ابوالحسن آپ کا صد ہزار شکر یہ کہ آپ نے دوبارہ میرے اندر اپنی ذات اور اپنے رب پر اعتماد بحال کیا، علامہ طنطاوی نے فرمایا۔ کہ پہلے ہم خشکی کے راستے سے آتے تھے، مدینہ کے راستہ میں ہفتوں لگ جاتے تھے شوق اور جذبہ ہمارا رہبر ہوتا تھا، ہمارے سینے میں ہزاروں تمنائیں موجزن ہوتی تھیں، اب ہم ہوائی جہاز سے دو یا تین گھنٹے میں یہ راہ طے کر لیتے ہیں ہم نے وقت کا فائدہ اٹھایا لیکن جذبات اور احساسات کا نقصان کیا۔ (کسبنا الوقت و خسرنا العواطف)

حضرت مولانا نے جس جذبہ کے تحت یہ مضامین لکھے ہیں اسے میں عقل وجدانی کہوں گا، اسی سے حضرت مولانا کی روح فیض یاب ہوئی ہے، ان مضامین میں تخیل اور جذبہ کی کارفرمائی ہے، نفس مضمون کی عطر بیزی اسی سے ہے، حسن خیر، صداقت یہاں ایک ہی ذات کے مختلف صفات ہیں، الفاظ اس کا ادراک پیش کرتے ہیں یہ ایک عطیہ غیبی ہے اس لئے میں نے اسے عقل وجدانی کہا ہے، ماورائے عقل نہیں جیسا کہ اکثر صوفیہ کہتے ہیں میں بتا دوں کہ یہ کتاب صوفیانہ استغراق کی آئینہ دار نہیں اس کے مضامین علوم عالیہ اور فنون لطیفہ کے بلند ترین سطحوں پر ہیں،

پوری کتاب مصنف کے مخصوص انداز فکر، احساس، تخیل، عقل اور محبت کے انوار سے لبریز ہے حضرت مولانا کے احساسات حقائق سے پیدا ہوئے ہیں اور ان کا ارتعاش پڑھنے والے کے دل کو بھی اس کی صدائے بازگشت سے مرتعش کر دیتا ہے۔

اقبال نے جس دیار کے لئے کہا تھا "اے خنک شہرے کہ آنجا دلبر است" حضرت مولانا کے مضامین کا یہ کارواں اسی شہر کی طرف رواں دواں ہے اسی دلبر کے شہر کے لئے جس کا اسم گرامی ہر مسلمان کے دل میں اہتزاز اور انبساط پیدا کر دیتا ہے چاہے وہ عابد شب زندہ دار ہو، چاہے رند بادہ خوار سب کے دل میں ایک کیفیت قبول، ایک تاثر پذیری، ایک دم پیدا ہو جاتی ہے، سب کا سینہ ایک دم کھل جاتا ہے توجہ اور تسلیم کے استقبال کے لئے۔

ان مضامین کے لئے کون سا لفظ استعمال کیا جائے، سروش غیبی فیضان الٰہی، ملکہ خداداد جو ہر قابل، ہر حال حسن ہر چیز پر محیط ہے اور یہ حسن اس شاعرانہ سرور اور جذباتی کیفیت کا خالق ہے جس کی نشاندہی علامہ طنطاوی نے کی ہے یہ ذکر حبیب آسمان اور زمین اور اس کے مظاہر کو ہمارے سامنے لے آتا ہے، آخر ان کی تخلیق کیوں ہوئی تھی تشبیہ اور استعارے اپنی جگہوں پر مگر سرّیت اور رموز باطن کا بیان نہیں۔

ساری کتاب ربودگی اور از خود رفتگی، وجد و سرور کی فضا رکھتی ہے صرف آمد ہی آمد ہے آپ کو یہ احساس ہوگا کہ جو اثر آپ کے اوپر ہوا ہے، وہ دوسرے الفاظ سے ممکن نہ تھا، اس کتاب کا تعلق افسانہ و حکایت درس و تلقین، فلسفہ و حکمت سے نہیں، تفکر، تاریخ اخلاقیات وغیرہ نے بحیثیت موضوع اس میں جگہ نہیں پائی ہے، حکیمانہ مقولے اور موعظت سے بھی معاملہ نہیں رہا ہے، پڑھتے جایئے اور اس سید مکی مدنی عربی پر دل فدا کرتے جایئے، جس کا نام و لقب کانوں میں رس گھول دیتا ہے، مدینہ

کا گلزار جس کے سبب سے ہمیشہ سر سبز رہے گا، اور جس کے کھجوروں کی مٹھاس ہمیشہ قائم رہے گی وہ پاک ذات، جسے شب معراج پروردگار مسجد حرام سے مسجد اقصیٰ لے گیا، اور ان مقامات تک پہونچایا جہاں تک کسی نبی کی رسائی نہیں ہوتی تھی اسی پروردگار نے اپنا مقدس کلام عربی زبان میں اتارا کیونکہ یہ اس کے محبوب کی زبان تھی، کتاب کو پڑھنے والے کو یہ خیال آئے گا کہ کون سی بات جو اس کتاب میں لکھی ہے اس کے علم میں نہیں، پھر یہ کون سا پر اسرار تغیر ہے جو یکا یک ان باتوں میں ایک نئی تب و تاب پیدا کر دیتا ہے، یہ دل کیوں کھنچا جا تا ہے، یہ روح کی گہرائیوں میں کیسی موسیقی گونج رہی ہے، یہ کون سی برقی رو ہے جو دل کے تاروں کو مرتعش کئے ہوئے ہے، یہ پڑھتے پڑھتے مراقبہ کی سی کیفیت کیوں طاری ہو رہی ہے، یہ ایک مکمل سکون کا احساس کیا ہے۔

ان کا کوئی جواب اس حقیر مضمون نگار کے پاس نہیں، اس کا دھیان نہ کسی ترکیب یا جملہ کی نغمہ خیزی پر جاتا ہے نہ الفاظ کی ہم آہنگی بلکہ خوش آہنگی پر، اسے تو کتاب پڑھنا ایک عبادت سا لگ رہا ہے، کیسی کیسی آرزوئیں اور بے تاب خواہشیں دل میں پیدا ہو رہی ہیں۔

ممکن ہے یہ ایک بلند نگاہ، لطیف الاحساس اور صاحب تخیل مصنف کے قلم کی سحر طرازی ہو، جسے سحر حلال کہیں گے، ایک خواب کی سی کیفیت ہے، اور کتاب ختم ہونے پر ایسا لگتا ہے کہ یہ خواب شکست ہو گیا، اور یہ رومانی فضا تحلیل ہو گئی۔

مصنف کتاب نے اپنی کتاب کی تزئین کے لئے آسمان کے تارے توڑنے کی کوشش نہیں کی ہے، ان کے پیر زمین ہی پر رہے ہیں، وہ زمین جس نے وہ آسمان پیدا کیا جو کتاب کے اندر اور لوگوں کے دلوں پر محیط ہے، مصنف کی زبردست قوت ان کے قوت بیان میں مضمر ہے ایسا لگتا ہے جیسے پڑھنے والا مصنف کے ساتھ ہم

رازی کے رشتے میں مربوط ہے اس سے عالی احساس اور کچھ نہیں ہو سکتا، کہیں خطیبانہ اثر انگیزی کا پرتو نہیں، کہیں شخصیت کا اظہار نہیں، بلکہ اس سے گریز ہے۔

آیئے اب ان ابواب رحمت میں داخل ہو جایئے، تصنیف کا پہلا مضمون ہے "وہ کتاب جس کا میں احسان نہیں بھول سکتا" یہ کتاب مولانا قاضی محمد سلیمان منصور پوریؒ کی رحمۃ للعالمین ہے، اس مضمون میں حضرت مولانا سامنے نہیں آتے بلکہ ایک دس گیارہ برس کا بچہ اپنی مہربان ماں کے سامنے روتا نظر آتا ہے، جسے ڈاکیہ سے کتاب لینی تھی، اور ماں کے پاس روپیہ نہ تھا دلارے معصوم بیٹے کے آنسوؤں کی تاب ماں نہیں لاسکی، اور روپیہ کا انتظام کر کے بیٹے کی ضد پوری کی، حضرت مولانا نے کتاب سے جو واقعات نقل کئے ہیں ان میں پہلا واقعہ سیدنا عمیر بن ابی وقاصؓ کا ہے جن کے آنسوؤں کی سفارش سے ان کو غزوہ بدر میں شرکت کی اجازت حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے دی، حضرت مولانا کا خیال ہے کہ معصوم بچے بڑوں سے زیادہ لطیف روح کے مالک ہوتے ہیں، اور زیادہ شعور رکھتے ہیں، خواہ اس کا بیان نہ کر سکیں، اس مضمون میں جو واقعات حضرت مولانا نے بیان کئے ہیں وہ ایسے ہی دلگداز ہیں قریش کے ان لوگوں کا ذکر جن کو اسلام قبول کرنے کی پاداش میں سخت اذیتیں دی جاتی تھیں، اور وہ اسے استقامت بلکہ لذت کے ساتھ برداشت کرتے تھے، مصعب بن عمیرؓ جو جامہ زیبی میں مثال دیئے جاتے تھے، غزوہ احد میں جب شہید ہوئے تو پورا کفن نصیب نہیں ہوا، اور سر ڈھانک کر پیروں پر گھانس ڈالی گئی، اس نظارہ نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو آبدیدہ کر دیا تھا، مدینہ میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا استقبال سارے قبیلوں کے سرداروں کا اصرار کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم ان کے یہاں قیام کریں، اور پھر حضرت ابو ایوب انصاریؓ کا شرف جو سرکار دو عالم کے میزبان ہوئے، احد میں صحابیوں کے اخلاص وفا، قربانی اور ایثار کی داستان، جنت کی خوشبو

سونگھنا، ابودجانہؓ جنھوں نے حضور کے بچانے کے لیے اپنے کو ڈھال بنالیا تھا۔

دوسرے مضمون کا عنوان ''عالم نو'' ہے۔

یہ بھی حضور صلی اللہ علیہ وسلم ہی کے ذکر میں ہے، جنھوں نے سب کی زندگی کا رخ بدل دیا، اپنی زندگی اور اپنے خاندان کی زندگی کو خطرہ میں بے دھڑک ڈال دیا، دولت و عیش کی بڑی سی بڑی پیشکش کو نامنظور کر دیا، محبوب وطن کو چھوڑا، ساری عمر بے آرام رہے، کبھی پیٹ بھر کے کھانا نہیں کھایا، ہر قربانی اور ہر خطرے میں پیش پیش رہے، جب دنیا سے تشریف لے گئے تو دنیا صحیح رخ پر آ چکی تھی، اور تاریخ کا دھارا بدل گیا تھا۔

صور زندگی کے عنوان سے جو مضمون آتا ہے وہ یہ بتاتا ہے کہ جسم اور پیٹ سے زیادہ ایک دوسری روشن حقیقت ہے، اور وہی کامیابی کی راہ ہے، حی علی الصلوۃ اور حی علی الفلاح کا نعرہ سارے بازاری شور وغل کو دبا دیتا ہے اور مادی حقیقتیں اس حقیقت کے سامنے دب جاتی ہیں، ایک غریب موذن کی صدائے اللہ اکبر ساری مصنوعی خداؤں کی خدائی کو زیر زبر کر دیتی ہے اور حقیقی بادشاہی کا اعلان کرتی ہے۔

وہ سحر جس سے لرزتا ہے شبستان وجود
ہوتی ہے بندہ مومن کی اذاں سے پیدا
(اقبالؔ)

''غار حرا کی روشنی'' وہ مضمون ہے جو ایک طرح کی خود کلامی ہے بلکہ بلند آواز سے سوچنا جسے انگریزی میں LOUD THINKING کہیں گے اس غار سے وہ صبح نمودار ہوئی تھی جس کے نور نے ہر چیز کو چمکا دیا، اور ہر سونے والے کو جگا دیا، تاریخ کا رخ موڑا، اور زمانے کا رنگ بدلا۔

اس غار میں دنیا کا وہ عقدہ حل ہوا، جو اس وقت لاینحل تھا، یہاں پروردگار عالم نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی رسالت کی صورت میں عالم انسانیت پر ایک احسان عظیم کا دروازہ کھولا، اور ایمان کی کنجی نے صدیوں کے بند قفلوں کو کھول دیا، نفس انسانی نفس امارہ سے نفس لوامہ ہوا، اور پھر نفس مطمئنہ بن گیا اب انسان حوادث اور واقعات سے عبرت حاصل کرنے لگا، مظلوموں کا حال زار دیکھ کر تڑپنے لگا، غریبوں، بیکسوں کے ساتھ شفقت کا برتاؤ کرنے لگا۔

''اقرأ'' کے سبق نے انسان کو علم کی قدر و قیمت یاد دلائی، مسلمان کا گھر اور مسجد مدرسہ بن گئی یہاں سے انصاف کا سبق ملا، امانت داری کا گہرا شعور اور خدا ترسی کا شدید احساس پیدا ہوا، دولت مندوں کو تعلیم ملی کہ مال اصل میں اللہ کا ہے۔

اس مضمون میں حضرت مولانا نے عہد رفتہ کی عمومی اسلامی زندگی کی تصویر کشی کی ہے، اور اس بات پر رنج کا اظہار کیا ہے کہ موجودہ دور کے مفکرین اور مصلحین کے پاس دل کو غذا دینے اور ایمان کا پودا لگانے کا سامان نہیں۔

آگے کے مضامین میں حضرت مولانا نے لکھا ہے کہ مردم سازی اور آدم گری کے کام میں اللہ تعالیٰ نے جو کامیابی آپ کو نصیب کی وہ آج تک کسی کو حاصل نہیں ہوئی، آپ نے انسانیت کی انتہائی پستی کو آخری بلندی تک پہنچا دیا، وہ لوگ سامنے آئے جن کا پختہ یقین، گہرا علم، گداز دل، بے تکلف زندگی، بے نفسی اور خدا ترسی، ذوق عبادت اور ذوق شہادت ان کی مال و دولت سے بے نیازی ان کی عقل اور حسن انتظام دنیا کی تاریخ میں اپنی نظیر نہیں رکھتا۔

خاکی و نوری نہاد بندہ مولا صفات
ہر دو جہاں سے غنی اس کا دل بے نیاز

حضرت ابو بکرؓ کا تھوڑی سی بچائی ہوئی رقم کو جو شیرینی کی تیاری میں صرف

ہوئی بیت المال میں داخل کر دینا حضرت عمر فاروقؓ کا بیت المقدس میں اس طرح داخل ہونا کہ غلام سواری پر اور خود نیچے اور پھٹے ہوئے پیوند لگے کرتے کے ساتھ صلح نامہ پر دستخط کرنا، سلطان صلاح الدین ایوبی جیسے زبردست فاتح اور عالیشان حکمراں کی شفقت و مرحمت اور احسان و فیاضی وہ مثالیں ہیں جو قاری کو حیرت اور فخر میں مبتلا کر دیتی ہیں۔

اس کتاب کا معرکۃ الآرا مضمون "امت کے وفود آقا کے حضور میں" کے صفحات کھلتے ہیں، یہ وہ مضمون ہے جس کو صاحب ذوق لوگوں نے بار بار پڑھا اور فیچر کے طور پر ریڈیو سے سنا، سعودی ریڈیو سے بھی نشر ہوا اور لکھنؤ ریڈیو سے بھی حضرت مولانا نے نامور شخصیتوں اور رہنماؤں کو بارگاہ نبوی میں حاضر ہوتے دکھایا، تخیل نے وہ نقشہ کشی کی کہ خود پڑھنے والا ان حضرات کو دیکھنے اور ان کا اظہار سپاس سننے لگا، سب اس بات کی گواہی دے رہے ہیں کہ آپ ہی وہ نبی ہیں جنھوں نے ظلمت سے روشنی کی طرف، تیرہ بختی سے خوش قسمتی کی طرف، مخلوق کی عبادت سے خدائے واحد کی عبادت کی طرف اور مذہب کے ظلم و استبداد سے اسلام کے عدل و انصاف کی طرف منتقل کیا۔ امت کے امام اور رہنما سب سے پہلے نظر آتے ہیں، تحیۃ المسجد کا دوگانہ پڑھ کر وہ کہہ رہے ہیں کہ اے اللہ کے رسول آپ نے وہ حکیمانہ اور معجزانہ نظام دیا، جس نے اخذ و استنباط کی صلاحیت پیدا کی، اگر آپ رہبری نہ کرتے تو نہ عظیم فقہ کا کوئی وجود ہوتا اور نہ عظیم اسلامی قانون وجود میں آتا، ان حضرات میں امام مالکؒ، امام ابو حنیفہؒ، امام شافعیؒ، امام احمد بن حنبلؒ وغیرہ نظر آتے ہیں، پھر وہ جماعت نظر آئی جن کے چہروں سے صلاح و تقویٰ اور زہد و عبادت کے آثار نظر آرہے تھے، اس میں حسن بصریؒ سفیان ثوریؒ فضیل بن عیاضؒ، شیخ عبدالقادر جیلانیؒ حضرت نظام الدین اولیاؒ، شامل ہیں، سب کہہ رہے ہیں کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم اگر آپ

سامنے نہ ہوتے تو ہم قناعت کو اپنی زندگی کا شعار نہیں بنا پاتے، نہ نفس کی ترغیبات پر قابو پاسکتے، اور نہ دنیا کے حسن و جمال سے مقابلہ کر سکتے۔

پھر باب النساء سے صالح، عبادت گذار اور عفیف خواتین کا گروہ داخل ہوتا ہے، کہہ رہی ہیں میرے سرکار آپ نے مردوں کے زور زبردستی سے ہم کو نجات دی، لڑکیوں کو زندہ درگور کرنے سے روکا، آپ نے فرمایا کہ جنت ماؤں کے قدموں کے نیچے ہے، آپ نے وراثت میں ہم کو شریک کیا اور یوم عرفہ کے تاریخی خطبہ میں فرمایا کہ عورتوں کے بارے میں خدا سے ڈرو، ہم کیونکر آپ کے احسانوں کو بیان کر سکتے ہیں۔

پھر علوم فنون کے موجد اور ائمہ نحو و لغت و بلاغت کی جماعت اپنے علوم کا سلام پیش کر رہے ہیں، اب سلاطین اور فرمانرواں کا گروہ آتا ہے، یہ وہ فرمانرواں تھے جو نصف کرہ ارض پر حکومت کرتے تھے، ان کے قدم لرزرہے ہیں صفہ کے پاس پہنچ کر رکتے ہیں، جو ان فقراء اور مساکین کا ٹھکانا تھا، جن کے قدموں کی خاک کو وہ اپنی آنکھوں کا سرمہ بنانے کے لئے تیار ہیں، وہ اپنی کوتاہیوں کا اقرار کرتے ہیں اور غلامانہ نذر عقیدت پیش کرتے ہیں۔

پھر شاعر اور انقلابی آتے ہیں، سید جمال الدین افغانی، شیخ حسن البنا اور ڈاکٹر اقبال بھی اس گروہ میں ہیں۔

اقبال کی زبان سے وہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی وفاداری اور اطاعت شعاری کا اعلان کرتے ہیں، اور ان رہنماؤں سے بیزاری کا اظہار کرتے ہیں جن کا رخ اسلام کے قبلہ سے پھر کر مغرب کی طرف ہو گیا ہے۔

تخیلات کا یہ حسین سلسلہ جو تاریخ کے سہارے قائم ہوا تھا، اذان کی آواز کے ساتھ ٹوٹ گیا، ''تری آواز مکے اور مدینے''

یہ حقیر مضمون نگار اقرار کرتا ہے، کہ اپنی ساری زندگی کے مطالعہ میں اسے

ایسا مضمون پڑھنے کو نہیں ملا جس میں حقیقت کے ساتھ جذبہ کی ایسی آمیزش ہو، جس کا اسلوب ایسا شاعرانہ ہو اور جو پڑھنے والے کو اپنے تخیل کی مدد سے وہاں پہنچا دے، جہاں باب جبریل، باب الرحمۃ، باب النساء، باب السلام ہیں، اور جہاں سرکار دو عالم اپنی ابدی آرام گاہ میں استراحت فرما رہے ہیں۔

یہ سلسلہ مضامین جاری وساری ہے، ان کا لطف ان کے پڑھنے میں ہے۔

علامہ اقبال کے لئے حضرت مولانا کے دل میں بڑا نرم گوشہ ہے، نقوش اقبال اس کا آئینہ دار ہے، اس کتاب میں بھی ''اقبال در دولت پر'' کے عنوان سے حضرت مولانا نے ایک بڑا ہی ادبی مضمون لکھا ہے، اقبال مدینۃ الرسول میں حاضر نہ ہوسکے، لیکن اپنے مشتاق اور بے تاب دل نیز اپنی قوت تخیل اور زور کلام کے ساتھ انھوں نے حجاز کی وجد انگیز فضاؤں میں بار بار پرواز کی۔

انھوں نے سرکار دو عالم کے حضور میں اپنی محبت اپنے اخلاص اور اپنی وفا کی نذر پیش کی وہ عالم تصور میں رسول کے مواجہ شریف میں حاضر ہوتے ہیں، درود و سلام پڑھتے ہیں حال دل بیان کرتے ہیں، امت اسلامیہ اور عالم اسلامی کے حالات اس کے مسائل ومشکلات اس کی آزمائشیں اور امتحانات نیز مغربی تہذیب اور مادی فلسفوں اور تحریکوں کے سامنے ان کی سپر افگنی اور بے بسی اپنے وطن میں اس کی غریب الوطنی اور خود اپنی قوم میں اپنے ناقدری کا شکوہ کرتے ہیں۔

بایں پیری رہ یثرب گرفتم
نوا خواں از سرور عاشقانہ
چوں آں مرغے کہ در صحرا سر شام
کشاید پر بہ فکر آشیانہ

مضمون کا سارا لطف اس کے پڑھنے میں ہے، ایسے ہی اس کے بعد کا مضمون

حضور و سرور ہے، یہ حجاز کا ذکر ہے، اپنے رسولؐ کے دیار کا، حضرت فرماتے ہیں "آبروئے ما ز نام مصطفیٰ است" اور مضمون کا خاتمہ اس شعر پر کرتے ہیں جوان کے حسب حال ہے جن پر ان کی کتابیں گواہ ہیں۔

ما انچہ خواندہ ایم فراموش کردہ ایم
الا حدیث دوست کہ تکرار می کنیم!

آخری مضمون نعت کا تمثیلی مشاعرہ ہے فارسی شعراء کی نذر عقیدت بھی ہے اور اردو شعراء کی نذر عقیدت بھی، نعتوں کے چنے ہوئے اشعار نعت گو کے زبان سے سنائے ہیں، وہ نعت گو جو صاحب دل بھی تھے، شیخ سعدی فرماتے ہیں۔

یتیمے کہ نا کردہ قرآں درست
کتب خانہ ہفت ملت بشست

عطار کہتے ہیں:

گرچہ ضائع کردہ ام عمر از گناہ
توبہ کردم عذر من از حق بخواہ

خسرو کہتے ہیں:

دم خلقش کہ جاں دادہ عرب را
فرد گشتہ چراغ بولہب را

جامی کہتے ہیں:

اے عربی نسبت و امی لقب
بندہ تو ہم عجم و ہم عرب
تیغ عرب زن کہ فصاحت تراست
صید عجم کن کہ ملاحت تراست

عرفی سامنے آتے ہیں۔

دوراں کہ بود تا کند آرائش مسند
مداح شہنشاہ عرب را وعجم را
ہشدار کہ نتواں بیک آہنگ سرودن
نعت شہ کونین و مدیح کے وجسم را

پھر قدسی اپنی مشہور نعت پیش کرتے ہیں:

مرحبا سید مکی مدنی العربی
دل وجاں باو فدایت چہ عجب خوش لقبی

ہندوستان کے بھی فارسی نعت گوشعرا اپنا کلام پیش کرتے ہیں، جس میں اقبال بھی ''پس چہ باید کرد اے اقوام مشرق'' میں سے وہ اشعار پیش کرتے ہیں جو انھوں نے حضور رسالت مآب میں پیش کئے ہیں، اب اردو ادب کے نعت گوشعراء کی باری آتی ہے، انھوں نے بھی اپنا دل نکال کر رکھ دیا ہے، یہ تمثیلی مشاعرہ ختم ہوتا ہے، اور ساتھ ہی یہ مضمون نگار بھی اجازت لیتا ہے۔

باد نسیم آج بہت مشک بار ہے
شاید ہوا کے رخ پر کھلی زلف یار ہے

یہ کتاب بھی عربی میں لکھی گئی تھی، اور سعودی ریڈیو سے جستہ جستہ نشر ہو چکی ہے، ریڈیو پر اس کے پڑھنے والے لبنان کے اناؤنسر استاذ عبدالرحمٰن قصاب ایک مرتبہ ہفتہ واری قسط پڑھنے کے درمیان رو پڑے تھے، اور کہا کرتے تھے کوئی سنگ دل ہی ہوگا جو اس کو پڑھتے وقت اپنی آنکھ پر قابو رکھ سکے۔



المرتضیٰ

خلیفہ راشد امیر المومنین سیدنا علی بن طالب رضی اللہ عنہ وارضاہ کی سیرت پر ایک غیر جانبدارانہ، عالمانہ وعادلانہ انداز پر لکھی ہوئی علمی و تحقیقی کتاب کی ضرورت تھی، ایسی کتاب جو دور فتن کی آندھیوں کے درمیان ایک اولوالعزم صحابی رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی عزیز ومحبوب شخصیت، پروردۂ آغوش نبوت کے چہرہ پاک کا حقیقی رخ دکھائے، افراط، تفریط، غلو اور حق تلفی دونوں سے محفوظ ہو، یہ حضرت مولانا کی دلی آرزو بھی تھی، اور آپ کے برادر و مربی حضرت مولانا ڈاکٹر سید عبدالعلیؒ کی تمنا بھی تھی، کیونکہ حضرت سیدنا علی کرم اللہ وجہہ پر اسلام دشمن عناصر کی بدگوئیوں اور دوسرے فرقہ کی پرستش کی حد تک عقیدت مندیوں نے آپ کی سیرت کے صحیح اور واقعی نقوش کو نگاہوں سے اوجھل کر دیا تھا۔۔۔ صحیح العقیدہ اہل سنت علماء، ائمہ مذاہب اربعہ، مشائخ ومحدثین کا جو صلح جو اور صلح پسند رویہ رہا ہے اس کی نمائندگی ضروری تھی۔

حضرت مولانا یہ کتاب بہت پہلے لکھ چکے ہوتے مگر آپ کی نگاہ میں زیادہ اہمیت خود اسلام اور صاحب رسالت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی دعوت کی تھی، آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی رسالت پر عرب وعجم میں بے تحاشہ حملے ہو رہے تھے جن کا سلسلہ اب بھی جاری ہے، مسلمانوں کے اندر احساس کمتری نہیں بلکہ خود حقارتی پھیل

رہی تھی، یورپ کی غلامی نے دل شکستہ کر رکھا تھا، اور نوبت یہاں تک پہونچ گئی کہ اپنی سیاسی شکست کو اپنے دین کی کمزوری کا نتیجہ سمجھنے لگے، رسالت محمدی کو ایک وقتی تحریک سمجھا جانے لگا، تربت (زمین) کی پرستش ہونے لگی، ان حالات میں خلفائے راشدین ہی اور ان میں حضرت علی کرم اللہ وجہہ تو الگ رہے، خود رسول برحق کی رسالت پر یقین خطرہ میں پڑا ہوا تھا مسئلہ پورے اسلام کا تھا یا یوں کہئے اسلام کے قلب وجگر پر جو تیر دشمنوں کے سمت سے آرہے تھے ان کا نشانہ اسلام کے قلب وجگر پر تھا، سیرت سید احمد شہید اور ماذا خسر نے اسی شہ رگ کو قائم رکھنے میں اپنا کردار ادا کیا جو عصر حاضر کی فکری یلغار سے واقف، دینی غیرت رکھنے والے، دل ودماغ سے توقع کی جاسکتی تھی۔

''المرتضیٰ'' کی تالیف ان اہم مورچوں کے دفاع کے بعد ہوئی، لیکن خدا کی مصلحت تھی کہ ایسے وقت میں یہ کام انجام پائے جبکہ چند نام نہاد، مدعیان بحث و تحقیق، جن کا علم و تحقیق سے کوئی واسطہ نہ تھا، غیر مستند عبارتوں اور من گھڑت افسانوں کی مدد سے جاہلیت اولیٰ کے احیاء کے لئے کوشاں تھے، اور پہلی صدی کے فتنوں کو اپنی خواہش کے مطابق موڑ توڑ کر پیش کرنا، ہنر سمجھ رہے تھے، احادیث و انساب اور تاریخ کے واقعی مآخذ کو اپنی من مانی معروضات سے اس پورے مجموعہ کا انکار کرنا فیشن بن رہا تھا۔ یہ محض خدا ساز بات تھی کہ المرتضیٰ کی تالیف ونشر واشاعت، اس زمانہ میں پیش آئی، یہ کتاب اصلاً عربی میں لکھی گئی اور عربوں میں مقبول ہوئی، اس کے کئی ایڈیشن وہاں نکلے اور اس کے اردو ترجمہ کے بھی کئی ایڈیشن نکل چکے، اور انتہائی احتیاط ورع، توسط واعتدال کے ساتھ تمام صحابہ کرام کے حقوق احترام کو ملحوظ رکھتے ہوئے ایک علمی دستاویز تیار ہوگئی، علی رغم انوف الحاقدین والمفسدین، یہ کتاب اپنے مقصد میں کامیاب رہی، مصنف مدظلہ نے یہ دکھایا

ہے کہ خلافت راشدہ جس ترتیب سے قائم ہوئی وہ مصلحت خداوندی کے عین مطابق اور اسلام کی ضرورت کے مطابق تھی، کتاب کی ترتیب بھی غیر مقلدانہ ہے، حضرت علی کرم اللہ وجہہ کا رسول صلی اللہ علیہ وسلم سے تعلق اور عہد نبوت میں آپ کی سیرت، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے خلفاء راشدین سے آپ کا تعاون اور دست راست بننا، اور دور فتنہ میں آپ کا منصفانہ ومومنانہ عمل، پھر آپ کے ذاتی جوہر، ایمان و یقین کے مظاہر ایک حسین چوکھٹے میں دل آویز اور نادرہ اسلوب وترتیب کے ساتھ سجائے گئے ہیں۔



کتاب (بصائر)

پروفیسر وصی احمد صدیقی

یہ مختصر تحریر حضرت مولانا ابوالحسن علی ندوی کی تصنیف ''بصائر'' کے تعارف میں ہے لفظ تعارف کے استعمال کی جسارت کے لئے میں قارئین سے معذرت خواہ ہوں ''ایاز قدر خود شناس'' کی ہدایت سے واقف ہوں مگر میں نے سوچا کہ مناسب لفظ ڈھونڈھنے میں وقت لگانے کے بجائے میں کتاب ''اولوالابصار'' کی نظروں کے سامنے رکھ دوں، کتاب اپنے زعیموں کی داستان ان کے کارنامے، ان کا دبستان فکر، ان کے بنا کردہ اعلیٰ دینی مدارس، تربیتی مراکز، ان کی لائی ہوئی اصلاحی تحریکات کا ایک مختصر خاکہ ہے، یہ اختصار ایک بحر ناپیدا کنار کو ایک جوئے خوش آب میں تبدیل کرنا ہے، جس کا سلیقہ ہر کس و ناکس کے قابو میں نہیں، بیان میں جذبات کا ایک ہم آہنگ توازن ہے اور سطروں کے بیچ سے یہ بات ابلتی نظر آرہی ہے کہ جن کا بیان ہے ان کی خوبی اور محبوبی سے مولانا کا دل سرشار ہے، حضرت مولانا کے قلم میں جو ہمہ گیری اور وسعت ہے وہ سب پر ہویدا ہے، کوئی بھی ذکر ہو اس کا رشتہ مذہب سے ہوتا ہے، یہ مذہبی جذبہ دل کی گہرائیوں سے بروئے کار آتا ہے اور کوئی شک نہیں عبدیت کا احساس دیتا ہے۔

یہ کتاب مولانا نے کیوں لکھی، اس کا بیان آگے آئے گا، ابھی تو کتاب میں ذکر کردہ ان قدسی صفات عالی نفوس کا بیان ہے، جو احیائے دین کے بانی مبانی تھے،

جن کا نقش پا وقت کے سینہ پر ثبت ہے، یہ وہ مبارک لوگ ہیں، جنھوں نے مذہب کی تجدید کے ساتھ معاشرے کی تجدید بھی کی ہے، حضرت مولانا نے مجدد الف ثانی حضرت شیخ احمد سرہندیؒ سے ابتدا کی ہے اور علامہ سید سلیمان ندویؒ پر خاتمہ کیا ہے، بیچ میں دیگر جلیل القدر ہستیوں کا بیان آتا ہے، گو زیادہ فاصلہ نہیں لیکن زمانے بدلے ہوئے ہیں مگر ان زعیموں کی قوتیں اپنے اپنے مرتبہ اور اہمیت کے مطابق ایک دوسرے کے شریک عمل ہیں، یہ شیرازہ بندی مکاں اور زماں کی پابندیوں سے آزاد ہے یہاں تخیل کی کارفرمائی نہیں بلکہ حقیقت کا بیان ہے، ان بزرگوں نے اپنے پیش رؤوں کے افکار میں ردوبدل نہیں کیا ہے، بلکہ حکمت وبصیرت کے خزانے کو بانٹتے چلے گئے ہیں، وہ خزانہ جو کبھی خالی نہیں ہوتا، یہ واقعہ ہے کہ کوئی زمانہ (انبیاء کو چھوڑ کر) گناہ سے مبرا معصوم لوگوں کا زمانہ نہیں رہا ہے، ہر زمانہ کو مصلح اور مجدد کی ضرورت رہی ہے، ان بزرگوں نے جو قدریں پیش کی تھیں وہ ازلی اور ابدی قدریں ہیں، اسلامی معاشرہ کے عناصر ترکیبی یہی قدریں ہیں، ان بزرگوں کو خیر کا بے مثال شعور تھا، ان کا اول اور آخر قرآن اور حدیث تھا جن سے شریعت بنی ہے، سنت رسول صلی اللہ علیہ وسلم سے ذراسی بھی روگردانی ان کے لئے ناقابل برداشت تھی۔

ادھر ایک طبقہ نے جماعتی مفاد یا شخصی مصلحت یا ایک خاص مشرب اور طریقہ کو فائدہ پہونچانے کے لئے ان بزرگوں کی بنا کردہ دینی تحریکوں، دعوتی سرگرمیوں اور اصلاحی کوششوں کے بارے میں غلط فہمیاں پیدا کرنے اور تعلیمی مرکزوں کے سلسلے میں شکوک اور شبہات پیدا کرنے کی کوششیں شروع کی ہیں، یہ کتاب اس کے ازالہ کے لئے لکھی گئی ہے۔

مصنف کتاب نے اس رکاکت، اس شماتت کے توڑ کے لئے کوئی الزام نہیں لگایا ہے ان کی تحریر خالص ایجابی ہے، خیالات اور احساسات کا طلسم پیچ وتاب

نہیں، کہیں شک اور نا امیدی نہیں، ایسی حقیقتوں کا بیان جو خود اپنی سچائی کی گواہ ہیں، بہت ضروری مقصد کو سامنے رکھ کر کتاب لکھی گئی ہے، حضرت مولانا نے لکھا ہے کہ انھوں نے غیر جانبدارانہ طریقہ پر تاریخ کے صحیح واقعات کی روشنی میں پوری دیانت داری کے ساتھ ان دعوتی واصلاحی تحریکوں، تعلیمی اداروں اور فکری اور تربیتی مراکز کا مختصر تعارف پیش کرنے اور عقائد کی تصحیح کرنے قرآن اور حدیث سے عوام کا رشتہ جوڑنے وشرک و بدعت کی نفرت ان کے دلوں میں بٹھانے میں ان دینی مدرسوں اور دعوتی تحریکوں نے جو کارہائے نمایاں انجام دیئے ہیں ان پر روشنی ڈالی ہے، کوئی شک نہیں کہ اس کتاب کو پڑھ کر قارئین ان عالمگیر دعوتی اور اصلاحی تحریکوں، تعلیمی اور تربیتی اداروں اور ان سے نسبت رکھنے والی قابل احترام شخصیتوں کی دینی خدمات سے واقف ان کی اصلاحی کوششوں سے آگاہ، اور عقائد کو صحیح کرنے میں ان کی قربانیوں اور حیرت انگیز کامیابیوں سے روشناس ہوں گے۔

ان بزرگان دین کے احوال کا بیان حضرت مولانا نے جس طرح کیا ہے وہ یاد دلاتا ہے کہ مومن مومن کا آئینہ ہے، فلسفیانہ انشاء، ابدی صداقتوں پر ضوافگنی، ان بزرگوں کے فکر اور عمل کے روپ میں حسن کے مظاہر کا بیان مسلمانوں کی زندگی اور مذہب میں جاندار تعلق پر زور، غرض یہ وہ کتاب ہے جو ایسا کوئی شخص نہیں لکھ سکتا جس کا علم بے پناہ اور مزاج غیر معمولی حساس نہ ہو، صریر خامہ نوائے سروش ہے میں نے لکھا ہے، کہ کتاب ''اولوا الابصار' کے لئے ہے، اس سے یہ مطلب ہرگز نہ نکالا جائے کہ یہ صرف برائے خواص ہے، ایک عامی کے لئے بھی غالب کا یہ مصرعہ حسب حال ہوگا ''میں نے یہ جانا کہ گویا یہ بھی میرے دل میں ہے'' میرا مطلب نگاہ کی نہیں بلکہ دل کی بصارت اور بصیرت سے ہے۔

جن کا بیان ہے ان پر پہلے بھی حضرت مولانا بڑے شاندار مضامین اور

کتابیں لکھ چکے ہیں، حضرت مجدد الف ثانیؒ اور حضرت شاہ ولی اللہؒ پر تاریخ دعوت و عزیمت کی دو ضخیم جلدیں تصنیف کی ہیں جو دائرۃ المعارف کا درجہ رکھتی ہے، حضرت سید احمد شہیدؒ پر مولانا کی تصنیف وہ معرکۃ لآرا تصنیف ہے جس کے ٹکر کی کتاب اردو میں نہیں لکھی گئی، اس کتاب میں حضرت مولانا اسمٰعیل شہیدؒ کے کارنامے کا مفصل بیان ہے، مولانا قاسم نانوتویؒ مولانا رشید احمد گنگوہیؒ مولانا خلیل احمد سہارنپوریؒ شیخ الہند مولانا محمود حسن صاحب کے حوالے حضرت مولانا کی بیشتر کتابوں میں مل جائیں گے حکیم الامت مولانا اشرف علی تھانویؒ، مولانا حسین احمد مدنیؒ، شیخ الحدیث مولانا زکریاؒ حضرت مولانا محمد الیاسؒ، حضرت مولانا سید سلیمان ندویؒ، پر مولانا کے لکھے ہوئے بہترین اسکیچ ''پرانے چراغ'' میں شامل ہیں، یہ کراماتی اسلوب ہے کہ اس کتاب میں ان بزرگوں کے سوانح اور کارناموں کا بیان اختصار سے ہے، مگر سرسری نہیں، ان بزرگوں کی عظمت کا پورا حق ادا ہو گیا ہے، بقول حضرت مولانا ان حضرات نے آدم گری، مردم سازی اور روحانی تزکیہ اور تربیت کا کارنامہ انجام دیا، ایسے مردان کار تیار کئے جو حمایت شریعت اور محو بدعت کا عظیم الشان کام انجام دینے کی صلاحیت رکھتے تھے۔

پھر دینی علوم کی بقا اور شریعت اسلامی کے تحفظ کے لئے دار العلوم دیوبند، مظاہر العلوم جیسے شاندار مدارس کا قیام عمل میں آیا، ندوۃ العلماء جس کی تاسیس حضرت مولانا محمد علی مونگیریؒ کے مبارک ہاتھوں سے ہوئی جن کے رفقاء میں علامہ شبلی نعمانیؒ تھے، یہ ادارہ قدیم اور جدید دونوں میں اپنا اعلیٰ مقام رکھتا ہے، اس کے عالی شان فرزندوں کی تصانیف کے حوالے سے لوگ سند اعتبار حاصل کرتے ہیں۔

اللہ تعالیٰ ان کو نیک ہدایت دے جو بقول حضرت مولانا کے بے مقصد جہاد اور بغیر دشمن کے جنگ لڑنے پر آمادہ ہیں، کیا یہ زمانہ ان ہی باتوں کا ہے۔

یہ کتاب عربی میں لکھی گئی تھی، اس کا ترجمہ میاں جعفر مسعود حسنی نے کیا ہے، ایسی سلیس عبارت لکھنا کچھ ان ہی کا حصہ ہے مولانا واضح رشید ندوی جیسے ادیب شہیر کے فرزند نے ترجمہ کا حق ادا کر دیا۔

● ● ●

حضرت مولانا کی مؤلفات کی طویل فہرست ہے، اور ان کتابوں پر کچھ روشنی عبدالماجد الغوری نے اپنی کتاب "ابوالحسن علی الحسنی الندوی، الامام المفکرو الداعية الاديب" میں ڈالی ہے، یہ کتاب دارابن کثیر دمشق نے اپنی سیریز سلسلہ اعلام العلماء کے پانچویں نمبر پر رکھی ہے، اس پر مفتی اعظم شام شیخ احمد گفتارو کا تعارف، ڈاکٹر مصطفیٰ الخن، ڈاکٹر وہبہ الزحیلی نے مقدمہ اور پیش لفظ لکھا ہے، نیز حضرت مولانا کی کتابوں کی فہرست محمد طارق زبیر ندوی نے اپنی کتاب "سماحة الداعيه المجاهدالامام ابوالحسن علی الحسنی الندوی و مؤلفاته العربية" میں درج کی ہے، اس لئے میں نے مناسب نہیں سمجھا کہ ایک چھپی ہوئی چیز کو دوبارہ نقل کروں، کل کتابوں کی تعداد ۱۷۶ ہے، اور ہر کتاب کا حق ہے کہ اس پر چند صفحات لکھیں جائیں، جس کے لئے ایک علاحدہ تالیف کی ضرورت ہے۔



تو مردِ میداں تو میرِ لشکر

العظمة لله وحده۔ عظمت تو صرف اللہ تعالیٰ کی عظمت ہے جو ہمیشہ سے ہے اور ہمیشہ باقی رہے گی، اپنی مخلوق میں اس نے جس کو چاہا دینی و دنیوی عزت و مقام عطا فرمایا اور ہر ایک کو ایک جداگانہ خصوصیت سے نوازا، ہر موتی اپنے آب تاب میں جداگانہ اور اپنی چمک دمک میں منفرد ہے ''کل فردة فذة''۔ جواہرات میں ہر ایک کی خصوصیت تب و تاب، روشنی اور تاثیر دوسرے سے ممتاز ہے۔

بعض سوانح نگاروں کو تشفی اس طرح ہوتی ہے کہ وہ ممدوح کو بزرگان سلف میں سے کسی بزرگ کا قائم مقام یا اس کا مثنیٰ قرار دیں، مثلاً یہ کہیں فلاں عالم دین فقہ میں ایسی دستگاہ رکھتے ہیں کہ اپنے وقت کے امام ابوحنیفہ تھے، اہل اللہ اور صالحین کی سیرت میں کسی کو حسن بصریؒ اور شیخ عبدالقادر جیلانی اور خواجہ معین الدین چشتی بتائیں، اسرار شریعت اور دین و عقل کی شاہ راہوں پر چلنے والوں میں سے کسی حکیم وقت کو غزالی، طوسی اور شاہ ولی اللہ دہلوی بتائیں۔

حضرت مولانا علی میاں صاحب مدظلہ کے بعض تذکرہ نویس مسلم و غیر مسلم اصحاب نے آپ کو شاہ ولی اللہ لکھا ہے اور کسی نے آپ کو اپنے وقت کا مجدد الف ثانیؒ بتایا ہے۔ مگر راقم کے محدود مطالعہ کا حاصل یہ ہے کہ ہر ایک کی شخصیت اپنی جگہ

پر منفرد تھی، خدمت دین کے ہزاروں گوشے ہیں اور سینکڑوں اقسام ہیں، خدمت کرنے والوں کا زمانہ علاحدہ علاحدہ رہا ہے، ان کے سامنے جو مسائل پیش آئے اور جن حالات سے ان کو نمٹنا پڑا، وہ ان کے زمانہ کے ساتھ مخصوص تھے، کسی کے سامنے اکبری دور کا فتنہ تھا کسی کے نزدیک وہ زمانہ تھا جب کہ کچھ لوگ اسلام کا چہرہ مسخ کرکے دوسرے دین کا لیبل چڑھانا چاہتے تھے جن کی سرکوبی ضروری تھی غرض ہر ایک کے سامنے اپنے وقت کے اہم مسائل تھے، حضرت مولانا علی میاں کے سامنے وہ لوگ تھے جو علم وفکر کے پردہ میں بعثت نبوی صلی اللہ علیہ وسلم کی تحقیر کررہے تھے اور اسلام کے مقابلہ میں ایک متوازی دین برپا کرنا چاہتے تھے، اور کسی کی ہمت نہیں تھی کہ ان کا نوٹس لے۔ اللہ تعالیٰ نے مولانا کو بروقت خبردار کیا اور ان کی تربیت وتعلیم اس انداز سے کرائی کہ وہ اس فتنہ کو سمجھیں اور اس کے لیے اپنی توانائیاں صرف کردیں، ان کو اس کام کے لیے ایک علمی وزن، فکری تفوق، قوت بیان عطا فرمایا۔

ناظرین اس کتاب کے پچھلے صفحات میں ملاحظہ فرماچکے ہیں کہ قومیت عربیہ بظاہر عرب قوم کی سربلندی کی ایک تحریک تھی، اس کا مقصد عربوں کو دنیا کی باعزت قوموں کے درمیان ایک مقام دینا تھا، بظاہر ایک بے رنگ وبو تحریک تھی، لیکن جن لوگوں نے قریب سے جاکر دیکھا اور جن کی نظر ان کے مصنفین ومفکرین کے افکار ونظریات پر گہری تھی انھوں نے اس حقیقت کو پالیا کہ یہ تحریک جو بظاہر معصوم نظر آتی ہے درحقیقت اپنے اندر بے دینی، شرک، انکار نبوت اور توہین رسالت کے زہریلے کیڑوں کی آماجگاہ اور مہلک جراثیم سے بھری ہوئی تھی۔ مولانا نے برصغیر میں تن تنہا اس کے خلاف نعرہ جہاد بلند کیا، لوگوں کو متنبہ کیا، اپنی تمام تر فکری اور قلمی صلاحیتوں کو اس کام کے لیے لگادیا۔

ملک کے اندر الجھے ہوئے سیاسی مسائل ہیں، مسلمان گراوٹ کے آخری

نقطہ پر پہنچ چکے ہیں، ان کی نہ کوئی آواز ہے اور نہ سیاسی وزن، فرقوں اور ٹولیوں میں بٹے ہوئے ہیں ہر شخص اپنی جگہ پر قائد و رہنما ہے اور ہر مدرسہ کا ایک منبر ہے جہاں سے نئی نئی صدائیں لگائی جا رہی ہیں، اس ماحول میں جب کہ آئے دن ایک نئی جماعت کھڑی ہوتی ہے اور اتحاد بین المسلمین کی تحریک اٹھاتی ہے اور اتحاد و وحدۃ کلمہ کا اس کے نزدیک یہ مطلب ہوتا ہے کہ سب کے سب اس کے جھنڈے کے نیچے آکر جمع ہو جائیں، وہ اس آیت "وَاعْتَصِمُوْا بِحَبْلِ اللّٰهِ جَمِيْعًا وَّلَا تَفَرَّقُوْا" (سب لوگ مل کر اللہ رسی کو مضبوط پکڑو، اور آپس میں ایک دوسرے سے جدا نہ ہو) کا مطلب یہ بتاتے ہیں کہ سب ان کی پارٹی کی رسی کو مظبوطی سے پکڑ لیں۔

اور سب اس راستہ پر گامزن ہوں جو ان کی فکر کی طرف "مستقیم" ہے ان حالات میں کسی ایک نئی پارٹی کا بنانا تفرقہ کا ایک نیا راستہ کھولنا ہے، مولانا نے کبھی سیاست کی راہ اختیار نہیں کی اور نہ اس میں حصہ لیا، اگر وہ ذرا بھی سیاسی مزاج رکھتے تو غالباً جمیعۃ علماء ہند ان کی جدوجہد کا مرکز ہوتی۔ کیونکہ حضرت مولانا سید حسین احمد مدنی مولانا کے خانوادہ کے شیخ تھے۔ مولانا کے بڑے بھائی جناب ڈاکٹر سید عبد العلی حسنیؒ حضرت مدنی کے مرید تھے، حضرت کی والدہ نے دوبارہ بیعت آپ ہی کے ہاتھ پر کی تھی، اور خود مولانا ابوالحسن علی ندوی حدیث میں ان کے شاگرد اور بزرگان دیوبند کے معتقد رہے اور اب بھی ہیں، تو حضرت مدنیؒ سے بڑھ کر ان کو کون لیڈر مل سکتا تھا، جن کی ایک ایک ادا کو سنت نبوی کا آئینہ سمجھتے ہیں، اور جن کو للّٰہیت کا افضل ترین نمونہ سمجھتے ہیں، اور حضرت مدنیؒ جمیعۃ علماء کے صدر اور سرپرست تھے، لیکن مولانا کا مزاج گرم سیاست سے میل نہیں کھاتا تھا۔ اس لیے خود حضرت مدنی نے بھی ان سے اس بات کی فرمائش نہیں کی اور نہ مولانا اس کی طرف مائل ہوئے۔ خاکسار نے مولانا کو یہ کہتے ہوئے سنا ہے کہ کوئی صوفی، بزرگ جس طرح اپنی

ریاضت خاصہ میں بلند ہوتے رہتے ہیں اسی طرح حضرت مدنیؒ کا روحانی عروج اس وقت بھی جاری رہتا ہے جب کسی سیاسی پلیٹ فارم پر غیر مسلموں کے ساتھ بیٹھے ہوئے اجلاس کی کارروائی میں شریک رہتے ہیں اس عقیدت کے باوجود حضرت مولانا علی میاں مدظلہ نے سیاست کی گرم بازاری سے علاحدگی ہی میں عافیت محسوس کی، مگر ایک وقت ایسا آیا جب کہ مسلمانوں کے قتل عام کا منظر خود جا کر جمشید پور میں دیکھا، اس وقت آپ نے کوئی نئی جماعت تو نہیں بنائی البتہ مختلف جماعتوں سے التماس کیا کہ آپ سب مل کر خون مسلم کی ارزانی کو بچانے کے لیے کھڑے ہوں اس طرح مسلم مجلس مشاورت کا وجود سامنے آیا، مولانا منظور نعمانی علیہ الرحمہ نے اس مجلس کی تشکیل کے بعد بارہ دری میں تقریر کرتے ہوئے فرمایا کہ اس مہم میں وہ اس درجہ سرگرم تھے کہ آٹھ بار دہلی کا سفر کیا۔ اور نجی مجلس میں فرمایا کہ مولانا علی میاں اس زمانہ میں آنکھوں کا آپریشن کرا چکے تھے اور زخم مندمل نہیں ہوا تھا۔ سب کام مولانا نعمانی کو تنہا کرنا پڑا، مگر کامیابی کا سہرا مولانا علی میاں کے سر رہا کیونکہ یہ اجتماع ناکامی پر ختم ہو رہا تھا اور اس وقت کے کانگریسی رہنما ڈاکٹر سید محمود مرحوم کانگریس کے اصول سے ایک انچ اترنے کے لئے تیار نہیں تھے اس وقت جب کہ مولانا کے سر سے لے کر آنکھوں تک پٹی بندھی ہوئی تھی اور ڈاکٹروں نے بولنے کو منع کر دیا تھا ایسی تقریر کی جس نے مایوسی کی فضا کو بدل دیا۔ جو لوگ اس مجلس میں شریک تھے اور ابھی زندہ ہیں گواہی دے سکتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے مولانا سے کیا کام لیا۔

سیاست سے تعلق اس وقت بھی مولانا کا نہیں ہوا مگر حالات کی سنگینی نے مجبور کیا کہ پورے ملک کا دورہ کریں، ڈاکٹر محمود مولانا ابواللیث ندوی مولانا عتیق الرحمٰن مرحوم کے ساتھ پورے ملک کا دورہ کیا اور دیکھنے والوں نے بیان کیا ہے کہ خلافت کی تحریک کے بعد مسلمانوں میں زندگی کی لہر دوبارہ دیکھی گئی، بدقسمتی سے یہ تحریک

کامیاب نہیں ہوئی اور ایک نئی جماعت بن کر اپنے ہی کارندوں کے ہاتھ ختم ہوگئی۔ اگرچہ کاغذوں پر اب بھی زندہ ہے۔

دوسرا مسئلہ جس نے مسلمانوں کو بے چین کر دیا اور جس کی قیادت مولانا کو کرنا پڑی وہ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کے اسلامی تشخص کو مٹانے کا مسئلہ تھا جو سازش مکمل ہو چکی تھی اور تقریباً انتظام بھی ہو چکا تھا، اس وقت مولانا نے مردانہ وار اس کا مقابلہ کیا، اور حکومت کو اپنا پلان بدلنا پڑا۔

پھر کچھ عرصہ کے بعد مطلقہ عورت کے نان نفقہ کا مسئلہ اٹھا، وہ مسئلہ پارلیمنٹ میں زیر بحث تھا، متعصب ہندوؤں نے مسلمانوں کے پرسنل لا میں مداخلت کا ایک اچھا موقع دریافت کیا، ہندو اکثریت کی خوشنودی حاصل کرنے والے ایک ''مسلمان'' ممبر پارلیمنٹ نے مسلم دشمنی کو اپنی مقبولیت کا ذریعہ سمجھ کر استعفیٰ دے دیا۔ مگر کانگریسی حکومت کے طویل دور میں یہی ایک مسئلہ تھا جو مسلمانوں کے حق میں فیصل ہوا اور اس میں صرف مولانا علی میاں مدظلہ کی جدو جہد اور جوش عمل نے اس کام کو سرانجام دیا۔ اور اس وقت کے وزیر اعظم نے کھل کر مسلمانوں کا ساتھ دیا۔

تیسرا مسئلہ وندے ماترم کے ترانہ کا تھا جو سرکاری مدارس میں نافذ کیا جا چکا تھا اور تمام آثار قرائن بتا رہے تھے کہ اب اسلامی درس گاہوں کو بھی مجبور کیا جائے گا کہ یہ ترانہ مدرسوں میں گایا جائے۔ یہ ترانہ جو کسی بنگالی شاعر نے لکھا تھا، اور جو صراحۃً مشرکانہ مضمون پر مشتمل تھا۔ اور خود مسلمانوں میں سے ایک بقلم خود مولانا نے اس کی تائید کر دی تھی اور کہا تھا کہ یہ تو ایسا ترانہ ہے جیسے اقبال کا ترانہ ''سارے جہاں سے اچھا ہندوستاں ہمارا'' ہے، مزید رواداری اور وسعت ظرفی کا ثبوت دیتے ہوئے انھوں نے قشقہ لگا کر سرسوتی دیوی کی مورتی کے آگے رکوع بھی کیا۔ جس کی صاف وغیر مبہم فوٹو ہندی اخبار میں شائع ہوئی۔

اس ترانہ کے مشرکانہ مضامین پر مشتمل ہونے کا نوٹس علماء اوار ان کی جماعتوں نے پہلے بھی لیا تھا اور اس موقع پر بھی انھوں نے کنونشن بلایا۔ تقریریں ہوئیں، تجویزیں پاس ہوئیں مگر حکومت نے کسی بات کا نوٹس نہیں لیا۔ پھر خدا کا کرنا ایسا ہوا کہ ایک ٹیلی ویژن کے نمائندے نے مولانا سے ان کی رائے پوچھ لی، آپ نے کہا یہ حرام ہے اور مسلمان کے بچے اس کو نہیں پڑھیں گے۔ اور اگر حکومت نے مجبور کیا تو ہم مسلمانوں کو مشورہ دیں گے کہ اپنے بچوں کو اسکولوں سے نکال لیں۔ مولانا کے اس ارشاد کو "علی میاں کا فتویٰ" کہہ کر ملک کے طول وعرض میں شائع کیا گیا، حکومت کے وزیر داخلہ نے دوسرے ہی روز یہ بیان دیا کہ یہ تمام قوموں کے بچوں پر عائد نہں کیا گیا ہے، جو چاہے اس میں شریک ہو، اور جو نہ چاہے وہ شریک نہ ہو۔ پھر مقامی حکومت کے جس وزیر نے یہ سرکلر جاری کیا تھا اس کو سبکدوش کر دیا گیا۔ یہ سب اس شخص کے اقدام سے ہوا جو غیر سیاسی شخص تھا۔ یعنی حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی مدظلہ۔

مولانا نے کسی الکشن میں کسی کی تائید یا مخالفت نہں کی اور نہ کسی قسم کا تعلق حکمرانوں سے رکھا۔ اور ایک گوشہ نشین انسان جس کو لکھنے پڑھنے کے علاوہ کوئی کام نہ رہا ہو، جس کے لے معمولات وتلاوت اوراذ کار سے فرصت نہ ملتی ہو لیکن اس کی انفرادی رائے، تنظیموں اور جماعتوں کی مشترکہ کوششوں پر بھاری ثابت ہوئی ہو۔

مولانا نے الحمدللہ آج تک کسی وزیر اعظم یا گورنر سے ملنے کی خواہش نہیں کی، مسلم پرسنل لا کی بعض تجاویز کے تحت جبراً قہراً ایک دو مرتبہ وفد کی قیادت میں نرسمہاراؤ سے ضرور جا کر ملے۔ اور شاہ بانو کیس کے سلسلے میں راجیو گاندھی سے ملے تھے۔ مگر اپنی یا کسی افراد خاندان کی خاطر خدانخواستہ نہ کسی وزیر اعظم سے ملے نہ بادشاہ وقت سے۔ ہاں متعدد سابق وزیر اعظم جیسے اندرا گاندھی، وی پی سنگھ، چندر شیکھر،

آپ سے ملنے کے لیے تکیہ رائے بریلی گئے۔ دو بر سر عمل وزیر اعظم مسٹر ایچ ڈی دیو گوڑا اور موجودہ وزیر اعظم اٹل بہاری باجپئی خود ملنے کے لیے آئے، گورنروں اور چیف منسٹروں میں سے سوائے ایک (مایاوتی) کے سب نے حاضری دی، بنگال کی لیڈر خاتون ممتا بنرجی نے بھی حاضری دی اور آدھے گھنٹے تک انتظار میں ان کو رکنا پڑا۔ غرض ملک کے اندر آپ کو جو عظمت و مقبولیت حاصل رہی وہ ماضی قریب میں شاید ہی کسی سیاسی یا غیر سیاسی رہنما کو حاصل ہوئی ہو۔

بیرون ہند میں مقبولیت

سعودی عرب کے نامور فرماں روا ملک فیصل کی خواہش پر متعدد بار ان سے تنہائی میں ملاقات ہوئی۔ اور ان کے علاوہ بادشاہوں سے رابطہ عالم اسلامی کے وفود کے صدر کی حیثیت سے ملے۔ آپ کا اخلاقی اثر ان پر پڑا، خاص طور پر ان کی بے نیازی دیکھ کر، کیونکہ انھوں نے خدانخواستہ اپنی ذات اور ندوہ کے لیے بلکہ ہندوستانی مسلمانوں کے لیے بھی کوئی مدد ان سے نہیں مانگی، ان سے جو کہا وہ یہی ہے کہ اپنے ملک کو لادینی کی لہر اور مادی تحریکات سے بچائیں اور فیشن و اسراف سے ملک کو بچا کر اسلامی اسپرٹ لوگوں میں پیدا کریں وہاں کے مشائخ سے دوستانہ مراسم رہے اور شیخ بن حمید، ائمہ حرم، شیخ عمر بن حسن، شیخ حرکان، عبداللہ بن نصیف وزیر تعلیم حسن بن عبداللہ آل شیخ وزیر حج حسین عرب، رابطہ عالم اسلامی کے سکریٹری جنرل شیخ محمد سرور الصبان اور شیخ محمد صالح قزاز، شیخ محمد الحرکان اور دوسرے رابطہ عالم اسلامی کے سربراہ ہمیشہ آپ سے آپ کی قیام گاہ پر آکر ملے۔ حالانکہ یہ وہ حضرات ہیں جن سے ملنے کے لیے دوسرے ارکان مجلس اور اپنے اپنے ملک کے مشائخ ان کے دفتروں میں جاتے تھے، اور بعض حضرات اجازت طلبی میں کافی دیر تک دفتر

استقبالیہ میں انتظار کرتے، ایک مشہور شخصیت کے مالک، شیخ محمد سرور الصبان سے ملنے کے لیے ان کے سکریٹری کے دفتر میں تشریف فرما تھے۔ شیخ محمد سرور الصبان اس وقت اوپر کی منزل میں ایک کمیٹی میں بیٹھے تھے جس میں حضرت مولانا بھی تشریف فرما تھے، جب نیچے سے ان کے سکریٹری نے ان صاحب کا نام اوپر بھیجا تو شیخ نے مولانا سے پوچھا کیا ان سے ملنا مناسب ہوگا، حضرت مولانا نے بہت بلند الفاظ میں ان صاحب کا تعارف کرایا اور کہا ضرور ملیے۔

ہندوستان میں حضرت مولانا کو ایک بار نہیں دو بار خود وزیر اعظم نے براہ راست دریافت کیا کہ کیا ''پدم بھوشن'' کا خطاب لینا منظور کریں گے، مولانا نے دونوں مرتبہ صراحت کے ساتھ معذرت کرلی، یہی وہ خطاب ہے جو پہلے حضرت سید حسین احمد مدنی کو دیا گیا تھا، جس کو آپ نے واپس کردیا تھا، معلوم نہیں کسی اور عالم کو یہ خطاب اب تک دیا گیا ہے یا نہیں۔ ہاں مولانا ابوالکلام آزاد کے انتقال کے بیس سال بعد ملک کا سب سے بڑا خطاب ''بھارت رتن'' دیا گیا تھا۔

پڑوسی ملک پاکستان جو مسلمانوں کا ملک ہے لیکن ہندوستان سے مسلسل سرد جنگ کی کیفیت رہتی ہے۔ وہاں کسی ہندوستانی مسلمان کو جس نے ترک وطن کرکے پاکستان کی سکونت نہیں اختیار کی، اسے کوئی خاطر میں نہیں لاتا۔ بلکہ ان کے ہندوستان میں رہنے کی وجہ سے لوگ ایک طرح کی اجنبیت محسوس کرتے ہیں، مگر جہاں تک حضرت مولانا کا تعلق ہے، جب وہاں رابطہ عالم اسلامی کے منعقد کردہ اجلاس میں شرکت کے لیے گئے تو وہاں کے بڑے بڑے حکام آکر ملے۔ اور ایک جشن کا سماں قائم ہوگیا۔ دوسری مرتبہ جب کسی عرب ملک سے واپس آتے ہوئے پاکستان رکے تاکہ اپنے خاص اعزہ اور خاص طور پر اپنے رفیق قدیم حضرت مولانا محمد ناظم ندوی سے ملاقات کریں تو صدر پاکستان جنرل ضیاء الحق نے اسلام آباد

آنے کی دعوت دی، مولانا نے وقت کی تنگی کا عذر کرتے ہوئے معذرت کرلی، تو خود جنرل صاحب صرف مولانا سے ملنے کے لیے کراچی آئے اور دعا کی درخواست کی۔ ابھی دو سال ہوئے رابطہ ادب اسلامی کی ایک اردو نشست لاہور میں منعقد ہوئی، اس موقع پر اس وقت کے صدر پاکستان لغاری صاحب اور پنجاب کے وزیر اعلیٰ آکر ملے۔

یہ بات قابل ذکر ہے کہ بیرون ممالک میں یمن ایک ایسا ملک ہے جہاں علمائے کرام یا کوئی ہندوستانی جانے کی اور وہاں کے لوگوں سے ملنے کی ضرورت نہیں محسوس کرتا، حالانکہ یمن اب بھی خالص قدیم عربی معاشرت کا نمائندہ ہے، حضرت مولانا وہاں بھی ایک جمعیت کی دعوت پر تشریف لے گئے، وہاں کے اخبارات نے بڑی بڑی سرخیوں سے مولانا کی آمد کا ذکر کیا اور تقریروں کے اقتباسات دیئے، صدر حکومت، فوجی جنرل اور حکام نے وہ پذیرائی کی جو کسی والیِ سلطنت کی کی جاتی ہے۔

اور یہ پہلا ملک ہے جہاں اردن کے بعد حضرت مولانا نے فوجیوں کو خطاب کیا۔

عنداللہ مقبولیت کے یہ آثار جو خلق خدا میں مقبولیت سے ظاہر ہیں ایک بوریہ نشین عالم دین کو حاصل ہوئیں، معاندین، خواہ اس کی جو تاویل کریں اور اپنے اندرونی جذبۂ حسد کو ٹھنڈا کرنے کے لیے جو بھی توجیہ کریں وہ ان کا کام ہے۔ لیکن حقائق سے انکار کرنا بہت دشوار ہے۔

مسلمانان ہند نے وہ ردعمل بھی دیکھا ہے جو ندوہ میں چھاپہ پڑا اور آپ کے مکان پر تلاشی کے لیے حملہ کرنے پر ملک کے پورے طول وعرض میں ایک بھونچال سا آگیا تھا۔ اور لکھنؤ کے لوگوں نے دار العلوم ندوۃ العلماء سے وابستگی اور عقیدت محبت کا جو ثبوت دیا اس کی مثال نہیں ملتی ہے۔

انگریزی اخبارات نے جو ہمیشہ مسلمانوں کے اداروں کی اہانت کرتے

رہتے ہیں، انھوں نے اس محکمہ کو ملزم قرار دیا جس کے اشارہ پر یہ اقدامات ہوئے تھے عوام اور حکومت کے ایوانوں میں ایک ہل چل سی مچ گئی تھی۔ اس زمانہ میں ایک ضمنی الیکشن ہورہا تھا۔ اس میں مسلمانوں نے متفقہ طور پر حکومت کے خلاف ووٹ دیا، اور شکست کا سامنا کرنا پڑا۔ جس کا اعتراف کھل کر مدراس کے اخبار ''ہندو'' نے کیا، سابق وزیر اعظم وی پی سنگھ نے اس حملہ کی مذمت کرتے ہوئے ندوہ کے لئے (PRESTIGIOUS) قابل اہمیت ادارہ جو پورے عالم اسلامی میں باعزت مقام رکھتا ہے۔ بتایا۔ ندوہ کی یہ اہمیت، دنیا جانتی ہے، صرف حضرت مولانا کی شخصیت کی بنا پر تسلیم کی گئی۔ ندوہ آپ کے عہد میں جس عروج پر پہنچا ہے اس کا تصور بھی ہمارے جیسے لوگوں کے لیے محال ہے، جنھوں نے پہلے کا زمانہ دیکھا تھا، اور یہ ایک مستقل باب ہے جو ایک مستقل کتاب یا طویل باب کا محتاج ہے۔ اتنا اشارہ کرنا مناسب ہوگا کہ ملک کے اندر یا ملک کے باہر جہاں بھی آپ تشریف لے گئے وہاں ایک جشن اور شادی کا سا سماں قائم ہو گیا، دہلی میں حاجی کرامت اللہ کے مکان پر ایک زمانہ میں قیام تھا، وہاں کشمیر کے مرحوم میر واعظ محمد فاروق صاحب، مرکزی کابینہ کی وزیر محسنہ قدوائی چند پارلیمنٹ کے ممبر اور علماء وخواص اس کثرت سے جمع ہو گئے کہ ایک فلسطینی طالب علم ڈاکٹر تحسین نے کہا " کانه الفرح "یعنی ایسا لگتا ہے کہ یہاں کوئی شادی کی تقریب ہے، خود غریب خانہ پر مکہ مکرمہ پر اور دہلی میں یہی محسوس ہوتا ہے کہ کسی شاعر نے آپ ہی کے لیے یہ شعر کہا ہے۔

ہماں شادی وعشرت باشد اے دوست
دراں خانہ کہ مہمانے تو باشی

یہ دنیا جانتی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت مولانا کو جو عزت وتوقیر عطا فرمائی، وہ کسی جماعت، درس گاہ یا ادارے قومی یا بین الاقوامی تنظیم کے صدر یا رکن ہونے کی

وجہ سے نہیں بلکہ آپ کی خود ذاتی شخصیت نے ان تنظیموں کو فائدہ پہنچایا۔ اور اس کی عزت بڑھائی، یہ صرف ہندوستان کے اندر ندوہ یا مسلم پرسنل لاء یا دینی تعلیمی کونسل کی بات نہیں بلکہ رابطہ عالم اسلامی جو بین الاقوامی ادارہ ہے، اس کے دوسر براہوں نے اس کا اعتراف کیا ہے، جیسا کہ پہلے گذر چکا کہ رابطہء عالم اسلامی کی سالانہ نشست میں ایک سال مولانا شریک نہیں تھے تو اس کے سکریٹری جنرل نے کہا کہ مجلس پھیکی معلوم ہو رہی ہے۔ اور دوسرے سربراہ نے یہ کہا کہ اگر شیخ (مولانا ابوالحسن علی ندوی) ایک گھنٹہ کے لیے بھی سیشن میں شریک ہو جائیں تو اس سیشن کی عزت بڑھ جائے گی۔

حضرت مولانا آکسفورڈ یونیورسٹی کے اسلامک سینٹر کے صدر ہیں، جب اس سینٹر کو سعودی عرب کی حکومت نے ۴۵ لاکھ پونڈ دینے کا اعلان کیا تو اخبارات میں حضرت مولانا کی تصویر شائع ہوئی اور یہ لکھا گیا کہ یہ آکسفورڈ کا وہ اسلامک سینٹر ہے جس کے صدر شیخ ابوالحسن علی ندوی ہیں۔

مولانا کی حالیہ زمانہ علالت میں ریاست ''برونائی'' نے سب سے بڑی اسلامی شخصیت کا ایوارڈ دیا۔ اور وہاں کے وزیر اپنے ایک وفد کے ساتھ اس ایوارڈ کو پیش کرنے کے لیے آئے، لیکن یوپی کی حکومت نے روک دیا کہ نقص امن کا خطرہ ہے، کیونکہ اس زمانہ میں لکھنؤ یونیورسٹی کی یونین نے مولانا کا ''پتلا'' جلایا تھا۔

بہر حال دیکھنے کی بات یہ ہے کہ ایک طرف آکسفورڈ، پھر ادھر خلیج عرب کی ریاست دبئ اور مشرق بعید کی ریاست برونائی گویا دنیا کے طول وعرض میں اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کو ایک ایسی شخصیت دی، جو سب کے لیے باعث افتخار ہے۔

لیکن اس درخشانی وتابانی سے یہ نہ سمجھا جائے کہ دنیا میں آپ کا کوئی مخالف ومعاند نہیں ہے، یہ بات کسی پیغمبر اور ان کے حواریین، نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اور

ان کے آل اصحاب میں سے کوئی بھی ایسا نہیں ہوا جس کے ماننے والوں کے ساتھ، انکار کرنے والے اور بدگوئی کرنے والے نہ رہے ہوں۔ جیسا کہ اس کتاب کے شروع میں میں نے وضاحت کی ہے۔ عرب ممالک جہاں سب سے بڑھ کر اور سب سے پہلے آپ کی شخصیت کا اعتراف کیا گیا ہے وہاں بھی آپ کے مخالفین ہیں اور اپنے پورے زور وشور کے ساتھ سرگرم عمل ہیں، ان کا اعتراض، یا نقطۂ اختلاف یہ ہے کہ آپ صوفی ہیں، صوفیہ کی عظمت کرتے ہیں، ان کے کارناموں کو اجاگر کرتے ہیں، شیخ حامد الفقی جن سے مولانا کی ملاقات کا ذکر گذشتہ صفحات میں آچکا ہے۔ ان کی نظر میں "ربانية لا رهبانية" کا مصنف اور "الطريق الى مدينة" پر خطبہ دینے والا کب بری ہو سکتا تھا۔

دوسری شخصیت شیخ محمد ناصر البانی کی تھی جن کی تنقید کا نشانہ اصحاب سنن و صحاح رہے ہیں، ان کے ماننے والے اور حلقہ بگوش مولانا کی تحریروں کو برداشت نہیں کر سکتے تھے جن میں سوز دروں، نالۂ نیم شب اور آہ سحر گاہی کو وقعت کی نگاہ سے دیکھا اور دکھایا گیا ہے۔

ملک کے اندر بھی ایسے افراد کافی تعداد میں ہیں جن کے لیے حسد و عناد کا یہ سبب بہت کافی ہے کہ مولانا کا انتساب ان کی جماعت کی طرف نہیں ہے۔

نجد کے ایک شیخ (۱) جنھوں نے تبلیغی جماعت کے خلاف ایک مستقل کتاب لکھی ہے ان کا نقطۂ اعتراض یہ ہے کہ شیخ ابوالحسن نے شیخ الحدیث حضرت مولانا زکریاؒ کو "ریحانه الهند" لکھا ہے۔ اور دعوت و تبلیغ کے مجدد حضرت مولانا محمد الیاسؒ کے لیے بلند ترین الفاظ لکھے ہیں حالانکہ یہ سب موصوف کی نظر میں صوفی تھے۔ مخالفت و عداوت کا سبب جو بھی ہو مگر اس کے وجود سے ہم ناواقف نہیں ہیں

(۱) حمود التویجری، موصوف نے ایک قصص کی روایت پر پوری کتاب علمائے دیوبند پر سب وشتم میں لکھ ڈالی۔

اور اس کے ساتھ یہ جانتے ہیں کہ ان چند اہل عناد کو چھوڑ کر ہر صاحب انصاف اور اہل علم، صاحب ضمیر نے ہمیشہ آپ کا احترام ملحوظ رکھا ہے اور دل سے دعا دی ہے کہ

بخوبی ہم چو مہ تابندہ باشی
بملک دل براں تابندہ باشی



آخری باب

حیات مستعار کا آخری
اور
حیات ابدی کا پہلا دن

حضرت مولاناؒ کی عمر میں اللہ تعالیٰ نے برکت عطا فرمائی، ۸۶ برس اس خاکدان ارضی کے میسر ہوئے اور زندگی کا ہر لمحہ کامیاب، ہر ساعت روشن اور تابناک، انابت الی اللہ، توجہ اور دعا کی ایسی ساعتیں اللہ نے عطا فرمائیں کہ اس جیسا ایک لمحہ سو برس کی زندگی میں ایک مرتبہ بھی مل جائے تو سو سالہ زندگی بھی کامیاب وکامران قرار دی جائے۔

اس زندگی میں سیکڑوں راتیں مکہ اور مدینہ میں گزریں، ۸۶ رمضان ملے اور ہر رمضان کی شب قدر ملی، دعا وابتہال، ذکر ومناجات اور ہزاروں بار تلاوت کلام پاک کی سعادت اسیؔ سال تک جاری رہی، روزانہ کی تلاوتیں، ابتہال ودعائیں، اور مناجاتیں ایک طرف بدستور قائم رہیں دوسری طرف پوری مدت حیات دین کے لئے سربکف رہے، جسم کا ذرہ ذرہ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ غیرت دینی میں شعلۂ جوالہ بنا ہوا ہے، اس کے علاوہ نہ دنیا کی دولت سے کوئی سروکار، اور نہ ناموری کی تمنا، نہ سرداری کی خواہش، اور نہ صدارت کی ہوس۔ اس زندگی کا پیمانہ بھی ایک نہ ایک دن

پورا ہونا ہی تھا عیسوی صدی کی پہلی ہزاری ختم ہونے کو آئی، روزہ، تلاوت، ذکر کے معمولات پورے ہو چکے تھے، آپ کی آنکھیں بند اور روح حظیرۃ القدس میں داخل ہوگئی، تفصیل مولانا بلال عبدالحی حسنی (حضرت کے برادر بزرگ ڈاکٹر سید عبدالعلیؒ کے پوتے) مولانا نذر الحفیظ ندوی استاد دارالعلوم ندوۃ العلماء، مولانا سید محمود حسن حسنی حضرت کے بھانجے مولانا محمد الثانیؒ کے نواسے، اور برسہابرس کے خدمت گذار اور خدمت کے لئے اپنی زندگی وقف کرنے والے الحاج عبدالرزاق نے جو تفصیل لکھی ہے اس کو ذیل میں ملاحظہ فرمائیں:-

حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی کا معمول تھا کہ تہجد سے قبل بیدار ہو جاتے استنجا اور وضو سے فارغ ہو کر نوافل کی نیت باندھ لیتے، کبھی چار کبھی چھ، کبھی آٹھ رکعت پڑھتے، اس رمضان میں نوافل کا اہتمام بہت بڑھ گیا تھا، سحری ختم ہونے سے دس منٹ قبل سحری کھاتے، اس کے بعد کبھی تو ہاتھ اٹھا کر اور کبھی بغیر ہاتھ اٹھائے دعا فرماتے، اذان کے بعد فجر کی سنت پھر فرض کے بعد منزل پڑھتے اور لیٹ جاتے۔ آخری عشرہ میں فجر بعد جو لوگ واپس ہوتے وہ مصافحہ کے لئے حاضر ہوتے، ان کو لیٹے لیٹے رخصت فرماتے، اور دعائیہ کلمات کہتے۔ رمضان کے دنوں میں کوشش فرماتے کہ ساڑھے نو بجے اٹھ جائیں۔ استنجا، اور وضو سے فارغ ہو کر دو رکعت نفل پڑھتے، پھر قرآن شریف کم از کم آدھا پارہ ورنہ عام طور پر ایک پارہ تلاوت فرماتے۔ ادھر کچھ عرصہ سے یہ معمول ہو گیا تھا کہ قرآن پاک کی تلاوت کے بعد صبح کو متن بخاری شریف سماعت فرماتے قیام لکھنؤ میں مولوی سید عبداللہ حسنی اور رائے بریلی میں مولوی سید بلال حسنی کو قرأت کا شرف حاصل ہوتا، پھر لکھنے لکھانے اور تصنیف و تالیف کا کام شروع ہو جاتا، والد ماجد مولانا حکیم سید عبدالحی حسنی صاحبؒ کے مرتب کردہ مجموعہ احادیث ''تہذیب الاخلاق'' کو بھی مطالعہ میں رکھنے لگے

تھے۔اس کے بعد سورہ یٰسین روزانہ گیارہ مرتبہ اور جمعرات کے دن تیرہ بار تلاوت فرما کر حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے لے کر اس وقت تک کے تمام مجددین و مصلحین، مجاہدین اور اصحاب دعوت وعزیمت، ربانی وحقانی علماء اور اپنے اساتذہ اور محسنوں اور عزیز واقارب اور عام مسلمانوں کو ایصال ثواب کرتے، اس معمول میں کچھ کمی رہ جاتی تو عصر سے کچھ قبل یا بعد مغرب اس کی تکمیل فرماتے، عام طور پر ان معمولات میں ناغہ نہیں ہوتا تھا، عصر بعد کی مجلس میں بھی زیر لب کچھ پڑھتے رہتے، مغرب بعد اوّابین سے فراغت پر سورہ فتح پابندی سے پڑھتے، سفر میں سورہ فتح عام طور سے اوّابین سے پہلے اور بسا اوقات مغرب سے کچھ پہلے تلاوت کر لیتے اسفار میں جس شہر اور بستی سے گذرتے وہاں کے مدفون مسلمانوں کے لئے ایصال ثواب کا اہتمام فرماتے۔

جان لیوا مرض سے سنبھالا لینے کے بعد اہل تعلق کا یہ تاثر تھا کہ یہ عارضی صحت ہے کسی وقت بھی یہ دولت بے بہا ہم سے چھن سکتی ہے۔خود حضرت والا بھی اس طرح کے جملے بڑے درد وکرب سے مختلف اوقات میں فرماتے تھے اللّٰھم لقائك کبھی فرماتے اب ہم بھی چلے، خدایا عاقبت محمود کردے، کبھی فرماتے اے اللہ اب تو بلالے، اس معذوری کے ساتھ کب تک؟ ایک خادم سے مختلف وقتوں میں فرمایا کہ تم پر کام کا بوجھ بہت ڈال دیتے ہیں، بس کچھ ہی دن تک ہے۔کبھی فرماتے اب ہم بھی چلے، بس کچھ دن اور، کچھ دن اور۔

شعبان کا آغاز ہوتے ہی یہ سوال خدام اور حضرت کے معالجین کے درمیان گردش کرنے لگا کہ رمضان کا مہینہ کہاں گذرے گا۔ڈاکٹروں نے اصرار کیا کہ ندوہ میں گذرے، آخر میں حضرت والا کے انشراح اور مرضی پر چھوڑ دیا گیا۔

حضرت نے فرمایا کہ رمضان سے قبل رائے بریلی جانا ہے چنانچہ ۲۷ رشعبان

کو تکیہ تشریف لائے، ۲۸؍ کو قیام کر کے خلاف معمول مولوی سید بلال حسنی سے فرمایا کہ مجھے مسجد لے چلو، مسجد کے صحن میں جانماز بچھا دی گئی، دو رکعت نماز ادا کی، پھر مسجد کے اندرونی حصے میں تشریف لے گئے، وہاں بھی دو رکعت نماز ادا کی، پھر فرمایا کہ ندی کی طرف لے چلو، چنانچہ جہاں نئے زینے بنے ہیں وہاں کھڑے ہو کر چاروں طرف دیکھا، فرمایا ماشاء اللہ، ماشاء اللہ اس کے بعد فرمایا کہ مسجد کی پشت پر لے چلو، جہاں سید صاحب کے زمانہ کا ایک پتھر رکھا ہوا ہے۔ تکان کے خیال سے یہ فرمائش نہیں پوری کی گئی۔ مسجد سے نکلتے وقت سامنے ہی شاہ علم اللہؒ کا روضہ ہے جہاں محبوب والدین اور بھائی بہن کے علاوہ بھی گنجہائے گراں مایہ دفن ہیں۔ وہیں زینے کے پاس ٹیک لگا کر کھڑے کھڑے دیر تک ایصال ثواب کرتے رہے وہاں سے واپسی پر تکان کے باوجود گھر کے اندر تشریف لے گئے جہاں گھر کی تمام مستورات جمع تھیں، مولانا سید محمد رابع حسنی ندوی صاحب بھی موجود تھے، پندرہ منٹ کے بعد گھر سے واپس بنگلہ پر تشریف لے آئے۔ بعد نماز ظہر آرام کر کے اول وقت عصر کی نماز پڑھی، پھر گھر تشریف لے جا کر ملاقات کی اور لکھنؤ روانہ ہو گئے۔

پہلا روزہ شروع ہوا تو فرمایا کہ معلوم نہیں پورا رمضان ملتا ہے یا نہیں۔ اے اللہ! تو پورے رمضان کی برکتوں سے نواز دے۔ اور فرمایا کہ جو کام دوائیں نہ کر سکیں وہ رمضان نے کر دیا۔

وطن میں آخری عشرہ گذارنے کے بارے میں حضرت والا نے اپنے معالجوں سے اجازت لے لی تھی۔ ڈاکٹر نظر، ڈاکٹر عبد المعبود خاں، ڈاکٹر سید قمر الدین ڈاکٹر کرنل شمسی اس مشورہ میں شریک تھے۔ ۲۰؍ رمضان ۱۴۲۱ھ مطابق ۲۹؍ دسمبر ۱۹۹۹ء کو رائے بریلی ایک بڑے قافلہ کے ساتھ روانگی ہوئی یہاں معتکفین سے مسجد بھر گئی، پہلے دن حضرت والا نے دریافت فرمایا کہ مسجد میں کتنے لوگ ہیں مولوی

سید بلال حسنی نے عرض کیا کہ مسجد بھر گئی ہے، فرمایا! ''بانی کا اخلاص ہے۔''
آخری شب تراویح کے بعد ساڑھے نو بجے مجلس میں معمول کے مطابق تشریف فرمایا مختلف سوالات کے جوابات دیے، دمشق سے چھپ کر حضرت والا کی جو تصنیفات آئی تھیں ان کو دیکھ کر فرمایا کہ یہ سب اللہ تعالیٰ نے لکھوائی ہیں۔ایک خادم نے جو باہر کے دورے سے حاضر ہوئے تھے، حضرت کو جب یہ اطلاع دی کہ ایک صاحب خیر نے ۲۷ ہزار ڈالر ترکی کے ایک ناشر اور مترجم کو دیئے ہیں کہ وہ حضرت کی تمام تصنیفات شائع کر کے ترکوں میں مفت تقسیم کریں۔تو اس خبر پر بڑی مسرت کا اظہار فرمایا۔مجلس میں " العاقبة للمتقين" سے متعلق سوال کیا گیا تو فرمایا کہ عاقبت مذموم بھی ہوتی ہے اور محمود بھی، آخر میں استفسار فرمایا کہ کیا کل جمعۃ الوداع ہے؟

وصال کے دن بھی مذکورہ بالا روزانہ کے تمام معمولات پورے فرمائے۔ ساڑھے نو بجے بیدار ہو کر استنجا گئے، وضو کے بعد نوافل پڑھے پھر قرآن شریف کی تلاوت کی، سجدہ تلاوت بھی کیا، لکھنؤ میں قرآن مجید ختم کر چکے تھے، تیرہواں پارہ آخری دن پڑھا، مولوی سید جعفر مسعود حسنی خدمت میں حاضر ہوئے اور تکیہ تشریف آوری پر اہل تکیہ کی مسرت اور شادمانی کا ذکر کیا اور عرض کیا کہ آپ تشریف لاتے ہیں تو بہار آجاتی ہے، فرمایا کہ یہ تکیہ کی خصوصیت ہے جو انشاء اللہ باقی رہے گی۔تھوڑی دیر بعد لکھنؤ سے ڈاکٹر عبدالمعبود خاں بھی حاضر ہوگئے، حضرت نے فرمایا کہ اتنی سخت سردی میں آپ آگئے، انھوں نے عرض کیا کہ حضرت سے وعدہ کیا تھا، یہ بھی کہا کہ ہم اپنے ساتھ آکسیجن اور مانیٹر بھی لائے ہیں تا کہ حضرت کو کوئی زحمت نہ ہو، یہ سن کر حضرت مسکرادیئے۔ بھائی صابر جو برسوں سے حضرت کا خط بناتے آئے تھے ان سے خط بنوایا، اس کے بعد نہانے کی تیاری کی، بھائی ذکاء اللہ خاں اندوری

راوی ہیں: غسل خانہ جانے سے پہلے سوال کیا آج ۲۲/رمضان ہے۔ پھر فرمایا کہ کیا نماز جمعہ پندرہ منٹ تاخیر سے ہو سکتی ہے؟ بھائی عبدالرزاق نے عرض کیا کہ آپ فرمائیں تو تاخیر سے نماز ہوگی ساڑھے گیارہ بجے غسل کے لئے تشریف لے گئے پندرہ منٹ بعد غسل سے فارغ ہو کر آ گئے۔ کپڑے زیب تن کئے، شیروانی کے بٹن مولوی سید بلال حسنی نے لگائے۔ فرمایا کہ تم لوگ تیار ہو جاؤ، نماز میں پندرہ منٹ تاخیر کرادو، فرمایا کہ اب ہم سورہ کہف پڑھیں گے۔ (اس سورہ کے پڑھنے کا معمول آٹھ سال کی عمر سے تھا) یہ فرما کر بستر پر بیٹھ گئے، لیکن بجائے سورہ کہف پڑھنے کے سورہ یٰسین پڑھنے لگے، دس بارہ آیتیں ہوئی ہوں گی کہ زبان رک گئی یہ آیت فَبَشِّرْهُ بِمَغْفِرَةٍ وَّ اَجْرٍ كَرِيْمٍ تھی (جیسا کہ حاضر الوقت خدام نے بتایا) جس طرح بیٹھے تھے اس سے تھوڑا پیچھے کی طرف جھک گئے، مولوی بلال حسنی نے سر کو اور خادم خاص بھائی عبدالرزاق نے پاؤں کو اٹھا کر تخت پر لٹا دیا ڈاکٹر سید قمر الدین اور ڈاکٹر عبدالمعبود خان قریب ہی تھے، آکسیجن لگائی گئی۔ انجکشن جب رگوں میں نہیں لگ سکے تو کولھے میں لگائے گئے، ڈاکٹر قمر الدین صاحب نے ایک انجکشن دل پر لگایا، ہاتھ سے قلب کی مالش کی، اور منھ سے ہوا بھی بھرنے کی کوشش کی، لیکن راہ حق کا یہ مسافر ان تمام طبی کوششوں سے پہلے ہی روانہ ہو چکا تھا، اس وقت بارہ بجنے میں دس منٹ باقی تھے۔ خبر جنگل کی آگ کی طرح پھیلی اور محبین واہل تعلق کے قافلے دیوانہ وار رائے بریلی پہنچنا شروع ہو گئے۔

حضرت کے خواہر زادہ مولانا محمد ثانیؒ کے فرزند مولوی سید محمد حمزہ حسنی ندوی نے اس نازک موقع پر غسل، تجہیز و تکفین، نماز جنازہ اور تدفین کے سارے امور طے کئے۔

غسل دینے میں حسب ذیل حضرات شریک تھے، مولوی سعید بنو ندوی

(جنوبی افریقہ) جو رمضان گذارنے آئے تھے، حضرت کے مجاز بھی ہیں، خادم خاص بھائی عبدالرزاق (۱) سید حسن عسکری طارق صاحب (مدینہ منورہ) (۲) مولوی سید بلال حسنی ندوی (۳) حضرت کے کاتب خاص مولوی نثار الحق ندوی (۴) مولوی نیاز احمد ندوی بھی شریک ہو گئے، اور اس موقع پر مولانا سید محمد رابع حسنی ندوی، مولوی سید سلمان حسینی ندوی، مولوی سید عبداللہ حسنی ندوی موجود تھے۔ اور بھائی عبدالمعید پرتاپ گڑھی (خادم) عزیزان محمود حسنی محمد معاذ کاندھلوی، سید شارق سلمہم اور حافظ مصباح الدین صدیقی موجود رہ کر معاونت کر رہے تھے اس موقع پر مولوی سید حمزہ حسنی ندوی، سید جعفر مسعود حسنی، سید عمار حسنی اور دیگر افراد خاندان موجود تھے۔

بعد مغرب سات بجے سے پونے دس بجے تک آخری دیدار کرنے والوں کا ہجوم رہا جو بتدریج بڑھتا ہی جا رہا تھا، نماز جنازہ کا اعلان دس بجے کیا گیا تھا، چنانچہ ٹھیک پونے دس بجے جنازہ اٹھایا گیا، دو منٹ کا راستہ پچیس منٹ میں طے ہوا، مسجد کے اندر منبر کے قریب جنازہ رکھا گیا مولانا سید محمد رابع حسنی ندوی صاحب نے نماز جنازہ پڑھائی۔

ساڑھے دس بجے جنازہ قبر میں اتارا گیا، قبر میں جن لوگوں نے جنازہ اتارا ان میں مولانا سید محمد رابع حسنی ندوی، مولوی سید عبداللہ حسنی ندوی، خادم خاص بھائی عبدالرزاق تھے، بھائی عبدالرزاق اور سید بلال حسنی لکڑی کے پٹرے لگا رہے تھے، محبوب منصور پوری پٹرے دے رہے تھے آخری پٹرا لگانے سے پہلے کسی نے توجہ دلائی

---

(۱) نصیر آباد ضلع رائے بریلی کے رہنے والے ہیں، حضرت سے ۱۹۵۴ء میں بیعت ہوئے اور تا زندگی حضرت کی خدمت میں رہے، اب آپ کے جانشین مولانا سید محمد رابع حسنی ندوی کے ہمراہ ہیں۔

(۲) سید حسن عسکری صاحب بھونڈیہہ بہار کے رہنے والے اور مدینہ منورہ میں ٹیلیفون کے انجینئر ہیں، مدینہ منورہ کے زمانہ قیام میں حضرت اور حضرت کے خدام و مرافقین کھانے میں ان کے مہمان رہتے تھے۔

(۳) حضرت کے بڑے بھائی ڈاکٹر عبدالعلیؒ صاحب کے پوتے۔

(۴) حضرت کے کاتب خاص جو ندوہ سے فارغ ہونے کے بعد سے آخر تک حضرت کے ساتھ رہے۔

کہ کفن کا بند کھولا نہیں جاسکا، چنانچہ مولوی بلال حسنی نے قبر میں اتر کر بند کھول دیا، پھر آخری پٹرا بھی لگا دیا گیا، تدفین روضہ شاہ علم اللہ میں ہوئی، جہاں آخری جگہ باقی تھی۔

مجمع غیر معمولی تھا، ساڑھے آٹھ بجے تھانیدار ایس پی کو رپورٹ دے رہا تھا کہ پونے دو لاکھ آدمی آچکے ہیں اور جوں جوں نماز کا وقت قریب آرہا تھا (موسم کی سختی، سردی اور شدید کہرے کے باوجود) آنے والوں کی تعداد میں اضافہ ہوتا رہا اور سلسلہ تو تدفین کے بعد تک جاری رہا، دور دراز کی گاڑیاں سحر تک آتی رہیں۔ع

آسمان تیری لحد پر شبنم افشانی کرے

حادثہ جمعہ کو پیش آیا جمعرات کو ڈاکٹر عباد الرحمٰن نشاط صاحب نے جو حضرت کے مجاز بھی ہیں) حج کے سفر کی بات رکھی تھی حضرت نے منظور فرما لیا تھا اور ارادہ کر لیا تھا۔ اس کی بھی حضرت کو بڑی فکر تھی کہ روپئے پیسے جمع نہ رہیں، جو آرہا ہے جاتا رہے اس کے لئے بار بار بھائی عبدالرزاق کو آواز دیتے اور مولوی بلال اور مولوی محمود کو بھی تاکید کی کہ جہاں مناسب سمجھو بتا دو، ہم دیں گے۔

اس طرح حضرت حج کے سفر کی نیت کر کے، اور روزہ کی حالت میں، نماز کی تیاری اور انتظار میں، دیتے دلاتے اور اپنی عملی زندگی سے زہد و عبادت و استغناء اور تعلق مع اللہ کی دعوت دیتے ہوئے رخصت ہو گئے۔ انا للہ و انا الیہ راجعون

وفات کے بعد

حضرت کے وصال کا صدمہ بہت غیر معمولی تھا۔ لیکن بزرگوں اور صلحاء کے انتقال کے وقت اہل تعلق اور مخلصین و محبین کو اللہ تعالیٰ برداشت کی قوت اور صبر و ضبط کا یارہ عطا فرما دیتے ہیں، دوسری خصوصیت جو عام طور پر اولیاء اللہ اور ربانی علماء کے وصال پر دیکھی جاتی بلکہ کھلے عام محسوس کی جاتی ہے وہ یہ کہ وحشت و گھبراہٹ

کے بجائے پوری فضا پر سکینت وطمانینت کا شامیانہ تنا ہوتا ہے کوئی گھبراہٹ و مایوسی نہیں ہوتی اور نہ ہی فکر مندی اور تشویش ہوتی ہے بلکہ ذکر ودعا اور انابت کی کیفیت پیدا ہو جاتی ہے۔ حضرت کے وصال کے وقت بھی ان ہی کیفیات اور احساسات کا غلبہ تھا۔ تیسرا احساس عام طور پر بزرگوں کی وفات پر ہر شخص کو خواہ وہ کتنا ہی قریب اور برسوں سے ساتھ رہا ہو، اپنی محرومی اور اس نعمت عظمیٰ کی ناقدری کا ہوتا ہے اس کے دل پر ایک چوٹ سی لگتی ہے اور ساری عمر کی تقصیریں یاد آتی ہیں اور حسرت ہوتی ہے کہ کاش اللہ تعالیٰ کی اس عظیم نعمت کی قدر کر لیتے۔ ع

یک حرف کاشکے صد جانوشتہ ایم

اور

حیف در چشم زدن صحبت یار آخر شد
روئے گل سیر ندیدیم و بہار آخر شد

کا غم ناک احساس ستاتا ہے۔

اوروں کا حال تو نہیں معلوم البتہ ہم نیازمندوں کا ایک احساس یہ بھی ہے کہ اتنی مدت گزرنے کے باوجود حضرت ہمارے درمیان موجود ہیں کہیں تشریف لے گئے ہیں تھوڑی دیر میں تشریف لے آئیں گے۔

آخری دیدار کے لئے جو لوگ آرہے تھے چہرہ مبارک پر پہلی نظر پڑتے ہی بے اختیار سسکی کی آواز نکل جاتی تھی۔ آنکھیں ضبط کے باوجود چھلک جاتیں۔ جذبات پر قابو پانا مشکل ہو جاتا زندگی میں جس طرح نظر بھر کر دیکھنا مشکل ہوتا تھا اسی طرح وفات کے بعد بھی چہرۂ مبارک پر چند لمحے سے زیادہ نظر جمانا ناممکن ہو رہا تھا آنکھیں بند کئے اور سر جھکائے غم سے نڈھال لغزیدہ قدموں سے کسی گوشے کی پناہ لینے نکل جاتے، تا کہ خاموشی سے گھٹ گھٹ کر کسی طرح اس کوہ غم کو اٹھا سکیں۔

دیدار کے لئے سب سے زیادہ مضطرب مسجد کے معتکفین تھے ان کی بیقراری اور بے چینی صبر وضبط کے سارے بندھن توڑنے والی تھی لیکن مرضی مولیٰ از ہمہ اولیٰ سمجھ کر خون کے آنسو پی گئے پھر بھی ذکر وتلاوت اور دعاؤں میں ان کا قلبی اضطراب ظاہر ہو جاتا اور آنسوؤں کی جھڑی لگ جاتی۔ تسکین اس وقت ہوئی جب حضرت کا جنازہ مسجد کے اندر منبر کے قریب اس جگہ لایا گیا جہاں حضرت ہمیشہ نمازیں ادا فرماتے تھے۔

وصال کے بعد ہی مولانا سید محمد رابع صاحب کے مشورہ سے نماز جنازہ اور تدفین کا وقت دس بجے شب مقرر کر دیا گیا اس کی اطلاع عام کر دی گئی شدید سردی اور کہرے کے باوجود مجمع بڑھتا ہی گیا، لیکن یہ بھی اللہ تعالیٰ کا خاص فضل وکرم رہا کہ لاکھوں کا یہ مجمع بے قابو نہیں ہونے پایا۔ گھر سے جنازہ جیسے ہی نکالا گیا مضبوط فولادی ہاتھوں نے تابوت کے پایے اس طرح اپنے قبضہ میں کر لئے کہ اژدحام سے تابوت موجوں کی طرح ہلکورے لے رہا تھا۔ اور دائیں بائیں جا رہا تھا مگر لاش مبارک تابوت پر ہی رہی۔ آخری آرام گاہ تک کا سفر بڑے سکون سے طے ہوا۔ اللہ تعالیٰ کا خصوصی فضل وکرم اور بہت بڑا احسان تھا یہ بھی ہوا کہ نماز جنازہ کی ادائیگی بھی بڑے اطمینان اور خشوع وخضوع کے عالم میں ہوئی۔ مائک اور روشنی کے انتظام سے بھی اس میں مدد ملی، جنازہ کے انتظار میں جو وقت گزرا اس میں بھی ذکر ودعا کا اہتمام ہو رہا تھا اور تسبیحات کی تلقین بھی مائک سے کی جا رہی تھی۔

نماز جنازہ کے بعد بڑی تعداد اسی وقت روانہ ہو گئی۔ انتظامیہ نے دو کلو میٹر پہلے ہی سواریوں کو روک دیا تھا، اس لئے آنے جانے میں یہ فاصلہ طے کرنا کمزوروں اور معمر حضرات کے لئے آسان نہ تھا۔ مگر اللہ تعالیٰ کی خاص مدد رہی شدید کہرے کے باوجود تمام لوگ بخیر وخوبی اپنی منزلوں تک پہنچ گئے، الحمد للہ کہ نہ کسی کو ٹھنڈک لگی اور نہ ہی کوئی حادثہ پیش آیا۔ دہلی سے مرکز نظام الدین اور جامعہ ملیہ سے

کچھ حضرات نے بذریعہ ہوائی جہاز آنے کی کوشش کی مگر شدید کہرے کی وجہ سے جہاز پرواز نہ کرسکا اور مسافروں کو جہاز سے اتر کر واپس جانا پڑا، ٹرین سے آنے والے بھی سولہ سترہ گھنٹے سے پہلے نہیں پہنچ سکے، تعزیت کے لئے آنے والوں کا سلسلہ ابھی تک جاری ہے خط تو ہزاروں کی تعداد میں دنیا کے کونے کونے سے آئے فیکس اور فون کے ذریعہ بھی تعزیت کا سلسلہ دو ماہ تک جاری رہا۔

اس خاندان والاشان کی یہ تاریخ رہی ہے کہ ہر دور میں تعلیم و تزکیہ کا سلسلہ جاری رہا ہے خاندان میں کسی نے بھی مشیخت کی دوکان نہیں لگائی جو اہل ہوتا اسی کی طرف خاندان اور خاندان کے باہر کے لوگ خود بخود بغیر کسی رسمی اعلان کے رجوع کرنے لگتے اور اسی کو بڑا امان لیتے۔ حضرت رحمۃ اللہ علیہ کا معاملہ یہ تھا کہ دس سال کی عمر ہی سے خاندان کے بزرگ حضرات دینی معاملات میں آگے کرنے لگے تھے۔ حضرت کی وفات کے بعد حضرت کے بھانجے اور خلیفہ مولانا سید محمد رابع صاحب ندوی کے ساتھ حضرت کے جانشین کی حیثیت سے لوگوں نے معاملہ شروع کردیا۔ اور بغیر کسی رسمی کارروائی کے بیعت اور تجدید بیعت لوگ کرنے لگے۔

اللہ تعالیٰ نے ندوۃ العلماء کی نظامت کا مسئلہ بھی اسی طرح حل فرمادیا اور بالاتفاق آراء سب نے اس کو تسلیم کرلیا۔ حالات بہت جلد معمول پر آگئے۔ خادم خاص حضرت مولانا سید محمد رابع صاحب کے رفیق سفر و حضر کی حیثیت سے رہتے ہیں، کاتب خاص مولانا نثار الحق کا قیام تکیہ پر ہے، اندرون و بیرون ملک دورے بھی شروع ہوگئے ہیں عشاء کے بعد کی مجلس مہمان خانہ میں اور بعد عصر اساتذہ دارالعلوم اور شہریوں کی آمد کا سلسلہ معمول کے مطابق جاری ہوگیا ہے۔

داتا رکھے آباداں ساقی تری محفل کو

اخبار ورسائل کے خاص نمبر

لکھنؤ کے روزنامہ "ان دنوں" کا ایک جملہ حقیقت کا آئینہ اور مسلمانوں کے جذبات کا ترجمان ثابت ہوا اور اس کو ہندوستان سے نکلنے والے دیوبند کے عربی ماہنامہ نے بھی ترجمہ کرکے شائع کیا وہ یہ تھا "حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ کی وفات کے بعد مسلمان اپنے آپ کو اس درجہ بے بس اور سرپرست سے محروم سمجھ رہے ہیں جیسے شیشان کے مسلمان اپنی لاچاری و بے بسی کے ساتھ دنیا کے سامنے بے بس نظر آرہے ہیں، یا جس طرح آسام میں سیلاب کے بعد وہاں کے باشندے آسمان کے نیچے اپنے آپ کو سرپرستی سے محروم پا رہے ہیں" روزنامہ مذکور کے الفاظ مجھے یاد نہیں ہیں اور نہ وہ شمارہ نظروں کے سامنے ہے لیکن مفہوم بعینہ وہی تھا جس کو میں نے ابھی نقل کیا ہے۔

قاعدہ یہ ہے کہ جب کہیں اور جہاں کہیں ایک عظیم شخصیت کے اٹھ جانے کا حادثہ پیش آتا ہے تو اس کے افراد خاندان اور اس سے متعلق اپنے غم کا اظہار اور جانے والی شخصیت کی عظمت کا بیان بہت جوش وخروش اور مجاز و کنایہ کی زبان میں اس طرح کرتے ہیں جیسے "آسمان ٹوٹ پڑا، آفتاب کی روشنی ماند پڑگئی، غم کے بادل گھر آئے، حسرت و یاس سے دنیا تہہ و بالا ہوگئی علم و فضل کا آفتاب عین نصف النہار

میں غروب ہوگیا......وغیرہ وغیرہ

الحمد للہ کہ حضرت کے قریبی نیاز مندوں اور عقیدت رکھنے والوں اور ان کے ساتھ ان کے خاندان کے افراد میں سے کسی نے کوئی اس طرح کا جملہ زبان سے نہیں نکالا، راقم نے آپ کی وفات کے بعد تعمیر حیات کا جو اداریہ لکھا تھا اس کو بہت سے لوگوں نے نقل کیا اور اپنے زخم جدائی کے لئے اس کو مرہم سمجھا، وہ حضرت صدیق اکبر کا جملہ تھا، "طاب حیا و طاب میتا"۔(زندگی بھی خوشگوار اور موت بھی شاندار) راقم نے جو چند سطریں لکھی تھیں وہ ندوۃ العلماء کے تمام فرزندوں اور حضرتؒ کے افراد خاندان کی فکری نمائندگی کا نمونہ ہے اس لئے ان سطور کو حضرت کی سوانح کے اخیر میں نقل کرتا ہوں۔

وہ واقعہ جس کو لیک نہ لیک دن آنا ہی تھا، وہ ۲۲/رمضان المبارک ۱۴۲۰ھ (۳۱/دسمبر ۱۹۹۹ء) کو پیش آگیا۔یعنی حضرت مخدوم ومربی مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندوی نے وفات پائی۔اللھم قدس روحه واکرم مثواه

یانفس أجملی جزعا فانك ماتحذرین قد وقعا

اے نفس شورش غم پر قابو رکھ، جس بات کا تجھے ڈر تھا وہ بات پیش آگئی۔

خلود، ہیشگی کی زندگی آخرت کیلئے ہے، عالم ناسوت کے لئے فنا مقدر ہے۔

بہ گیتی گر کسے پائندہ بودے

ابوالقاسم محمدؐ زندہ بودے

کسی کی موت پر اظہار غم کوئی نئی بات نہیں ہے، اس کے سیکڑوں اور ہزاروں انداز بیان ہیں، نظم و نثر دونوں میں یہ صنف ادب مشہور ہے، لیکن ہر طرح کے مبالغوں سے پاک، انتہائی حقیقت پسندانہ سادہ اور سچا، دل کی گہرائیوں سے نکلا ہوا، بے تصنع، اور سخن سازی سے مبرا جملہ سیدنا ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کا جملہ

ہے۔سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد آپ کے جسد اطہر کے پاس تشریف لائے، جبین مبارک کو چوما اور کہا۔" طبت حیا و طبت میتا" آپ کی زندگی پاکیزہ اور اچھی رہی اور آپ کی موت بھی پاکیزہ اور اچھی رہی۔آج رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ایک امتی، اللہ کے بندہ بے نوا ابوالحسن علی پر یہی جملہ ہر طرح صادق نظر آتا ہے۔آج وہ اللہ کے لطف وکرم کے محتاج، اس کی مغفرت کے طلبگار، اسکی رحمتوں کے امیدوار ایک جسد خاکی میں، حضرت مولانا، سیدنا مرشدنا اور اسی قافیہ وترکیب کے سیکڑوں الفاظ نام کے پہلے اور نام کے بعد لکھے جاسکتے ہیں۔مگر یہ سب دنیاوی زندگی کے القاب تھے، آخرت کا لقب صرف وہی ہے جس میں عبدیت کا اظہار ہو۔

بات کہی تھی خلیفہ رسول برحق نے، اور جس کے حق میں کہی تھی وہ سرور کائنات اور فخر موجودات تھے، مثال وتشبیہ تعریف وتشخص میں نہیں دی جارہی ہے۔ ہاں اس نور کا ایک شمہ، اس سمندر کا ایک قطرہ، ایک بندہ خدا اور رسول پاک صلی اللہ علیہ وسلم کے متبع سنت فرد پر صادق آرہا ہے۔

طاب حیا...... زندگی کامیاب، بلند اقبال رہی، مقبولیت عند اللہ کا تاج زریں آخری سانس تک سر پر رہا، مقبولیت ونورانیت ایسی جو عہد قریب میں کہئے یا اس صدی میں اس درجہ وسیع پیمانے پر شاید ہی کسی کو حاصل ہوئی ہے۔

ایک فقیر بے نوا، بے تاج وگہر نے بادشاہی کی، دلوں پر حکومت کی، ملک سے باہر صرف عرب کے کسی ایک خاص حصہ میں نہیں بلکہ تمام عرب ممالک میں، مشرق قریب، اوسط، اور بعید کے ہر خطے میں، وہ دینی کتابوں کا مصنف جس کی کتابیں پڑھنا علم وثقافت کی دلیل ہو اور جس سے ناواقفیت جہل ونادانی کی علامت ہو، جو بغیر کسی فکر وفن، اور بغیر سیاسی قلابازیوں، انجمن سازیوں کے، پارٹیوں اور

جماعتوں پر بھاری ہو، جس کے ایک بول سے ''اوراق حکومت پرشکن'' آجاتی ہو، جو زندگی بھر کسی گورنر یا صدر حکومت کی، یا وزیر اعظم یا وزیر اعلیٰ کی کوٹھیوں کا چکر لگاتا ہوا نہ دیکھا گیا ہو، بلکہ خود حکمراں ہی، اپنی حکمرانی کے زمانے میں بھی اور حکمرانی ختم ہونے کے بعد بھی اس کے در پر آئے ہوں، جو بادشاہوں اور جمہوریتوں کے صدروں سے نہ ملنے سے ڈرا ہو اور نہ ڈر کر بات کی ہو، ایک ہی وقت میں متعدد آل انڈیا اور آل ورلڈ جماعتوں کا صدر ہو، مگر اپنے بوریہ فقر سے ایک انچ ٹلا نہ ہو، جس کو اگر کسی غیر مسلم نے دیکھا تو برملا کہا، ''یہ چہرہ کسی جھوٹے کا نہیں ہوسکتا''، اور مسلمان نے دیکھا تو اس کی عقیدت و محبت کا دم بھرتا رہا۔ جس نے کسی بڑی سی بڑی کانفرنس یا بڑے سے بڑے مہمان کی خاطر اپنے معمولات اوراد وظائف میں ایک لمحہ کی تقدیم و تاخیر نہ کی ہو۔ غیرت دینی اور حب نبوی میں جس نے وقت کے کسی بڑے سے بڑے جابر حکمراں کی پرواہ نہ کی ہو۔ ''طاب حیا'' کی اس سے زیادہ روشن، واضح، بے داغ تصویر اس عہد میں نمایاں دیکھی گئی ہے؟

فرمودۂ صدیقی کا دوسرا جملہ ''طاب میتا'' اور دعائے ماثورہ ''اللھم بارك فی الموت و مابعدالموت'' کی قبولیت بھی دنیا نے دیکھ لی۔ رمضان المبارک کا مہینہ، فالج زدہ اور کمزور جسم کے ساتھ تمام روزے پورے کیئے، ایک وقت کی فرض نماز کیا سنت و مستحب بھی فوت نہیں ہوئی، تلاوت و اوراد میں کوئی لمحہ بھر کا فرق نہیں آیا، شدید علالت میں بھی جس کی جماعت نہ چھوٹی ہو، جمعہ کا دن اور جمعہ کے تمام آداب مسنونہ، حجامت، غسل و وضوء سے آراستہ، معمول کے مطابق مسجد جانے کے لئے تیار، تلاوت کے دوران جب سورہ یٰسین کی گیارہویں آیت ''فبشرہ بمغفرۃ و اجر کریم'' پر آخری سانس لی ہو، ''طاب میتا'' کی اس سے اچھی تفسیر کس نے دیکھی اور پڑھی ہے۔

حرم بیت اللہ اور حرم نبوی شریف کے مئذنہ (اذان دینے کی جگہ) سے یہ آوازیں بلند ہوتی ہیں، الصلوٰۃ علی المیت الغائب، علی سماحۃ السید ابی الحسن علی الحسنی الندوی۔ اس نماز میں خادم الحرمین الشریفین اوران کے وزراء و حکام شریک تھے، تو دوسری طرف اللہ کے وہ اشعث و اغبر (پراگندہ حال پراگندہ بال) بندے بھی تھے جو ہزاروں میل کی مسافتیں طے کرکے حرمین میں ستائیسویں شب گذارنے آئے تھے۔

حدیث شریف میں آیا ہے کہ ایک مرتبہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کسی جنازے کی نماز پڑھا رہے تھے، صلاۃ جنازہ کی دعاء کے الفاظ سن کر صف بستہ نمازیوں میں ایک صحابی نے کہا" لیتنی کنت المیت" کاش میں ہی میت ہوتا اور میری نماز جنازہ ہوتی۔ امت اسلامیہ میں آج بھی ایسے ہزاروں نفوس ہیں جن کے دل میں یہ بات آئی ہوگی جب ایک ہندی المولود قصباتی مسلمان کے لئے مسجد حرم میں بیس لاکھ اور مسجد نبوی میں ۸ لاکھ مسلمان زائر جنازہ غائبانہ پڑھ رہے تھے۔

اس غم کی کہانی میں یہ شادمانی تابناک روشنی ہے!!

لیکن یہ تو محتاط ترین الفاظ میں ندوہ کی طرف سے حادثہ کی اطلاع تھی، عالم اسلام میں حضرت مولانا کی جدائی کس طرح محسوس کی گئی وہ ایک مہینہ کے گذرنے کے بعد مختصراً اس عاجز نے ان سطور میں لکھا تھا۔

مدارس اسلامیہ میں ہندوستان، پاکستان، بنگلہ دیش میں تعزیتی جلسوں اور قرآن خوانیوں کی فہرست تیار نہیں کی جاسکی کیونکہ وہ روزنامہ اخبارات میں آتی رہیں اور اخبارات منتشر ہوتے رہے، خاص اجتماعات اور سیمیناروں کا سلسلہ بھی اب جاکر کم تو ہوا ہے لیکن جاری ہے۔ آخری سیمینار جس میں راقم نے شرکت کی وہ دہلی

یونیورسٹی کے شعبہ عربی کی طرف سے تھا جس میں یونیورسٹی کے پرووائس چانسلر کے علاوہ علی گڑھ یونیورسٹی کے سابق وائس چانسلر جناب سید حامد اور سعودی عرب کے سفیر جناب عبدالرحمٰن ناصر العوہلی، مولانا عبدالکریم پاریکھ اور ندوۃ العلماء کے ناظم و اساتذہ شریک تھے، یہ دوروزہ سیمینار مولانا کی تصنیفات پر آخر مارچ میں منعقد ہوا اس سیمینار میں جو مقالات پڑھے یا پیش کیے گئے ان کا مجموعہ عنقریب مطبوعہ شکل میں اہل علم کی نظر سے گذرے گا۔علی گڈھ یونیورسٹی کے دوشعبوں نے الگ الگ سیمینار کیے، کراچی یونیورسٹی پاکستان نے ایک بڑا تعزیتی جلسہ منعقد کیا جس کو ہمارے عزیز دوست ڈاکٹر ظفر حسنین زیدی نے مؤثر انداز میں یونیورسٹی کی طرف سے بطور تعزیت خطاب کیا، ظفر حسنین وہاں کے وائس چانسلر اور بڑے ہونہار اور تسلیم شدہ سائنس داں تھے، حال ہی میں اچانک طور پر انتقال کر گئے، دوسرے مقامات پر جو جلسے اور اجتماعات ہوئے اور جن پرچوں نے اپنے خاص نمبر نکالے ان کی مختصر فہرست مولوی شاہد بارہ بنکوی نے تعمیر حیات میں شائع کی تھی جس کو ہم یہاں نقل کر رہے ہیں۔

سب سے بڑی وراثت

حضرت مخدوم و مربی مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندوی۔اللّٰھم قدس روحہ و نور قبرہ کی وفات کو مہینہ سے زائد دن گذر چکے ہیں، اس واقعہ کا اثر دنیا پر کیا پڑا اس کو بیان کرنے کے لئے مبالغہ بیانی کی حاجت نہیں جو اطلاعات دنیا بھر کے اخبارات سے، معاصرین کے پیغامات سے، رسائل و مجلّات کے اداریوں اور مقالات سے حاصل ہوئی ہیں، ان کو یکجا اگر کر دیا جائے تو کئی ضخیم جلدیں تیار ہو جائیں گی اور جبکہ یہ سلسلہ جاری ہے، اور آپ کی زندگی و تالیفات پر سیمیناروں اور یادگاری جلسوں کا سلسلہ بھی قائم ہے۔راقم کو متعدد حضرات نے بتایا کہ شب

۲۷ر رمضان کو حرمین میں جو جنازہ کی نماز غائبانہ ہوئی اس میں شرکاء کی تعداد جو میں نے لکھی تھی وہ صحیح نہیں تھی، حرم مکی اپنی تمام وسعتوں کے ساتھ بھرا ہوا تھا، تہہ خانوں اور چھتوں پر بھی کہیں بھی ایک مصلی کی جگہ خالی نہیں تھی۔ حرم بیت اللہ کے جو حصے کھلے ہوئے ہیں اس کے آگے جو محلے مثلاً مسفلہ، مدعیٰ، فندوق جیاد، اور ادھر حارۃ الباب اور شارع منصور کے پل تک لوگ جمع تھے۔ یہی حال مدینہ منورہ میں تھا، وہاں تمام وسعتیں جن کا اندازہ حجاج وزائرین کو ہوگا اور جو ۱۲ر یا ۱۴ر لاکھ سے کم کی گنجائش نہیں رکھتا سب پُر تھے۔ اس کے علاوہ مکہ مکرمہ کی اکثر بیشتر بڑی بڑی مسجدوں میں حضرت کی تدفین سے پہلے جمعہ کی نماز کے بعد نماز جنازہ ہو چکی تھی۔ میں نے عصر کے وقت ڈاکٹر شاہ رئیس العابدین صاحب کو حادثہ کی اطلاع دی تو انھوں نے بتایا کہ شارع منصور کی سب سے بڑی مسجد میں وہ حضرت کی نماز جنازہ غائبانہ پڑھ کر آئے ہیں۔ ڈاکٹر محسن عثمانی ندوی نے بتایا کہ دمشق کی جامع مسجد میں انھوں نے نماز جنازہ غائبانہ ادا کی جس کا اعلان وہاں کے مفتی اعظم علامہ احمد کفتارو نے کیا تھا۔ الاھرام (قاہرہ) کی رپورٹ کے مطابق جامعہ ازہر میں نماز جنازہ غائبانہ ادا کی گئی۔ استنبول اور بغداد، کویت، دبئی کی اطلاعات بھی اسی طرح کی ملتی رہیں۔ اندازہ یہ ہے کہ کم از کم ایک کروڑ مسلمانوں نے غائبانہ نماز جنازہ پڑھی اور رفع درجات کی دعائیں کیں۔ خود رائے بریلی میں جو نماز جنازہ، نماز تراویح کے بعد ادا کی گئی اس کے متعلق پولیس کی اطلاعات کی روشنی میں ڈیڑھ سے دو لاکھ افراد کے شرکت کی اطلاع ہے، یہ سب اللہ تبارک تعالیٰ کے یہاں مقبولیت کی علامتیں ہیں جو ہم عاجزوں اور اللہ کے ناکارہ بندوں کے لئے زخموں کا مرہم اور اللہ کی رحمت پر یقین کے اسباب بڑھانے کا ذریعہ ہیں۔ اور اس بات کی علامت ہے کہ اللہ تعالیٰ سے اگر کسی کا تعلق ہے تو وہ خالی نہیں جاتا، اس کو کسی فرضی اور موہوم بات کا سہارا لینے

کی ضرورت نہیں پڑتی ہے۔

اللہ کی رحمت بے پایاں کا ایک مظہر یہ بھی ہے کہ آج چالیس، پینتالیس دن گذرنے کے بعد بھی ایسا محسوس ہوتا ہے کہ حضرت مولانا جیسے اپنے کمرہ میں جلوہ افروز ہوں اور اب نکل کر آنے والے ہیں۔ بقول جگر مرادآبادی مرحوم کے۔

وہ کب کے آئے بھی اور گئے بھی، نظر میں اب تک سما رہے ہیں
یہ چل رہے ہیں، وہ پھر رہے ہیں، یہ آرہے ہیں، وہ جا رہے ہیں

حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی رحمۃ اللہ علیہ کی وفات جمعہ کے روز ۲۲ر رمضان ۱۴۲۱ھ اور عیسوی بیسویں صدی کے آخری دن ۳۱ر دسمبر ۱۹۹۹ء کو ہوئی تقریباً دولاکھ افراد نے سخت سردی اور کہر میں لمبی مسافتیں طے کر کے جنازے میں شرکت کی مکہ مکرمہ اور مدینہ منورہ، دبئی، شارجہ، عمان کی مسجدوں میں تدفین سے پہلے ہی نماز جنازہ غائبانہ پڑھی گئی جس میں سرکاری طور پر خادم الحرمین الشریفین کے حکم سے حرمین شریفین میں شب قدر کی نماز جنازہ غائبانہ پڑھی گئی۔ رباط، الجزائر، موری تانیا، لیبیا، اور دنیا کے دوسرے کنارے پر سنگاپور، کوالالمپور، (ملیزیا) قدح (ملیزیا) جاکرتا (انڈونیشیا) کے علاوہ آسٹریلیا کے متعدد مقامات پر جلسہ ہائے تعزیت منعقد ہوئے۔ ان کی فہرست تیار کرنا مشکل ہے۔ البتہ جو خاص اطلاعات اور اخبارات کے ذریعہ جن کا علم ہوا۔ ان کا ذکر ان سطور میں کیا جارہا ہے۔

لکھنؤ میں ہونے والے متعدد اہم اجلاس

● ادارہ دار المبلغین لکھنؤ کے زیر اہتمام ۹ر فروری ۲۰۰۰ء کو مولانا عبدالشکور ہال میں مولانا علی میاں کی یاد میں ''پیغام رشد وہدایت'' کے عنوان سے ایک بڑا جلسہ ہوا۔ اس جلسہ میں مولانا عبداللہ عباس ندوی، مولانا سید محمد رابع حسنی ندوی، مولانا

عبدالعلیم فاروقی، ڈاکٹر مسعود الحسن عثمانی وغیرہ نے بڑے جذباتی انداز میں مولانا کی سیرت کے علمی، دعوتی اور اصلاحی پہلوؤں پر تفصیل سے روشنی ڈالی، اور عرب وعجم کے حکمرانوں، سلاطین وامراء سے مولانا کے بے غرض زاہدانہ تعلقات کا تذکرہ کیا۔

● شہر لکھنؤ کی جانب سے انجمن محمدیہ ویلفیر سوسائٹی نظیر آباد لکھنؤ کے زیر اہتمام گنگا پرشاد میموریل ہال امین آباد میں ایک اہم یادگاری جلسہ مولانا کی یاد میں منعقد ہوا، جس میں مولانا سید محمد رابع حسنی ندوی، مولانا سعید الرحمٰن اعظمی ندوی، اور ڈاکٹر کلب صادق وغیرہ نے حضرت مولانا کو ان کی ہمہ جہت اور عالمگیر شخصیت اور ان کے داعیانہ کردار کی روشنی میں خراج عقیدت پیش کیا۔

● مولانا علی میاں یادگاری کمیٹی کے زیر اہتمام قصبہ بجنور لکھنؤ میں مولانا کی یاد میں ایک جلسہ ''امن وآشتی'' کے عنوان سے مولانا سعید الرحمٰن اعظمی ندوی کی صدارت میں منعقد ہوا۔ جس میں گورنر اتر پردیش جناب سورج بھان نے کہا کہ مولانا علی میاں ایک نیک انسان اور سچے دیش بھگت تھے اس جلسہ میں ڈاکٹر کلب صادق اور مولانا سعید الرحمٰن اعظمی ندوی نے مولانا کی امتیازی خصوصیات پر روشنی ڈالی۔

● حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی کی یاد اور ان کی تحریک ''پیام انسانیت'' کے سلسلے میں کرسچن کالج کے گراؤنڈ گولہ گنج لکھنؤ میں ایک عظیم الشان اجلاس ہوا۔ جس میں مختلف مکاتبِ فکر کے علماء ودانشوروں نے خطاب کرتے ہوئے کہا کہ مولانا علی میاں ندوی سے حقیقی محبت کا تقاضا یہ ہے کہ ان کے پیام ''پیام انسانیت'' کو نہ صرف عام کیا جائے، بلکہ اسے عملی جامہ پہنایا جائے، اور ان کی زندگی کو نمونہ اور مشعلِ راہ بنایا جائے، اس جلسہ میں مولانا سید محمد رابع حسنی ندوی، مولانا سعید الرحمٰن اعظمی ندوی، مولانا احمد میاں فرنگی محلی، مولانا سلمان حسینی ندوی، ڈاکٹر کلب صادق، مولانا عبدالعلی فاروقی، مولانا جہانگیر عالم قاسمی، شنکراچاریہ، سوامی نند وغیرہ نے شرکت کی۔

● جمعیت شباب الاسلام کے زیر اہتمام جامعہ سید احمد شہید احمد آباد کٹولی لکھنؤ میں ۲۸/۲۹/۳۰/ مارچ ۲۰۰۰ء کو "حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی اپنی دعوت وفکر کے آئینہ میں" کے عنوان پر ایک سہ روزہ سیمینار منعقد ہوا، جس میں مسجد اقصیٰ کے امام شیخ محمد محمود الصیام نے مہمان خصوصی کی حیثیت سے شرکت کی، اور حضرت مولاناؒ کی شخصیت پر ایک قصیدہ سُنایا اوران کی زندگی کے مختلف گوشوں پر روشنی ڈالی، سیمینار میں مولانا عبداللہ عباس ندوی، مولانا سید محمد رابع حسنی ندوی، مولانا تقی الدین ندوی، مولانا محمد اجتباء ندوی، مولانا سید نظام الدین (پٹنہ) مولانا سعید الرحمٰن اعظمی ندوی، مولانا شمس الحق ندوی، مولانا برہان الدین سنبھلی، مولانا محمد سالم قاسمی، مولانا محمد باقر حسین بستوی، مولانا عبدالکریم پاریکھ، جناب عشرت علی صدیقی، مولانا سید سلمان الحسینی ندوی، مولانا ابوسبحان روح القدس ندوی، مولانا نذر الحفیظ ندوی، مولانا محمد خالد ندوی، ڈاکٹر مسعود الحسن عثمانی، مولانا نثار الہدیٰ قاسمی، قاری محمد قاسم (مدراس) ڈاکٹر رضی الاسلام ندوی (علی گڑھ) شیخ محمد عبداللہ، مولانا شمس تبریز خاں صاحب، ڈاکٹر طفیل احمد مدنی، مولانا عبدالعلیم قاسمی بھٹکلی وغیرہ نے مولانا کی علمی ودینی اورادبی خدمات پر تقریریں کیں، اور مقالات پڑھے۔ مقررین نے کہا کہ حضرت مولانا ایک بےلوث انسان تھے، ان کے اندر انسانیت کا درد تھا، وہ ملک وطن کے سلسلے میں بہت فکر مند رہتے تھے۔ انہوں نے کہا کہ ضرورت اس بات کی ہے کہ حضرت مولانا کے کام اور پیغام کو عام کیا جائے اوراپنے اندر جذبہ عمل پیدا کیا جائے، یہی مولانا کا پیغام تھا، اور یہی ان سے سچی عقیدت ومحبت کی نشانی ہے۔

● مفکر اسلام حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی کی یاد میں ہونے والے سیمینار میں ایک سیمینار "مولانا علی میاں اور حب الوطنی" کے عنوان سے ۹/ اگست ۲۰۰۰ء کو مولانا محمد علی جوہر فاؤنڈیشن لکھنؤ کے زیر اہتمام گاندھی بھون میں

مولانا سید محمد رابع حسنی ندوی کی صدارت میں ہوا جس کا افتتاح کرتے ہوئے مولانا عبداللہ عباس ندوی نے کہا کہ مولانا سید ابوالحسن علی ندوی ایک پکے مسلمان ہونے کے ساتھ ساتھ وہ ایک سچے محب وطن بھی تھے، اور تحریک پیام انسانیت کے پلیٹ فارم سے ان کی ملکی وقومی خدمات اس کی زندہ مثال ہیں، مولانا سید محمد رابع حسنی ندوی نے اپنی صدارتی تقریر کرتے ہوئے کہا کہ آزادی کے بعد پوری دنیا میں خصوصاً عالم اسلام میں ہندوستان کا تعارف ایک معتبر اور پروقار ملک کی حیثیت سے حضرت مولاناؒ نے کرایا انہوں نے کہا کہ مولانا جہاں چودہ سوسالہ تاریخ کے امین تھے وہیں جذبۂ حب الوطنی میں اپنی مثال آپ تھے، اس سیمینار سے مولانا عبدالکریم پاریکھ، مولانا سید سلمان حسینی ندوی، پروفیسر محمود الرحمٰن (سابق وائس چانسلر علی گڑھ مسلم یونیورسٹی) پی ایم گولا (علی گڑھ) عشرت علی صدیقی، چودھری شرف الدین داؤ جی گپتا، ڈاکٹر ملک زادہ منظور احمد، اور وصی احمد صدیقی وغیرہ نے بھی خطاب کیا۔

علی گڑھ کے اہم سیمینار

شعبہ عربی مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کی جانب سے ۲۳/۲۴ رفروری ۲۰۰۱ء کو ''مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ ہندوستان میں علوم عربیہ واسلامیہ کا ارتقاء'' کے موضوع پر دوروزہ علمی مذاکرہ کا اہتمام کیا گیا، جس میں ہندوستان کے اہم اداروں، جامعات اور مدارس کے معروف علماء وادباء اور اساتذہ نے مولانا ندوی کی علمی وادبی خدمات پر مقالے پیش کئے، اور بحث ومباحثہ میں حصہ لیا، اس ادبی وعلمی مذاکرہ میں مولانا سعید الرحمٰن اعظمی ندوی مہتمم دارالعلوم ندوۃ العلماء، ڈاکٹر محمود الرحمٰن صاحب وائس چانسلر علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، پروفیسر کفیل احمد، ڈاکٹر محمد صلاح الدین

عمری، پروفیسر محمد راشد ندوی اور پروفیسر محمد سالم قدوائی وغیرہ نے حضرت مولانا کی علمی ودینی خدمات پر اپنے تحقیقی مقالے پیش کیے۔

● ۲۵/مارچ ۲۰۰۰ء کو مسلم یونیورسٹی علی گڑھ میں ایک دوسرا دوروزہ اہم سیمینار ناظم شعبۂ دینیات مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کے زیر اہتمام حضرت مولانا کی شخصیت پر ہوا، جس میں مولانا نظام الدین صاحب جنرل سکریٹری آل انڈیا مسلم پرسنل لاء بورڈ، مولانا سعود عالم قاسمی ناظم شعبۂ دینیات اور مفتی ظفیر الدین صاحب دار العلوم دیو بند، ڈاکٹر اشتیاق حسین قریشی لکھنؤ، مولانا سید سلمان الحسینی ندوی، مولانا عتیق احمد بستوی، مولانا ابوسحبان روح القدس ندوی، ندوۃ العلماء لکھنؤ کے علاوہ ملک کے اہم علماء ودانشوروں نے شرکت کی اور مقالے پڑھے ناظم ندوۃ العلماء مولانا سید محمد رابع حسنی ندوی خود تو شرکت نہ فرما سکے۔ البتہ ان کا مقالہ بعنوان ''مولانا علی میاں اور ندوۃ العلماء'' ان کے عزیز سید محمود حسنی ندوی نے اس سیمینار میں پیش کیا، وائس چانسلر ڈاکٹر محمود الرحمٰن صاحب نے خصوصی طور پر دلچسپی لی اور شرکت بھی کی۔ اور ''باغ علی میاں'' کے نام سے ایک چمن کا افتتاح امام مسجد اقصیٰ شیخ محمد محمود الصیام سے کرایا۔

دہلی

پیام انسانیت کے واسطے سے ایک سیمینار دہلی میں عزت مآب جناب کرشن کانت نائب صدر جمہوریہ ہند کی صدارت میں منعقد کیا گیا، جس میں محترم نائب صدر صاحب کے علاوہ سابق وزیر اعظم جناب وی پی سنگھ، جناب اٹل بہاری باجپئی وزیر اعظم ہند کے دہلی سے باہر ضروری سفر کی وجہ سے ان کی نمائندگی مرکزی وزیر جناب راج ناتھ سنگھ نے کی ناظم ندوۃ العلماء مولانا سید محمد رابع حسنی ندوی، معتمد

تعلیمات مولانا عبداللہ عباس ندوی ،مولانا عبدالکریم پاریکھ صاحب وغیرہ نے تقریریں کیں، جلسہ میں دہلی کی سربرآوردہ شخصیتوں کے علاوہ دہلی یونیورسٹی، جواہرلعل نہرویونیورسٹی ، جامعہ ملیہ اسلامیہ اور جامعہ ہمدرد کے اساتذہ وطلباء اور عوام وخواص کاایک بڑا مجمع شریک ہوا۔

● دہلی شاخ کے عالمی رابطہ ادب اسلامی نے حضرت مولانا علی میاںؒ کی یاد میں جلسہ منعقد کیااس میں صدر رابطہ شاخ دہلی پروفیسر محمد اجتباء ندوی نائب صدر پروفیسر سید ضیاء الحسن ندوی، پروفیسر شفیق احمد خاں ندوی، وغیرہ نے مولانارحمۃ اللہ علیہ کوخراج عقیدت پیش کیا، پروفیسر شیث اسماعیل اور جناب وکیل احمد نے اپنی تعزیتی نظمیں پڑھیں۔

● ایک جلسہ جامعہ ملیہ اسلامیہ کے کانفرنس ہال میں ڈاکٹر ذاکر حسین اسلامک اسٹڈیز جامعہ ملیہ اسلامیہ کی جانب سے منعقد کیا گیا جس میں پروفیسر اختر الواسع ،خواجہ حسن ثانی نظامی پروفیسر نثار احمد فاروقی ،پروفیسر ظفر احمد نظامی اور پروفیسر سید ضیاء الحسن ندوی نے مقالات پڑھے، اس سیمینار کے اہم شرکاء میں پروفیسر شمیم احمد حنفی، پروفیسر علی نقی جعفری، پروفیسر محمد اجتباء ندوی، پروفیسر بدرالدین الحافظ اور پروفیسر شفیق احمد خاں وغیرہ تھے، جلسہ میں حضرت مولانا کے لئے دعائے مغفرت بھی کی گئی۔

ممبئی

● انجمن اسلام ممبئی کے زیر اہتمام حضرت مولانا علی میاں ندویؒ کی حیات وخدمات پرایک سیمینار ۲۸/مارچ ۲۰۰۰ء کوصابوصدیق انجیرنگ کالج کے لطیفی ہال میں منعقد ہوا، اس سیمینار میں مولانا محمد سالم قاسمی ،مولانا ضیاء الدین

اصلاحی ،مولانا تقی الدین ندوی مظاہری ،ڈاکٹر محمد اسحاق جمخانہ والا ،مولانا ابوظفر حسان ندوی ،جناب شمیم طارق ،مولانا عبدالرزاق ندوی وغیرہ نے شرکت کی مقررین نے اپنی تقریروں اور مقالوں میں جذباتی انداز میں حضرت مولانا کو خراج عقیدت پیش کیا انہوں نے کہا کہ مولانا علی میاں ندوی ایک غیر متنازع شخصیت تھے جن کو ہر مذہب و مسلک والے قدر کی نگاہ سے دیکھتے تھے۔

اورنگ آباد

● جامعہ کاشف العلوم اورنگ آباد میں حضرت مولانا علی میاں ندویؒ کی حیات وخدمات پر ایک اہم سیمینار ۲۹/اپریل ۲۰۰۰ء کو ہوا جس میں مولانا سید محمد رابع حسنی ندوی، مولانا واضح رشید ندوی، مولانا عبدالکریم پاریکھ، پروفیسر ضیاء الحسن ندوی، مولانا نذر الحفیظ ندوی، پروفیسر محمد اجتباء ندوی، مولانا محمد سالم قاسمی کے علاوہ دیگر علماء وادباء نے حضرت مولاناؒ کی زندگی کے مختلف گوشوں پر روشنی ڈالی، اور مقالے پڑھے، اور مقالات کے عناوین اور شرکاء کے اعتبار سے یہ سیمینار بڑا کامیاب رہا۔

رائے بریلی

● وصی نقوی نیشنل انٹر کالج رائے بریلی میں مولانا کی یاد میں ہونے والا ''پیام انسانیت'' کے جلسہ سے مولانا سید محمد رابع حسنی ندوی ،مولانا عبدالکریم پاریکھ، مولانا کلب صادق، مولانا عبداللہ مغیثی ،مولانا محمد حمزہ حسنی ندوی، اور سابق وزیر اعظم وی پی سنگھ وغیرہ نے خطاب کرتے ہوئے کہا کہ مولانا علی میاں نے ہمیں پیام انسانیت کی جو راہ دکھائی ہے اس کو اختیار کر کے زندگی کا سفر طے کریں، مقررین نے کہا کہ مولانا نے اپنے کردار وعمل سے انسانیت کو زندہ کیا، اس لئے ہمیں بھی صالح پاکیزہ اور سچا انسان بننا چاہیے۔

کلکتہ

● مدرسہ باب العلوم کلکتہ کی جانب سے حضرت مولانا علی میاں ندوی کے نام سے ایک خصوصی سمپوزیم کلکتہ مسلم انسٹی ٹیوٹ ہال میں منعقد ہوا، جس میں مولانا سعید الرحمٰن اعظمی ندوی اور مولانا ابو محفوظ الکریم معصومی نے کہا کہ مولانا کی ہمہ جہت شخصیت اپنے اندر ایک دعوت اور ایک پیغام رکھتی ہے، آج اس تاریک دور میں مولانا کی تعلیمات کو عام کرنے کی سخت ضرورت ہے، سمپوزیم سے دوسرے اہم علماء ودانشوروں نے بھی خطاب کیا۔

سری نگر کشمیر

● انجمن نصرۃ الاسلام سرینگر کشمیر کے زیر اہتمام میر واعظ مولوی محمد عمر فاروق کی سربراہی میں مولانا سید ابوالحسن علی ندوی کی حیات وخدمات کے موضوع پر ایک اہم سیمینار ہوا جس میں مولانا خالد ندوی غازی پوری، مولانا انظر شاہ کشمیری اور مولوی محمد عمر فاروق نے حضرت مولانا کی علمی، عملی، فکری، روحانی اور دعوتی زندگی پر بھرپور روشنی ڈالی۔

نیپال

● جامعہ نور الاسلام جلپاپور نیپال کے زیر اہتمام ایک جلسہ ہوا جس میں حضرت مولاناؒ کو جذباتی انداز میں یاد کیا گیا، اسی طرح مدرسہ نور العلوم نول پراسی میں بھی ایک بڑا جلسہ ہوا۔

دہرہ دون

● شہر دہرہ دون میں انجمن شباب الاسلامی کے زیر اہتمام ایک بڑا جلسہ ہوا جس میں مقررین نے کہا کہ حضرت مولانا علیہ الرحمہ کی ذات والا صفات ایک

''شجرۂ طیبہ'' تھی، جس کی جڑیں ہندوستان میں اور شاخیں سارے جہاں میں پھیلی ہوئی ہیں، اس کے ثمرات انشاءاللہ رہتی دنیا تک سرسبز وشاداب، زندہ اور زندگی بخش رہیں گے۔

مقررین نے کہا کہ حضرت مولانا نے اپنے افکار وخیالات، داعیانہ کردار، حکمت وبصیرت اور مومنانہ فراست کے جو گرانقدر نقوش چھوڑے ہیں وہ عوام وخواص سب کے لئے مفید ہیں، اس لئے لوگوں کو ان سے فائدہ اٹھانا چاہیے۔

جلسہ سے انجمن کے سکریٹری جناب رسال الدین ندوی حقانی اور جناب عبدالصمد قاسمی نے بھی خطاب کیا۔

دبئ

● ابنائے ندوہ امارات کے زیر اہتمام دبئ میں حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ کے حیات وخدمات کے موضوع پر جناب سید خلیل الرحمٰن کی صدارت میں ۸/جون ۲۰۰۰ء کو ایک سیمینار ہوا جس میں دبئ وشارقہ میں مقیم ابنائے ندوہ کے علاوہ شہر دبئ کے چیدہ وچنیدہ علماء، تجار، دانشور اور علم دین سے شغف وتعلق رکھنے والے لوگوں کی ایک بڑی تعداد نے شرکت کی، اس سیمینار میں جن ندوی فضلاء نے حضرت مولانا کی حیات وخدمات کے مختلف گوشوں پر مشتمل مقالے پڑھے وہ یہ ہیں، جناب فخر علی ندوی، جناب سید محمد ظفر ندوی، جناب نعمت اللہ ندوی، جناب عبیداللہ صدیقی ندوی، حبیب اللہ ندوی، جناب عبدالمتین منیری بھٹکلی اور محمد نعمان ندوی بھٹکلی۔

جلسہ کی صدارت مولانا احمد سعید ندوی بھوپالی نے کی۔ اور مولانا محمد خالد ندوی کانپوری نے تلاوت کلام پاک سے جلسہ کا افتتاح کیا پھر جمعیت ابنائے ندوہ کے سکریٹری جناب نظام الدین صاحب ندوی نے حاضرین کا استقبال کرتے

ہوئے سیمینار کے اغراض ومقاصد محض شخصیت پرستی یا ایک رسم کی ادائیگی نہیں بلکہ مادرِ علمی ندوۃ العلماء کی فکر اور حضرت مولانا کی تعلیمات وارشادات کو زیادہ سے زیادہ لوگوں تک پہونچانا ہے۔

● دبئی ہی میں حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ کی یاد میں ''انڈین اصلاحی سینٹر'' اور ''مرکز اہلسنۃ والجماعۃ'' کی جانب سے اہم جلسے ہوئے جن میں وہاں کے اہم علماء وادباء اور دانشوروں نے شرکت کی، اور مقررین نے حضرت مولانا کی عالمی پیمانہ علمی، دینی اور دعوتی خدمات پر تفصیل سے روشنی ڈالی، اس کے علاوہ دبئی کی مختلف اسلامی انجمنوں، تنظیموں اور اداروں کی طرف سے درجنوں جلسے ہوئے اور ان میں مولانا کے اوصاف وکمالات بیان کئے گئے۔

ملیشیا

● ملیشیا میں حضرت مولانا کی وفات کی اطلاع ملتے ہی کوالالمپور، ترنگانو، قدح، کلنتن، جزیرہ ملکاس میں تعزیتی جلسے اور غائبانہ نماز جنازہ کا اہتمام کیا گیا۔ سب سے بڑا تعزیتی جلسہ ۲۷؍رمضان المبارک ۱۴۲۱ھ کو معہد التربیۃ الاسلامیہ قدح میں ہوا، جہاں پورے ملیشیا سے ندوی فضلاء شریک ہوئے ان کے علاوہ ملیشیا کے ممتاز علماء اور داعیوں نے اس جلسہ میں حضرت مولانا کی وفات پر اپنے رنج وغم کا اظہار کیا۔

رمضان المبارک کے بعد کوالالمپور میں دو بڑے سیمینار منعقد ہوئے جن میں حضرت مولانا کی زندگی اور علمی ودعوتی کارناموں پر مقالات پیش کئے گئے۔

پہلا سیمینار کوالالمپور میں انٹرنیشنل اسلامک یونیورسٹی کے زیر اہتمام ہائر اسٹڈی کے اساتذہ اور طلبہ کی طرف سے منعقد کیا گیا جلسہ کی صدارت وائس چانسلر

ڈاکٹر محمد کمال حسن نے کی۔انھوں نے مولانا کی شخصیت اوران کی جامعیت اوران کے علمی ودعوتی کارناموں کا جائزہ لیا، اوراس طرح کے علمی سیمینار کے انعقاد کووقت کی ضرورت قراردیا، وائس چانسلر کے علاوہ شعبۂ تاریخ کے صدرڈاکٹر ارشاد السلام نے مولانا کی زندگی اور علمی وتربیتی کارناموں پر مقالہ پیش کیا، دوسرا مقالہ ڈاکٹر منجد بہجت پروفیسر شعبہ عربی ادب نے مولانا کی تنقیدی اصول ومعیار کے عنوان سے پیش کیا، ڈاکٹر منجد نے چند ماہ قبل ایم اے کے ایک مقالہ کی نگرانی بھی کی تھی، جومولانا سیدابوالحسن علی ندوی کی عربی زبان وادب کی خدمات سے متعلق تھا، تیسرا مقالہ کلیۃ اصول الدین کے پروفیسرڈاکٹر محمد بن نصر نے پیش کیا، جس کا موضوع تھا" معاشرہ کی اصلاح کے بارے میں مولانا ندوی کا طریقہ کار" ڈاکٹر محمد بن نصر یونیورسٹی سے نکلنے والے رسالہ کے چیف ایڈیٹر بھی ہیں، انھوں نے مولانا کی تعلیمی اورتربیتی آراء اور مجددین ومصلحین کی اصلاحی جدوجہد کے بارے میں مولانا کے اصول اورطریقہ کار کا جائزہ ان کی تحریروں کی روشنی میں لیا، اوربتایا کہ شیخ ندوی نے موجودہ دور کے نوجوانوں کی ذہن سازی کا جوطریقہ اختیار کیاوہ نبوی اسلوب سے ہم آہنگ ہے، چوتھا مقالہ شعبۂ قرآن وسنت کے استاذ لیث سعود قیسی نے پیش کیا جس کا عنوان تھا شیخ ندوی اوران کی کتاب "السیرۃ النبویۃ" صاحب مقالہ نے تفصیل کے ساتھ اپنے مقالہ میں بتایا کہ مولانا ندوی نے سیرت کے موضوع پر جوکتاب لکھی ہے وہ اپنے منہج اور اسلوب کے اعتبار سے اچھوتی اورالبیلی کتاب ہے، یہ صرف آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت ہی نہیں بلکہ اسلام کی جامع اورزندہ تصویر ہے، اس میں مغرب کے شک آفریں تہذیب سے متاثر نئے طبقہ کی تسکین کا پورا سامان موجود ہے، یہ کتاب غیر مسلموں کوبلا تحفظ کے دی جاسکتی ہے۔

سیمینار کا آخری مقالہ شعبہ تاریخ واسلامی تہذیب کے پروفیسرڈاکٹر محسن

محمد صالح کا تھا، جنھوں نے ”رویة الندوی للتاریخ الاسلامی “کے عنوان سے محاضرہ پیش کیا۔اس مقالہ میں مولانا کی ”متنوع ثقافت“ چار زبانوں پر قدرت اور ان کے علمی وتاریخی ذخیروں تک رسائی کا تذکرہ کرکے یہ بتایا کہ مولانا نے روایتی تاریخی کتابوں پر بھروسہ نہ کرکے نئے سرچشمے تک رسائی حاصل کی، انھوں نے تاریخ نویسی کے لگے بندھے طریقہ پر تنقید کی اور نئے انداز سے تاریخ نویسی کا بلند معیار پیش کیا،اس میں جامعیت اور توازن ہے۔

● دوسرا سیمینار ملیشیا کے نوجوانوں کی مشہور تنظیم حرکة الشباب الاسلامی (ABIM) کے زیر اہتمام انٹرنیشنل یونیورسٹی کے کیمپس میں ملک فیصل ہال میں منعقد کیا گیا،اس میں شرکت کے لئے دارالعلوم ندوۃ العلماء کے استاذ مولانا نذر الحفیظ ندوی کو دعوت دی گئی تھی۔مولانا نے اپنی تقریر میں حضرت مولانا کی حیات وخدمات پر تفصیل سے روشنی ڈالی،اس سیمینار میں احمد فہمی زمزم ندوی اور بدرالدین ندوی نے مولانا کی حیات وخدمات اور تصنیفی خصوصیات پر مقالے پیش کئے۔ ان کے علاوہ ملیشیا کے ممتاز عالم ومحقق ڈاکٹر عثمان محمدی نے مولانا کے تربیتی افکار ونظریات پر مقالہ پیش کیا۔

چوتھا مقالہ انٹرنیشنل اسلامک یونیورسٹی کے پروفیسر وپرنسپل ”کلیة اصول الدین “ڈاکٹر عبدالمجید نے پیش کیا۔جس کا عنوان تھا ”مغربی افکار پر مولانا ندوی کی تنقید“۔پانچواں مقالہ پروفیسر صدیق فاضل نے پیش کیا مقالہ کا موضوع تھا ”فکر دین کی تجدید میں مولانا ندوی کا حصہ“۔

مقالات کے علاوہ عربی اور ملیشین زبانوں میں حضرت مولانا کی تصنیفات کی نمائش بھی لگی تھی جو دلچسپی اور شوق سے لوگوں نے دیکھی اس موقع پر ندوی فاضل احمد فہمی زمزم کی ترتیب دی ہوئی کتاب کا رسم اجرا بھی ہوا۔یہ کتاب ملیشین نوجوانوں

کی تنظیم (ABIM) کی فرمائش پر حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی اور ان کی حیات وخدمات اور علمی کارنامے کے عنوان سے ملیشین زبانوں میں تیار کی گئی تھی۔ چند گھنٹوں کے اندر اس کتاب کے پانچ ہزار نسخے شائقین نے خرید لئے۔

سائنس یونیورسٹی پنیانگ کے منتخب اساتذہ اور رابطہ ادب اسلامی کے ارکان کی ایک نشست شعبۂ ادب کے دفتر میں منعقد ہوئی، مولانا نذر الحفیظ ندوی نے اس موقع پر حاضرین کی طلب وخواہش پر مولانا کے انتقال کے واقعہ کی تفصیلات بتائیں۔

انڈونیشیا

● انڈونیشیا کے شہر ہوان اور جاکرتا سے جو اطلاعات ملی ہین ان سے معلوم ہوا کہ بڑی مسجدوں سے غائبانہ نماز جنازہ کا اہتمام کیا گیا اور تعزیتی جلسے بکثرت منعقد کئے گئے۔

بنگلہ دیش

● بنگلہ دیش اور تھائی لینڈ سے ندوی فضلاء نے غائبانہ نماز جنازہ اور تعزیتی جلسوں اور سیمینار کی تفصیلی خبریں ارسال کی ہیں اس کے علاوہ اردن کی راجدھانی عمان، دمشق، استنبول، قونیہ، انقرہ، ریاض، دمام، الخبر، جدہ، رباط کاسابلانکا، الجزائر، بیروت، دبئی، شارجہ، ابوظبی میں تعزیتی جلسے منعقد کئے گئے جن میں چند کی خبریں دی جارہی ہیں۔ جنوبی افریقہ اور مشرقی افریقہ کے شہروں اور مقامات پر بھی جلسے ہوئے۔

پاکستان

● پاکستان میں کراچی، لاہور، فیصل آباد، گجرانوالہ، اسلام آباد، اکوڑہ،

خٹک ،کوئٹہ، پشاور، حیدرآباد، سندھ سے تعزیتی جلسوں اور سیمیناروں کی تفصیلی رپورٹیں موصول ہوئی ہیں۔

رابطہ ادب اسلامی کے زیر اہتمام لاہور اور اسلام آباد میں سیمینار ہوا۔

● اسلام آباد میں حضرت مولاناؒ پر ایک سیمینار کا انعقاد انٹرنیشنل اسلامک یونیورسٹی کے زیر اہتمام ہوا، جس میں صدر پاکستان جناب رفیق تارڑ نے خصوصی دلچسپی لی اور شرکت فرمائی عرب ممالک کے اہم مفکرین ،ادباء خصوصاً مصر کے فضلاء نے شرکت کی اور اپنے تأثرات پیش کئے اور مقالات پڑھے۔

مصر

● مصر میں رابطہ ادب اسلامی کے زیر اہتمام حضرت مولانا کی یاد میں ایک اہم جلسہ کا انعقاد کیا گیا جس میں رئیس جامعۃ الازہر ڈاکٹر عبدالحلیم عویس نے بھی شرکت کی اس جلسہ میں مصر کے نامور علماء وفضلا شریک ہوئے اور حضرت مولانا کی علمی، دینی، دعوتی اور اصلاحی خدمات پر تقریریں کیں۔ ڈاکٹر عبدالحلیم عویس نے کہا کہ حضرت مولاناؒ ایک صاحب بصیرت عالم دین، بلند پایہ مفکر اور ممتاز صاحب قلم، شخصیت کے حامل تھے،اس کے علاوہ مصر میں مقیم ندوی فضلاء کی جانب سے دو جلسے منعقد ہوئے، جن میں ندوی فضلاء نے اپنے محسن ومربی حضرت مولانا علی میاں کے عظیم کارناموں پر روشنی ڈالی اور اپنے جذبات واحساسات کا اظہار بڑے مؤثر اور دل گیر انداز میں کیا۔ اسی طرح مصر کے دیگر شہروں میں حضرت مولانا کی یاد میں متعدد جلسوں اور سیمیناروں کا اہتمام کیا گیا۔

جنوبی افریقہ

● جنوبی افریقہ میں شیخ الحدیث حضرت مولانا محمد زکریا رحمۃ اللہ علیہ کے

نام سے موسوم دارالعلوم زکریا میں حضرت مولانا علی میاں ندوی رحمۃ اللہ علیہ کی یاد میں ایک عمومی جلسہ حضرت مولانا سید محمد رابع حسنی ندوی کی صدارت میں ہوا، جس میں حضرت مولانا کے بارے میں دارالعلوم کے مفتی رضاء الحق صاحب کا عربی میں منظوم نذرانۂ عقیدت دارالعلوم کے ایک طالب علم نے پیش کیا جس کے ہر شعر سے عقیدت ومحبت کے جذبات کا اظہار ہوتا تھا اس کے بعد مفتی رضاء الحق صاحب نے نثر میں بھی حضرت مولانا سے اپنے والہانہ تعلق وجذبات کا اظہار ایک مقالہ میں کیا، خصوصاً حضرت سید احمد شہیدؒ کے احسانات اوران کے دینی ودعوتی کارناموں اور سرفروشانہ کوششوں کا تذکرہ نہایت والہانہ انداز سے کیا جس کا ایک سبب خود مفتی صاحب کا علاقہ پنج تار سے وطنی تعلق بھی ہے جو حضرت سید صاحب کی سرفروشانہ کوششوں کا ایک مرکز رہا ہے۔

جلسہ کے آخر میں صدارتی تقریر فرماتے ہوئے مولانا سید محمد رابع حسنی ندوی نے حضرت مولانا کی زندگی کے مختلف پہلوؤں کی طرف روشنی ڈالتے ہوئے بعض اہم واقعات کی طرف اشارہ کیا کہ حضرت مولانا نے کیسے کیسے اہم اور نازک موقع پر بات کی اور اللہ تعالیٰ کی مدد ونصرت ایسی کھل کر سامنے آئی کہ تمام سننے والے اور حاضرین مجلس حیرت میں رہ گئے۔

اس جلسہ میں دارالعلوم ندوۃ العلماء کے مؤقر استاد مولانا سید عبداللہ حسنی ندوی اور مولانا عبدالعزیز بھٹکلی ندوی نے بھی شرکت کی۔

برطانیہ

● برطانیہ کے مسلم کمیونٹی فورم کی جانب سے ڈیوس میری اسپورٹس سنٹر واقع ویسٹ پارک لندن میں ۳۰؍جولائی ۲۰۰۰ء کو حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی

کی شخصیت پر ایک عالمی سیمینار ہوا۔

لندن کے اس سیمینار میں امریکہ، یورپ، افریقہ، ہندوستان، پاکستان، دبئی لندن، کویت، انگلینڈ اور عرب ممالک کے جید علماء وفضلاء اور ادباء اور دانشوروں نے حضرت مولانا رحمۃ اللہ علیہ پر مختلف عنوانات کے تحت مقالے پیش کئے۔ اور ان کی زندگی کے مختلف گوشوں پر تفصیل سے روشنی ڈالی۔

اس سیمینار میں شریک ہونے والوں میں مولانا محمد تقی عثمانی (پاکستان) مولانا مجاہد الاسلام قاسمی، مولانا سید سلمان الحسینی ندوی، مولانا مفتی احمد خان پوری، مولانا عبداللہ کیودراوی، (ہندوستان) مولانا تقی الدین ندوی مظاہری (دبئی) مولانا عتیق الرحمٰن سنبھلی (لندن) ڈاکٹر مزمل حسین، مولانا محمد یعقوب قاسمی (امریکہ) مولانا محمد عیسیٰ منصوری (لندن) مفتی زبیر بیاب (افریقہ) ڈاکٹر مناظر احسن، ڈاکٹر ڈیوڈ براؤننگ (انگلینڈ) کے نام قابل ذکر ہیں۔

انگلینڈ

● شمالی انگلینڈ کے شہر باٹلے (BATLEY) میں حضرتؒ کی یاد میں ۲۴ر جنوری ۲۰۰۰ء کو ایک اہم جلسہ ہوا، جس میں مولانا محمد یعقوب قاسمی (ڈیوز بری) نے حضرت مولانا کے مناقب اور اوصاف پر تفصیل سے روشنی ڈالی، انہوں نے کہا کہ حضرت مولانا کو اللہ تعالیٰ نے غیر معمولی صلاحیتوں سے نوازا تھا، دین کا درد اخلاص نیت اور دین کی خاطر سب کچھ کر گزرنے کا جذبہ ان کے اندر کوٹ کوٹ کر بھرا ہوا تھا۔ جلسہ سے مولانا عتیق الرحمٰن سنبھلی نے خطاب کرتے ہوئے کہا کہ مولانا مرحوم ان شخصیتوں میں تھے کہ ان کی صحبت اور عقیدت سے جس نے فیض پایا اس نے بڑی چیز پائی۔

اسی طرح ملک و بیرونِ ملک میں سیکڑوں علمی، دینی اور ادبی اداروں تنظیموں، انجمنوں کے زیر اہتمام حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ کی ہشت پہل، عالمگیر و ہمہ گیر شخصیت پر علمی مذاکرے سیمینار، کانفرنس، سمپوزیم اور اجلاس منعقد ہوئے، جن میں حضرت مولانا کے اوصاف و کمالات، افکار و تصورات اسلوب دعوت، مختلف تحریکات، دینی و علمی اداروں سے ان کا قائدانہ تعلق، عرب و عجم پر ان کے فکر کے اثرات اور دیگر بہت سی خصوصیات پر روشنی ڈالی گئی ہے۔

اخبارات ورسائل اور خصوصی و یادگاری نمبر

● حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ کی دینی علمی، دعوتی اصلاحی، ادبی خدمات اور ان کے کارناموں کو اجاگر کرنے اور ان کے دعوتی پیغام کو عام کرنے اور ان کی تحریک پیامِ انسانیت کو مزید تقویت پہنچانے کے لئے ملک کے اندر اہم دینی اداروں اور ان کے اصلاحی رسالوں کے ذمہ داروں نے حضرت مولاناؒ کی شخصیت پر عربی اور اردو میں درجنوں خصوصی اور یادگاری نمبر نکالے جن میں حضرت مولاناؒ کی ہمہ جہت اور ہمہ گیر بلکہ عالمگیر شخصیت کو ان کے شایان شان خراج عقیدت پیش کیا گیا، کتابیں تصنیف کی گئیں اور رسالوں میں کثرت سے مضامین شائع کئے گئے۔

ریاض

● سعودی عرب سے الادب الاسلامی کا ضخیم تعزیتی شمارہ قابل ذکر ہے جس میں پچیس عرب شعراء کے قصائد ہیں جو ان کے جذبات کے نمائندگی کرتے ہیں اس کے علاوہ تقریباً تیس قصیدے اور ہیں جو خالص عرب نژاد دانشوروں کے ہیں، اردو میں کہے ہوئے قطعات اور تعزیتی قصائد کو اب تک یکجا نہیں کیا گیا ہے، مگر جن پر میری نظر پڑی ہے وہ اس قدر زیادہ ہیں کہ ایک مکمل دیوان تیار کیا جا سکتا ہے۔

ان جلسوں، سیمیناروں اور اجتماعات کے علاوہ حضرت کی زندگی پر اردو اور عربی میں متعدد کتابیں نکل چکی ہیں، پروفیسر ڈاکٹر اجتباء ندوی کی مرتبہ سوانح حیات دار القلم دمشق نے شائع کی ہے، جو جامعیت اور خوش بیانی کا مجموعہ ہے، اور ڈاکٹر پروفیسر محسن عثمانی نے یحدثونك عن ابی الحسن کے عنوان سے آپ کی سوانح پر ایک پاکیزہ مجموعہ تیار کیا ہے جو اہل علم کے لئے مرجع کا کام دے گا۔ اردو میں خاص نمبروں کے علاوہ جناب محمد حسن انصاری نے حضرت کے سوانحی نقوش کو کتابی شکل میں شائع کر دیا ہے اور ابھی یہ سلسلہ شروع ہوا ہے اور نہ جانے کب تک چلتا رہے گا۔

''رابطہ الادب الاسلامی'' جو ڈاکٹر عبد القدوس ابو صالح پروفیسر ریاض یونیورسٹی نے مرتب کیا ہے، اس میں عرب علماء اور دانشوروں کے وہ مضامین شامل ہیں جن سے حضرت مولانا کی قدر و منزلت کا اندازہ ہوتا ہے۔ عرب شعرا نے جو خراج عقیدت پیش کیا ہے ان کی تعداد پچیس ہے اور اکثر قصیدے تیس چالیس اشعار سے زیادہ ہیں۔ ان کے علاوہ جو عربی قصائد اس پرچہ میں نہیں آسکے اور دوسرے عربی رسائل و جرائد میں چھپے ان کی تعداد بھی اس سے کم نہیں۔ رابطہ الادب الاسلامی کے خاص شمارے میں ان قصائد کا عنوان ''باب ارائی'' رکھا ہے۔ اسی طرح مراکش کے شہر ''ایوجہ'' میں پروفیسر حسن الامرانی نے اپنے رسالہ ''مشکاۃ'' کا خاص نمبر بڑے آب و تاب کے ساتھ نکالا ہے جس میں الجزائر، مراکش، لیبیا، قریتانیا اور طرابلس کے دانشوروں کے مقالات اور قصائد ہیں۔

ان کے علاوہ جو خاص نمبر نکلتے رہے ان کا سلسلہ ختم نہیں ہوا ہے اور ایک سال گزرنے کے بعد بھی بعض رسائل اپنے خاص نمبر نکالنے کا اہتمام کر رہے ہیں اس لئے اس فہرست کو جو اوپر دی گئی ابھی مکمل نہیں کہا جا سکتا۔

ہم حضرت مولانا سے کسی درجہ کا بھی تعلق رکھنے والے ہوں دعا گو ہیں کہ حضرت مولانا کی زندگی کا اصلی جوہر اخلاص، فدائیت اور دین کے لئے بیقراری و بے چینی رکھنے والے افراد ان کے خاندان میں نیازمندوں میں یا کہیں بھی اسلام پسندوں میں پیدا ہوتے رہیں اور باقی رہیں۔ حیات و موت اللہ تعالیٰ کی سنت عادیہ ہے، وہ اپنی جگہ پر اپنا کام کرتی رہے گی، ہم مسلمان نہ مرثیہ خوانی کے قائل ہیں نہ کسی شخصیت کی تقدیس کو اپنا دین سمجھتے ہیں۔

رہے نام اللہ کا جو پہلے بھی تھا اور آج بھی ہے اور آئندہ بھی باقی رہے گا۔

البعث الاسلامی

● ''البعث الاسلامی'' جو دار العلوم ندوۃ العلماء کا اہم دینی اصلاحی اور ادبی رسالہ ہے، اس نے ۲۹۰ صفحات پر مشتمل خصوصی نمبر ''عدد ممتاز عن فقید الأمة الاسلامية سماحة العلامة الشيخ ابی الحسن علی الحسنی الندوی'' کے نام سے نکالا، جس میں ہندوستان اور عرب ملکوں کے علماء اور ادباء اور دانشوروں کے اہم مضامین خطوط، پیغامات شائع ہوئے، یہ خصوصی نمبر مجلس صحافت و نشریات ندوۃ العلماء کے زیر اہتمام مولانا سعید الرحمٰن اعظمی ندوی مہتمم دار العلوم ندوۃ العلماء کی ادارت میں منصۂ شہود پر آ گیا ہے۔

الرائد

● ''الرائد'' بھی ندوۃ العلماء کا ایک مؤقر عربی رسالہ ہے جسے عرب دنیا میں بڑی مقبولیت حاصل ہے اور عرب علماء و ادباء بڑی قدر کی نگاہ سے دیکھتے ہیں اس نے بھی حضرت مولانا پر اپنا خصوصی شمارہ ''عدد ممتاز عن سماحة الشيخ الندوی'' کے نام سے شائع کیا۔ یہ شمارہ مولانا سید محمد رابع حسنی ندوی کی سرپرستی

اور مولانا سید واضح رشید ندوی اور مولانا سید عبداللہ حسنی ندوی کی سربراہی میں منظر عام پر آگیا ہے۔ یہ دونوں رسالے عربی جاننے والوں کے لئے بیش قیمت تحفہ ہیں۔

تعمیر حیات

● حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی رحمۃ اللہ علیہ کی وفات حسرت آیات کے فوراً بعد ''تعمیر حیات'' نے اپنا خصوصی ضمیمہ عام شمارے کے ساتھ نکال دیا تھا جس میں حضرت مولاناؒ کی عظیم المرتبت شخصیت اور ان کے اوصاف وکمالات کا تذکرہ چند مضامین کے ساتھ اجمالاً آگیا تھا، اب ماشاء اللہ حضرت کی سیرت و سوانح پر عرب وعجم کے نامور مشہور ومعروف علماء وادباء اور دانشوروں کے اہم مضامین مولانا کی علمی ودینی خدمات، افکار وخیالات، اسلوب دعوت طریقہ کار مختلف تحریکوں اداروں انجمنوں سے ان کا قائدانہ تعلق اور عرب وعجم پر ان کی فکر کے اثرات اور ان کے امتیازی اوصاف وکمالات، منتخب شعراء کے کلام ودیگر بہت سی خصوصیات پر مشتمل خصوصی ویادگاری مجلّہ ''مفکر اسلام نمبر'' منصۂ شہود پر آگیا ہے اور آپ کے ہاتھوں میں ہے جس میں حضرت کی ہمہ گیر، عالمگیر شخصیت اور پاکیزہ زندگی کا مکمل احاطہ کیا گیا ہے، تعمیر حیات کا یہ خصوصی اور یادگاری نمبر مولانا عبداللہ عباس ندوی معتمد تعلیمات دارالعلوم ندوۃ العلماء مولانا سید محمد رابع حسنی ندوی ناظم ندوۃ العلماء کی سرپرستی میں مولانا سید محمد واضح رشید ندوی، پروفیسر وصی احمد صدیقی، پروفیسر سید محمد اجتباء ندوی، پروفیسر ضیاء الحسن ندوی، مولانا نذر الحفیظ ندوی، مولانا محمد حمزہ حسنی ندوی (ناظر عام ندوۃ العلماء) کی نگرانی اور مولانا شمس الحق ندوی کی ادارت میں شائع ہوکر منظر عام پر آگیا ہے یہ نمبر خوبصورت ٹائیٹل دیدہ زیب کتابت عمدہ طباعت، بہترین کاغذ اور دیگر بہت سے محاسن وخوبیوں پر مشتمل ہے اور ظاہری ومعنوی اعتبار

سے قابل تعریف اور ایک تاریخی دستاویز ہے۔

فریگرینس آف ایسٹ

● دار العلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ سے نکلنے والے انگریزی سہ ماہی ''فریگرینس آف ایسٹ'' نے بھی اپنا خصوصی شمارہ علی میاں نمبر (Special Issue on Ali Miyan) انگریزی میں نکالا ہے جس میں حضرت مولانا علی میاں ندوی کی حیات وخدمات اور دعوت وتعلیمات پر انگریزی میں اہم مضامین شامل کیے گئے ہیں یہ میگزین مولانا سید واضح رشید ندوی اور جناب شارق علوی کی سربراہی میں ماشاءاللہ منظر عام پر آ گیا ہے۔

بانگِ درا لکھنؤ

● انجمن شباب الاسلام لکھنؤ کی جانب سے مولانا سید سلمان الحسینی ندوی کی سربراہی میں بانگِ درا کا خصوصی نمبر نکلا جو مضامین کے لحاظ سے قابل تحسین اور قابل مطالعہ ہے۔ اس رسالہ کے ''مفکر اسلام حضرت مولانا علی میاں نمبر'' میں ملک وبیرون ملک کے نامور اہل علم، علماء اور دانشوروں کے اہم مضامین شامل ہیں جو قارئین کو دعوتِ مطالعہ دیتے ہیں۔

لاریب کلکتہ

● مدرسہ باب العلوم کلکتہ کے رسالہ لاریب نے ایک خصوصی اور یادگاری مجلّہ ''مولانا علی میاں نمبر'' شائع کیا۔ یہ مجلّہ اپنے منتخب مضامین اور حضرت مولانا کی شخصیت اور ان کے اقوال واحوال کے لحاظ سے قابل قدر اور داد وتحسین کے لائق ہے۔

رضوان لکھنؤ

● ماہنامہ ''رضوان'' لکھنؤ کی طرف سے بھی حضرت مولانا کی شخصیت پر خصوصی شمارہ نکالا گیا۔ یہ شمارہ مولانا حمزہ حسنی ندوی کی ادارت میں منظر عام پر آ گیا ہے

اوراہل علم صاحبان قلم،عوام وخواص خصوصاً خواتین کے لئے حضرت کاایک تحفہ ہے جسے حاصل کر کےضرور مطالعہ کیجئے۔

الصحوۃ الاسلامیۃ حیدرآباد

● جامعہ اسلامیہ دارالعلوم حیدرآباد سے عربی میں نکلنے والے رسالہ "الصحوۃ الاسلامیۃ " کامفکراسلام حضرت مولاناعلی میاں نمبر" نکلااس میں عرب وعجم کے علماءودانشوروں کے منتخب مضامین شائع ہوئے ہیں۔

الداعی دارالعلوم دیوبند

● الداعی جودارالعلوم دیوبند کاعربی ترجمان ہے۔اس کے فاضل ایڈیٹر نورعالم خلیل امینی نے بڑی نفاست اورذوق سےاعلیٰ ترین پیمانہ پرحضرت مولانا کی شخصیت پرخاص نمبرعربی میں شائع کیا ہے جوایک دستاویزی حیثیت رکھتا ہے اورخودرئیس التحریرکی تحریراخلاص وصداقت کانمونہ ہے۔

الشارق اعظم گڑھ

● جامعہ اسلامیہ مظفرپورقلندرپوراعظم گڑھ کاترجمان رسالہ''الشارق'' کاخصوصی نمبرحضرت مولاناسیدابوالحسن علی ندویؒ کی یادمیں مولاناتقی الدین ندوی مظاہری کی سرپرستی میں شائع ہوا،جس میں حضرت مولانا کی عظمت ورفعت اوران کے اوصاف وکمالات کاتذکرہ ملک وبیرون کے اہل علم وقلم نے اپنے مضامین میں بڑے محبت آمیزانداز میں کیاہے۔

نوائے ادب ممبئی

● انجمن اسلام اردوریسرچ انسٹی ٹیوٹ ممبئی سے حضرت مولاناسید

ابوالحسن علی ندوی کا قریبی تعلق تھا، اور وہ انجمن کے معاملات میں دلچسپی بھی لیا کرتے تھے۔ اس انجمن کے زیر اہتمام "سہ ماہی نوائے ادب" کا "مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندوی نمبر" شائع ہوا ہے جس میں حضرت مولانا کی حیات وخدمات کے بارے میں فکر انگیز اور معلومات افزاء مضامین شامل کئے گئے ہیں۔ انجمن اسلام نے اپنے محسن کو اس خصوصی نمبر کے ذریعہ خراج عقیدت پیش کر کے ان کے کارناموں کی یاد تازہ کر دی ہے۔

نصرۃ الاسلام کشمیر

● ماہنامہ "نصرۃ الاسلام" جو خطہ کشمیر کا ایک دینی تعلیمی، اخلاقی، اصلاحی اور ادبی رسالہ ہے، جس نے حضرت مولانا کی شخصیت پر اپنا ایک خصوصی شمارہ "مفکر اسلام نمبر" نکالا ہے، یہ نمبر انجمن نصرۃ الاسلام کے سرپرست میر واعظ مولوی محمد عمر فاروق کی سرپرستی اور محمد سعید الرحمٰن شمس کی ادارت میں شائع ہوا ہے جس میں متعدد اہل قلم کے مضامین شائع کئے گئے ہیں۔

ارمغان شاہ ولی اللہ پھلت

● ماہنامہ "ارمغان شاہ ولی اللہ" پھلت نے اپنا خصوصی شمارہ "گوشۂ مفکر اسلام" کے نام سے نکالا جس میں حضرت مولانا کی شخصیت، حیات اور امتیازی کمالات اور ان کی تعلیمات پر مشتمل مضامین شائع کئے گئے ہیں۔

نئی دنیا دہلی

● ہفت روزہ "نئی دنیا" نے حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی پر اپنا خصوصی شمارہ "مفکر اسلام نمبر" بڑی آن بان اور بڑے آب وتاب کے ساتھ باتصویر

شائع کیا یہ شمارہ اپنے مضامین انتخاب، تصاویر اور ترتیب وتزئین کے لحاظ سے قابل قدر اور قابلِ تحسین ہے۔ اس میں مولانا کی خدمات اور عالمی پیمانہ پر ان کی مقبولیت اوران کی خصوصیات وامتیازات پر تفصیل سے روشنی ڈالی گئی ہے یہ رسالہ تصاویر کی وجہ سے بڑا پرکشش تھا اور بروقت بھی نکلا تھا اس لئے اس کی اشاعت ایک لاکھ کے قریب ہوئی اور کئی ایڈیشن بھی نکلے۔

الجمعیۃ دہلی

● ہفت روزہ ''الجمعیۃ'' نئی دہلی نے اپنا خصوصی شمارہ ''مفکر اسلام مولانا علی میاں ندوی نمبر'' کے نام سے شائع کیا، جس میں حضرت مولانا کو خراج عقیدت پیش کیا گیا ہے، ان کی دینی خدمات کا اعتراف بھی کیا گیا ہے اور ان کی تعلیمات کو مشعل راہ بنانے کی ترغیب بھی دی گئی ہے۔

افکار ملی دہلی

● ''افکار ملی'' دہلی نے بھی اپنا ایک خاص شمارہ حضرت مولانا کی یاد میں نکالا، اس میں اہل قلم اور صاحبان علم ودانش نے حضرت مولانا کی خدمات اور ان کی امتیازی خصوصیات کا بڑے دلنشیں انداز میں تذکرہ کیا۔

ملی اتحاد دہلی

● ''ملی اتحاد'' دہلی نے بھی اپنی ایک اشاعت میں حضرت مولانا پر ایک خصوصی ضمیمہ شائع کیا، جس میں مولانا کی پہلودار شخصیت پر روشنی ڈالی گئی۔

ہدایت جے پور

● ماہنامہ ''ہدایت'' جے پور نے بھی ایک خصوصی نمبر حضرت مولانا علی میاں کی نسبت سے نکالا، جس میں حضرت مولانا کی عالمی پیمانہ پر مقبولیت اور ان کی دینی

دعوتی خدمات کا تذکرہ اہل علم وقلم نے تفصیل سے کیا۔

تذکیر غازی پور

● مجلّہ ''تذکیر'' غازی پور نے بھی اپنی خصوصی اشاعت ''بیادگار مفکر اسلام حضرت مولانا علی میاں ندویؒ'' میں کئی اہم مضامین اور حضرت مولانا کی اہم تحریریں شائع کر کے حضرت مولانا کو خراج عقیدت پیش کیا ہے۔

نقش نوائط بھٹکل

● بھٹکل سے حضرت مولانا علی میاں صاحب ندوی کو بڑا لگاؤ تھا۔ اور اہل بھٹکل بھی حضرت مولانا سے عقیدتمندانہ بلکہ نیازمندانہ تعلق رکھتے تھے، وہاں سے نکلنے والے رسالہ ''نقش نوائط'' نے اپنا خصوصی شمارہ ''مفکر اسلام حضرت مولانا علی میاں نمبر'' کنٹر زبان میں شائع کر کے اپنی محبت وعقیدت کا اظہار کیا ہے۔

ارمغان جامعہ بھٹکل

● جامعہ اسلامیہ بھٹکل سے حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی کا بحیثیت سرپرست بڑا تعلق تھا اور جامعہ کے اساتذہ بھی حضرت مولانا سے بڑی عقیدت ومحبت رکھتے تھے، طرفین کے اس خصوصی تعلق کی بنا پر جامعہ میں حضرت مولانا کی یاد میں جلسہ بھی ہوا، اور طلباء نے اپنے اساتذہ کی نگرانی میں حضرت مولاناؒ پر ایک خصوصی رسالہ اردو میں ارمغان جامعہ کا ''مفکر اسلام نمبر'' بھی نکالا، جس میں مولانا کی حیات وخدمات پر کسی قدر تفصیل سے روشنی ڈالی گئی ہے۔

الزہرۃ بھٹکل

● اسی جامعہ اسلامیہ بھٹکل سے نکلنے والے عربی مجلہ ''الزهرة'' نے

بھی ''عدد ممتاز عن سماحة الشیخ ابی الحسن علی الحسنی الندوی'' کے نام سے خصوصی نمبر نکالا ہے، اس میں بھی حضرت مولانا رحمۃ اللہ علیہ کے عظیم کارناموں اور عالمی پیمانہ پر ان کی دینی ودعوتی کوششوں کو بیان کیا گیا ہے۔

صوت القرآن احمد آباد

● ماہنامہ ''صوت القرآن'' احمد آباد کی جانب سے ''مفکر اسلام نمبر'' شائع ہوا، جس میں حضرت مولانا کی ہمہ گیر شخصیت اوران کی دینی وعلمی خدمات پر روشنی ڈالی گئی ہے۔

بیرون ملک کے اخبارات ورسائل

● اسی طرح ملک اور بیرون ملک سے شائع ہونے والے عربی، اردو، ہندی کے جرائد ورسائل میں حضرت مولانا کی حیات وخدمات پر تفصیل سے روشنی ڈالی گئی، اور بہت خوب لکھا گیا۔ روزنامہ ''الشرق الاوسط'' لندن، ''المدینہ'' مدینہ منورہ، روزنامہ ''عکاظ'' مدینہ منورہ، روزنامہ ''البیان'' متحدہ عرب امارات، ''صراط مستقیم'' برمنگھم، ''اردو نیوز'' جدہ، ''المجتمع'' کویت، المسلمون الدعوہ، الاربعاء، الرابطة العالم الاسلامی کے علاوہ دوسرے بہت سے عربی رسالوں نے حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی کو خراج عقیدت پیش کیا اور عرب اہل قلم ودانشوروں کے معیاری مضامین بھی شائع کئے۔

پاکستانی اخبارات ورسائل

پاکستان کے اہم رسالوں میں الفاروق کراچی، البلاغ کراچی تعمیر افکار کراچی، ختم نبوت کراچی، بینات کراچی، انوار مدینہ لاہور، حق چار یار لاہور، الحق کوڑہ، خٹک، النصیحۃ لاہور، الصیانۃ، لاہور، ترجمان القرآن، لاہور، وغیرہ نے حضرت

مولانا رحمۃ اللہ علیہ کی شخصیت پر تفصیلی مضامین چھاپے اور مولانا کی زندگی کے نقوش اور خدمات کا تفصیلی خاکہ پیش کیا، جن میں ماہنامہ، الحق، کا کردار خاص طور پر قابل ذکر رہا ہے۔

بنگلہ دیش کے اخبارات ورسائل

● بنگلہ دیش کے اخبارات ورسائل میں بھی حضرت مولانا کی سیرت پر مضامین شائع کئے گئے جو کافی مقبول ہوئے۔

ہندوستانی اخبارات ورسائل

● ہندوستان کے عربی، اردو، ہندی، انگریزی اخبارات ورسائل نے بھی اس سلسلے میں قابل، ذکر رول ادا کیا ہے، اور حضرت مولانا کی جلالت شان اور علمی شخصیت سے قارئین کو روشناس کرایا، ان اخبارات ورسائل میں، البعث الاسلامی، الرائد، تعمیر حیات، کاروان ادب، فریگرینس (انگریزی) ندوۃ العلماء لکھنؤ، بانگ درا، لکھنؤ، الفرقان لکھنؤ، ندائے ملت لکھنؤ، نئی دنیا، نئی دہلی، روزنامہ انقلاب ممبئی، معارف اعظم گڑھ، ماہنامہ، دارالعلوم دیوبند، ماہنامہ مظاہر العلوم علوم، سہارنپور، آئینہ دارالعلوم دیوبند، ندائے دارالعلوم وقف دارالعلوم دیوبند، یادگار شیخ سہارنپور ندائے شاہی مرادآباد، فیض محمود اعظم گڑھ الرشاد اعظم گڑھ، الشارق، اعظم گڑھ ماہنامہ رضوان لکھنؤ، سہ ماہی اسلام اور عصر جدید دہلی، ماہنامہ اشرف العلوم حیدرآباد ،ملی اتحاد دہلی، ارمغان پھلت مظفر نگر، سہ روزہ دعوت دہلی، افکار ملی دہلی، اردو راشٹریہ سہارا لکھنؤ، روزنامہ ان دنوں لکھنؤ، حقیقت لکھنؤ، پیام سچ لکھنؤ، جدید مرکز لکھنؤ، صحافت لکھنؤ، لاریب لکھنؤ، السراج جھنڈانگر، نورتوحید کشمیر، فراسۃ المؤمن کانپور، نقیب پٹنہ، اردو ٹائمز ممبئی، سالار بنگلور، سیاست بنگلور، روزنامہ مقدس اورنگ

آباد، ماہنامہ ہدایت جے پور، مجلّہ تذکیر غازیپور، نقش نوائط، بھٹکل، الداعی دارالعلوم دیوبند، سہ ماہی صفا حیدرآباد، ماہنامہ ہجرت ونصرت، پونہ، روحانی اسرار سہارنپور، دعوت وعزیمت دہلی، اخبار مشرق کلکتہ، صوت الامۃ بنارس، محدث بنارس، ترجمان القرآن بنارس، المحمود ہاپوڑ، المآثر مئو، نورر توحید، جھنڈانگر، برہان دہلی، النور مہاراشٹرا، ماہنامہ ذکریٰ رامپور، سہ ماہی اسلام دہلی، نصرۃ الاسلام کشمیر، روزنامہ ٹائمز اورنگ آباد، پائنیر لکھنؤ، ٹائمس آف انڈیا لکھنؤ، ہندوستان ٹائمس لکھنؤ، اسٹیٹس مین دہلی، سیاست جدید کانپور، انڈین ایکسپریس دہلی، جاگرن لکھنؤ، مسلم بنگلور، ریڈینس دہلی، ارمغان جامعہ بھٹکل کے علاوہ سیکڑوں ہندی، انگریزی، عربی، اردو، فارسی اخباروں نے حضرت مولانا پران کی شایان شان مضامین شائع کئے، اورٹی وی، ریڈیو وغیرہ نے خبریں نشر کیں، اور حضرت مولانا کی پاکیزہ سیرت اوران کی دینی وعلمی خدمات سے لوگوں کو روشناس کرایا۔

''جدید مرکز'' کا جلسہ ڈاکٹر عبداللہ عباس ندوی نے لکھنؤ کے اسی طرح کے ایک اجتماع کو خطاب کیا جو'' جدید مرکز'' کے صدر دفتر میں جناب حسام الدین صدیقی کی دعوت پر منعقد ہوا تھا اور جس میں شہر کا منتخب ترین طبقہ موجود تھا۔

حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی رحمۃ اللہ علیہ نے عربی واسلامی ادب وثقافت کی جو خدمات انجام دی ہیں وہ ایک انفرادی شان رکھتی ہیں، اس کا اعتراف انہی الفاظ میں ابھی ۲۵ رشعبان ۱۴۲۱ھ کو مغرب اقصیٰ میں کیا گیا، اور ایک '' وسام '' (تمغہ) آپ کے نام پیش کیا گیا، اور حضرت مولانا کے جانشیں مولانا سید محمد رابع ندوی ناظم ندوۃ العلماء کو دعوت دی گئی تھی کہ وہ مغرب کے دارالحکومت ''رباط'' میں جاکر اس سپاس نامہ عقیدت واحترام کو اپنے ماموں صاحب علیہ الرحمہ کی نیابت میں قبول کریں، مولانا سید محمد رابع حسنی ندوی نے ہندوستان کے اندر اپنے طے شدہ

دوروں کے پیش نظر معذرت کرلی اوراپنی نیابت کے لئے حضرت مولاناؒ کے ایک خادم راقم الحروف (مولانا عبداللہ عباس ندوی معتمد تعلیم دارالعلوم ندوۃ العلماء) کو منتخب فرمایا۔

یہ لفظ "وسام" ہماری زبان میں غیر معروف ہے، مگر عربی میں یہ لفظ بہت قدیم اور فصیح ہے اگر کسی کے جسم یا لباس پر ایک ایسا علامتی نشان لگایا جائے جس سے اس کی شناخت کی جاسکے اس کو "وسام" کہتے ہیں فوج کے جنرلوں اور بڑے عہدے داروں کے شانے پر کچھ ایسے علامتی نشان (ستاروں کی شکل میں) لگائے جاتے ہیں ان کو بھی "وسام" کہتے ہیں۔ اور اگر کسی بڑے تسلیم شدہ عالم اور دانشور کی خدمات کے اعتراف میں اس طرح کے نشان پیش کئے جائیں تو انگریزی میں اس کو EGION OF HONOUR کہا جاتا ہے اردو میں میں نے اس کا ترجمہ تمغۂ اعتراف یا سپاسنامہ عقیدت کیا ہے۔

یہ تمغہ اعتراف یا سپاسنامہ عقیدت واحترام "ایسسکو" (تنظیم برائے امور تربیت وتعلیم وثقافت) کے ساتویں اجلاس کے موقع پر پیش کیا گیا، جو "رباط" میں اس سال منعقد ہوا جہاں اس کا صدر دفتر ہے، اور اس کو شاہِ مغرب ملک محمد السادس کی سرپرستی حاصل ہے۔ یہ تمغہ یا سپاسنامہ ایک سنہری پلیٹ ہے، جس پر یہ عبارت کندہ ہے۔

المنظمة الاسلامية للتربية والعلوم والثقافة (الله اكبر) اليسسكو ISESSCO الى فضيلة العلامة الشيخ ابوالحسن على الحسنى الندوى تقدير عطائه العلمى المميز فى خدمة الثقافة العربية الاسلامية۔

دستخط سکریٹری جنرل ایسسکو

عبدالعزیز بن عثمان التویجری

اس آخری جملہ کا مفہوم اردو میں یہ ہوا کہ حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی ؒ نے اسلامی ادب وثقافت کی بیش بہا اور انفرادی انداز کی عظیم خدمات انجام دی ہیں اس کا اعتراف اور ان کی شخصیت کی عظمت کو ظاہر کرنے کے لئے یہ "وسام" پیش کیا گیا جو یہاں کا سب سے اعلیٰ درجہ کا تمغہ ہے۔

اس کے ساتھ ایک سند بھی ہے جو ایک خوبصورت مخملی سبز رنگ کے غلاف میں پیش کی گئی، اس طرح کی اسناد پر بطور عنوان عربی میں جو لفظ لکھے جاتے ہیں "براء ۃ" ہے بڑے بڑے ایوارڈ کے ساتھ اسی طرح کی سند دی جاتی ہے اور اس کا عنوان بھی یہی ہوتا ہے۔ حضرت علامہ کی خدمت میں بعد وفات یہ سند دی گئی کیونکہ جب کمیٹی نے پاس کیا تھا اس کے بعد کا اجتماع اب ہوا ہے، اس پر لکھا ہے۔

تقدير عطا ئه المميّز اعراباً للخدمات الحليلة التى قدمها الى الثقافة العربية الاسلامية تتشرف المنظمة الاسلامبة للتربية والعلوم والثقافة (الايسسكو)بتقديم وسام الا يسسكو من درجة الاولى الى فضيلةالعلامة الشيخ ابوالحسن على الحسنى الندوى تغمده الله برحمته

ان کی انفرادی وممتاز خدمات جلیلہ کے اعتراف وقدردانی کے ساتھ اور ان کی عظمت کو تسلیم کرتے ہوئے، تنظیم برائے اسلامی تربیت، علوم اور ثقافت (ایسسکو) سب سے بڑا امتیازی نشان ''وسام'' حضرت علامہ شیخ ابوالحسن علی حسنی ندوی رحمۃ اللہ علیہ کی خدمت میں پیش کرنے کا شرف حاصل کرتی ہے تغمدّه الله برحمته (اللہ تعالیٰ

آپ کو ہمیشہ اپنی رحمت کے چادروں میں ڈھکا رکھے)

(دستخط سکریٹری جنرل)

عبدالعزیز بن عثمان التویجری

برصغیر سے باہر مراکش کے شہر ''رباط'' میں وہاں کے بادشاہ محمد السادس کی سرکردگی میں علمی وادبی خدمات انجام دینے والا ادارہ ایسسکو نے مولانا کی خدمت میں سپاس نامۂ عقیدت واحترام ایک ''وسام'' کی شکل میں پیش کیا جس کو راقم نے مولانا نے سید محمد رابع حسنی ندوی کی نیابت میں وصول کیا اس کی کسی قدر تفصیل تعمیر حیات مورخہ ۱۰؍جنوری ۲۰۰۱ء میں تحریر کیا تھا۔



INDEX





محمد غفران ندوی


شخصیات






د ڈ ذ

ر ز















ن



ھ

ی



الف

ب پ



م

متفرقات

ادارے، جامعات، تنظیمات

الف

ن و ہ

